ناولٹ

انٹرویو

افسانے

ناول

نظمیں غزلیں

مکمل ناول

مستقل سلسلے

اپریل 2012
جلد 26 شمارہ 8
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: 91 بی، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

رضیہ جمیل

پہلی بات

شعاع کا اپریل کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
تنگ نظری کے زہر نے ذہنوں کو انتشار، سراسیمگی، خوف اور بے بسی کی فضا میں سانس لیتے جہاں تعصب، مسموم کر رکھا ہو، انصاف کی جستجو بھی لاحاصل ٹھہرے تو ناہموار زندگی کی صداقتیں دھندلانے لگتی ہیں۔ نیکی اور خیر سے ایمان اٹھنے لگتا ہے۔ دہشت اور وحشت تمام انسانی اوصاف پر حاوی نظر آتی ہے۔

تہذیب انسانی میں معاشرے کی تشکیل میں عدل اور انصاف کی حیثیت بنیادی رہی ہے۔ وہ قومیں اپنا وجود کھو بیٹھیں اور صفحۂ ہستی سے معدوم ہوگئیں جہاں انصاف میں امتیاز برتا جاتا تھا۔ بالادست اور زیردست کے لیے علیحدہ علیحدہ پیمانے مقرر تھے۔

اس سب پر مستزاد یہ کہ چاروں طرف سے اس قدر ڈھول اڑائی جا رہی ہے کہ سوچ و فکر کی راہیں مسدود اور مثبت قوتیں ہر سطح پر کمزور نظر آ رہی ہیں۔ ظلم، ناانصافی اور جبر پر کسی ردعمل کا اظہار بھی نہ ہو تو تمام تر خوش امیدی کے باوجود اضطراب کی کیفیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔

حالات بدلنا اختیار میں نہیں، تبدیلی کا عمل بھی آسان نہیں کہ پچھلے دو عشروں میں جڑیں بہت گہری ہو چکی ہیں۔ مگر کیا خواہش بھی نہیں کی جا سکتی؟

تبدیلی کے عمل کا آغاز ارادے اور خواہش سے ہی ہوتا ہے۔ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ کم از کم ظلم کو دل میں ہی برا سمجھ لیا جائے۔ شاید کبھی نجات ممکن ہو جائے۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ جنت کے پتے،
- نایاب جیلانی کا مکمل ناول ۔ دل کی بات،
- سونیا نوید، صوفیہ امجد اور رشک حبیبہ کے ناولٹ،
- عنیقہ محمد بیگ، قانتہ رابعہ، امثل عزیز شہزاد، سلمٰی فاروق اور فاطمہ عسکری کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
- کاشف خان اور کنول کاشف خان کا بندھن،
- میکسم گورکی کے شہرہ آفاق ناول "ماں" پر تبصرہ،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ دستک،
- شعاع کے ساتھ ساتھ ۔ قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ ہم نے آپ کے لیے پوری محنت سے ترتیب دیا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کے لیے آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

ناؤ بیچ بھنور سائیں
میرے ہاتھ میں ڈر سائیں

دیر تو ہے تیرے گھر میں
نہیں اندھیر مگر سائیں

دولت علم و یقیں بھی نہیں
اور نہ کوئی ہنر سائیں

اپنے نور کی کوئی لو
میرے نام بھی کر سائیں

تیرے وصف نہ ختم ہوئے
ختم ہوا دفتر سائیں

نعمان فاروق

نعت رسول مقبول

چشم نمناک اِدھر سوئے مدینہ دیکھے
دل مشتاق اُدھر گنبدِ خضرا دیکھے
آپ کی ذات ہے قرآن کا پرتو
بند کیسے ہے کوئی کوزے میں دریا دیکھے
آپ مینارۂ انوار ہیں جس رہ سے چلے
دور تک راہ گزر ایک اُجالا دیکھے
انؐ کے قدموں کی سنے چاپ کبھی سینے پر
انؐ کو بیٹھا کبھی آغوش میں صحرا دیکھے
انؐ کے احباب جو ملتے میں رہے ہیں ان کے
انؐ پہ قربان! کوئی ان کا نصیبا دیکھے
وہ جو کرتا ہے محبت میں وفا کا دعوا
انؐ کے احکام پہ صدیق کا مرنا دیکھے

شمیم فاطمہ

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

انسانی جان کی حرمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اونٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک شخص نے اس کی نکیل تھام رکھی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "آج یہ کون سا دن ہے؟"

ہم خاموش رہے' حتیٰ کہ ہم سمجھے کہ آج کے دن کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی دوسرا نام اس کے نام کے علاوہ تجویز فرمائیں گے۔ (پھر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے؟"

ہم نے عرض کیا۔ "بے شک۔"

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ کون سا مہینہ ہے؟"

(ہم اس پر بھی) خاموش رہے اور یہ (ہی) سمجھے کہ اس مہینے کا (بھی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کے علاوہ کوئی دوسرا نام تجویز فرمائیں گے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کیا یہ ذوالحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟"

ہم نے عرض کیا "بے شک!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تو یقیناً" تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبرو تمہارے درمیان اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج کے دن کی حرمت تمہارے اس مہینے اور اس شہر میں ہے۔ پس جو شخص حاضر ہے اسے چاہیے کہ غائب کو یہ (بات) پہنچادے کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ جو شخص یہاں موجود ہے وہ ایسے شخص کو یہ خبر پہنچائے' جو اس سے زیادہ (حدیث کا) یاد رکھنے والا ہو۔"

علم کا درجہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "آپ جان لیجیے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔"

تو (گویا) اللہ تعالیٰ نے علم سے ابتدا فرمائی اور (حدیث میں ہے) کہ علما انبیا کے وارث ہیں۔ (اور) پیغمبروں نے علم (ہی) کا ورثہ چھوڑا ہے۔ پھر جس نے علم حاصل کیا' اس نے (دولت کی) بہت بڑی مقدار حاصل کرلی۔ اور جو شخص کسی راستے پر حصول علم کے لیے چلے' اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کی راہ آسان کردیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔"

اور (دوسری جگہ) فرمایا۔

"اور اس کو عالموں کے سوا کوئی نہیں سمجھتا۔"

اور فرمایا۔ "اور ان لوگوں (کافروں) نے کہا' اگر ہم سنتے' عقل رکھتے تو جہنمی نہ ہوتے۔"

اور فرمایا۔

"کیا علم والے اور جاہل برابر ہیں؟"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص کے ساتھ اللہ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عنایت فرمادیتا ہے۔"

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "علم تو سیکھنے ہی سے آتا ہے۔"

اور حضرت ابوذر رضیؓ کا ارشاد ہے کہ "اگر تم اس پر تلوار رکھ دو" اور اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا" اور مجھے گمان ہو کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو

ایک کلمہ سنا ہے گردن کٹنے سے پہلے بیان کرسکوں گا تو یقیناً" اسے بیان کرہی دوں گا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ۔

"حاضر کو چاہیے کہ (میری بات) غائب کو پہنچا دے۔" (صحیح بخاری)

نصیحت کا انداز

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آسانی کرو اور سختی نہ کرو اور خوش کرو اور نفرت نہ دلاؤ۔"

عبداللہ (ابن مسعود) ہر جمعرات کے دن لوگوں کو وعظ سنایا کرتے تھے۔ ایک آدمی نے ان سے کہا۔

"اے ابو عبدالرحمان! میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیں ہر روز وعظ سنایا کرو۔"

انہوں نے فرمایا۔ "سن لو' میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ کہیں تم تنگ نہ ہوجاؤ اور میں وعظ میں تمہاری فرصت کا وقت تلاش کیا کرتا ہوں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ ہم کبیدہ خاطر نہ ہوجائیں' وعظ کے لیے ہمارے اوقات فرصت کا خیال رکھتے تھے۔" (صحیح بخاری)

تشریح:

احادیث بالا اور اس باب سے مقصود اساتذہ کو یہ بتلانا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے ذہن کا خیال رکھیں' تعلیم میں اس قدر انہماک اور شدت صحیح نہیں کہ طلبا کے دماغ تھک جائیں اور وہ اپنے اندر بے دلی اور کم رغبتی محسوس کرنے لگ جائیں۔

اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے درس و مواعظ کے لیے ہفتہ میں صرف جمعرات کا دن مقرر کر رکھا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نفلی عبادت اتنی نہ کی جائے کہ دل میں بے رغبتی اور ملال پیدا ہو۔

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔

"جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرے' اسے دین کی سمجھ عنایت فرمادیتا ہے اور میں تو محض تقسیم کرنے والا ہوں' دینے والا تو اللہ ہی ہے اور یہ امت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی اور جو شخص اس کی مخالفت کرنے گا' اسے نقصان نہیں پہنچاسکے گا' یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قیامت) آجائے (اور یہ عالم فنا ہوجائے۔)" (صحیح بخاری)

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ "سردار بننے سے پہلے سمجھ دار بنو" (یعنی دین کا علم حاصل کرو)

اور ابو عبداللہ (حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ "سردار بنائے جانے کے بعد بھی علم حاصل کرو' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ نے بڑھاپے میں بھی دین سیکھا۔"

رشک کرنا

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ۔

"رشک صرف دو باتوں میں جائز ہے۔ ایک تو اس شخص کے بارے میں جسے اللہ نے دولت دی ہو اور وہ اس دولت کو راہ حق میں خرچ کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہو اور ایک اس شخص کے بارے میں جسے اللہ نے حکمت (کی دولت) سے نوازا ہو اور وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہو اور (لوگوں کو) اس حکمت کی تعلیم دیتا ہو۔" (صحیح بخاری)

علم کا زوال

حضرت انسؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا کہ "میں تم سے ایک ایسی حدیث بیان کرتا ہوں' جو میرے بعد تم سے کوئی نہیں بیان کرے گا' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔

"علامات قیامت میں سے یہ ہے کہ علم (دین) کم ہوجائے گا۔ جہل ظاہر ہوجائے گا۔ زنا بکثرت ہوگا۔ عورتیں بڑھ جائیں گی اور مرد کم ہوجائیں گے۔ حتیٰ کہ

پچاس عورتوں کا نگران صرف ایک مرد رہ جائے گا۔"
(صحیح بخاری)

علم کی فضیلت کے بیان میں

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ

"میں سو رہا تھا۔ (اسی حالت میں) مجھے دودھ کا ایک پیالہ دیا گیا۔ میں نے (خوب اچھی طرح) پی لیا۔ حتیٰ کہ میں نے دیکھا کہ تازگی میرے ناخنوں سے نکل رہی ہے۔ پھر میں نے اپنا بچا ہوا (دودھ) عمر بن خطاب کو دے دیا۔"

صحابہؓ نے پوچھا "آپ نے اس کی کیا تعبیر لی؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "علم۔" (صحیح بخاری)

میانہ روی

ابو مسعود انصاریؓ سے روایت ہے۔
ایک شخص (حزم بن ابی کعب) نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر) عرض کیا۔
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! فلاں شخص (معاذ بن جبل) نماز پڑھاتے ہیں اس لیے میں (جماعت کی) نماز میں شریک نہیں ہو سکتا۔" (کیونکہ میں دن بھر اونٹ چرانے کی وجہ سے رات کو تھک کر چکنا چور ہو جاتا ہوں اور طویل قرأت سننے کی طاقت نہیں رکھتا۔)

(ابو مسعودؓ راوی کہتے ہیں کہ "اس دن سے زیادہ میں نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وعظ کے دوران غضب ناک نہیں دیکھا۔")
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اے لوگو! تم (ایسی شدت اختیار کرکے لوگوں کو دین سے) نفرت دلانے لگے ہو۔ (سن لو) جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ ہلکی پڑھائے کیونکہ ان میں بیمار، کمزور اور حاجت والے (سب ہی قسم کے لوگ) ہوتے ہیں۔"

تشریح:
غصہ کا سبب یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے بھی منع کر چکے ہوں گے دوسرے ایسا کرنے سے ڈر تھا کہ کہیں لوگ تھک ہار کر اس دین سے نفرت نہ کرنے لگیں۔

شفاعت کی سعادت

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا۔
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قیامت کے دن آپ کی شفاعت سے سب سے زیادہ سعادت کسے ملے گی؟"
تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اے ابو ہریرہ! مجھے یقین تھا کہ تم سے پہلے کوئی اس کے بارے میں مجھ سے دریافت نہیں کرے گا۔ کیونکہ میں نے حدیث کے متعلق تمہاری حرص دیکھ لی تھی۔ سنو! قیامت میں سب سے زیادہ فیض یاب میری شفاعت سے وہ شخص ہوگا، جو سچے دل سے یا سچے جی سے "لا الٰہ الا اللہ" کہے گا۔"

تشریح:
حدیث شریف کا علم حاصل کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحسین فرمائی۔ دل سے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شرک سے بچے، کیونکہ جو شرک سے نہ بچا، وہ دل سے اس کلمہ کا قائل نہیں ہے۔ اگرچہ زبان سے اسے پڑھتے ہیں۔

علم کا اٹھ جانا

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ۔
"اللہ علم کو اس طرح نہیں اٹھالے گا کہ اس کو بندوں سے چھین لے۔ بلکہ وہ (پختہ کار) علما کو موت دے کر علم اٹھائے گا۔ حتیٰ کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، ان سے سوالات کیے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے جواب دیں گے۔ اس لیے خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔"

عورتوں کی تعلیم

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ عورتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "(آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فائدہ اٹھانے میں) مرد ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں اس لیے آپ اپنی طرف سے ہمارے (وعظ کے) لیے (بھی) کوئی دن خاص فرما دیں۔" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک دن کا وعدہ فرمالیا۔ اس دن عورتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاقات کی اور انہیں وعظ فرمایا اور (مناسب) احکام سنائے۔ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا اس میں یہ بات بھی تھی۔
"جو کوئی عورت تم میں سے (اپنے) تین (بچے) آگے بھیج دے گی۔ اس کے لیے دوزخ سے پناہ بن جائیں گے۔" اس پر ایک عورت نے کہا۔ اگر دو (بچے بھیج دے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں! اور دو (کا بھی یہ حکم ہے۔)"

تشریح:
یعنی دو معصوم بچوں کی موت ماں کے لیے بخشش کا سبب بن جائے گی۔ پہلی مرتبہ تین بچے فرمایا، پھر دو اور ایک حدیث میں ایک کے انتقال پر بھی یہ بشارت آئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو ایک مقرر دن میں یہ وعظ فرمایا۔ دو بچوں کے بارے میں سوال کرنے والی صحابیہ کا نام ام سلیم تھا۔ ایک بچے کے لیے بھی یہی بشارت ہے۔
ابو ہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا "ایسے تین (بچے) جو ابھی بلوغت کو نہ پہنچے ہوں۔"

تشریح:
بلوغ ہونے سے پہلے بچے کی موت کا کافی رنج ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے بچے کی موت ماں کی بخشش کا ذریعہ قرار دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"مجھ پر جھوٹ مت بولو۔ کیونکہ جو مجھ پر جھوٹ باندھے وہ دوزخ میں داخل ہو۔"
حضرت انسؓ فرماتے تھے کہ "مجھے بہت سی حدیثیں بیان کرنے سے یہی بات روکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔ "جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔"

قرآن کا علم

شعبی کہتے ہیں میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا۔
کیا آپ کے پاس کوئی (اور بھی) کتاب ہے؟
انہوں نے فرمایا "نہیں، مگر اللہ کی کتاب قرآن ہے یا پھر فہم ہے جو وہ ایک مسلمان کو عطا کرتا ہے۔ یا پھر جو کچھ اس صحیفے میں ہے۔"
میں نے پوچھا۔
"اس صحیفے میں کیا ہے؟"

انہوں نے فرمایا! "دیت اور قیدیوں کی رہائی کا بیان ہے اور یہ حکم کہ مسلمان، کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔"

علم کی فضیلت

اور اللہ پاک نے (سورۂ مجادلہ) میں فرمایا۔
"جو تم میں ایمان دار ہیں اور جن کو علم دیا گیا ہے، اللہ ان کے درجات بلند کرے گا اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔"
اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ طٰہٰ میں) فرمایا۔ (کہ یوں دعا کیا کرو۔)
"پروردگار مجھ کو علم میں ترقی عطا فرما۔"

تشریح:
امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے فضیلت علم کے

بارے میں قرآن مجید کی ان دو آیات ہی کو کافی سمجھا' اس لیے کہ پہلی آیت میں اللہ پاک نے خود اہل علم کے لیے بلند درجات کی بشارت دی ہے اور دوسری میں علمی ترقی کے لیے دعا کرنے کی ہدایت کی گئی۔ نیز پہلی آیت میں ایمان و علم کا رابطہ مذکور ہے اور ایمان کو علم پر مقدم کیا گیا ہے۔

جنت کے عمل

حضرت انسؓ سے روایت ہے ایک دفعہ ایک دیہاتی آیا اور اس نے کہا کہ "(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ہاں آپؐ کا مبلغ آیا تھا۔ جس نے خبر دی کہ اللہ نے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنا کر بھیجا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس نے بالکل سچ کہا۔"

پھر اس نے پوچھا "آسمان کس نے پیدا کیے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔ "اللہ عزو جل نے۔"

اس نے پوچھا کہ "زمین کس نے پیدا کی ہے اور پہاڑ کس نے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔ "عزو جل نے۔"

پھر اس نے پوچھا کہ "ان میں نفع دینے والی چیزیں کس نے پیدا کی ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ عزو جل نے۔"

پھر اس نے کہا کہ "پس اس ذات کی قسم دے کر آپ سے پوچھتا ہوں جس نے زمین و آسمان اور پہاڑوں کو پیدا کیا اور اس میں منافع پیدا کیے' اللہ عزو جل نے آپ کو اپنا رسولؐ بنا کر بھیجا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ۔ "ہاں! بالکل سچ ہے۔" (اللہ نے مجھ کو رسول بنایا ہے۔)

پھر اس نے کہا کہ "آپؐ کے مبلغ نے بتلایا ہے کہ ہم پر پانچ وقت کی نمازیں اور مال سے زکوٰۃ ادا کرنا اسلامی فرائض ہیں' کیا یہ درست ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں اس نے بالکل کہا ہے۔"

پھر اس نے کہا۔ "آپؐ کو اس ذات کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے آپؐ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنایا ہے' کیا اللہ پاک ہی نے آپؐ کو ان چیزوں کا حکم فرمایا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں بالکل درست ہے۔"

پھر وہ بولا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کا خیال ہے کہ ہم میں سے جو طاقت رکھتا ہو اس پر بیت اللہ کا حج فرض ہے۔ آپؐ کو اس ذات کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا کہ کیا اللہ ہی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ "ہاں!"

پھر وہ کہنے لگا کہ "قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا' میں ان باتوں پر کچھ زیادہ کروں گا نہ کم کروں گا۔" (بلکہ ان ہی کے مطابق اپنی زندگی گزاروں گا۔)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر اس نے اپنی بات کو سچ کر دکھایا تو وہ ضرور ضرور جنت میں داخل ہو جائے گا۔"

بندھن

کاشف خان ہمراہ کنول کاشف خان

شاہین رشید

ہمارے یہاں کامیڈی فنکاروں کی تعداد بہت کم ہے۔ معین اختر اور لیاقت سولجر کے خلا کو تو کوئی پر نہیں کر سکتا' لیکن ابھی بھی کچھ فنکار ہیں جو کامیڈی کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور لوگوں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر کر تھوڑی دیر کے لیے ٹینشن سے نجات دلا دیتے ہیں۔ کامیڈین کاشف خان ان میں سے ایک ہیں۔ لوگوں کو ہنسانے والے اپنی گھریلو زندگی میں کیسے ہیں۔ آئیے دیکھتے ہیں۔

کاشف خان

"کیسے ہیں کاشف اور آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے اور جو ہمارا کام ہے' وہی کر رہا ہوں' ہم ایک معیاری کامیڈی کے لائیو شو کرتے ہیں۔"

"شوز کے سلسلے میں آپ ملک سے باہر بھی جاتے ہیں تو کیا فیملی کو ساتھ لے کر جاتے ہیں؟"

"نہیں۔ ہمیشہ نہیں۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے کہ فیملی کو ساتھ لے جاتا ہوں' ورنہ عموماً اپنی ٹیم کے ساتھ ہی جاتا ہوں۔"

"تو پھر فیملی آپ کو اور آپ فیملی کو مس کرتے ہوں گے؟"

"بالکل جی۔ بالکل جی۔ یہ تو ہوتا ہی ہے' لیکن کیا کریں کہ یہی ذریعہ روزگار ہے اور گھر سے دور فیملی سے دور جانا پڑتا ہے۔ مگر اب کمپیوٹر نے کام آسان کر دیا ہے۔ اب اسکائپ کے ذریعے آمنے سامنے بیٹھ کر آسانی سے بات ہو جاتی ہے تو اس طرح دوری کا احساس ذرا کم ہو جاتا ہے۔ دور بہت فاسٹ ہو گیا ہے۔ فاصلے سمٹ گئے ہیں۔"

"اب تو بس اسکائپ پہ چھونے کی کسر رہ گئی ہے' خیر "بندھن" کی طرف آئیے' پہلے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے۔"

"ہم ماشاء اللہ بارہ بہن بھائی ہیں اور بھائیوں میں میرا پہلا نمبر ہے اور میری تعلیم انٹر تک ہے۔ زیادہ تعلیم اس لیے نہیں حاصل کر سکا کہ میں فیلڈ میں آگیا تھا۔ میرے علاوہ میرا ایک چھوٹا بھائی اس فیلڈ میں ہے جو کہ "ہم" ٹی وی سے وا بستہ ہے۔ میں 17 اگست 1977ء میں کراچی میں پیدا ہوا اور ہم اردو اسپیکنگ ہیں۔"

"شادی کب ہوئی' کتنے بچے ہیں؟"

"2 فروری 2002ء میں میری شادی

ہوئی' اور تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑے بیٹے کا نام خریم (khuraim) ہے۔ دوسرے بیٹے کا نام محمد جریر اور بیٹی کا نام ہے رابیکا بیٹی درمیان کی ہے یعنی بیٹا' بیٹی اور پھر بیٹا اور میرے دونوں بیٹوں کے نام صحابہ کرام کے نام پر ہیں اور میری بیگم کا نام کنول ہے۔"

"کنول پھول کا نام ہے تو کنول کے پھول کی طرح ہی ہیں کیا اور کیا پسند کی شادی ہے؟"

"بالکل جی۔ نام کا کچھ اثر آیا ہے؟ اور پسند کی شادی نہیں ہے۔ گھر والوں کی پسند ہے۔ ارینج میرج ہے۔ میں نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے شاید مجھے ٹی وی میں دیکھا ہو گا۔ تو بڑوں کے فیصلے تھے سر جھکا دیا اور اللہ کا شکر ہے کہ کوئی مایوسی نہیں ہوئی۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی؟ اور منگنی کے دوران کوئی ملاقات یا بات چیت ہوئی؟"

"ہمارا تو چٹ منگنی پٹ بیاہ والا کام ہوا۔ جب گھر والوں نے ہماری شادی کا ارادہ کیا' تب ہی انہوں نے لڑکی ڈھونڈنا شروع کی اور منگنی صرف دو مہینے ہی رہی اور دو مہینے کے دوران نہ ملاقات ہوئی' نہ بات ہوئی' اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ شادی میں جو مسائل جنم لیتے ہیں' وہ لمبی چوڑی منگنی کی وجہ سے اور بلاوجہ کی ملاقاتوں اور بات چیت کی وجہ سے ہی ہوتے ہیں۔"

"لوگ تو کہتے ہیں کہ میل ملاقات سے انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے مزاجوں کا پتا چلتا رہتا ہے؟"

"میں اس بات کو نہیں مانتا' کیونکہ ایسا عموماً" ہوتا نہیں ہے۔ میں نے تو میل ملاقات کے نتیجے میں لڑائیاں ہی ہوتے دیکھی ہیں۔ کیونکہ شادی کے بعد کی لائف کچھ اور ہوتی ہے اور شادی سے پہلے کی کچھ اور۔ شادی سے پہلے ملاقاتیں ہوں تو توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں جو پوری نہ ہوں تو لڑائیاں ہوتی ہیں۔ جبکہ بغیر دیکھے ایک دوسرے کے مزاجوں کو سمجھنے میں ہی کافی وقت لگ جاتا ہے۔ کم سے کم دو سال تو آرام سے ہی گزر جاتے ہیں۔"

"تو پھر پہلی مرتبہ کب دیکھا' شادی کے دن؟ شادی دھوم دھام سے ہوئی؟"

"ہماری رسمیں مشترکہ ہوئی تھیں۔ تو دیکھنے کا موقع ملا۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ بہت بڑا فنکشن ہوا تھا جو صبح اذان کے وقت ختم ہوا تھا اور چونکہ میں تھوڑا شرمیلا تھا۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی' صرف چوبیس سال کا تھا اور کنول سترہ' اٹھارہ سال کی تھی۔ رسمیں بہت انجوائے کیں۔ اپنی شادی میں خود بہت ایکٹیو تھا میں۔ اس لیے کہ گھر میں بڑا تھا تو سارا انتظام وغیرہ خود ہی کرنا تھا مجھے۔"

"شادی کے لڈو ہیں' کھانے چاہئیں یا نہیں؟"

"میں کہتا ہوں کہ جس کو پچھتانا ہے' وہ کھائے ہی نہیں تو بہتر ہے' کسی کی زندگی سے کھیلنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب آپ قبول ہے قبول ہے کہہ دیتے ہیں تو پھر آپ کو اپنی بیوی کو اور بیوی کو میاں کی تمام اچھائیوں اور برائیوں سمیت قبول کر لینا چاہیے' یہ نہیں کہ کوئی بات بری لگی اور اس کو ٹھکرا دیا یا کوئی غلط قدم اٹھا لیا۔ شادی تو سمجھوتے کا اور پیار محبت سے زندگی گزارنے کا نام ہے۔"

"چوبیس سال کے آپ تھے' سترہ' اٹھارہ سال کی کنول' اس عمر میں تو لڑکیوں کی تعلیم بھی زیادہ نہیں ہوتی اور نہ ہی عقل' پھر کوئی مشکل پیش آئی ایڈجسٹ کرنے میں؟"

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے' عقل تو ہوتی ہے اور ہم نے تو اس وقت کو بہت انجوائے کیا اور ہماری جوڑی کو لوگ فاختاؤں کی جوڑی کہتے تھے۔ امن کے علم بردار کہلاتے تھے اور چونکہ بیگم کم عمر تھیں' اس لیے ہمارے رنگ میں رنگ گئیں' ہمارے انداز میں ڈھل گئیں۔"

"کنول آپ کی کامیڈی کو پسند کرتی ہیں اور آپ چاہیں گے کہ یہ اس فیلڈ میں آئیں۔"

"یہ ہمارا روٹین کا کام ہے۔ اس لیے کبھی دیکھ لیا' کبھی نہ دیکھا۔ جہاں تک فیلڈ میں آنے کی بات ہے تو میں اس کی اجازت نہیں دوں گا' کیونکہ میرا خیال ہے کہ یہ کام ان پر سوٹ نہیں کرے گا۔ جو خواتین اس فیلڈ میں آتی ہیں' دو وجوہات کی بنا پر آتی ہیں یا تو ان کو شوق ہوتا ہے یا کوئی مجبوری ہوتی ہے تو جو شوقین ہوتی ہیں اور جو مجبور ہوتی ہیں' دونوں ہی Extr emist (شدت پسند) ہوتی ہیں۔ تو یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"بیگم مزاج کی کیسی ہیں اور شادی کی سالگرہ مناتے ہیں؟"

"اچھی ہیں مزاج کی' بچوں کے ساتھ غصہ دکھاتی ہیں۔ مجھے تو کبھی غصہ نہیں دکھایا اور ہمارے درمیان اختلاف رائے ہوتا ہے۔ لڑائی نہیں ہوتی' اور شادی کی سالگرہ تو نہیں مناتے' البتہ بچوں کی سالگرہ ضرور مناتے ہیں' ہم تو روز ہی منا لیتے ہیں' ایک دوسرے کو گفٹ دے دے کر' لاہور جاتا ہوں تو گفٹ لے آتا ہوں' ملک سے باہر جاؤں تو گفٹ لے آتا ہوں۔"

"سگھڑ ہیں؟ اور فضول خرچ؟ اور کس روپ میں اچھی لگتی ہیں؟"

"سگھڑ بہت ہیں' مجھے اچھے اچھے کھانے کھلا کر پینو کر دیا ہے اور فضول خرچ بالکل نہیں ہیں' بچت کی عادت ہے اور جو بھی خرچ کروانا ہوتا ہے' میرے ہاتھ سے کرواتی ہیں اور جہاں تک روپ کی بات ہے تو ہر روپ اچھا ہے' مگر مجھے سادگی میں اچھی لگتی ہیں۔"

"کھانا آپ دونوں ساتھ ہی کھاتے ہیں؟ انتظار کرتی ہیں آپ کا؟"

"پہلے ہم دونوں ساتھ مل کر کھانا کھاتے تھے' مگر اب ایسا نہیں ہے' کیونکہ میری مصروفیات بڑھ گئی ہیں اور اب میرے پاس واپسی کا کوئی ٹائم شیڈول نہیں ہوتا تو میں کہہ دیتا ہوں کہ آپ میرا انتظار نہ کیا کریں۔"

"جن لوگوں کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی' ان سے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"ہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ فوراً" شادی کر لیں۔ شادی کرنا اچھی بات ہے۔ شریعت کا حکم ہے اور ایک اکیلا آدمی فضول خرچ ہوتا ہے' شادی کے بعد بچت ہو جاتی ہے اور زندگی سیٹل ہو جاتی ہے۔ سارے کام وقت پر ہو جاتے ہیں' بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں' کپڑے دھلے ہوئے اور استری کیے ہوئے مل جاتے ہیں۔"

"بیوی آل ان ون ہوتی ہے؟"

"شادی فری میں کپڑے دھلوانے کا مہنگا ترین سودا ہے اور بیوی آل ان ون ہوتی ہے اگر اچھی ہو تو۔ اور میری بیوی واقعی آل ان ون ہے۔"

کنول کاشف خان

"کیسی ہیں آپ کنول صاحبہ' اور کیا ہو رہا ہے؟"

"جی۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں' اور میری ساس آئی ہوئی ہیں تو ان سے گپ شپ ہو رہی تھی۔"

"اچھا؟ دوستی ہے آپ کی ان سے' ساس کے لیے تو کہا جاتا ہے کہ وہ ماں کی طرح نہیں ہو سکتیں۔"

"نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے' ہمارے لیے تو ہماری ساس ماں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ وہ مجھے اپنی بیٹی سمجھتی ہیں اور میں ان کو اپنی ماں سمجھتی ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم دونوں میں کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔"

"جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہ رہی ہیں آپ؟"

"اب نہیں' لیکن میں جتنا عرصہ رہی' کبھی ہم دونوں کے درمیان لڑائی جھگڑا نہیں ہوا' میں تقریباً" ڈیڑھ' دو سال جوائنٹ فیملی میں رہی ہوں اور ساس آتی ہیں تو کافی ہفتے رہ کر جاتی ہیں اور مجھے ان کا آنا اور ہمارے پاس رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

"تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے' سسرال میں سب سے اچھا رشتہ کون سا لگا آپ کو؟"

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اور سسرال میں نندیں' دیور سب ہی بہت اچھے ہیں اور چونکہ کاشف گھر کے بڑے ہیں تو سب نہ صرف ان کی عزت کرتے ہیں بلکہ ان کی اہمیت کو بھی سمجھتے ہیں' کبھی لڑائی جھگڑا کچھ نہیں ہوا ہم لوگوں کے درمیان۔"

"کاشف ماشاء اللہ ایک مشہور شخصیت ہیں۔ آپ جب ان کے ساتھ جاتی ہیں تو کیا محسوس کرتی ہیں؟"

"مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ لڑکیاں ان کے ساتھ تصاویر بنواتی ہیں تو میں بالکل بھی برا نہیں مانتی۔ ان کی تو فیلڈ ہی ایسی ہے کہ لوگ ان کو دیکھتے ہیں ان کو پسند کرتے ہیں۔"

"ڈر نہیں لگتا کہ کہیں بدل نہ جائیں۔ پھر مذہب نے بھی چار شادیوں کی اجازت دی ہوئی ہے۔"

"نہیں' بالکل بھی ڈر نہیں لگتا اور بے شک اسلام نے اجازت دی ہوئی ہے مگر مجھے تو ان پر مکمل بھروسا ہے کہ یہ بدل نہیں سکتے اور ویسے بھی اب کافی سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو۔"

"آپ کی ارینج میرج ہے اور ایک دوسرے سے کوئی رشتہ داری بھی نہیں تھی۔ تو ایک نئے ماحول میں آنا کیسا لگا تھا؟"

"بالکل بھی اجنبی نہیں لگا۔ ویسا ہی ماحول تھا جیسا ہمارے اپنے گھر کا تھا تو اس لیے مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ سب پیار محبت سے رہتے تھے تو ہمیں اور کیا چاہیے تھا۔"

"آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں اور گھر میں کون سے نمبر پر ہیں؟"

"میرے ماشاء اللہ چھ بھائی اور دو بہنیں ہیں ہم۔ میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد حیات ہیں۔ میں نے صرف انٹر تک تعلیم حاصل کی پھر میری شادی ہو گئی۔ ہم اردو اسپیکنگ ہیں۔ میں بہن بھائیوں میں پانچویں نمبر پر ہوں۔"

"آپ چاہیں گی کہ آپ کے بچے بھی والد کے نقش قدم پر چلیں اور اس فیلڈ میں آئیں۔"

"بچے جائیں۔ ان کے بابا جانیں۔ وہ جس فیلڈ میں لانا چاہیں گے۔ بچے بھی اسی فیلڈ میں آئیں گے۔ اور میں تو کبھی ان کے ساتھ شوبز کی تقریب میں بھی نہیں گئی کیونکہ بچوں کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی کہ کہیں آئیں جائیں۔"

"شادی تو بہت دھوم دھام سے ہوئی' رسمیں انجوائے کی تھیں آپ نے؟"

"شادی تو دھوم دھام سے ہوئی اور کم عمری کی شادی تھی' اس لیے شادی کی رسمیں ہم نے انجوائے کیں اور ہمارے یہاں جب مایوں کی رسم ہوتی ہے تو لڑکی کو تھوڑا پردے میں رکھا جاتا ہے۔ ہر رسم میں گھونگھٹ کے ساتھ بیٹھی' میں نے تو انہیں پی ٹی وی کے پروگراموں میں دیکھا ہوا تھا لیکن انہوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے تو مجھے شادی کے دن ہی دیکھا۔"

"عروسی جوڑا کس کی طرف سے تھا سسرال سے یا آپ کے اپنے گھر سے؟ چھوٹی عمر میں شادی ہوئی گھر چھوڑتے وقت کیا محسوس ہوا تھا؟"

"عروسی جوڑا سسرال سے آیا تھا۔ بارات اور ولیمہ دونوں دلوں کا جوڑا سسرال سے آیا تھا۔ اور واقعی چھوٹی عمر کی شادی تھی تو رونا دھونا بہت ہوا۔ کچھ مسئلے مسائل بھی تھے تو گھر چھوڑنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں؟ شادی کی سالگرہ مناتی ہیں؟"

"ہنی مون کے لیے تو اسلام آباد اور مری وغیرہ گئے تھے اور منہ دکھائی میں مجھے چین اور لاکٹ ملا تھا۔ اور جس دن شادی کی سالگرہ ہوتی ہے ہم کھانا کھانے باہر چلے جاتے ہیں۔"

"گھر کے کاموں میں کاشف آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں؟"

"ہاں۔ ان کاموں میں تو یہ بہت آگے ہیں' میری اگر طبیعت خراب ہو تو بہت خیال رکھتے ہیں اگر گھر میں زیادہ مہمان آجائیں تو پھر کچن میں میرا ہاتھ ضرور بٹاتے ہیں۔ اور بچوں کا خیال بھی رکھتے ہیں۔"

"ایک دوسرے کو کس نام سے بلاتے ہیں؟"

"میں ان کا نام نہیں لیتی۔ منے کہہ کر بلاتی ہوں۔ مجھے نام لینا اچھا نہیں لگتا' ہاں کسی سے ذکر کرنا ہو تو پھر کاشی یا کاشف کہہ دیتی ہوں۔"

"کاشف صاحب کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیے؟"

"سچ پوچھیں تو ان کی ساری عادتیں بہت اچھی ہیں۔ بری کے لیے تو سوچنا پڑے گا۔ بس کبھی کبھی غصہ آجاتا ہے جو کہ وقتی ہی ہوتا ہے پھر تھوڑی دیر کے بعد سیٹ ہو جاتے ہیں۔ ورنہ تو کافی خیال رکھتے ہیں۔ میرا' بچوں کا' ہماری ہر ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔"

"آپ کبھی روٹھ کر میکے گئیں اور شادی کے لیے لڑکی کا خوبصورت ہونا کتنا ضروری ہے؟"

"ارے نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہی ان شاء اللہ ایسا کبھی ہوگا' کوئی اپنے گھر سے بھی روٹھ کر جا سکتا ہے بھلا۔ اور شادی کے لیے خوبصورت ہونا ضروری نہیں البتہ نارمل شکل و صورت تو ضروری ہونا چاہیے تاکہ لڑکی سجی بنی اچھی لگے اور لڑکے کے ساتھ بیٹھے تو اچھی لگے۔ ویسے تو خیر آج کل کے لڑکوں کی اپنی مرضی ہوتی ہے جس کو بھی پسند کرلیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری ارینج میرج ہے اور بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے ہماری۔"

"آپ نے کہا کہ لڑکی ایسی ہو جو سجی بنی اچھی لگے تو کاشف کو آپ سجی بنی اچھی لگتی ہیں یا سادگی میں؟"

"میں ان کو بالکل سادہ اچھی لگتی ہوں' جب ہماری شادی ہوئی تھی تو ان کو تو لپ اسٹک لگانا بھی پسند نہیں تھا۔ تو جہاں کہیں ان کے ساتھ جانا ہوتا تھی بہت سادگی میں جاتی تھی بہت ہی لائٹ لپ اسٹک لگا کر۔"

"مگر آپ کا دل تو چاہتا ہوگا؟"

"سچی بات ہے۔ شروع میں تو مجھے میک اپ کرنا آتا بھی نہیں تھا۔ لیکن جب سسرال والے کہتے تھے تو کرنا پڑتا تھا' پھر آہستہ آہستہ میک اپ کرنا آگیا تو اب بھی ہلکا پھلکا ہی کرتی ہوں۔ کبھی کسی شادی بیاہ میں جانا ہو تو۔"

"آپ دونوں میں جب ہلکی پھلکی لڑائی ہوتی ہے تو صلح کون کراتا ہے؟"

"جس کی غلطی ہوتی ہے' وہ ہی پہلے سوری کرتا ہے اگر میں کوئی غصے میں بات کر دوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے سوری کرلینی چاہیے۔ اور اگر ان سے کوئی زیادتی ہو جائے تو پھر وہ سوری کرلیتے ہیں۔"

"شادی کے نقصانات ہیں یا فائدے؟"

"نقصانات تو بالکل بھی نہیں ہیں۔ فائدے بہت ہیں۔ اور فائدے یہ ہیں کہ ایک لائف پارٹنر مل جاتا ہے' اللہ تعالیٰ اولاد کی نعمت سے نواز دیتا ہے' زندگی میں ایک سکون آجاتا ہے۔ جینے کا ڈھنگ آجاتا ہے۔"

"کاشف رومانٹک مزاج ہیں؟ موڈ میں ہوں تو کیا کرتے ہیں؟ ان کے ساتھ دوسرے ملک گئیں؟"

"بہت رومانٹک مزاج ہیں۔ موڈ میں ہوں تو پھر گھر سے باہر ڈنر کرانے لے جاتے ہیں اور جب انہیں موقع ملتا ہے مجھے بھی دوسرے ملک اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ میں دبئی اور انڈیا ان کے ساتھ جا چکی ہوں۔"

"فضول خرچ کون ہے آپ یا کاشف؟"

"ہم دونوں ہی فضول خرچ نہیں ہیں۔ لیکن جب کہیں باہر جاتے ہیں ملک سے یا شہر سے باہر تو پھر ان کا دل چاہتا ہے کہ خوب خرچ کریں۔ اور میرا بھی یہی دل چاہتا ہے۔"

کاشف خان اور کنول کے ساتھ بات کر کے بہت اچھا لگا۔ اور ہم نے ان سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

سجل

"سجل! کیسی ہو۔ آج کل تمہارے کافی ڈرامے مختلف چینلز سے دیکھ رہے ہیں۔ گھر جانے کا وقت مل جاتا ہے؟"

ہنستے ہوئے۔ "جی میں ٹھیک ہوں۔ اور ہاں جی گھر جانے کا وقت مل جاتا ہے جب ڈرامے ایک ساتھ مختلف چینلز پر چل رہے ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک وقت میں بنے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔"

"اچھا۔ گزشتہ دنوں تم اسپتال میں تھیں۔ کیا ہو گیا تھا؟"

"پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ امی کہتی ہیں کہ نظر ہو گئی تھی۔ مگر میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔ بس زیادہ کام کرنے کی وجہ سے تھوڑی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔"

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

"اب تو اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اور کام بھی دوبارہ شروع کر دیا ہے۔"

"تمہارا تعلق تو لاہور سے ہے۔ کراچی شفٹ ہونے کی وجہ؟"

"لاہور بھی اپنا ہے بلکہ پورا پاکستان اپنا ہے۔ اس لیے جہاں اللہ تعالیٰ نے رزق لکھا ہے وہیں جانا پڑتا ہے۔"

"یعنی لاہور میں اتنا کام نہیں تھا' اسی لیے کراچی آئیں؟"

"جی بالکل۔ یہاں کراچی میں ماشاء اللہ کافی کام ہے۔"

"بہت چھوٹی لگتی ہو۔ کب کی پیدائش ہے تمہاری؟"

"میں جی 17 جنوری 1994ء میں پیدا ہوئی۔ اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ میں کتنی بڑی ہوں۔"

"اتنی چھوٹی عمر میں اتنی شہرت۔ کیا بچپن سے خواب دیکھا تھا شہرت کا؟"

"شہرت کا تو نہیں البتہ اچھی اداکارہ بننے کا خواب ضرور دیکھا تھا اور اللہ نے میرا خواب پورا کیا۔ جب چھوٹی تھی تو آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اداکاری کیا کرتی تھی۔ اور مختلف پوز بنا بنا کر دیکھا کرتی تھی۔"

"فلمیں اور ڈرامے دیکھنے کا بھی شوق ہوگا؟"

"جی ہاں۔ بالکل۔ فلمیں بھی دیکھتی تھی مگر کم' کیونکہ زیادہ فلمیں دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ ڈرامے ضرور دیکھا کرتی تھی اور اسکول کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ بس میری وہی پریکٹس کام آئی۔"

"تم بہت چھوٹی ہو' اور اس فیلڈ میں سیاست بہت ہے۔ ڈر لگتا ہے؟"

"جی ڈر لگتا ہے۔ اسی لیے اپنے آپ کو صرف اور صرف کام میں مصروف رکھتی ہوں اور کسی سے کوئی فالتو بات نہیں کرتی۔ باقی اللہ حفاظت کرنے والا ہے' میرے لیے جو بہتر ہوگا وہی ہوگا۔"

"کم عرصے میں بہت کچھ کرلیا ہے۔ اب کیا کرنا ہے؟"

"ابھی تو ابتدا ہے۔ ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے۔ اپنے بہت سے پسندیدہ کردار کرنے ہیں۔ اپنے کرداروں سے ہنسانا بھی ہے رُلانا بھی ہے بہت آگے تک جانے کی خواہش ہے۔"

"سینئر فنکار تعاون کرتے ہیں؟"

"جی بہت زیادہ۔ سب بہت اچھے ہیں اور مجھے ان سے سیکھنے کا بہت موقع ملتا ہے۔"

"آج کل کون کون سے ڈرامے آن ایر ہیں؟"

"آج کل "میرے قاتل میرے دلدار اور محمود آباد کی ملکائیں" اگرچہ اس میں میری موت دکھا دی گئی ہے لیکن فلیش بیک میں میرا کام چلتا رہتا ہے۔" احمد حبیب کی بیٹیاں' چاندنی' دل ہی تو ہے۔ میں بابا کی لاڈلی" وغیرہ چل رہے ہیں' کچھ عنقریب آن ایر آنے والے ہیں۔"

سجل اس فیلڈ میں ایک نیا مگر بہت اچھا اضافہ ہے۔ ان کا تفصیلی انٹرویو بھی عنقریب آپ پڑھیں گے۔

یاسر نواز

"کیسے ہیں آپ۔ آپ کا سیریل جنت سے نکالی ہوئی عورت کافی پسند کیا جارہا ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ جی ہاں پسند کیا جارہا ہے۔ آپ کو کیسا لگ رہا ہے' یہ بتائیں؟"

"اچھا لگ رہا ہے۔ اس لیے تو آپ سے بات کر رہی ہوں۔

اس میں ناظرین کے لیے کیا پیغام ہے؟"

"اس میں میاں بیوی کے لیے پیغام ہے کہ اگر میاں بیوی کا رشتہ مضبوط ہے تو کم زور بھی بہت ہے۔ اور یہ پیغام ہے ان مردوں کے لیے جو غصے میں آکر اپنا گھر برباد کر لیتے ہیں اور پھر بعد میں پچھتاتے ہیں کہ ہائے ہم نے یہ کیا کیا۔"

"اس سیریل میں "جنت" کس کے لیے استعمال ہوا ہے؟"

"اس سیریل میں "جنت" سے مراد وہ جنت ہے جو ماں کے قدموں تلے ہوتی ہے اور اس سیریل میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اولاد اللہ کی نعمت ہے اور اسے بڑھاپے کا سہارا بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن اولاد پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"ڈرامے میں کوئی کردار بلاوجہ نہیں آتا۔ ثمینہ پیرزادہ کے کزن کا آنا کیا کسی نئی کہانی کو جنم دے گا؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' ڈرامے میں وہی کردار آتے ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے ندیم کا کردار (منظور قریشی) بھی بلاوجہ نہیں ہے۔ لیکن جو آپ سوچ رہی ہیں' ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔"

"یعنی شادی وغیرہ کا کوئی چکر نہیں ہوگا؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ دیکھیں۔"
"چلیں ٹھیک ہے سسپنس رہنے دیں۔ فنکاروں کا انتخاب صرف آپ کی مرضی سے ہوتا ہے؟"
"نہیں صرف میری مرضی سے نہیں ہوتا بلکہ باقاعدہ ڈسکس ہوتا ہے کہ کون سا کردار کس فنکار پر سوٹ کرے گا۔ بس اسی حساب سے فنکاروں کو کاسٹ کیا جاتا ہے۔"
"آج کل ڈائریکٹر حضرات بلا تکان کام کیے جا رہے ہیں ایک کے بعد ایک۔ آپ کیوں سلو چلتے ہیں؟"
"میں بھی ایک کے بعد ایک سیریل تیار کر سکتا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس سے کارکردگی اور معیار متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے سال میں دو پروجیکٹ پہ تو کام کرنا چاہیے مگر بہت زیادہ پر نہیں۔"
"چلیں جی۔ ٹھیک ہے۔ اب آپ کا کوئی نیا سیریل آئے گا تو بات کریں گے۔ ان شاء اللہ۔"

مہوش حیات

انسان وہی اچھا ہوتا ہے جس کے رویے میں کچھ پاکر تبدیلی نہ آئے۔ مگر شہرت کا نشہ اتنا برا ہوتا ہے کہ انسان کا دماغ خراب کر دیتا ہے۔ مہوش حیات پہ بھی اس کا کچھ کچھ اثر ہے۔ مگر زیادہ نہیں ہم سے کم ہمارے ساتھ تو نہیں۔ ہم نے جب جب بات کی مہوش نے بہت اچھی طرح بات کی۔
"ڈرامہ "گلابی ساڑھی" نے تمہیں شہرت دی! کیا ایسا ہی ہے؟"
"جی بالکل ایسا ہی ہے۔ ویسے اس سے پہلے میں کچھ کمرشلز وغیرہ بھی کر چکی تھی اور ایک فون کمپنی کے لیے بھی ماڈلنگ کر چکی تھی مگر ڈرامے کے حوالے سے گلابی ساڑھی ہی میرے لیے بریک تھرو ثابت ہوا۔"
"دل تو بھٹکے گا" کا کیا رسپانس مل رہا ہے۔ کیا ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں اس معاشرے میں؟"
"دل تو بھٹکے گا" کا رسپانس بہت اچھا مل رہا ہے۔ ناظرین کا فیڈ بیک بہت اچھا آ رہا ہے۔ اور جہاں تک ایسی لڑکیوں کی بات ہے تو کیوں نہیں، ایسی لڑکیاں ہیں ہمارے معاشرے میں۔ اپنی پڑھائی کی خاطر اور گھر میں خوشحالی کے لیے قربانیاں دیتی ہیں۔"
"اس رول کی آفر ہوئی تھی؟"
"نہیں۔ مجھے نائمہ والا رول ملا تھا۔ لیکن مجھے یہ رول زیادہ پسند آیا اور ڈائریکٹر نے میری خواہش کا احترام کیا۔"
"اپنے یادگار ڈراموں میں کس کا ذکر کرنا چاہو گی؟"
"کافی سارے ہیں۔ "چار چاند... تھوڑی سی وفا چاہیے... بھورانی... آخری سانس... تحفہ... پریم لتا" اور کافی ہیں۔ اس وقت تو یاد بھی نہیں آ رہے۔"
"شہرت نے تمہاری شخصیت کو بگاڑا نہیں۔ کیوں؟"
"کیوں؟... یہ تو اچھی بات ہے نا... ہم بھی عام انسانوں کی طرح انسان ہی ہوتے ہیں۔ بس اسکرین پہ آتے ہیں تو خاص ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ بہت اچھا کام کر رہے ہیں مگر چونکہ وہ اسکرین پہ نہیں آتے اس لیے لوگ ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔"
"خوش ہو اس فیلڈ میں آ کر۔ اور اگر نہ ہوتیں اس فیلڈ میں تو؟"
"نہیں... میں نے اس فیلڈ میں ہونا تھا۔ کیونکہ میں بچپن سے ہی اس فیلڈ میں ہوں۔ میری والدہ بھی اس فیلڈ سے بہت عرصہ وابستہ رہی ہیں۔ میری اداکاری میں جو بھی گیپ آیا وہ صرف اس وجہ سے کہ میں پڑھائی میں مصروف تھی۔ اگر پڑھائی نہ کرتی تو گیپ نہ آتا۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ فیلڈ کوئی بھی ہو اس کے لیے پڑھائی بہت ضروری ہے۔"
"تھکن کا احساس ہوتا ہے؟"
"بالکل ہوتا ہے۔ مگر میں اس کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتی کام کروں گی تو تھکن بھی ہو گی، پھر آرام کرنے کے لیے کافی ٹائم مل جاتا ہے اس لیے تھکن بھی اتر جاتی ہے۔"
"چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہو؟"
"ہم لوگوں کے لیے چھٹی کا کوئی دن مخصوص نہیں

ہے۔ کئی کئی دنوں کے بعد کبھی ایک آدھ چھٹی مل جاتی ہے تو کوشش کرتی ہوں کہ وہ دن صرف اور صرف اپنی فیملی کے ساتھ گزاروں اور انجوائے کروں۔"
"اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے کیا کرتی ہو۔ ایکسرسائز یا ڈائٹنگ؟"
"دونوں۔ ایکسرسائز تو کام کے دوران ہی ہو جاتی ہے کیونکہ سارا دن کام ہی اتنا ہوتا ہے کہ اچھی خاصی ایکسرسائز ہو جاتی ہے۔ اور جہاں تک ڈائٹنگ کی بات ہے تو ڈائٹنگ سے چہرے کی رونق ماند پڑ جاتی ہے۔ میری ڈائٹنگ یہ ہوتی ہے کہ میں وقت پر کھاتی ہوں اور وقت پر سوتی ہوں۔ اپنی بھوک کو اگر ہم اوٹ پٹانگ چیزوں سے کم کریں گے تو یہ ایک طرح سے ہم موٹاپے کو دعوت دیں گے۔ پانی، جوس اور سلاد کا استعمال زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے۔"
"مگر آپ کے کام میں تو لنچ کا کوئی ٹائم ہی فکس نہیں ہوتا؟"
"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس دوران میں جوس کا استعمال کرتی ہوں۔ کھانے سے پرہیز کرتی ہوں۔ کھانا تو برابر ہی کھاتی ہوں۔"
"تمہاری صبح کب ہوتی ہے؟"
"جب صبح کام پہ جانا ہو تو آٹھ نو بجے اٹھ جاتی ہوں اور جس دن دیر سے جانا ہو اس دن پھر بارہ ایک بجے اٹھتی ہوں۔"
"تمہاری شوٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔ ان شاء اللہ پھر بات کریں گے۔"

سوزین

"کیسی ہو؟..."
"اللہ کا شکر ہے۔"
"کیا ہو رہا ہے آج کل۔ کیا کیا آن ایئر ہے؟"
"وہی کام کام اور صرف کام۔ اور آن ایئر تو آج کل آپ میرا سیریل جینز دیکھ رہے ہوں گے۔ باقی کافی کام انڈر پروڈکشن ہے۔ ابھی کچھ ہی عرصہ قبل "خواب آنکھیں خواہش چہرے" ختم ہوا ہے۔ آپ نے دیکھا تھا وہ سب؟"
"جی بالکل دیکھا تھا اور اس میں تمہارا کام بہت اچھا تھا۔ رول کا کمال تھا، تمہارا یا ڈائریکٹر کا؟"
"میرے خیال میں پوری ٹیم کا کمال تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اگر ڈائریکٹر اچھا ہے تو ٹیم ورک ہے ورنہ نہیں... مجھے قیصر خان کے ساتھ کام کر کے بہت اچھا لگا، بہت اچھے انسان ہیں۔"
"تمہارا رول بھی کافی جان دار تھا۔ مشکل ہوئی یا مزا آیا؟"
"جان دار تھا۔ مگر مشکل نہیں تھا۔ اس لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئی بلکہ میں نے تو اپنے رول کو انجوائے کیا۔"
"آج اللہ نے جو عزت دی ہے اس میں تمہاری محنت کا تو عمل دخل تو ہے ہی۔ اس کے بعد کس کو کریڈٹ دو گی؟"
"سب سے پہلے تو میں اپنے رب کا شکر ادا کروں گی پھر میں اپنے والد اور اپنے دوست امیر علی کا ذکر ضرور کروں گی کہ جن کے تعاون اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے مجھے یہ مقام نصیب ہوا ہے۔"
"کبھی سوچا تھا کہ اس فیلڈ میں آؤ گی اور پھر شہرت و کامیابی بھی ملے گی؟"
"سچ بتاؤں میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ البتہ مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی تھی تو میری پھپھو اکثر مجھے کہا کرتی تھیں کہ یہ بچی ایک دن اپنے ماں باپ کا نام روشن کرے گی۔ اور دیکھیں کہ آج یہ بات سچ ثابت ہو گئی ہے۔"
"کیا ان کے سامنے اداکاری کرتی تھیں؟"
"نہیں نہیں۔ ایسا کچھ نہیں کرتی تھی... شاید ان کی چھٹی حس بہت تیز تھی اور کوئی بات ان کو مجھ میں نظر آتی تھی اس لیے انہوں نے ایسا کہا۔"
"اچھا سوزین! پھر بات کریں گے۔"
"ضرور! اللہ حافظ۔"

رضیہ جمیل

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی عافیت' سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو' ہم کو' ہمارے شہر کو' ہمارے ملک کو دہشت گردوں اور دشمنوں سے محفوظ رکھے۔ (آمین)
اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔
پہلا خط لیہ سے اصغری سرور کا ہے' لکھتی ہیں۔
تین دفعہ افسانہ لکھنے کی جسارت کی اور تینوں دفعہ اسے شائع کرنا تو دور کی بات یہ تک بتانا مناسب نہ سمجھا آپ نے کہ میں مزید کوشش کروں یا روک دوں۔

ترک رسم دوستی ہرگز میرا مسلک نہ تھا
اتفاقاً" اپنوں سے رابطے کم ہوگئے

۔ بس "تجدید وفا" کچھ ڈرامہ سیریل "ہم سفر" سے ملتا جلتا سا لگا۔ ہو سکتا ہے آگے جا کر میرا خیال غلط ثابت ہو جائے۔ جنت کے پتے سبق آموز تھی فی الحال تبصرہ محفوظ وادھار نمرہ جی۔ جس بات نے قلم اٹھوایا وہ یہ کہ ٹائٹل بے حد نفیس تھا۔ آپی کہ پلیز' پلیز ماڈل کی مہندی والا ہاتھ سامنے کی طرف پورا دکھایا کریں یہ آدھے ادھورے ڈیزائن ہمارے کسی کام نہیں آتے تو جناب یہ تھی وہ گزارش جس نے ہماری خود ساختہ ناراضی اڑن چھو کی۔
پورے چار سال بعد بزم میں آئی ہوں۔ ایم اے انگلش کے بعد بی ایڈ اور ایم ایڈ کر چکی ہوں۔ کچھ دنوں بعد میری شادی ہے۔

ج پیاری اصغری! سب سے پہلے تو ایم اے انگلش' بی ایڈ اور ایم ایڈ کرنے پر مبارک باد قبول کیجئے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کی شادی ہونے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ شادی آپ کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں لے کر آئے۔ "تجدید وفا" آپ کو "ہم سفر" سے ملتا جلتا لگا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی ہمارے خیال میں تو دونوں میں کوئی مماثلت ہی نہیں ہے۔
ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے خط شائع نہ ہو سکے اور نہ ہی کہانیوں کے بارے میں آپ کو بتایا گیا۔
اب بات چار سال پرانی ہے تو ہمیں بھی یاد نہیں ہے۔ کہ آپ کی کہانیوں کا کیا بنا۔ اچھی بہن ہم اس کالم میں بارہا فون نمبر لکھ چکے ہیں۔ آپ کو کہانیوں کے بارے میں فون کر کے معلوم کر لینا چاہیے تھا۔ آپ کے پاس ان کہانیوں کی نقول ہوں تو ہمیں دوبارہ لکھ کر بھجوا دیں۔

عفت جبیں نے فیصل آباد سے لکھا ہے

میں گزشتہ سات سال سے خواتین ڈائجسٹ' شعاع اور کرن کی قاری ہوں۔ اور میں نے اپنی پیدائش سے پہلے کے رسالے بھی پڑھے ہیں۔ لیکن اس وقت کے معیار میں اور اب کے معیار میں' میں نے کوئی کمی نہیں دیکھی۔ بلکہ اضافہ ہی ہوتا دیکھا اور بلاشبہ ہماری رائٹرز نے اس میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان سب رائٹرز کا شکریہ۔
ج عفت! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف

اور تشکر مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ بلاشبہ ہماری مصنفین ہمارا سب سے قیمتی اور نایاب سرمایہ ہیں۔

آمنہ' آنسہ' محدثہ اور مقدسہ فیصل آباد سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے

خواتین اور شعاع کے تمام سلسلے بہت اچھے ہوتے ہیں اور تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ پلیز عفت سحر سے گزارش ہے بٹ ہاؤس کے بارے میں کچھ لکھیں اور درثمن سے کچھ اچھا سا لکھوائیں۔ وہ تو شادی کروا کے چھپ گئی ہیں۔ آمنہ ریاض کو شادی کی بہت زیادہ مبارک باد اور پلیز آمنہ جی آپ بھی شادی کروا کے ہمیں چھوڑ نہ مت دیجئے گا۔ اور پلیز F.M 103 فیصل آباد کے آر جے مان منعب اور جہانزیب (زیبی) کا انٹرویو تصویر کے ساتھ شائع کر دیجئے گا اور فرحت اشتیاق کا انٹرویو بھی پلیز ضرور شائع کیجئے گا۔
ج آمنہ' آنسہ' محدثہ' مقدسہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آٹھ سال سے شعاع پڑھ رہی ہیں اور صرف اس ڈر سے خط نہیں لکھا کہ شائع ہو یا نہیں۔ اچھی بہن آپ خط لکھتیں تو شائع ہو ہی جاتا اور بالفرض شائع نہ بھی ہوتا تو ہم آپ کی رائے سے تو آگاہ ہو جاتے۔
فرحت اشتیاق کا انٹرویو اس ماہ اپریل کے خواتین ڈائجسٹ کے "سالگرہ نمبر" میں شامل ہے۔ اور عفت سحر پاشا کا "بٹ ہاؤس" کے بارے میں لکھا افسانہ بھی۔ انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

غلام محمد کالونی فیصل آباد سے حبہ نے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

خط لکھنا کتنا خوب صورت احساس ہے جو لکھتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے۔ حالانکہ دور حاضر کے مستند ذرائع ابلاغ نے دنیا کو ایک مٹھی میں بند کر دیا ہے۔ مگر آج بھی جو مزہ خط تحریر کرنے میں ہے۔ وہ ایس ایم ایس یا کال کرنے میں کہاں۔
جہاں تک بات ہے مارچ کے شمارے کی تو میں یہ کہوں گی کہ مارچ کا پورا شمارہ ہی بہترین تھا۔ فہرست میں نمرہ احمد کا نام پڑھ کر تو دل گویا بلیوں اچھلنے لگا۔ نمرہ کے سسپنس سے بھرپور اس ناول کو ہم کافی حد تک سمجھ گئے ہیں۔ مگر وقت سے پہلے اپنے لگائے گئے اندازوں کو ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ (بھئی ان کے غلط ہونے کا ڈر جو ہے۔)
"شہر پتھر کے باسی" نفیسہ صاحبہ نے کافی اچھا لکھا' ٹاپک تو پرانا ہی ہے' مگر خوشنما کا ظلم نہ سہنا اور بہادری دکھانا بہت پسند آیا' ورنہ بالکل روایتی سی اسٹوری تھی۔ "جان دے جان لے" بھی اچھا اور دلچسپ سا ناول تھا۔
افسانوں میں سب سے زیادہ "پاؤں کی جوتی" نے متاثر کیا۔ ۔ اور ہاں یاد آیا' آپی میں بالوں میں انڈہ' دہی لگاتی ہوں' اس سے میرے بالوں کو تو بہت فرق ہے' بہت بہتر ہو گئے ہیں مگر ایک مسئلہ ہے کہ اس سے بالوں سے انڈے کی اسمیل آتی ہے' پلیز' پلیز' پلیز اس کا کوئی حل بتائیں۔
ج پیاری حبہ! آپ کا طویل خط اور تفصیلی تبصرہ صفحات کی کمی کے باعث شائع نہیں کر سکے' لیکن آپ کا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ مصنفین تک آپ کی رائے پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ آپ کا افسانہ پہچان ابھی پڑھا نہیں گیا ہے۔ آپ فون کر کے اس کے بارے میں معلوم کر لیں۔
بالوں میں انڈہ اور دہی لگانے کے بعد جب سر دھوئیں تو اچھی طرح شیمپو کریں اور زیادہ پانی سے سر دھوئیں' پھر بالوں سے ناخوشگوار مہک نہیں آئے گی۔

انیلا نے ڈھرکی سے لکھا ہے

شعاع کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ تمام رائٹرز اپنی مثال آپ ہیں۔ شعاع ان لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے جن کی زندگی گھروں تک محدود ہے۔ کہانیوں میں ہمارے اردگرد اور ہماری زندگی سے وابستہ کئی باتوں کا عکس ہوتا ہے جو ہمیں بہت کچھ سکھا جاتا ہے۔ شعاع کے لیے ڈھیروں دعائیں۔
ج پیاری انیلا! آپ کے خط لیٹ ملتے ہیں' اس لیے شائع نہیں ہو سکتے۔ آپ نے یہ خط مارچ کے شمارے کے لیے لکھا تھا' لیکن لیٹ ملنے کی بنا پر آپ کا تبصرہ شامل نہ ہو سکا۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اب جلدی خط لکھیے گا تاکہ ہم شامل کر سکیں۔

ام کلثوم رائے فیصل آباد سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے

"ستارہ شام" میں ہادی کا اعتماد واقعی قابل ستائش ہے۔ نمرہ ویلڈن ہر بار کی طرح اک اچھوتا موضوع، لیکن میرے کچھ سوال ہیں۔ ان کے جواب ضرور دیجئے گا۔ میں نے گزشتہ سال دو افسانے (لمحوں کے قرض، کیسی جیت، کیسی ہار) اور بہت پہلے ایک ناولٹ (محبت کے جگنو) بھیجا تھا۔ ان کا کچھ پتا ہی نہیں ہے۔

ج پیاری ام کلثوم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ غزل کی اشاعت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ آپ اپنے افسانے کے بارے میں 32721666 پر فون کرکے معلوم کرلیں۔

گاؤں بھوبرا شہر سکھ بیلی منڈی سے اقرا رانی محمد نے شرکت کی، لکھتی ہیں

میرے گاؤں کا نام شاید آپ کے لیے نیا ہے۔ اس میں دو علیحدہ علیحدہ گورنمنٹ گرلز اینڈ بوائز اسکول ہیں۔ وہ بھی پرائمری۔ گاؤں سے کافی دور ایک اسکول گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول ہے اور اب عین متوقع ہے کہ ہائی اسکول بن جائے۔ یہاں سڑکیں تو پکی ہیں، لیکن بہت زیادہ آمد و رفت کی وجہ سے بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ اور ایسا کچھ خاص ہے ہی نہیں جو بیان کے لائق ہو۔

ج پیاری اقرا! آپ کا اندازہ صحیح ہے، ہم نے اس سے پہلے آپ کے گاؤں کا نام نہیں سنا۔ چھوٹے شہروں اور دور دراز گاؤں سے خط موصول ہوتے ہیں تو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ ہمارے گاؤں کی لڑکیاں پڑھنا لکھنا جانتی ہیں اور دوسری خوشی یہ کہ شعاع ایسے علاقوں میں بھی جاتا ہے جن کا نام بھی ہم نہیں جانتے۔

اقرا! آپ کے گاؤں کی سب سے خاص بات تو یہی ہے کہ وہاں گورنمنٹ گرلز اور بوائز اسکول ہے خواہ مڈل تک ہی سہی۔ سندھ کے بہت سے گاؤں تو ایسے ہیں جہاں لڑکیوں کے لیے پرائمری اسکول تو کیا قرآن پاک پڑھنے کے لیے کوئی مدرسہ بھی نہیں ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہِ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

شبانہ خان نے کراچی سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین سے تعلق چار یا پانچ سالہ پرانا ہے۔ باقاعدہ پڑھنے کے لیے مالی حالات اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اس لیے کبھی کوئی شمارہ پڑھ لیا تو کبھی کوئی۔ خواتین و شعاع کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ اور تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ میں ایک کہانی بھیج رہی ہوں، اگر شائع ہونے کے لائق ہو تو کردیں، اگر نہ ہو تو بھی بتادیں کہ کیا کمیاں ہیں۔

ج پیاری شبانہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کی کہانی الگ قانون ایک ہفتہ پہلے موصول ہوئی ہے ابھی پڑھی نہیں گئی۔ آپ 32721666 پر ایک ماہ بعد فون کرکے پتا کرلیں۔

بکھڑیوالی کلاں گوجرانوالہ سے اقرا اقبال نے شرکت کی ہے

"ستارہ شام" میں ہادی کا پہلے ہی روز شبیہہ سے ٹکراؤ "اللہ خیر کرے" عالیہ جی! پلیز جویا کی پریشانیاں کم کردیں۔ "تجدید وفا" حذیفہ اگر مستقل مزاج رہا تو جویریہ کو کوئی ڈر نہیں۔ نفیسہ سعید کی کاوش کافی اچھی لگی۔ نمرہ احمد کا جواب نہیں۔ مہوش مغل کی ہلکی پھلکی تحریر اچھی لگی۔ پیاری آپی! کیا بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا کے تبصرہ میں آمنہ زریں اپنی مرضی کی کتاب منتخب کرتی ہیں یا ہم اس سلسلے میں فرمائش کرسکتے ہیں۔ آپی میں نے مِنّی کیور کا طریقہ پوچھا تھا، کیا آپ بتادیں گی؟

ج پیاری اقرا! مِنّی کیور کے متعلق آپ کی فرمائش پوری کررہے ہیں۔

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا میں آمنہ زریں کتاب خود منتخب کرتی ہیں، مگر ہماری تائید و مشورے کے ساتھ، اگر آپ کسی کتاب پر تبصرہ چاہتی ہیں تو ضرور بتائیں، اگر کتاب اچھی ہوئی تو آپ کی فرمائش پوری کرکے ہمیں خوشی ہوگی۔

عائشہ نے ٹنڈو محمد خان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میرے پیارے شہر ٹنڈو محمد خان کا تعارف.... (پیارا تو اب ہوا ہے گیارہ سال بعد ورنہ میں بھی سائرہ رضا کی سیمنٰی تھی پہلے) میرا پیارا شہر ٹنڈو محمد خان ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں کی آبادی تقریباً" پچاس ہزار کے قریب ہے۔ یہاں اسکول، کالج، اسپتال، کوچنگ سینٹر، بینک سب ہی سہولتیں موجود ہیں۔ (ماشاء اللہ) یہاں کے لوگ بہت پیار اور محبت کرنے والے ہیں۔ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے کام

آتے ہیں۔ ٹنڈو شہر سے ملحقہ علاقوں میں سیلاب متاثرین سات، آٹھ مہینے گزرنے کے باوجود ابھی تک پریشان ہیں۔ یہاں شوگر مل بھی ہیں۔
یہاں کے شاہی بازار میں ضرورت کی ہر چیز میسر ہے۔
یہاں کی تعلیم کا معیار بھی بہتر سے بہتر ہو رہا ہے اور ایک خاص بات ہماری پیاری رائٹر کنیز نبوی بھی ٹنڈو محمد خان کی ہیں۔ (ہے نا اعزاز کی بات)
"دیوار شب" اس مرتبہ اچھا لگا۔ خاص کر وہ منظر جب سالار، اسلام صاحب کے گلے ملتا ہے... میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ ستارہ شام بہت چھوٹی کہانی لگی۔ شروع ہی ہوئی کہ ختم... ناولٹ میں تجدید وفا اچھا جا رہا ہے۔
افسانوں میں ٹرپل زیڈ زینب ظفر زرین کا زندگی بہت اچھا لگا۔ نظم، غزل علی زبیر کی بہت اچھی تھی۔
مکمل ناول میں مہوش مغل کا جان دے اچھا لگا —
افسانہ نسرین خالہ کا "ہم اہل دل" بس ٹھیک تھا، مگر ایک جملے پہ بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ جب ریحام کی امی اس کی پیدائش سے ایک مہینے پہلے وفات پا گئی تھیں... !!!!
رائٹرز سے مجھے یہ کہنا ہے کہ سب بہنیں اس دوڑ میں کیوں لگ جاتی ہیں کہ ہیروئن کا نام مشکل سے مشکل ہونا چاہیے۔ ریحام مجھے تو سمجھ نہیں آیا کہ یہ نام لڑکے کا ہے یا لڑکی کا۔
بہت پہلے ہماری قاری بہنیں تھیں۔ رباب کھلابٹ کالونی سے اور امبر بورے والا سے وہ اب اپنی رائے نہیں بھیجتیں، کیوں؟ کہاں کھو گئیں۔
ج پیاری عائشہ! ٹنڈو محمد خان کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا، کنیز نبوی کی وجہ سے ہمیں بھی ٹنڈو محمد جان سے بہت اپنائیت کا احساس ہوتا ہے، سیلاب متاثرین کے سلسلے میں حکومت کا رویہ بہت افسوس ناک ہے اللہ تعالیٰ ان کی مشکلات دور کرے۔ آمین، مارچ کے شعاع کے ٹائٹل پر عمیمہ ملک کی تصویر نہیں تھی۔ جن غلطیوں کی آپ نے نشان دہی کی آئندہ خیال رکھیں گے۔

نازیہ بتول نے نامعلوم شہر سے لکھا ہے

نمرہ احمد کو شعاع میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کچھ نیا ہی لکھتی ہیں اور سائرہ رضا کا افسانہ بھی کمال کا تھا۔ شروع میں مولانا الطاف حالی کی نعت کے انتظار قابل فہم وادراک تھے۔ اچھے لگے۔ باجی پلیز میرے افسانے کا بتائیں۔
ج پیاری نازیہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ آپ کی کہانی "جبر مسلسل" ابھی پڑھی نہیں گئی۔ نٹ کھٹ شاہراہ کے بارے میں معذرت۔ نازیہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے، تھوڑی سی توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ ان شاء اللہ کامیاب ہوں گی۔

میمونہ منشاء نے باغبان پورہ ہاڑی سے لکھا ہے

برائٹ سی دلہن دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ پھر جلدی سے سونیا نوید کی تحریر تجدید وفا کی طرف بڑھے، یہ تحریر مجھے بے حد پسند ہے اور اس کی وجہ جویریہ ہے۔ جس کا کردار بالکل مجھ پر فٹ آتا ہے۔ تو جناب اس کے بعد ہم دیوار شب کی طرف بھاگے۔ پلیز آمنہ جی رفتار تھوڑی بڑھا دیں۔ اس کے علاوہ جان دے جان لے اور شہر پتھر کے باسی بھی بہت لاجواب تحریریں تھیں۔ اور جنت کے پتے تو کمال کر دیا نمرہ احمد نے۔ آئندہ شمارے میں پڑھ کر دل بہت بے چین ہو گیا۔ پلیز سلسلہ وار ناول کی تعداد تھوڑی کم کر دیں۔ افسانوں میں پاؤں کی جوتی نمبر لے گیا۔ "ہم اہل دل" پڑھ کر ہم قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئے اور باقی سارے افسانے بھی بہت زبردست تھے۔ اور پلیز آپی! ثمینہ عظمت علی میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ آپ ہر ماہ ان کی تحریریں شامل کیا کریں۔
ج پیاری میمونہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ اپنی تحریریں ضرور بھجوائیں، قابل اشاعت ہونے کی صورت میں شعاع میں شامل ہوں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی تعریف و تبصرہ ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ قسط وار ناول دو سے زیادہ تعداد میں دیے جائیں یہ ہمیں بھی اچھا نہیں لگتا، لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس طرح قارئین بہت سی اچھی تحریریں پڑھنے سے محروم رہ جائیں گی۔ کیونکہ مصنفین اتنا طویل لکھتی ہیں کہ ایک ہی قسط میں دینا ممکن نہیں ہوتا۔

لودھراں سے رضوانہ شکیل راؤ لکھتی ہیں

ٹائٹل پسند آیا۔ حسب معمول سارے مستقل سلسلے اچھے تھے۔ نمرہ احمد کے جنت کے پتے کے سحر نے اپنے

آگے کسی کو ٹھہرنے نہ دیا۔ خاص طور پر ڈولی کا کردار بہت انٹرسٹنگ تھا۔ نمرہ احمد جب بھی آتی ہیں اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور لاتی ہیں۔ جی ہاں کئی سال پہلے واقعی "شریفوں کا مجرا" کے نام سے ویڈیو کیسٹ آئی تھی' جب نیٹ اتنا عام نہیں تھا۔ اور یہ خبر کئی اخبارات کی شہہ سرخی بنی تھی' نجانے اس کی وجہ سے کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد ہوئی ہوگی۔ دستک کا سلسلہ بور لگنے لگا ہے' پلیز دستک میں کسی ایک اداکار کا انٹرویو لے لیا کریں' لیکن ڈھنگ کا" میرے ڈیڈی کی دلہن افسانہ ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ اچھا لگا۔

ج پیاری رضوانہ معذرت خواہ ہیں صفحات کی کمی کے باعث پچھلے ماہ آپ کا تبصرہ شامل نہ ہوسکا' لیکن اطمینان رکھیں۔ ہم نے آپ کا تفصیلی تبصرہ پوری توجہ سے پڑھا تھا۔ دستک کا سلسلہ معروف شخصیات سے ہلکی پھلکی گفتگو کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ جس میں ان کی حالیہ مصروفیات اور واقعات پر بات چیت ہوتی ہے۔ اگر ہماری دیگر قارئین نے بھی ناپسندگی کا اظہار کیا تو غور کریں گے۔

سائرہ میر خان نے میر پور خاص سندھ سے لکھا ہے

سب سے پہلے انتظار تھا سونیا نوید کے ناولٹ "تجدید وفا" کا۔ یہ ایک بہترین تحریر ہے۔ میں نے سوچ بھی لیا ہے کہ آگے جوریہ کی زندگی میں کون کون سے امتحان آنے ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ میرا اندازہ کس حد تک درست ثابت ہوتا ہے۔ ایک اور تحریر جس کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے وہ ہے نمرہ احمد کا مکمل ناول "جنت کے پتے"۔ آگے کیا ہونے والا ہے اندازہ لگانا مشکل ہے۔ "شہر پتھر کے باسی" نفیسہ سعید کے اس مکمل ناول میں جو' جو میں سوچتی تھی وہی ہوتا گیا۔ "جان دے" صوفیہ مغل کی ہلکی پھلکی خوب صورت تحریر تھی۔ کوئی محبت کرے تو محبوب پر یقین بھی اتنا ہی پختہ ہونا چاہیے جتنا عباد کو عزیزہ رحمان پر تھا۔ آمنہ ریاض کا سلسلہ وار ناول اب اچھا جارہا ہے۔ افسانوں میں سائرہ رضا کا افسانہ "پاؤں کی جوتی" سب سے بہترین تھا۔ شہر کی پڑھی لکھی لڑکی کبھی بھی ان قبائلیوں میں نہ ایڈجسٹ ہوپاتی ہے' نہ ہی خوش رہ سکتی ہے۔ باقی تمام افسانے بھی اچھے تھے۔ "ہمارے ڈیڈی کی دلہن" میں تو ڈیڈی نے کمال کردیا۔

ج پیاری سائرہ! آپ کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اتنے عرصے سے شعاع پڑھ رہی ہیں تو خط اتنی دیر سے کیوں لکھا۔ شعاع پر آپ کا تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

حنا کاشف خان نے بستی بوہڑ ملتان سے لکھا ہے

خوب صورت سی دلہن کے مہندی بھرے ہاتھ زیادہ پسند آئے اور دوڑ لگائی "دیوار شب" کی طرف۔ پلیز عالیہ جی جویا اور معاذ کو اب ملا دیں' بہت دکھ سہہ لیے جویا نے' سلمان پر ویسے تو غصہ آتا ہے ہی لیکن اس دفعہ اس کی نوعیت زیادہ ہی شدید ہے۔ "ستارہ شام" کی اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ "شہر پتھر کے باسی" نفیسہ سعید کی بہت خوب صورت تحریر تھی۔

"بلوشہ کے ساتھ جو ہونے جارہا تھا' سچ میں یقین نہیں آیا کہ دنیا میں ایسا بھی ہوسکتا ہے' خدا سب کی بیٹیوں کی عزت محفوظ رکھے۔ صوفیہ مغل کچھ زیادہ متاثر نہ کرسکیں' لیکن میرے ڈیڈی کی دلہن پڑھ کر مزہ آگیا۔ اب بات کرتے ہیں نمرہ احمد کی۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے ان کی تعریف کی جائے۔ جنت کے پتے اپنے نام کی طرح منفرد اور اور پاکیزہ سی تحریر' جتنا پڑھا گردو پیش سے گم ہوکر پڑھا' لیکن آخر میں باقی آئندہ نے دل کے ٹکڑے کردیے' افسانے سارے ہی اچھے تھے' لیکن یہ گورے گورے... ہلکی پھلکی سی تحریر مزہ دے گئی۔ "عمیرہ احمد' فائزہ افتخار' نمو بخاری کہاں گم ہوگئیں' بس ڈھونڈ لائیں انہیں' عمیرہ جی تو لگتا ہے بالکل ہی بھول گئی ہیں۔

ج پیاری حنا! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف اور تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رمل' رزم' کشف اور ماہم وھا بے جی سے تشریف لائی ہیں' لکھتی ہیں

"ستارہ شام" آمنہ ریاض بہت زیادہ اچھا لکھ رہی ہیں۔ لیکن یہ کیا ہم تو سمجھے ہادی اور شبیہہ کی شادی ہوگی لیکن یہ تو ہادی اور جیدی کی ہوگئی' ویسے آمنہ جی شبیہہ کا کردار ہر ماہ لکھا کریں اور دیوار شب عالیہ بخاری کا بہت اچھا ہے اور سب سے زیادہ معاذ اور جویا کا کردار پسند ہے۔

' عام میں اور آپی پلیز عاطف اسلم کا تفصیلی انٹرویو لے لیں نا اور شاہد آفریدی اور عمر اکمل اور حفیظ کا انٹرویو لازمی لیں نا اور آپی پکوان میں چائنیز ڈشز بھی لکھیں نا اور باقی ہمارے لیے دعا کریں' ہمارے ایگزام ہونے والے ہیں

ج رمل' رزم' کشف اور ماہم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی فرمائش آمنہ ریاض تک پہنچا رہے ہیں۔ ہماری بیشتر قارئین کو شبیہہ العباس کا کردار بہت پسند ہے۔ ہادی کی شادی شبیہہ سے کیسے ہوسکتی تھی۔ اس کی تو منگنی تو تنوی سے ہوچکی ہے۔

انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

نجم السحر نے چونڈہ ضلع سیالکوٹ سے شرکت کی ہے' لکھا ہے

شعاع میں تمام کہانیاں ہی زبردست تھیں۔ مکمل ناول میں جان دے اور پتھر دل کے باسی زبردست رہا۔ جنت کے پتے اگلی قسط پڑھ کر بتائیں گے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ ناولٹ میں تجدید وفا ٹھیک جارہا ہے۔ عمیرہ جی آپ کہاں ہیں' پلیز شعاع کے لیے مکمل ناول لکھیں۔ میرے ابو جی اپنی لکھی ہوئی نعتیں اور حمد شعاع کے لیے بھیجنا چاہتے ہیں کیا وہ بھیج سکتے ہیں۔ آپ سے ایک ریکویسٹ ہے' پلیز ہم سفر ڈرامہ کے ایکٹر فواد خان اور ایکٹریس ماہرہ خان کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج نجم السحر! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کے والد صاحب کی نعتیں ضرور شائع ہوں گی۔ جس طریقے سے یہ خط بھجوایا ہے' اسی پتے پر لفافے میں ڈال کر بھجوا دیں۔

انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

• نائلہ ذل سیالکوٹ سے تشریف لائی ہیں' لکھتی ہیں

[illegible] ت جی کا افسانہ اچھا لگا۔ "پتھر کے باسی" اچھی [illegible] تھی۔ آمنہ جی سے کہنا ہے "ستارہ شام" کی رفتار [illegible]۔ سائرہ جی کا افسانہ بھی دلچسپ تھا۔

[illegible] مکمل ناول "جان دے' جان لے" گویا شمارے [illegible] تھا۔ ایک فقرے نے ساری توجہ اپنی طرف مبذول [illegible]

[illegible] آنکھوں کو پرنم کردیتا ہے اور یہی آنسو [illegible] دلیل ہیں۔" دیل ڈن مہوش جی' خدا کرے آپ یونہی لکھتی رہیں۔ آپی آپ سے پوچھنا ہے "شعاع کے ساتھ" کیا اختتام پذیر ہوگیا ہے؟ آپ سے درخواست ہے زوہیب حسن کا انٹرویو بھی شعاع میں شامل کریں اور کیا فرحت اشتیاق شعاع کے لیے نہیں لکھتیں؟

ج حنا! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔

فرحت اشتیاق شعاع کے لیے بھی لکھتی رہی ہیں۔ آج کل ان کی بے حد خوب صورت تحریر "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہورہی ہے۔

"شعاع کے ساتھ ساتھ" سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ صفحات کی مجبوری کی وجہ سے ہر ماہ شامل نہیں کرپاتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

اوکاڑہ سے زینب لودھی نے لکھا ہے

حمد و نعت اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں سے مستفید ہونے کے بعد "ستارہ شام" کی طرف دوڑ لگادی۔ پچھلے دو' تین ماہ کی طرح اس بار بھی کہانی آگے نہیں بڑھی۔ "دیوار شب" کو عالیہ بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ پلیز جویا کے ساتھ اب اور زیادہ برا مت کریں۔ سلمان اور آپا گل کے ساتھ تو جتنا برا ہو وہ کم ہے۔ انہوں نے تو بے حسی کی حد کردی ہے۔ دونوں ہی خود غرض ہیں۔ ابھی صرف سائرہ رضا کا افسانہ بہت اچھا لگا۔

ج پیاری زینب شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ عالیہ بخاری تک آپ کا تبصرہ اور مشورے پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فلک یاسمین نے سرگودھا سے لکھا ہے

شعاع ایک ایسا رسالہ ہے جس کا مطالعہ ہر عمر کے لوگ کرسکتے ہیں۔ ویسے تو مارچ کا پورا شمارہ ہی زبردست تھا' لیکن شہر پتھر کے باسی بہترین انتخاب تھا۔ اور جنت کے پتے بھی لاجواب ہے۔ میرے پاس ایک کہانی ہے' کیا وہ میں آپ کو بھیج دوں اور کیا آپ ٹائٹل کے لیے ماڈل کے علاوہ کوئی اور تصویر شائع نہیں کرتے۔

ج پیاری فلک شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔

خط لکھنے کے لیے سوچتے اتنا عرصہ لگا دیا۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہے گا۔
سرورق پر ماڈل کے علاوہ بھی تصویر لگ سکتی ہے اگر آپ کوئی تصویر شائع کرانا چاہتی ہیں تو بھجوا دیں کہانی بھجوانے کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ فوراً بھجوا دیں اچھی ہوئی تو شائع ہو جائے گی۔

مسرت الطاف احمد نے کراچی سے لکھا ہے

فہرست پر نظر پڑی تو نمرہ احمد کا نام دیکھ کر جہاں خوشی ہوئی وہاں نبیلہ عزیز کو ایک بار پھر غائب دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی یہ کیا۔

ڈرامہ "ہم سفر" کے اختتام پر جب میں نے فرحت اشتیاق کو پہلی بار ٹیلی وژن اسکرین پر دیکھا تو خوشگوار حیرت کا احساس ہوا کیونکہ میں نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں اپنی موسٹ فیورٹ رائٹر کو اتنی جلدی دیکھ سکوں گی۔ فرحت آپی! آپ کی ڈریسنگ، بات کرنے کا اسٹائل، آپ کا مسکرانا آپ کی ہر ادا دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی، میری امی نے بھی آپ کی بہت تعریف کی ہے۔

ج پیاری مسرت! ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے ماہ آپ کا خط اور انتخاب جگہ نہ پاسکا۔ نبیلہ عزیز کے سلسلے میں معذرت خواہ ہیں۔ پچھلے دنوں نبیلہ کی پیاری بیٹی فریال بیمار رہی۔ پھر ان کی ساس جوان کی پھوپھو بھی ہیں۔ ان کی ناسازی طبع کی بنا پر وعدے کے باوجود لکھ نہ پائیں۔
آپ کی تنقید و تعریف مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

فضا بانو اور ملائکہ ساجد نے لاہور سے شرکت کی، لکھتی ہیں

اس ماہ کا سرورق نہایت شاندار تھا، سب سے پہلے نمرہ احمد کا ناول پڑھا۔ "جنت کے پتے" میرے پاس وہ لفظ ہی نہیں ہیں، جن سے میں اس ناول کی تعریف لکھوں یقیناً "میجر احمد ہی" ڈرلی ہے پلیز آپی آپ ہر سال ہم بہنوں سے ووٹنگ کرکے ایک تحریر کو سال کی بیسٹ تحریر نامزد کریں۔ یعنی سال کا بیسٹ ناول، افسانہ یا ناولٹ، پھر اس رائٹر کو ایک خاص انداز میں خراج تحسین پیش کیا جائے "شہر پتھر کے باسی" نفیسہ سعید آپ نے حقیقت کے قریب تر لکھا بہت اچھے۔ ناول دونوں بہترین تھے۔

ج فضا اور ملائکہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید، سرورق آپ کو پسند آیا بہت شکریہ۔ "جنت کے پتے" میں آپ کا اندازہ کس حد تک درست ہے۔ یہ تو آپ آگے پڑھ کر ہی جان سکیں گی۔ اتنا بتا دیں کہ نمرہ احمد کی تحریروں میں آگے کیا ہوگا؟ کون کیا نکلے گا؟ اس کا اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں ہے، بہرحال دیکھتے ہیں۔
مصنفین کے بارے میں آپ کی تجویز بہت اچھی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سال بھر میں جتنی تحریریں شائع ہوتی ہیں، ہماری زیادہ تر قارئین سال کے آخری مہینوں میں شائع ہونے والی تحریروں پر اظہار خیال کرتی ہیں، جیسا کہ ہم عموماً "نئے سال کے سروے" میں دیکھتے ہیں۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ مختصر تبصرہ ہمیں زیادہ اچھا نہیں لگا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

ثنا حسین گل نے شجاع آباد سے لکھا ہے

فروری کے شمارے میں کہانیاں بہت زبردست تھیں اور ٹائٹل گرل بہت خوب صورت تھی۔ جسے میں نے بار دیکھا اور انٹرویو میں مجھے فاطمہ آفندی کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ پلیز آپ عمر گل اور سعید اجمل کا انٹرویو ضرور شائع کریں اور ہاں ان کی مسز کی تصویر ضرور شائع کیجیے گا۔

ج پیاری ثنا! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ انٹرویو فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں، غزل کی اشاعت کے لیے معذرت۔

عالیہ بخاری

دیارِ شب

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتلائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی نہ ہے۔ جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ نگینی آ لگی چڑیل دیکھ کر خیام کو شدید دھچکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اسے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایماندار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو [illegible] ہی وہ ہر چیز بجھوئے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ حویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زویا کمال سے کر دی جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ حویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔

زرتاج بیگم کے بنگلے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں سے غریب عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ اور بتول جیسی کتنی ہی عورتوں کے گھر اس امداد کے سہارے چل رہے ہیں۔ بوا عظمت زرتاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے، جو عرصہ دراز

سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔
سلمان رفتہ رفتہ زندگی بیکی عادت سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آجاتا ہے۔ زوبیہ اپنی من مانیوں سے ہر جائز و ناجائز ہر طرح کی خواہشات منوالیتی
ہے۔ اظہار چچا، شاکرہ بیگم اور آپا گل سوائے تلملانے کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امیدیں زوبیہ کو ملنے والے بنگلے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔
اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے، جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید کوفت
اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ دیعا اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا خاندان مع سوائے جویا
اور زنیلہ کے اس حادثے سے خوب حظ اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ کر نہیں پاتی۔
دلدار نانی کے چوبارے کی رونق دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جس پر نگینہ آئے دن جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ شاما ہر موقع پر اس کی اٹنک شوٹی
کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ گیتی زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن
خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد و رفت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔
خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گیتی کی
چوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی
دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے اس کے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت
تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔
فرنتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود نمائی اور خود ستائشی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح
سیکرٹریز بدلنے کی عادت ہے۔ حالیہ سیکرٹری نبیل سے ان کا "تعلق" ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نبیل جسے ڈرائیور زاہد کی مدد سے یہ نوکری ملی
ہے۔ فرنتاج بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا
جز بز ہوتا ہے۔ فرنتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نبیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے فرنتاج
بیگم چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے پیسے کو محتاج ہونے
لگتا ہے۔ بابو شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابو شوکت اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر
کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر گیتی کی چوڑیاں اسے یاد کی ڈور سے باندھے ہوئے ہیں۔
گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آپا گل سے بحث کرتی ہے۔ آپا گل کی لایعنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے
ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی سچائی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آپا گل کے شوہر اکبر اپنے
اثر و رسوخ سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلوا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا وہم سمجھتے ہیں۔
سلمان، زوبیہ کے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے اور خانزو نادہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب
پریشان رہتے ہیں۔
جویا کا رشتہ آنا فاناً طے ہو جاتا ہے جس میں اظہار چچا، آپا گل اور شاکرہ بیگم کی کوششیں شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا
کام دکھاتی ہے۔ وہ جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے تو گم صم سا
ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دادی، چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زوبیہ، جویا کو اکساتی ہے کہ اگر وہ چاہے
تو رشتہ ختم کروانے میں مدد کر سکتی ہے۔ زوبیہ آپا گل اور شاکرہ بیگم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ تاہم جویا ایسا کہنے سے منع کر دیتی ہے۔
صندل کو بالی صاحب کی فلم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں نگینہ کے طور طریقے کھٹکتے ہیں۔ وہ
اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

۵۰

پچاسویں قسط

ملازمہ اچانک غیرت میں آجانا "'' ولی سی بات ہوتی۔
"ملازم نہیں سے 'میرا گھر ہے' مالک ہوں میں تمہارا۔ بے غیرت! دیکھ لوں گا ایک ایک کو۔"
سلمان کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ زوبیہ چند لمحے خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھے گئی۔ ملگجے
لباس، بھاسی ہوئی رنگت اور بے تحاشا بڑھتا ہوا وزن۔
زوبیہ بے تاثر نگاہوں سے سلمان کو دیکھے گئی اور پھر خاموشی سے کھڑکی سے ہٹ گئی۔
باہر سے آنے والی آوازوں میں اب شدت آرہی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں ڈوبی اور سیڑھیاں اتر کر
نیچے چلی آئی۔
"نسرین!" اس نے سامنے کھڑی ملازمہ کو آواز دی۔
"گیٹ پر جاؤ اور اسے اندر لے آؤ!"
"جی!" وہ فرماں برداری سے فوراً ہی مڑ گئی۔
اگلے چند لمحوں میں سلمان لاؤنج میں کھڑا تھا۔
"مجھے پتا تھا زوبی! تم مجھ سے ناراض نہیں رہ سکتیں۔ بہت محبت کرتی ہو مجھ سے، بلکہ ہم دونوں ہی ایک
دوسرے کے بغیر۔" وہ والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا، مگر زوبیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے پر مجبور
کر دیا۔
"آواز نیچی رکھو سلمان! ویسے بھی بہت تماشا دکھا چکے ہو تم باہر گیٹ پر، تمہیں ذرا بھی میری عزت کا خیال نہیں
آیا؟" زوبیہ کا لہجہ بے تاثر تھا۔
"میں۔ میں شرمندہ ہوں۔ وہ لوگ مجھے اندر آنے نہیں دے رہے تھے، اسی لیے میں غصے میں آگیا
تھا۔ سوری!" سلمان کے لہجے میں عاجزی تھی۔
"نہیں میں نے منع کیا تھا کہ وہ تمہیں اندر نہ آنے دیں۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔"
"چلو! اب تو بات ختم ہو گئی۔ تم کہو گی تو میں ملازموں سے بھی سوری کہہ لوں گا۔ تم سوچ نہیں سکتیں زوبی! کہ
میں تمہیں اور اپنے گھر کو کتنا مس کر رہا تھا۔ شکر ہے جو تم نے مجھے معاف کر دیا۔ دیکھنا! اب کبھی تمہیں کسی
شکایت کا موقع نہیں دوں گا، جیسے جس طرح تم کہو گی، سب ویسے ہی ہوگا۔"
تیز تیز لہجے میں وہ اسے اپنی وفاداری کا یقین دلانے میں مصروف تھا۔
زوبیہ کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آئی۔
"تمہارے ابو کے کیس کا کیا بنا؟ گھر آگئے یا ابھی تک جیل میں ہی پڑے ہیں؟" اس نے اپنے لہجے میں آئی
حقارت کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔
مگر وہ برا ماننے کی غلطی نہیں کرنے والا تھا۔
"وہ وہیں ہیں ابھی، لیکن تم فکر مت کرو، میں ان سے یا گھر کے کسی فرد سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ پہلے بھی
میں کون سا ملتا تھا ان سے۔ یہ تو تمہاری ناراضی کی وجہ سے وہاں رہنا پڑ رہا تھا۔ اب دیکھنا! ساری عمر لوٹ کر نہیں
جاؤں گا۔" وہ بہت آرام سے کہتے ہوئے صوفے پر بیٹھنے لگا تھا کہ۔
"ابھی نہیں! ابھی تم جاؤ۔ میں چند دن میں تم سے کانٹیکٹ کروں گی سلمان! پھر بات کریں گے۔ ابھی میں شہر
سے باہر جا رہی ہوں۔ گھر لاک کرنا ہے مجھے۔"
"گھر لاک کیوں؟ میں ہوں نا گھر پر، تمہیں جتنے دن کے لیے جانا ہے جاؤ، میں بہت اچھی دیکھ بھال رکھوں گا
سارے گھر کی۔"

آسائشوں، نعمتوں سے بھرا گھر۔ اشارے کے منتظر ملازم اور زوبیہ کی غیر موجودگی۔۔۔ سلمان نے دل ہی دل میں چٹخارہ سا لیا۔

"نہیں! میں نے کہا نا ابھی تم جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں دو چار دن میں تم سے خود بات کروں گی۔ لیکن ابھی مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی۔۔۔ اور وہ اب اسے دوبارہ ناراض کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

"چلو! چند دن اور سہی مگر۔۔۔ آنے سے پہلے مجھے فون کر دینا تاکہ میں تمہارے استقبال کے لیے پہنچ جاؤں پہلے سے۔۔۔ ویسے تم جا کہاں رہی ہو؟"

"یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔"

"میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔" اس کے لہجے میں خوشامد کا تاثر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ "میرے لیے تو یہی بہت ہے کہ تم نے آج مجھے معاف کر دیا اور۔۔۔"

"جاؤ سلمان! میں نے کہا نا مجھے دیر ہو رہی ہے۔۔۔" زوبیہ کے لہجے کی رکھائی اور بھی بڑھی۔

"بس! جا ہی رہا ہوں مگر اپنا وعدہ۔۔۔"

وہ تیزی سے کہتے ہوئے لاؤنج سے نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼
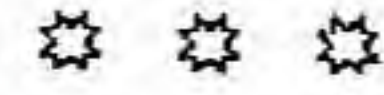
"نگینہ!" نانی ستارہ نے ادھ کھلے دروازے سے جھانک کر اسے آواز دی۔

وہ اپنے اس قدیمی بیڈ پر تکیوں میں منہ دیے لیٹی تھی جو بڑے وقتوں کی یادگار تھا۔

معلوم نہیں سو رہی تھی یا ایسے ہی کوئی ڈراما۔۔۔ انہیں قریب آ کر اسے دوبارہ آواز دینی پڑی۔

"نگینہ! اٹھ بھی جاؤ۔ یہ بھی کوئی وقت ہے سونے کا۔ سارا دن ہو گیا کمرے سے نکل کر نہیں جھانکا۔"

نانی ستارہ کو بیڈ تک آنے اور وہاں لگے کپڑوں کے ڈھیر کو ایک طرف سرکا کر بیٹھنے میں تھوڑی سی دقت کا سامنا ہوا تھا۔ کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے آتی روشنی کمرے کا حال زار بیان کر رہی تھی۔

نانی نے ایک نگاہ میں اس ساری ابتری کو نوٹ کیا۔ پچھلے کئی دنوں سے نگینہ نے پھر سے اس کمرے میں سونا شروع کر دیا تھا جس کی طرف وہ صندل کا اچھا وقت آنے کے بعد دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔

"نگینہ!" نانی ستارہ نے اس بار نگینہ کا کندھا ہلایا تو وہ آنکھیں خشک کرتے ہوئے ذرا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"رو رہی تھیں؟"

"بس ایسے ہی اماں!" اس نے شرمندگی سے جیسے اعتراف جرم کیا۔

نگینہ کی نظریں نیچی تھیں اور چہرہ سرخ بھیگا ہوا۔ نانی ستارہ کے دل کو دھکا سا لگا۔

زمانے بھر کے لیے بدزبان، غصیل، زمانہ ساز نگینہ ان کے سامنے آج بھی کسی چھوٹی بچی کی مانند مؤدب اور گھبرائی ہوئی تھی۔

انہوں نے محبت سے اس کے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے کیا۔ "ایسے ہی نہیں آ تا رونا کوئی تو بات ہے!"

"یہاں کسی ایک بات کا رونا کیا اماں! انبار لگے ہوئے ہیں۔ حرف اول سے لے کر غم کی کتنی شکلیں اور ڈوب مرنے کے کتنے مقام۔" اس کی نگاہ اب بھی جھکی تھی۔

نانی نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

نگینہ کے چہرے پر خوشی یا سکون کی ہلکی سی بھی رمق نہیں تھی۔

"اور زندگی میں مقام شکر آئے تو اتنی جلدی بھلا دیے تو نے؟ بڑا کہنے لگی تھی کہ میری توبہ جو اب اللہ کے آگے کوئی شکوہ گلہ کروں۔" اسے اس کی کہی بات یاد دلا کر انہوں نے نگینہ کو جو جذباتی سہارا دینا چاہا تھا کچھ خاص کارگر ثابت نہ ہو سکا۔

ٹپ ٹپ کتنے ہی آنسو نگینہ کی آنکھوں سے ٹوٹ کر بکھرے۔

"ہم جیسے کمینوں کو ایسے دعوے کہاں زیبا ہیں اماں! ورنہ سچ تو یہی ہے کہ مقام شکر سے تو ہم بس ایسے ہی گزرتے ہیں جیسے ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا۔ چند لمحوں کے لیے روح سیراب ہوئی اور بس!"

ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے اس نے جیسے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ "لمبا قیام تو دکھ کا ہی ہے زندگی میں۔ ساری عمر گزر جاتی ہے مناتے مناتے مگر ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔ بس روپ شکل بدلتی ہے ہمیں دھوکا دینے کے لیے۔"

اس کا سر جھکا ہوا تھا اور الفاظ جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے۔

"صندل کی چار فلموں کی ناکامی نے تجھے اتنا بوکھلا دیا نگینہ! میں نے تو تجھے اتنا کمزور پہلے کبھی نہیں دیکھا، زندگی ان چار فلموں کے آگے بھی تو چلنی ہے۔ صندل کی بھی چلے گی۔ گھبرا کیوں رہی ہے؟ یہی تو وقت ہے اپنی غلطیوں سے سیکھنے کا۔ اچانک ملی کامیابی اچھے اچھوں کے پیر اکھاڑ دیتی ہے۔ صندل کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔ کتنا منع کیا تھا میں نے دھڑا دھڑ فلمیں سائن نہ کرے بالی کی۔"

دھیمے دھیمے اپنے مخصوص پر تاثر انداز میں وہ جو کچھ بھی سمجھانا چاہ رہی تھیں نگینہ کے لیے بعد از وقت تھا۔

"نام نہ لیں اس کم بخت بالی کا۔ پہلی دو چار فلموں پر پیسہ لگانے کے بعد اس نے صرف صندل کا نام استعمال کیا۔ ایسی لو بجٹ فلمیں کروائیں اس سے پٹنی تو تھیں ہی۔"

"اب جو ہوا سو ہوا آخر ایک ہی بات کو کب تک دہرایا جاتا رہے گا یہاں سب اپنی اپنی بازی پر کھیلتے ہیں وہ بھی اور ہم بھی۔ نیا کیا ہے آخر؟ جو تم اور صندل چھچھوری کم ظرف عورتوں کی طرح واویلا کیے جا رہی ہو؟"

غیر محسوس سے انداز میں نانی ستارہ کے لہجے میں وہی سخت بستگی اتری جو آج بھی برادری کی عورتوں کو نگاہ نیچی رکھنے کا حکم دیتی تھی۔

"دکھ کو اپنی کمزوری بنا لو تو لوگ قدموں میں آئے کنکر پتھر کی طرح ٹھوکر پر اڑاتے ہیں۔ ٹکے سیر بھی دام نہیں لگاتی ہے یہ دنیا مگر اپنے اندر جذب کر لو تو یہی انسان کی طاقت بن جاتا ہے۔ دنیا کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ تو نے تو خود تجربہ کر دیکھا ہے نگینہ۔۔۔ پھر اب اس عمر میں۔۔۔؟"

غصہ۔۔۔ نصیحت۔۔۔ تنبیہہ!

نگینہ نے دھیرے سے ہتھیلی سے اپنا چہرہ خشک کیا۔

وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ اس کے آج تک کھڑے رہنے میں اس کے اپنے کمال سے زیادہ ان کے اپنے پیچھے کھڑے رہنے کا تھا اور آج بھی وہی ہے۔

"نانی!" شامانے بڑے بے موقع مداخلت کی۔ "باجی گل ناز آ رہی ہیں، میں انہیں آپ کے کمرے میں لے جا کر بٹھا رہی ہوں آ جائیے۔"

وقت کی کمی کے سبب اس نے ایک ہی سانس میں تین مختلف باتیں کیں اور فوراً ہی پلٹ گئی۔

"میں جاتی ہوں۔ تم اپنا حلیہ ٹھیک کر کے آ جانا!" وہ کھڑی ہوئیں اور وقار سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

وہ انہیں دیکھے گئی جب تک وہ اسے نظر آتی رہیں۔

برآمدے کے دوسرے سرے سے گل ناز کی کھکھلاتی ہوئی ہنسی ابھر رہی تھی۔

نگینہ پھرتی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

گل ناز 'الماس کے ساتھ محاذ آرائی کا عالم اس نے گیتی آرا کی شادی کے بعد خود ختم کر دیا تھا' مگر اپنی خستہ حالی وہ بہر حال گل ناز سے چھپا کر ہی رکھنا چاہتی تھی۔

منہ پر خوب سارا ٹھنڈا پانی ڈال کر' ہلکا سا میک اپ کرتے ہوئے اس نے اپنا فیورٹ نیلا آئی شیڈ بھی لگا ڈالا۔ صندل کتنا ہی کہتی تھی کہ یہ شیڈ بہت چیپ لگتا ہے' مگر وہ خود کو اس رنگ کے ساتھ بہت پر سکون پاتی تھی' نہ لگاتی تو ایسے محسوس ہوتا' جیسے کوئی بڑی کمی سی رہ گئی ہے۔

خود پر مطمئن سی نظر ڈال کر وہ نانی ستارہ کے کمرے میں آئی تو گل ناز بڑی تیزی سے آکر گلے سے لپٹ گئی۔

"کہاں رہتی ہے نگینہ؟ ہم تو تیری شکل کو ترس گئے' میں تو سمجھ رہی تھی کہ صندل کی کوٹھی پر گئی ہوئی ہے تو۔ وہ تو خالہ ستارہ نے بتایا کہ یہیں پر ہے۔" گئے دنوں میں وہ گل ناز کی ان ہی باتوں سے سو سو مطلب اخذ کر لیتی تھی' پر اب نہیں۔

"بس! اب تو یوں ہی سستی سوار رہنے لگی ہے گل ناز! کچھ کام دھام ہے نہیں' تو بس سمجھ لے کر عمر بھر کی تھکن نے گھیر لیا ہے تیری بہن کو۔" نرمی سے مسکراتے ہوئے وہ گل ناز کو وضاحت دے رہی تھی۔

نانی ستارہ نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

"تھکیں تیرے دشمن۔ اپنی بچیوں کی خوشیوں کو انجوائے کر۔ ساری عمر کی محنت کا انعام دیا ہے مولا نے تجھے۔ سالار جیسا بلند مرتبہ داماد آیا۔ گیتی کا نصیب کھلا۔ صندل فلم لائن میں کامیاب ہوئی۔"

ایک ٹھنڈی سانس آہ کی صورت بے اختیار ہی نگینہ کے لبوں سے خارج ہوئی۔

گل ناز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نگینہ نے سنبھل کر مسکرانا چاہا' مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"سنا ہے بالی نے نئی لڑکی سائن کر لی ہے اگلے سارے پروجیکٹوں میں؟"

گل ناز کے لہجے میں کوئی طعنہ یا تجسس نہیں تھا' صرف تشویش تھی۔

نگینہ نے خاموش سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

گل ناز کے ماتھے پر بل سا پڑا۔ "سارے ابن الوقت بیٹھے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں' سالار جیسا لڑکا دیکھ لیں صندل کے لیے بھی کوئی۔" نگینہ نے حیرت سے گل ناز کی طرف دیکھا۔ اسے گل ناز جیسی خاندانی کاروباری عورت سے کم از کم ایسی جذباتیت کی توقع نہیں تھی۔

"گیتی کی بات دوسری ہے گل ناز! ہمارے خاندان کا حصہ ہو کر بھی' اس میں کوئی خوبی' کوئی ہنر نہیں آسکا تھا۔ اگلے برسوں میں وہ صندل پر بوجھ بن جاتی۔ خدا نے کرم کیا جو سالار اس کے نصیب سے اس چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ کر آگیا' سو صد شکر ہے۔ خدا کرے کہ وہ ہمیشہ ہی گیتی کے حق میں اچھا رہے۔"

نانی نے بڑے سلیقے سے گلناز کی بات کا جواب دینے سے پہلے' اسے صندل اور گیتی کا فرق جتایا تھا۔

"وہی تو کہہ رہی ہوں خالہ کہ اگر ایسا ہی کوئی لڑکا اپنی صندل کو پسند کرے تو۔۔۔"

"زندگی اتفاقات اور امکانات پر نہیں چلتی گل ناز! اور صندل کو ایسی بد دعا مت دو۔ ہمارے ہاں کی لڑکیوں کو محبت راس نہیں آتی۔۔۔ فیروزہ کا انجام اتنی جلدی بھول گئیں کیا تم؟" خود کو سنبھالے رکھنے کے لیے وہ ذرا رکیں۔

گل ناز نے اضطراب سے پہلو بدلا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا ستارہ خالہ! بس اپنی گیتی کا مقدر دیکھ کر دل میں لالچ سا آرہا ہے۔ سچ! سالار جیسا نہ سہی' تھوڑا بہت معقول آدمی بھی ہو اور خلوص سے الماس کو نام شناخت دے تو میں ایک منٹ نہ لگاؤں اس کا نکاح پڑھوا کر رخصت کرنے میں۔ اب تو۔۔۔" اس کے لہجے کی حسرت نمایاں تھی۔

"وہ تمہاری مرضی ہے۔ سب کو اپنی اولاد کا اختیار ہے' لیکن ہمارے ہاں کسی ایک کو فن کی میراث لے کر آگے جانا ہی پڑتا ہے۔۔۔ اور صندل اس کی پوری طرح اہل ہے۔۔۔ یہ چھوٹی موٹی اونچ نیچ کچھ نہیں بگاڑ سکتی اس کا۔۔۔ وہ بہت آگے جائے گی۔"

وہی ٹھونک بجا لانے والا انداز' جس کے آگے کچھ بھی کہنے کی گنجائش ختم ہوتی تھی۔

چند لمحوں کے لیے وہ تینوں عورتیں ہی اپنی اپنی جگہ خاموش' اپنی اپنی سوچ میں گم ہو گئیں۔

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے گل ناز!"

"ہاں!" نگینہ کے توجہ دلانے پر اس نے چونک کر کپ اٹھایا اور ایک سانس میں پی کر واپس بھی رکھ دیا۔

"ٹھنڈی ہو گئی تھی تو دوسری بنوا لیتیں۔" نگینہ نے نرمی سے کہا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

نگینہ کو آج واقعی اس پر رحم سا آرہا تھا۔

"تم نے بتایا تھا کہ تم کوئی خاص بات کرنے آئی ہو؟" نانی ستارہ نے گل ناز کو خاموش پا کر یاد دلانا چاہا۔

"ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔" اس نے چونک کر کچھ مناسب لفظ تلاش کرنے چاہے۔ "خاص تو کیا خالہ! مگر کیا پتا خاص ہو ہی جائے آپ کی دعا سے۔" وہ کھسک کر کچھ اور قریب ہو کر بیٹھی۔ "ایک بڑی پارٹی آرہی ہے ایک آدھ دن میں الماس کو بہت پسند کرتے ہیں' پلٹ پلٹ کر یہیں آتے ہیں۔ پچھلی بار اشارہ دے کر گئے تھے کہ شادی کرنا چاہتے ہیں' تب تو میں نے توجہ نہیں دی تھی' مگر اب سوچتی ہوں کہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔"

"کون ہیں؟ مالی حیثیت واقعی مضبوط ہے یا بس یوں ہی اوپر اوپر کی شو شا بنا رکھی ہے۔۔۔ ساری معلومات کروا لیں یا یوں ہی جلد بازی میں۔۔۔"

نانی کے چہرے اور لہجے' دونوں میں تردد کا تاثر ابھر رہا تھا۔

گلے' شکایتیں' تنگ دلی سے ہٹ کر' یہاں خاندان کی یک جائی' کا اپنا انداز تھا۔

دھیمے دھیمے' سر جوڑے' وہ تینوں بڑی دیر تک صلاح مشورے کرتی رہیں۔

شاما نے دوسری اور تیسری بار بھی چائے بنا ڈالی۔ خاصی دیر لگا لینے کے بعد جب گل ناز اٹھی تو نگینہ اسے چھوڑنے طویل برآمدے کے آخری سرے تک آئی۔

"باہر کی دنیا کبھی یہ نہیں جان سکے گی نگینہ! کہ ہمارے ہاں کی مائیں دہرا تہرا عذاب سہتی ہیں' بلکہ وہ تو شاید ہمیں مائیں تسلیم ہی نہیں کرتے۔۔۔ ہے نا؟" اپنے پورشن کی طرف مڑنے سے پہلے گل ناز نے ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ نگینہ سے اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

"ہوں۔۔۔ شاید!" نگینہ نے یوں ہی خالی خالی نگاہوں سے گل ناز کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼

آئینے کے آگے کھڑے ہو کر بال بناتے ہوئے وہ مستقل ہی دھیمے سروں میں گنگنا رہا تھا۔

شاکرہ امی نے دل ہی دل میں نظر بد سے بچے رہنے کی دعا کی۔ کتنے دن بعد آج وہ واقعی خوش تھا' بلکہ بہت خوش۔

"کل آئی ہے' بہت پوچھ رہی ہے تمہیں' وہیں آجاؤ! میرے کمرے میں۔" وہ اطلاع دے کر پلٹنے لگی تھیں کہ رکنا پڑا۔

"مجھے نہیں ملنا ان سے۔ آج میرا موڈ بہت اچھا ہے۔ ان کے ساتھ بے کار کی کٹ کٹ شروع ہو جائے گی۔ وہ کسی کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ کہہ دیں کہ میں سو رہا ہوں۔"

بڑی رکھائی سے صاف انکار پکڑا کر وہ پھر سے خود کو آئینے میں تعریفی نگاہوں سے دیکھنے میں محو ہوا۔ شاکرہ امی بے ساختہ مسکرا دیں۔

"ارے نہیں۔ تم آؤ تو سہی' آج تو ماشاءاللہ وہ بھی بہت خوش ہے۔ لگتا ہے کہ اب پریشانیوں کے دن کٹ ہی گئے ہیں۔ اس نئے وکیل نے بہت امید دلائی ہے تمہارے ابو کے کیس کے سلسلے میں۔"

"چلیں! اچھا ہے۔ اگر وہ گھر آ جاتے ہیں۔ میں تو ویسے بھی یہاں سے جانے والا ہوں۔ کیا پتا آج ہی چلا جاؤں۔ زوبیہ نے مصالحت کر لی ہے مجھ سے۔ شاید آج ہی اس کا فون آ جائے بلانے کے لیے۔" اس بار اس نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

شاکرہ امی نے چونک کر سلمان کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

"کب ہوئی یہ مصالحت؟ تم نے تو ذکر بھی نہیں کیا۔" ان کے دل کو دھکا سا لگا تھا' اس کے اتنی رازداری برتنے پر۔

"جب میں اس سے ملنے گیا تھا' تب ہی اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ مجھے واپس بلا لے گی' رات پھر فون پر بات ہوئی تھی۔ اس نے کہا ہے کہ وہ مجھے آج کل میں خوش خبری دینے والی ہے۔"

"ارے واہ۔ اس نے کہا اور تم چل پڑو گے؟ کچھ تو اپنی عزت کا خیال کر لو سلمان!" آپا گل کی کراری آواز پر ان دونوں ہی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے کے بیچ کھڑی تھیں۔ سلمان نے برا سا منہ بنایا۔

"دیکھ لیا؟ اس لیے کہہ رہا تھا کہ نہ ملوں ان سے۔"

"ارے ہزار بار نہ ملو۔ ہم کون سا مرے جا رہے ہیں تم سے ملنے کے لیے' مگر اپنی عزت کا تو کچھ خیال کر لیا ہوتا۔ اب اگر وہ جھکی ہے تو کچھ شرط شرائط تو منوا لیتے۔ ایسا نہ ہو' پھر کسی دن وہ تمہیں نکال باہر کرے۔" وہ کہتی ہوئی آ کر بیڈ پر بیٹھ چکی تھیں۔ شاکرہ امی کو بھی بیٹھنا پڑا۔

"کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہے گل!"

"آپ کے نزدیک تو یہ ہمیشہ ہی ٹھیک ہوتی ہیں' لیکن میرے معاملے میں بولنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ میں جانوں' زوبیہ جانے۔ یہ ہم میاں بیوی کا معاملہ ہے۔" سلمان کے لہجے میں بہت دنوں بعد وہی کر و فر جھلکا' جو ایک مال دار بیوی کے شوہر ہونے کا احساس دلاتا تھا۔

آپا گل نے انتہائی بیزاری کے ساتھ زیر لب کچھ کہا۔

"کوس رہی ہوں گی آپ زوبیہ کو۔" سلمان نے ان کے تاثرات سے فوری اندازہ لگایا۔ "اصل میں تو یہ آپ کی جہالت تھی' جس نے میرا سارا امیج خراب کروایا زوبیہ اور اس کے ماں باپ پر' ورنہ وہ سب انتہائی پسند کرتے تھے مجھے۔ ایسے ہی تو شادی نہیں ہوئی تھی آخر۔"

شاکرہ امی کو لگا جیسے اب طبل جنگ بجا ہی چاہتا ہے' مگر آپا گل آج بدلی بدلی سی تھیں۔

"نہیں تمہارے منہ نہیں لگ رہی سلمان! ہاں اگر اگلی بار وہ تمہیں گھر سے نکالے تو روتے پیٹتے یہاں مت چلے آنا۔ وہیں اس کے دروازے پر بیٹھ رہنا۔ کیا خبر پھر معافی مل جائے۔"

ان کا انداز تحقیر آمیز تھا۔ "چلیں! امی آپ کے کمرے میں ہی بیٹھتے ہیں۔ اسے تو نہ آج ہماری پروا ہے اور نہ کل ہوگی۔" شاکرہ امی کا ہاتھ تھامے وہ کمرے سے نکلنے لگیں۔

"پروا کیا' اس بار تو میں رشتہ بھی ختم کر کے جا رہا ہوں' اس گھر کے ہر فرد سے۔ وہ عزت دار لوگ ہیں۔ جیل کے سزا یافتہ کے خاندان سے رشتہ داری رکھ کر بدنامی نہیں مول لے سکتے' اور نہ ہی میں آپ لوگوں کی بخشی ذلت کو

ہاہاں کا... دار ہو کسی ... میرا ہو نہ پایا۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ یارا۔" دروازے سے باہر قدم رکھتی شاکرہ امی کا پورا وجود ہی یک بارگی کانپا تھا۔

"کیا کہہ رہا ہے سلمان؟" انہوں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ سچ ہے جو کہہ رہا ہوں۔ کیا خبر آج ہی آخری دن ہو اس گھر میں میرا۔ تنگ آ گیا ہوں اس جہنم سے میں۔ آپ لوگ جھنتیں اپنا کیا ہوا... میں کس خوشی میں۔"

آپا گل بمشکل شاکرہ امی کو تھام کر ان کے کمرے تک لائیں۔ شاکرہ امی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے تھے اور آنکھوں سے نہ رکنے والے آنسوؤں کا سلسلہ تھا۔

کچن میں کام کرتی جویا نے سب کچھ خاموشی سے سنا تھا۔ ٹھنڈے پانی کا گلاس لے کر جب وہ کمرے میں آئی تو آپا گل بڑی توجہ سے شاکرہ امی کے ہاتھ پاؤں سہلا رہی تھیں۔

"بے کار میں ہی اس سلمان کی باتوں کو آپ دل سے لگا رہی ہیں۔ یہ تو ہمیشہ کا ناخلف ہے۔ اپنے اکلوتے ہونے کا ہمیشہ فائدہ اٹھاتا رہا۔ اچھا ہے' جو زوبیہ کے ساتھ ہی جا کر رہے۔ یہاں بھی تو بوجھ بنا بیٹھا ہے خالی۔"

جویا نے پانی کا گلاس آگے بڑھایا۔

"یہ لیں آپا پانی پی لیں۔" آپا گل نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر شاکرہ امی کے لبوں سے لگایا۔ "دیکھ لیں! بیٹیوں کو کتنا خیال ہے۔ آپ کا' میں اتنی دور سے کرایہ خرچ کر کے روز آتی ہوں۔ یہ جویا صبح سے شام تک کتنی محنت کرتی ہے' دو دو جگہ جاب' پھر گھر کی ذمہ داری۔"

جویا کو لگا جیسے اس نے سننے میں کچھ غلطی کی ہے۔ وہ شاید کسی اور کے بارے میں بات کر رہی تھیں' مگر نہیں۔

"بیٹھ جاؤ! کھڑی کیوں ہو؟ تم اور زویا تو مجھ سے اس طرح کٹی کٹی رہتی ہو' جیسے میں کوئی جانی دشمن ہوں تم دونوں کی' حالانکہ خدا جانتا ہے کہ میں کتنی محبت کرتی ہوں۔ کتنی فکر مند رہتی ہوں تم دونوں کے لیے۔"

جویا جلدی سے بیٹھ چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ خدا کا نام لے کر آپا گل کے جھوٹ بولتے رہنے کا سلسلہ اور بھی دراز ہوتا رہے' مگر یہ کایا پلٹ بہرحال حیران کن بھی تھی اور معنی خیز بھی۔

"پتھر دل نہیں ہوں میں۔ خون ہو میرا تم لوگ۔ کیا میرا دل نہیں کٹتا' جب میں تمہیں سر جھکائے صرف محنت میں جتا دیکھتی ہوں؟ تمہاری عمر کی لڑکیاں بنی سنوری اپنے گھروں میں راج کر رہی ہیں اور تم...."

اس کی مایوس' محروم زندگی کا جو رقت بھرا تجزیہ وہ کر رہی تھیں' جویا کے لیے ناقابل برداشت ہوا جا رہا تھا۔

"ارے! کوئی سلمان کو تو دیکھ لے۔ نکل تو نہیں گیا وہ کہیں گھر سے۔" شاکرہ امی نے اپنی ہی دہائی دی۔

"امی! آپ بھی نا بس۔" آپا گل نے ناگواری سے ان کی طرف دیکھا۔ "جاتا ہے تو جائے۔ چار دن میں پھر واپس یہیں کھڑا ہوگا۔ فکر مت کریں۔ زوبیہ برداشت کرنے والی نہیں ہے ایسے... پتا نہیں کیوں آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔" شاکرہ امی دوپٹا منہ پر رکھ کر پھر سے سسک رہی تھیں۔ جویا نے بے چین سا ہو کر ان کی طرف دیکھا اسے اچھی طرح پتا تھا کہ سلمان کی محبت' انہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے ہمیشہ محروم کرتی ہے۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا' جس کی اہمیت تین بہنوں کی موجودگی میں اور بھی مستحکم ہوئی تھی۔

"یہ لوگ تو کام کی بات بھی بھلا دیتے ہیں۔ سب کو اپنی ہی لگی رہتی ہے۔"

جویا کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

"معلوم نہیں' وہ کون سی کام کی بات تھی' جس کے لیے انہوں نے اس پر فی الحال سات خون بھی معاف کیے تھے۔"

"تم بھی کچھ عقل پکڑو جویا! سب کی خاطر اپنی زندگی کو خراب مت کرو' ویسے بھی ابو اب بری ہو ہی جائیں

گے۔ فرید بھائی نے بہت امید دلائی ہے' خود آئے تھے ہمارے گھر۔۔۔"

ان کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔

جویا یوں ہی خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھے گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کورٹ جانے پر اس کی خبر لینے ہی والی ہیں' مگر آج وہ اس کا ہر خیال غلط ثابت کرنے پر تلی تھیں۔

"فرید بھائی بہت تعریف کر رہے تھے تمہاری۔ کہہ رہے تھے 'ایسی سلجھی ہوئی' باہمت لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں' جیسی جویا ہے۔ مجھے تو بہت خوشی ہوئی ان کے منہ سے تمہاری تعریف سن کر۔ اچھا کیا جو اس روز تم خود چلی گئیں کورٹ اور جا کر مل لیں فرید بھائی سے 'ایسے ہی۔۔۔"

"میں گئی نہیں تھی آپا۔۔۔ امی اور سلمان بھائی نے زبردستی بھیجا تھا مجھے۔" اسے ان کی تصحیح کرنا پڑی۔

"ہاں تو اچھا ہوا نا! اسی بہانے ملاقات ہو گئی تمہاری فرید بھائی سے۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ دو سال پہلے بیوی مر گئی تھیں۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ یہ پریکٹس تو بس شوقیہ ہے' اصل میں تو۔۔۔"

"مجھے وہ اچھے آدمی نہیں لگے۔"

اسے ان کی اصلیت جاننے کی ذرا بھی آرزو نہیں تھی' سوائے آپا گل کو روکنا پڑا۔ "اور نہ ہی میں اب وہاں جاؤں گی' آپ یا اکبر بھائی کیوں نہیں جاتے' جب آپ کی ان سے اتنی دوستی بھی ہے؟" بے تاثر سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہونے لگی تھی کہ آپا گل نے ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھایا۔

"یہی بات تمہاری بری ہے جویا! ایک دم ہی کسی کے بارے میں فیصلہ مت کر لیا کرو۔ فرید بھائی بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور اب تو دو چار بار کا ہی جانا ہے' ضمانت تو اب ہوئی سمجھو۔"

جویا نے ایک گہری سانس لی۔

"پتا نہیں کب ہو گی ضمانت۔۔۔ آپ لوگوں نے ابو کا حال نہیں دیکھا ہے' وہ بالکل ٹوٹ چکے ہیں۔ اتنے عرصے جیل میں رہنا کوئی آسان بات نہیں ہے آپا۔۔۔ یہ تو آپ بھی سمجھ سکتی ہیں۔ اس بار انہوں نے صرف ایک ہی بات کی تھی مجھ سے کہ کیا کوئی اچھا وکیل کرنے کے لیے ہمارے پاس بالکل بھی پیسے نہیں ہیں؟" باوجود کوشش کے وہ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ "میرے لیے ان سے آنکھ ملانا بھی مشکل ہوتا ہے ہر بار۔۔۔"

اس کی آواز بتدریج نیچی ہوئی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابو کو بھی گھر کے حالات کو سمجھنا چاہیے۔ کوشش میں تو لگے ہوئے ہیں نا۔۔۔ خیر! اب فرید بھائی نے کہا ہے کہ وہ سب سنبھال۔۔۔" ڈور بیل کی آواز اچانک پورے گھر میں گونجتی چلی گئی۔

"میں دیکھتی ہوں!" وہ آنکھیں خشک کرتے ہوئے تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بنا آپا گل کی طرف دیکھے کمرے سے نکل گئی۔ دروازے پر جانے کے لیے نیچے ہی جانا پڑتا تھا۔

سلمان کے نام کی کوئی رجسٹری تھی۔ وصول کرنے کے بجائے' وہ سائن کروانے کے لیے پھر واپس اوپر آئی۔ سلمان اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ جویا نے بنا کچھ کہے سلپ اور لفافہ دونوں اس کی طرف بڑھائے اور پھر سلپ لے کر واپس نیچے چلی گئی۔ گیٹ بند کر کے واپس پلٹی تو آپا گل کی کھلکھلاتی ہنسی اسے سیڑھیوں پر ہی سنائی دینے لگی۔

"اب نہ ان کی خوش مزاجی پر ہی حیرت ہونی چاہیے اور بد مزاجی کا غم تو وہ خیر پہلے ہی منا چکی ہے۔"

ان تک پہنچنے سے پہلے اس نے خود کو یاد دلایا۔

صحن کے وسط میں وہ سلمان کے پاس کھڑی اس طرح بے قابو ہو کر ہنس رہی تھیں کہ عجیب ایب نارمل سا احساس ہو رہا تھا۔

جویا نے ایک الجھی ہوئی نظر سلمان کے پھیکے پڑتے چہرے اور آپا گل کی کھلکھلاہٹ پر ڈالی۔ غضب کا تضاد! سامنے ہی آیا کاغذ سلمان کے ہاتھ میں تھا۔

"ادیبہ نے خلع کا مقدمہ کر دیا ہے سلمان پر' بلا لیا ہے عدالت نے۔" آپا گل نے بڑے بے تابانہ انداز میں خبر بلند کی اور پھر سے ہنس پڑیں۔ جویا کی بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس خبر پر خوشی یا دکھ میں سے کون سا رد عمل ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

یا شاید وہ خود اب جذبات سے بالکل عاری ہوتی جا رہی ہے۔

"چلو! اب اپنا بیگ کھول لو۔ نہیں نہیں جا رہے تم۔۔۔" آپا گل سے مارے ہنسی کے بات کرنا مشکل ہو رہی تھی۔

سلمان نے قہر آلود نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

✡ ✡ ✡

دادی کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔

چائے کی ٹرے لے کر آتے ہوئے زری کے قدم چند لمحوں کے لیے ہی باہر رکے تھے۔

پتا نہیں' اندر جانا بھی چاہیے یا نہیں؟ اتنے عرصے یہاں رہ لینے کے بعد' اتنا تو وہ سمجھ ہی چکی تھی کہ جب گھر کے بڑے کسی بات پر صلح مشورے کے لیے اکٹھے بیٹھے ہوں تو اس کی موجودگی کو وہاں گوارا نہیں کیا جاتا ہے۔ وجہ کچھ بھی تھی' لیکن وہ اپنی سن گن لینے کی عادت سے مجبور ہو کر' بہانے بہانے منڈلانے سے باز نہ رہ پائی تھی۔

اسی لیے اس کی ساری معلومات "اپ ٹو ڈیٹ" رہتیں۔ اب آج ہی دادی کے کمرے میں امی' ابا' دادی اور معاذ کے درمیان کیا موضوع چل رہا تھا' پوری طرح نہ سہی' آدھی ادھوری بات تو وہ جان ہی چکی تھی۔ سو کچھ اور بھی سہی۔

دروازے کو دھکیلتے ہوئے وہ سیدھی اندر چلی آئی۔ شائستہ بیگم نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

"پھر چائے بنا لائیں تم؟ کس نے کہا تھا بنانے کو؟ ابھی تو پی کر بیٹھے ہیں سب!"

وہ ان کے لب و لہجے کی عادی ہو چکی تھی' سو ذرا بھی برا مانے بغیر میز پر چائے کی ٹرے رکھ کر پیش کرنے لگی۔

"کوئی بات نہیں' چائے کا کیا ہے' پھر پی لیں گے اور زری بیٹی تو چائے بناتی بھی خوب ہے۔"

ابا کو ان کا جھڑکنا کبھی بھی اچھا نہیں لگتا تھا' اس وقت اور بھی نہیں۔

زری کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

دادی کے لیے اس وقت کچھ بھی اہم نہیں تھا' سوائے اس بات کہ' جو وہ کہہ رہی تھیں۔

"اچھے لوگ ہیں' جانے پہچانے اور پھر لڑکا خود کتنا قابل۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ربیعہ کا رشتہ طے کرنے میں اب دیر نہیں کرنا چاہیے۔" زری کی آمد کو ذرا بھی اہمیت دیے بغیر انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے' پر اماں! ملک سے باہر' اتنی دور آسٹریلیا۔" شائستہ بیگم کو بھی اپنی توجہ زری سے ہٹانا پڑی۔

زری نے آنکھ بچا کر معاذ کی طرف دیکھا۔

وہ ابا کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں ان سے کچھ بات کر رہا تھا۔

چہرے کی بناوٹ' اس کے ماتھے پر بکھرتے بال' آنکھوں میں ٹھہری اداسی اور بے نیازی بھرا مخصوص انداز۔ چند لمحوں کے لیے تو اس کی نگاہ ہٹنا بھول گئی۔

شکر تھا جو شائستہ ' دادی کے ساتھ مصروف تھیں ' ورنہ شاید کھڑے کھڑے اسے کمرے سے تو کیا گھر سے باہر کرتیں ' تب ہی معاذ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"آج تمہاری بھابھی کا فون بھی آیا تھا زری! اگلے ہفتے وہ تم سے ملنے کے لیے آرہی ہیں ' گھر پہ۔"

"کیا؟" وہ بے یقینی سے معاذ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔" دادی نے معاذ کی بات سن لی تھی۔

"میں تو خود چاہتی ہوں کہ اسے اس کے رشتے داروں کے سپرد کردوں۔ جوان بچی ہے ' آخر کب تک اس طرح ......"

"کیا مسئلہ ہے ' آج کل روز کوئی نہ کوئی چلا آتا ہے مجھ سے ملنے۔" زری بری طرح پریشان ہوئی تھی۔ "اس روز وہ آپ کے دوست ' اس راجو کو لے آئے اور اب یہ سعیدہ بھابھی۔ آپ صاف منع کردیں ' کوئی نہ آئے۔ مجھے نہیں ملنا ولنا کسی سے۔" جھنجلائے ہوئے لہجے میں اپنی بات ختم کرکے وہ خالی ٹرے اٹھا کر فوراً" ہی باہر چلی گئی۔

"دیکھا اس لڑکی کا انداز ' آئی تھی تو کیسی گم صم مظلوم بنی ہوئی تھی اور اب ایسے بات کرتی ہے جیسے ہم اس کے پابند ہیں ' جو یہ کہے ' وہی کریں۔" شائستہ نے خاص طور پر معاذ کو مخاطب کیا تھا۔

زری کے اطوار اسے بھی "ہشیار باش" کا نعرہ لگاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے ' سو وہ ان سے پورا متفق تھا۔

"کیا کریں پھر اس کا امی؟ گھر سے نکال بھی تو نہیں سکتے نا! لڑکی ہے آخر۔ اب زبردستی کیسے تیار کریں اسے جانے پر؟"

"اس کے گھر والوں سے مشورہ کرلو کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر شادی کردو اس کی۔ ربیعہ کے بعد تو میں ویسے بھی اسے یہاں نہیں رکھوں گی۔ اچھا ہے ' اپنے گھر کی ہوجائے۔"

"اچھی بات کی آپ نے۔" معاذ کے چہرے پر پرسوچ سا تاثر ابھرا۔ "میں بھی دیکھتا ہوں ' آپ بھی کوشش کریں۔ ایسا ہوجائے تو بہت اچھا ہے۔"

"اور اگر پھر بھی یہ نہ مانے تو پھر اور اس کی ذمہ داری نہیں لی جائے گی ' ہمارے بلا سے سکھر جائے یا دارالامان۔"

شائستہ زیادہ تلخ ہونے لگیں تو دادی کو بات کاٹنا پڑی۔

"یہ کیا قصہ شروع کردیا؟ فی الحال بات ربیعہ کی ہورہی ہے۔ اس کو تو ایک طرف کرو خیر سے۔"

اسلام صاحب نے بھی ایک تنبیہہ کرتی نگاہ شائستہ بیگم پر ڈالی۔

"میں پوری طرح مطمئن ہوں۔ میرا طالب علمی کے زمانے کا دوست ہے اختر۔ انتہائی شریف اور خاندانی لوگ ہیں۔ کئی سال سے آسٹریلیا میں ہے ' مگر مستقل رابطے میں رہتا ہے۔ پچھلے سال بیوی اور بیٹے کو لے کر یہاں گھر بھی آیا تھا۔ کتنے مہذب اور سادہ طبیعت لوگ ہیں۔"

وہ مڑ کر دادی سے مخاطب تھے۔ "میں تو شکر گزار ہوں اپنے اللہ کا کہ اس نے ربیعہ کے لیے اتنا اچھا رشتہ بھیجا۔" ان کے لہجے میں پورا بھروسا اور بلا کی عاجزی تھی۔

معاذ نے احتراماً" نگاہ جھکائی۔

"میں نے اپنے اور اپنے بچوں کے سارے کام صرف خدا کے سپرد کیے ہمیشہ اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے اماں! میری کیا بساط ہے ' اس کی رحمت اور آپ کی دعائیں...... اور بس۔" دادی کا شفیق ہاتھ ان کے سر پر آکر پڑا تھا۔ آنسوؤں کی ایک باریک سی لکیر پرنور چہرے کی جھریوں میں کہیں گم ہوئی۔

"اگلے ماہ کے آخر تک وہ لوگ پاکستان آئیں گے ' تب ہی اس رشتے کو کوئی حتمی شکل دیں گے ان شاء اللہ لیکن اس سے پہلے ربیعہ سے رائے لینا بہت ضروری ہے۔ جو کچھ بھی ہو ' اس کی مرضی۔"

"سو ربیعہ بھی اب پرائی ہونے کو ہوئی۔"

سر جھکائے زمین کو تکتے ہوئے ' وہ ہلکے سے افسردگی کے ساتھ مسکرادیا۔ "زندگی کے اگلے ماہ و سال میں اس گھر میں کتنے ہی طویل وقفے ہوں گے جب نہ وہ دکھائی دیا کرے گی اور نہ اس کی ہنسی اور آواز گونجا کرے گی...... کتنا عجیب سا لگے گا!"

پل کے ایک چھوٹے سے وقفے میں ' بچپن سے لے کر اب تک کے کتنے ہی دل نشین پل۔

ہنستے ' روتے ' لڑتے ' جھگڑتے۔

سادہ دل ' محبت کرنے والی ' خدمت گزار بہن۔ سوچ کر بھی اسے نہ یاد آسکا کہ وہ کبھی بھی اپنی ذات کے لیے ڈیمانڈنگ ہوئی تھی۔

ابھی وہ یہاں اس گھر میں تھی ' تب بھی دل کسی بھاری بوجھ تلے آنا شروع ہوچکا تھا۔

خود کو مزید جذباتی ہونے سے روکنے کے لیے ' وہ آخر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کہاں چلے؟ اتنی ضروری بات ہورہی ہے۔"

وہ دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ اسے امی نے پیچھے سے پکارا۔

"ذرا اسکول جارہا ہوں ' تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" اس نے بغیر مڑ کے دیکھے ' جواب دیا اور کمرے سے نکل گیا۔

"گھر کی کسی بات سے اسے دلچسپی نہیں رہی ہے۔ ربیعہ بہن ہے اس کی ' مگر اس تک کی پروا نہیں ' بس اپنی مصروفیت عزیز ہے۔"

امی ناراضی سے بڑبڑائیں۔

"جانے دو اسے ' تم نہیں سمجھو گی۔" ابا نرمی سے مسکرادیے۔ برآمدے کی سیڑھیوں کے اس طرف اگلے احاطے سے وہ انہیں اپنی بائیک نکالتا ہوا نظر آرہا تھا۔

آج کل وہ پھر سے بائیک ہی استعمال کرتا تھا۔ گاڑی زیادہ تر گھر پر ہی کھڑی رہتی یا پھر گھر والوں کے آنے جانے میں استعمال ہوجاتی۔ امی اور دادی کو سب سے زیادہ فکر رہتی تھی۔

"سردی گرمی سب اپنے سر لیے رکھتا ہے۔ یہ گاڑی کس لیے ہے آخر؟ آپ بھی نہیں سمجھاتے اسے۔"

ابا کے چہرے پر آئی مسکراہٹ معدوم ہوئی۔

"کوئی ہے ' جو اس سے بھی زیادہ سختی جھیل رہا ہے۔" ان کی آواز نیچی تھی۔ شائستہ نے ٹھیک سے سنا نہیں تھا۔

"کیا کہا آپ نے؟"

"کچھ نہیں!" وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے دادی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اسکول کے آگے لگا رش غیر معمولی تھا۔

چھوٹا سا گیٹ کھلا ہوا تھا اور لوگ جس طرح باہر کھڑے تھے ' اس سے معاذ کو اچھی طرح اندازہ ہورہا تھا کہ اب اندر ہال کل بھی جگہ نہیں ہوگی۔

ولیام کے علاوہ آج کل دو لڑکے اور یہاں پڑھا رہے تھے ' مگر بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے یہ بھی ناکافی ثابت ہو رہے تھے۔

مگر وہ اس سلسلے میں بہت پرامید تھا۔

بہت سے پرانے ساتھی، زندگی کی مصروفیات میں کھو کر مجبوراً" بکھر بھی گئے تھے' مگر مدد کے لیے بڑھنے والے ہاتھوں میں بھی اضافہ ہوتا ہی جارہا تھا۔

گیراج اسکول سے لے کر یہاں تک کا کامیاب سفر۔ اور اب ایک قدم اور آگے۔

ابا ہمیشہ کہتے تھے کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں۔ یہ بے حسی' دہشت گردی' جمود' جڑوں تک پھیلا کرپشن' ہماری شناخت نہیں ہے۔

یہ تو ایک مٹھی بھر لوگوں کی پھیلائی نحوست ہے' جو حکمران طبقے سے لے کر انتہائی نچلی سطح تک' کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں ورنہ بحیثیت قوم ہم بہت محبت کرنے والے اور محب وطن لوگ ہیں۔ ابا فطرتاً" خوش امید تھے' اللہ پر بھروسا رکھنے والے ہر شخص کی طرح ___ اور خود وہ بھی ___ بڑی سہولت سے لوگوں میں سے جگہ بناتے ہوئے' وہ اندر تک آیا تو خیام اور وہ دونوں لڑکے اسے لوگوں میں گھرے ہوئے نظر آگئے۔

اپنے سامنے رجسٹر کھولے خیام مکمل مصروف تھا۔ معاذ کے پکارنے پر اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔

"معاذ بھائی! ___ شکر ہے جو آپ آگئے' کب سے تڑائی کر رہا تھا۔"

"یہ سب کیا ہے؟" حالانکہ وہ سمجھ چکا تھا' مگر پھر بھی مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

خیام کے ساتھ وہ دونوں لڑکے بھی مسکرائے تھے۔

"ایڈمیشن کا رش بنے دیکھ رہے ہیں اپنے اسکول کی مقبولیت؟ ہماری تو سمجھ میں نہیں آرہا معاذ بھائی! اتنے بچوں کو کیسے ایڈجسٹ کیا جائے گا؟"

"سب ہو جائے گا' فکر مت کرو۔ تم میں سے کوئی جاکر ذرا باہر کے رش کو سنبھالو۔" معاذ کا مخصوص پر سکون سا انداز ساری فکریں ہٹا تا تھا۔ خیام نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

آج ایڈمیشن اوپن کرنے کا پہلا دن بلکہ پہلی سہ پہر تھی۔ معاذ کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ پہلے ہی چند گھنٹوں میں اتنے سارے لوگ یہاں آجائیں گے' ورنہ وہ آفس سے سیدھا یہیں آگیا ہوتا۔

اگلے کچھ گھنٹوں کے لیے وہ بری طرح مصروفیت میں گھر ا تھا۔

ایک نرم سی مسکراہٹ لیے' لوگوں کے ہر سوال کا بہت تسلی سے جواب دیتے ہوئے' اس نے ایک بار بھی ہلکی سی بھی بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ایک ایسا کام' جس میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا۔ خیام نے کتنی ہی بار اسے رشک اور شرمندگی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا تھا۔

وہ عمر میں اس سے چند سال ہی بڑا تھا اور کتنی چھوٹی عمر سے اپنی ذات سے اوپر ہو کر کام کرنے کے بھید کو پا چکا تھا۔

اور اگر وہ یہاں معاذ کے پاس نہ آیا ہوتا تو شاید ساری زندگی صرف اور صرف اپنے ہی دکھ اور اپنے احساس کمتری کا غم مناتا رہتا ___ صرف اپنی پیدائشی بدنصیبی پر ہی ___

دل میں پہلی بار اٹھتے اس خیال پر وہ لمحے بھر کے لیے حیران بھی ہوا اور پھر فوراً" ہی خود سے ناراض بھی۔

"اس کی بدنصیبی سے بڑھ کر دوسرا کوئی دکھ آج بھی نہیں ہے ___ اور یہ جو لوگوں کا جم غفیر کھڑا ہے' کیا ہے ان کی محرومی ___ بس یہی کہ پیسے تھوڑے سے کم ہیں ان کے پاس' اور کیا؟ عزت' شناخت' خاندان سب سے مالا مال! ہونہہ!" اس نے دل ہی دل میں نہ جانے کس کس کو ٹھوکر سے اڑایا۔ معاذ نے ٹھیک اسی وقت خیام کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟ تمہیں کس پر غصہ آرہا ہے؟"

"مجھے؟ نہیں تو!" خیام دل ہی دل میں اتنے درست انداز پر حیران ہوا۔

"اچھا! پھر آؤ ذرا یہ لسٹ چیک کرو۔"
خیام نے اس کا بڑھایا ہوا رجسٹر خاموشی سے تھام کر اپنے سامنے کیا۔ اس نے بخوبی نوٹ کیا تھا کہ معاذ اس کی کسی بات کے پیچھے نہیں پڑا تھا جیسا کہ اس وقت۔ ذرا مطمئن ہو کر اس نے لسٹ پر نگاہ ڈالی۔
"اتنے سارے بچے، پہلے ہی دن۔" وہ سخت حیرت میں مبتلا ہوا۔
"ہاں! ہم اب اسکول کو بڑے پیمانے پر لے جا رہے ہیں۔ اگلے مہینے کے آخر تک نئی بلڈنگ میں اسکول شفٹ ہو جائے گا تو نئے سیکشن کھولے جائیں گے اور اسٹاف بھی بڑھایا جائے گا۔" معاذ کے پاس اس حوالے سے بڑی خوش گوار اطلاع تھی۔
"یہ تو واقعی بڑی خوش خبری ہے معاذ بھائی! مگر سب واقعی ممکن ہو سکے گا؟" خیام خوش تھا مگر۔۔۔
"سالار نے ڈونیٹ کی ہے عمارت۔ کروڑوں کی پراپرٹی ہے۔ آگے کے اخراجات کے لیے بورڈ آف ٹرسٹی بھی قائم کر رہے ہیں وہ۔ اور تمہیں پتا ہے، یہ سب وہ میرے کام کو نہیں ابا کے نام اور ان کی دیانت داری کو دیکھ کر کر رہے ہیں۔" معاذ کے چہرے پر خوشی کا گہرا تاثر تھا۔
خیام کو اس ان دیکھے شخص پر رشک آیا۔
"بہت بڑے آدمی ہیں کیا سالار صاحب؟"
"بہت زیادہ۔۔۔ پیسے کے حساب سے بھی اور کردار کے حساب سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ۔ ایسے لوگ لاکھوں کیا کروڑوں میں ایک آدھ ہی ہوتے ہیں۔"
"میں اب تک بھی ان سے نہیں مل پایا۔" خیام کے لہجے میں افسوس سا اترا۔
"مل لو گے جلد ہی۔ اس دن وہ یہاں آئے تھے مگر تم اس وقت ساجد کو دیکھنے ہاسپٹل گئے ہوئے تھے۔ بہت سارے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں خود، لیکن ان میں سے کچھ بھی ذاتی نہیں۔۔۔ سالار حیرت انگیز ہیں اور بے حد قابل رشک۔ خدا انہیں جزائے خیر دے۔"
معاذ کا لہجہ احترام میں ڈوبا اور آواز بتدریج نیچی ہوئی۔
خیام کے لیے کوئی بھی تبصرہ ناممکن ہوا۔
"کل یا پرسوں، وقت نکال کر تم ابا کے پاس گھر چلے جانا۔ پہلے سال کے سلیبس پر ان سے نظر ثانی کروانی ہے۔۔۔ یہ سب اس ہفتے ہی ہو جائے تو اچھا ہے، پھر آگے کے بہت سے کام ہیں۔"
معاذ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوا۔
باہر رات پوری طرح پھیل چکی تھی۔
وہ خیام کے ساتھ چلتا ہوا صحن میں آیا۔ خیام کے لگائے ہوئے گملے پھولوں سے پوری طرح بھر چکے تھے اور دل فریب سی مہک لیے ہوا کے جھونکوں میں خوشگوار ٹھنڈک تھی۔
"پتا ہے خیام! جب ہم نے سہراب بھائی کے گیراج میں اپنے اسکول کا آغاز کیا تھا، تب ہمیں پچیس بچے پورے کرنے مشکل ہو گئے تھے۔ ساجد کو اس کا باپ زبردستی واپس لے گیا تھا اور دوسرے والدین کو بھی لگتا تھا کہ ہم ان کے کمانے والے بچوں کو روزگار سے ہٹا رہے ہیں۔۔۔ اور آج دیکھو۔"
ذرا رک کر اس نے خیام کی طرف دیکھا۔
"نیک نیتی سے اٹھایا جانے والا قدم ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے اور خدا کبھی کسی کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔"
"مگر منزل ہر ایک کا مقدر بھی تو نہیں بنتی معاذ بھائی! وہ ہماری کم ہمتی کو جانتا ہے، پھر بھی۔۔۔؟" خیام نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
اس آدمی ادھوری بات کے آگے لگا سوالیہ نشان بوجھل سی اداسی لیے ہوئے تھا۔
چند لمحوں کے لیے تو وہ خود کسی یاد میں گم صم ہوا۔
اوپر تاروں بھرا آسمان مسکرا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اپنے کمرے کی بڑی سی کھڑکی کے اس پار پھیلے وسیع سبزہ زار پر انہوں نے ایک خاموش سی نگاہ ڈالی۔ اکا دکا نظر آتے ملازم اس سناٹے میں ڈوبے ماحول کا لازمی حصہ تھے اور اس دم گھونٹتی خاموشی میں بڑے غنیمت بھی۔
ایک گہری سانس لے کر وہ واپس مڑے۔ ایک ملازم ان کے حکم کا منتظر تھا۔
"جاؤ! یہ بیگ رکھو گاڑی میں۔۔۔ میں آ رہا ہوں!" انہوں نے چھوٹے سے سفری بیگ کی طرف اشارہ کیا تو وہ مستعدی سے حکم بجا لایا۔
اپنے والٹ میں موجود چیزوں کو ایک بار پھر انہوں نے عادتاً چیک کیا اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ اوپری منزل کے کوریڈور اور لاؤنج سے گزرتے ہوئے انہوں نے صرف اپنی ہی آہٹ کو محسوس کیا اور تلخی سے مسکرا دیے۔
برسوں سے سب ہی کچھ ایسا ہی تھا، مگر شاید وہ خود پر اپنا قابو کھو رہے تھے۔۔۔ ضرورت سے زیادہ حساسیت یا پھر کہیں دل کے کسی انتہائی گوشے میں چھپا عدم تحفظ کا سر اٹھاتا ہوا احساس۔
نیچے جاتی سیڑھیوں پر اترنے سے پہلے وہ بے ساختہ ہی ٹھٹکے۔
کیسی عجیب سی بات تھی، جس پر خود بھی یقین کرنے کو دل نہیں چاہا تھا۔
انتہائی کامیاب، مضبوط، با اختیار شخصیت۔
اپنی تمام تر خصوصیات کو یاد کر کے وہ خود پر مسکرائے، مگر خالی پن کا بڑھتا ہوا احساس اپنی جگہ تھا۔
"وہ یقیناً بے حد قنوطی ہو چکے ہیں۔۔۔ یا پھر بوڑھے ہونے جا رہے ہیں۔" ایک چھوٹی سی تنبیہ خود کو تھما کر وہ تیزی سے نیچے اترتے چلے گئے۔
بڑے سے لاؤنج کے آخری کونے پر وہ انہیں وہیں سے بیٹھی ہوئی نظر آ گئی تھی۔ آج کل اس کا آنا جانا معمول کی بات تھی، سو وہ بنا چونکے آگے بڑھتے چلے آئے۔
"السلام علیکم ڈیڈی!"
"وعلیکم السلام! کیسی ہو زوبی؟" وہ اس کے قریب پہنچ کر چند لمحوں کے لیے رکے۔
"مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا تھی!" وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ان سے مخاطب تھی۔
"اس وقت؟" انہوں نے کچھ الجھن بھرے انداز میں زوبیہ کی طرف دیکھا۔
اس کے ملگجے کپڑے، تیزی سے بڑھتا ہوا وزن اور معمولی نقوش والے چہرے پر پختہ العمری کی چھاپ۔۔۔ اور ان سب سے بڑھ کر اس کی ناکام ترین ازدواجی زندگی، جس کی ساری ذمہ داری وہ آج بھی خود اسی پر ہی الٹتے تھے۔
بہت عرصہ ہوئے وہ زوبیہ سے مکمل طور پر مایوس ہو چکے تھے۔
"میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا مگر آپ اس وقت بھی مصروف تھے۔"
"تمہیں پتا ہے میرے کام کی نوعیت کا۔ وقت کہاں ہوتا ہے میرے پاس۔" انہوں نے زوبیہ کے لہجے کی

شکستگی پر توجہ دیے بغیر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "میری فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔ چلتا ہوں۔"

"پلیز یوسف! سن تو لیں ایک منٹ کہ وہ کیا کہنے آئی ہے۔ اتنی دیر سے آپ کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔" مسز کمال سے بالآخر ضبط نہ ہوا۔

"کم آن! میں تمہاری بیٹی کے فیصلوں میں کبھی اتنی اہمیت نہیں رکھ سکا ہوں کہ میرا مشورہ ضروری سمجھا گیا ہو' البتہ تم اس کی اچھی مشیر ہو ہمیشہ سے۔۔۔ اور میں نے کبھی تم دونوں کی مخالفت نہیں کی۔"

"کاش آپ کر لیتے۔" دل کی گہرائی سے اٹھتی آواز کو زوبیہ نے لبوں پر آنے سے پہلے ہی بمشکل دبایا۔

"ساری زندگی آپ کے ساتھ گزار کر بھی میں آپ کو نہ سمجھ سکی یوسف! مانا بہت ساری غلطیاں جمع ہیں آپ کے پاس میری مگر۔۔۔"

"چلو شکر ہے! تمہیں یاد تو رہا کہ تم نے کچھ غلطیاں بھی کی ہیں۔" ایک تلخی بھری مسکراہٹ کے ساتھ یوسف کمال نے قدم آگے بڑھایا "اور مت بھولو کہ ان سب کے باوجود میں تمہیں برداشت کرتا رہا۔"

زوبیہ نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔

جو کچھ وہ کہنے آئی تھی' محض ایک منٹ کی بات تھی' مگر اس کے ماں باپ یہ ایک منٹ اسے ساری زندگی نہیں دے سکے تھے۔ معلوم نہیں' ان میں سے کون زیادہ قصوروار تھا؟

وہ بے تاثر سے انداز میں ان دونوں کو بحث کرتے ہوئے دیکھے گئی۔

اس نے وہ دور بھی دیکھا تھا' جب دھونس' غصہ اور رعونت میں اس کی ماں شاید حرف آخر تھی اور اب یہ زمانہ بھی جب' وہ انہیں ٹوٹتا بکھرتا بھی دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں زمانوں کے بیچ آئے فرق نے بھی ان کے آپس کے فاصلوں پر کوئی فرق نہیں ڈالا تھا شاید۔

"تم نے میری ساری زندگی کی خوشیاں ملیامیٹ کر دیں' پھر بھی۔۔۔!"

وہ دونوں وہیں کھڑے' جھگڑ رہے تھے' گو آوازوں میں پہلے والی گھن گرج نہیں' مگر تلخی۔

وہ اٹھ کر ان دونوں کے بیچ جا کر کھڑی ہوئی۔

"یہ کیا طریقہ ہے زوبیہ! بیچ میں سے ہٹو!" یوسف کمال نے جھنجلا کر اس سے کہا۔

"میں آپ دونوں کے بیچ میں کہاں ہوں ڈیڈی! میں تو آپ کے درمیان کبھی رہی نہیں۔۔۔ ہم تو ایک فیملی کبھی بن ہی نہیں پائے۔" زوبیہ کی آواز نیچی تھی' اتنی نیچی کہ اگر وہ دونوں اس کے بالکل قریب نہ کھڑے ہوتے تو شاید ٹھیک سے سن بھی نہیں پاتے۔

زوبیہ کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ کی سی کیفیت تھی۔

ان دونوں ہی نے اپنے اندر ایک نامعلوم سی بے چینی کو پھیلتا محسوس کیا۔

"یہ تو بس ایک دکھاوا ہے' اس گھر سے باہر کے لوگوں کے لیے' مسٹر اینڈ مسز کمال' زوبیہ کمال۔۔۔ ایک کامیاب دولت مند خاندان۔۔۔ جس کی حقیقت سے صرف' ہم تین ہی واقف ہیں کہ نہ ہم ایک خاندان ہیں اور نہ ہی' ہم میں سے کوئی بھی ایک خاندان گھرانہ بنانے کے لائق ہے۔"

اتنی دیر بولتے رہنے سے ہی اس کا سانس پھول رہا تھا۔ یوسف کمال نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تمہارا پھر کوئی بڑا جھگڑا ہوا ہے سلمان سے؟ اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہو گا کہ تم انہیں طعنے دینے کے بجائے اس سے صلح کر لو۔ تمہاری بدمزاجی کے ساتھ وہی ایک شخص ہے جو باآسانی نباہ کر سکتا ہے۔ محض روٹی' کپڑے پر ساری زندگی۔۔۔"

"آپ اور مشورہ دے بھی کیا سکتے ہیں؟" اس نے تیزی سے ان کی بات کاٹی تھی۔ "مگر میں آپ دونوں کی طرح

نا الفت بھری زندگی نہیں گزار سکتی۔ شاید یہی ایک چیز میں آپ دونوں سے نہیں لے پائی ڈیڈی! اور اس کے لیے میں خدا کی شکر گزار بھی ہوں کہ میں اپنے ماں باپ کی مکمل کاپی بننے سے بچ گئی۔"

یوسف کمال کے لیے آج پہلی بار اس سے آنکھ ملانا مشکل ہو گیا۔

"تم صرف مجھے ہی قصوروار نہیں ٹھہرا سکتیں زوبیہ!"

"میں آپ کو قصوروار ٹھہرا بھی نہیں رہی۔ یہاں سب اپنے حصے میں آئے جہنم کو بھگت رہے ہیں۔۔۔ آپ جائیں! آپ کو دیر ہو رہی ہے۔"

اسے بالآخر اپنے باپ کی مصروفیت کا خیال آ ہی گیا۔

"میں وہ بات سن کر جانا چاہتا ہوں' جس کے لیے تم نے مجھے روکا تھا۔"

"کچھ خاص نہیں' بس یہ بتانا تھا میں نے سلمان پر خلع کا مقدمہ کر دیا ہے۔ ایک آدھ پیشی پر فیصلہ بھی ہو جاتا ہے۔ میرے لائر نے بتایا ہے مجھے۔"

اس بار اس کا لہجہ سرسری سا تھا' محض اطلاع دینے والا انداز۔

یوسف کمال نے بے تاثر سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"جو تم بہتر سمجھو۔۔۔ میں چلتا ہوں۔"

اس بار وہ بات ختم کرتے ہی باہر جانے والے دروازے کی طرف مڑ گئے۔

زوبیہ اور مسز کمال میں سے کوئی بھی انہیں رخصت کرنے دروازے تک نہیں گیا تھا۔

"کیسی عجیب سی بات ہے ممی! ہمارے ہاں کسی بھی بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔" ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ زوبیہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا "یہی خبر کوئی مڈل یا لوئر مڈل کلاس کی عورت اپنے ماں باپ کو سناتی تو ان کا ریسپانس کتنا مختلف ہوتا' کہرام مچ جاتا ہے ایسی باتوں پر۔ میں نے خود سلمان کے گھرانے میں ایسا منظر دیکھا تھا' جب جویا کی شادی ہوتے ہوتے ختم ہو گئی تھی۔ ہارٹ پیشنٹ ہو گئی تھیں اس کی امی۔" بیگم کمال کی پیشانی پر ہلکا سا بل آیا۔

"خیر! وہ بھی کوئی ایسی قابل رشک صورت حال نہیں ہے۔۔۔ اور تمہاری سسرال جیسی تھرڈ کلاس ڈیلونس۔۔۔" وہ بیزاری سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "میں کھانا لگواتی ہوں۔"

"ڈیڈی کہاں گئے ہیں؟" ان کے ساتھ اٹھتے ہوئے اس نے یوں ہی پوچھا تھا۔

"پتا نہیں! میں نے اب یوسف کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ تھک چکی ہوں میں اس لاحاصل تعاقب سے۔" بے تاثر سے انداز میں اپنی بات کو انہوں نے مختصرا" نمٹایا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔

"شاید ہم سب ہی کتاب زندگی کا سب سے کارآمد باب اسی وقت پڑھ پاتے ہیں' جب اس پر عمل درآمد کا صحیح وقت بہت پیچھے جا چکا ہوتا ہے۔"

وہ تلخی سے مسکرائی۔

☆ ☆ ☆

سالار ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔

لاؤنج میں غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی' ایک پل میں اس کی نگاہ نے اطراف کا جائزہ لیا تھا۔ وہ بڑا سارا لاؤنج' اوپر کو جاتی سیڑھیاں' دوسرے سرے پر کوریڈور کی طرف مڑتے زرتاج بیگم اور نبیل کے تصرف میں آئے کمرے' سب ہی پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی کی موجودگی کا ہلکا سا بھی احساس نہیں۔

اپنی فطری مضبوطی کے باوجود وہ بڑی بے ساختہ سی گھبراہٹ میں مبتلا ہوا۔
"گیتی... گیتی...!" چاروں طرف دیکھتے ہوئے وہ بے تابانہ پکارا۔
کمروں اور سیڑھیوں پر اب بھی سناٹا تھا۔
"گیتی!" اس بار اس کی آواز بتدریج بلند ہوئی تب ہی وہ اسے کچن کی طرف سے آتی دکھائی دی۔
"کیا ہوا؟ خیریت تو ہے۔" دوپٹے کے پلو سے اپنے گیلے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ قریب آ کھڑی ہوئی۔
"ہاں!" ایک سکون بھری سانس سالار کے لبوں سے آزاد ہوئی۔ گیتی اب بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"کچھ نہیں... وہ تم نظر نہیں آئیں تو بس ایسے ہی۔" سالار کے چہرے پر ایک جھینپی سی مسکراہٹ آئی۔
وہ گیتی کو خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ حقیقت یہی تھی کہ جتنی دیر وہ خود گھر سے باہر رہتا اسے زرتاج اور نبیل کی موجودگی میں گیتی کا گھر پر ہونا تشویش میں مبتلا رکھتا تھا۔
"میں اپنے گھر میں ہوں یوں ہی پریشان مت ہوا کریں۔"
"بڑا سناٹا ہے آج!" وہ اس کی بات کی تردید یا تصدیق کیے بغیر بات کا رخ موڑ گیا۔
"ہاں! زرتاج آنٹی اور ان کے شوہر آج صبح سے ہی نظر نہیں آئے جب میں نیچے آئی تھی تو وہ لوگ گھر پر نہیں تھے ابھی تک نہیں لوٹے۔"
"اچھا!" وہ اسے ساتھ لیے لاؤنج کے صوفے پر آبیٹھا۔ "اور تم کچن میں کیا کر رہی تھیں؟"
"میں کھانا بنا رہی تھی بلکہ بنا چکی۔" سالار نے بہت محبت سے اس کے سادہ اور پرکشش چہرے کو دیکھا۔
"گھر میں ملازم ہیں نا؟"
تب ہی گیتی نے داخلی دروازے سے کسی کو اندر آتے ہوئے دیکھ کر دھیرے سے سالار کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔
"کوئی آرہا ہے۔" جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں سے دروازہ دور بھی تھا اور وہاں روشنی بھی نسبتاً کم تھی... گیتی فوری طور پر سمجھ بھی نہیں سکی تھی کہ باہر سے کون اندر آرہا ہے۔
"ارے راجو! رک کیوں گئے؟ آؤ نا۔" سالار نے بے تکلفی سے آواز دی تو وہ جھجکتے ہوئے انداز میں قریب آ کھڑا ہوا۔
"ارے راجو بھائی!" گیتی نے حیرت انگیز خوشی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ بہت اچھی ڈریسنگ اور بڑے اچھے ہیئر کٹ کے ساتھ راجو کی شخصیت میں بڑی ہی نمایاں تبدیلی آئی تھی۔
"میں تو سچ پہچان ہی نہیں سکی آپ کو... کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔"
"سب سالار بھائی کی مہربانی ہے بھابھی۔ انہوں نے ہی ساتھ لے جا کر شاپنگ بھی کروائی اور یہ بھی..." جھینپے ہوئے انداز میں راجو نے اپنے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔ سالار کے بار بار ٹوکنے پر اب وہ اسے سالار بھائی ہی کہنے لگا تھا۔
"ہاں تو بہت اچھا کیا نا! اتنا زبردست چینج آیا ہے آپ میں۔" اس بار وہ صرف مسکرایا تھا۔
گیتی اور سالار دونوں نے اس کی مسکراہٹ میں نمایاں ہوتی افسردگی کو محسوس کیا تھا۔
وہ شاید اپنے سے زیادہ ان دونوں کی خاطر خود کو بدل رہا تھا۔
"تم دیکھنا گیتی! راجو ان شاءاللہ کہاں سے کہاں پہنچے گا آفس تو جوائن کر لیا ہے اس نے۔ کمپیوٹر ٹریننگ بھی شروع ہو گئی ہے اور یہ انیکسی اب راجو کا مستقل گھر ہے۔ میں تو کہہ رہا ہوں کچھ عرصے بعد اپنی امی کو بھی اپنے پاس بلوالو۔"

وہ جب گیتی کو بتا رہا تھا تو راجو نے تشکر بھری نگاہوں سے سالار کی طرف دیکھا۔
ذات کی مکمل ٹوٹ پھوٹ کے بعد ایک روشن راستے پر اسے لانے والا وہی تھا۔ راجو نے دل کی انتہائی گہرائی کے ساتھ خدا کا شکر ادا کیا۔
گیتی اس سے اس کی امی کے بارے میں کچھ پوچھ رہی تھی سو وہ خود کو سنبھالتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"امی یہاں نہیں رہ سکتیں مستقل بھابھی... وہاں گاؤں میں میری بہنیں ہیں سارا خاندان ہے وہ وہاں بہت خوش ہیں یہاں ان سے نہیں رہا جائے گا۔"
"چلو! کوئی بات نہیں... تم بہرحال ان کی خدمت میں کوئی کمی مت رہنے دینا کبھی بھی۔" سالار نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"اور بس جلد ہی کوئی اچھی لڑکی دیکھ کر شادی کر لیں بالکل سیٹ ہو جائیں گے۔" گیتی نے بے ساختگی سے مشورہ دیا تھا مگر بہت ہی بے وقت۔
راجو کے چہرے سے وہ افسردہ سی مسکراہٹ بھی غائب ہوئی۔
"سوری راجو بھائی! میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ..." راجو کے جذبات کو سمجھ کر وہ فی الفور شرمندہ بھی ہوئی۔
"گیتی! تم ذرا چائے تو بنا لاؤ اچھی سی۔" سالار کو یہی مناسب لگا تھا۔
"گیتی کی بات کو دل پر مت لو راجو! اسے شاید اندازہ ہی نہیں ہے کہ تم روزی سے کتنی محبت کرتے تھے... اس نقش کو مدھم ہونے کے لیے ابھی وقت چاہیے لیکن اس نے جو کچھ کہا تمہارے بھلے کے لیے کہا۔ زندگی کو آگے تو چلنا ہی ہے نا تو پھر بہتر ہے کہ ہم اسے بہتر سے بہتر طور پر گزارنے کی کوشش کریں۔"
گیتی کے جانے کے بعد اس نے راجو سے کہا۔
"جی!" خاموشی کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد اس نے محض اتنا ہی کہا۔
"اچھا بتاؤ! اس وقت کیسے آنا ہوا؟" سالار نے نرمی سے بات کو بدلنا چاہا تو وہ کچھ چونک سا گیا۔
"ہاں... کچھ ضروری بات کرنا تھی آپ سے..."
"کہو!" سالار نے اس کی فکرمندی کو صاف محسوس کیا تھا۔
"وہ..." راجو کچھ کہتے کہتے رک سا گیا۔ اس کی نگاہ اس طرف اٹھی تھی جدھر سے گیتی کو آنا تھا۔
"وہ ابھی نہیں آرہی تم آرام سے بات کرو۔"
"نبیل آج لاہور چلا گیا ہے سالار بھائی! زرتاج میڈم اسے ایئرپورٹ چھوڑنے گئی تھیں اور اس کے بعد انہوں نے کچھ ہائی آفیشلز سے ملاقات کی ہے اور ابھی بھی وہ کسی میٹنگ میں ہیں۔" ایک ہی سانس میں اس نے قصہ تمام کیا۔ گھر پر چھائی ہوئی خاموشی کا سبب یہی مصروفیت تھی۔ سالار نے ایک گہری سانس لی۔
"وہ جو کر رہے ہیں کرتے رہیں۔ ان کا سارا زور کیس کی تحقیقات کو Slow down کرنے پر ہے راجو! وہ ڈی ایس پی ملک میں نہیں ہے زرتاج بیگم اسے نہ بلانے کے لاکھوں روپے دے چکی ہیں... مگر سچائی کو ظاہر ہونے سے اس طرح روکا نہیں جا سکتا۔" سالار کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ جھلک رہا تھا۔
"میں ایک اور بات کرنا چاہ رہا تھا سالار بھائی!"
"ہوں!" سالار نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔
"نبیل لاہور گیا ہے اور وہ وہاں بھی جاتا ہے گیتی بھابھی کے گھر کے دوسرے پورشن میں۔ اس بار بھی ضرور

جائے گا۔ مجھے فکر ہے گیتی بھابھی کے لیے کوئی پریشانی نہ کھڑی کردے۔ نبیل جیسے کمینے شخص سے ہر بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔" وہ گیتی کے لیے پریشان تھا' یہ اس کی وفاداری کا تقاضا تھا اور گیتی اور سالار سے گہری محبت کا اظہار بھی۔

"فکر مت کرو راجو! لیکن اچھا کیا جو تم نے میری توجہ اس طرف دلائی' نبیل اپنی گھٹیا فطرت سے باز نہیں آئے گا۔ لیکن اب اس کی کوئی بھی حرکت' خود اس کے خلاف گواہی بنے گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اب جلد اپنے ہی دام میں آئے گا' پولیس کے لیے وہ اپنے سارے ثبوت غائب کرچکا ہے' مگر قدرت کا حساب کتاب دوسرا ہے۔" سالار بہت پریقین تھا۔

راجو کے چہرے پر افسردگی کا گہرا تاثر اترا۔ "مجھ پر ایک مہربانی اور کردیجیے سالار بھائی۔۔۔ روزی کا دوبارہ پوسٹ مارٹم نہ ہونے دیں۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی قبر دوبارہ۔۔۔" اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی تھی۔ "بے شک ثبوت ضائع ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں۔"

سالار نے خود اپنے دل پر نمکین پانی کے قطرے گرتے محسوس کیے اور ایک بار پھر راجو کے لیے ہر حرف تسلی گم ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼
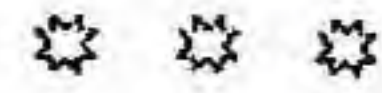
رات سے کئی بار بارش وقفے وقفے سے برسی تھی اور بادل تھے کہ ابھی بھی جھکے پڑتے تھے۔ نانی ستارہ کے چوبارے کے نیچے گلیوں میں سنسان سی دوپہر اتری تھی۔ نگینہ نے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے ذرا رک کر ایک اکتائی ہوئی نظر ماحول پر ڈالی۔ پانی میں بھیگے درودیوار' گیلریاں' چھجے اور نیچے گلی میں جگہ جگہ جمع کھڑا پانی۔

"مشکل ہی تھا جو آج شام کو یہاں کی رونق بحال ہوسکے۔" اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا اور اندر نانی ستارہ کے کمرے میں چلی آئی۔

صندل ابھی بھی وہیں تھی' سرخ آنکھیں اور زرد ہوتا ہوا چہرہ لیے۔ اپنی راتوں رات ملنے والی کامیابی کے بعد وہ اس سے زیادہ تیزی سے نیچے آتے ہوئے مکمل طور پر مایوس تھی۔

"کتنا کہتی تھی میں آپ کو' مجھے دوسرے بینر کی فلم سائن کرنے دیں' مگر آپ کو تو بالی کی غلامی کروانے کا شوق تھا۔ کتنی بڑی بڑی آفرز آرہی تھیں ان دنوں۔ ایک نہ لینے دی مجھے۔ اب دیکھ لیا اس کا انجام؟"

نگینہ کی شکل دیکھ کر اسے اپنے پچھلے سارے رونے یاد آجاتے اور ہر ناکام شخص کی طرح وہ بھی سارا الزام دوسروں کو دینے کی عادی ہوچکی تھی۔

"آپ نے خود ساری عمر ایکسٹرا کی حیثیت سے کام کیا اس لیے غلامی کی عادت پڑچکی تھی آپ کو۔ وہی آپ نے مجھے بنا دیا نمبرون ہیروئن تھی پچھلے ڈیڑھ سال سے میں۔ اگلے کئی سال نہیں ہٹنا تھا مجھے اس پوزیشن سے۔ مگر آپ کی غلط پلاننگ نے برباد کردیا مجھے۔"

اسے سمجھانے کی ہر کوشش ناکامی کا منہ دیکھ چکی تھی' جو نانی ستارہ نے اپنے سامنے کھلی کتاب پر سے نگاہ اٹھانا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ نگینہ بھی الماری کھول کر خاموشی سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔

"اب دیکھ لیا انجام؟ اتنے سال سے یہاں کام کررہی تھیں' مگر اتنا بھی اندازہ نہیں کرسکیں کہ بالی کا پچھلا سارا ریکارڈ کیا ہے۔ آپ تو صرف اپنی خواہش کے پیچھے بھاگتی رہیں کہ بیٹی کو ہیروئن بنانا ہے۔۔۔ چاہے ایک فلم کے لیے ہی سہی' سو پوری کی۔۔۔ اب آگے مجھے کیا کرنا ہے۔۔۔ کسی کنوئیں میں گردوں یا کھائی میں۔۔۔ آپ کو کوئی مطلب نہیں۔"

ان دونوں کی خاموشی سے وہ اور بھی تلخ ہورہی تھی اور ناممکن تھا کہ اب وہ خود سے خاموش ہوجاتی۔ نگینہ کو الماری بند کرکے اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

"جو بھی ہو' ہوگیا نا' کیوں اتنی مایوس اختیار کرلی۔۔۔؟ اور کوٹھی پر تالا ڈال کر یہاں بیٹھنے سے فائدہ؟ لوگوں پر تو یہی تاثر پڑ رہا ہوگا کہ فلاپ ہونے کے بعد منہ چھپا کر بیٹھ گئی ہے صندل۔"

"مائی فٹ!" لفظ "فلاپ" جیسے اس کی چڑ بن چکا تھا اور نگینہ اس وقت وہی استعمال کرنے کی غلطی کرچکی تھی۔

"لوگوں کو کوئی حق نہیں ہے میرے بارے میں بات کرنے کا۔ میں جہاں بھی رہوں' یہ میرا اپنا مسئلہ ہے اور اب بھی اس گھر کو افورڈ کرنا میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ کتنے لمبے چوڑے بل پڑے ہیں۔ پچھلے کئی مہینوں سے پے نہیں ہورہے' پھر وہاں ملازموں کی فوج اور اس بالی نے الگ میرے اوپر ایک لمبا چوڑا بل بنا کر رکھا ہے' پچھلے اخراجات کا۔"

وہ ذہنی' مالی' ہر طرح کے دباؤ میں بری طرح آچکی تھی۔ نانی کو مداخلت کرنا پڑی۔

"کچھ زیور رکھا ہے ابھی بھی میرے پاس۔ اسے بیچ کر اپنے خرچ میں لے لو' مگر اس طرح خود کو ہلکان مت کرو تم۔" کتاب بند کرکے انہوں نے ایک طرف رکھی تھی۔ "یہ سب وقتی پریشانیاں ہیں۔" نگینہ کو ان کی توجہ سے بے حد جذباتی سہارا ملا تھا' مگر سوچ سمجھ کر بولنا' وہ ساری عمر نہیں سیکھ سکی تھی۔

"گیتی سے پیسے منگوا لیتے ہیں۔ سالار تو پورا نواب ہے۔ بڑے کھلے ہاتھ سے خرچ کرتا ہے۔ جتنے کہیں گے' خوشی بھیج دے گا۔"

"بس یہی کسر رہ گئی ہے۔ آپ آخر کتنا اور ذلیل کروانا چاہتی ہیں مجھے؟ اب گیتی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں گی میں؛ کیا حیثیت رہی ہے اس کی میرے سامنے ساری عمر۔۔۔ اور آج وہ اس قابل ہوگئی کہ مجھے خیرات دے۔۔۔"

وہ بہت حساس ہورہی تھی۔ اتنی سی بات کہتے ہوئے اس نے مستقل اپنے آنسو صاف کیے تھے۔ نانی نے کچھ کہنے سے پہلے نگینہ کو ناراضی سے دیکھا تھا۔

"کوئی کچھ نہیں منگوا رہا گیتی سے۔ تم یہاں آؤ میرے پاس' شاباش!"

صندل کے لیے بھی نانی کی بات کو ٹالنا مشکل تھا' سو وہ آنسو صاف کرتے ہوئے ان کے قریب جا بیٹھی۔

نانی ستارہ نے بہت پیار سے اس کے چہرے کو چھوا۔

"گیتی آرا سے اپنا مقابلہ مت کیا کرو بیٹا! اکلوتی بہن ہے تمہاری اور جان چھڑکتی ہے تم پہ۔۔۔ پتا ہے نا؟"

ان کا لہجہ دھیما اور پراثر تھا اور جو کچھ انہوں نے کہا' اس سے انکار بھی نہیں تھا۔ صندل نے نگاہ چرائی۔

"تم گیتی سے کہیں زیادہ قابل ہو بیٹا! بچپن سے محنت کی فن کو سیکھنے میں۔ مشکل راہ چنی۔ خود کو ثابت کیا۔ سالوں بعد ہمارے گھرانے میں کوئی اس اونچائی پر آیا۔۔۔ تمہاری وجہ سے۔۔۔ یہ کیا کم فخر کی بات ہے؟"

بہت نرمی' بہت محبت سے وہ جو بھی کہہ رہی تھیں' صندل نے بالکل خاموش ہوکر سنا۔

"جب وہ وقت نہیں رہا تو یہ بھی کٹ جائے گا۔ یقین کرو میرا' آنے والا کل تمہارے لیے اتنی خوشیاں اور کامیابیاں لے کر آئے گا کہ تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ اپنے اچھے وقت کا انتظار کرنے میں۔۔۔"

کمرے میں صرف نانی ستارہ کی آواز تھی۔ تب ہی ان کا موبائل بج اٹھا۔

"جاؤ! اپنے کمرے میں آرام کرو' بالکل ٹھنڈے دل و دماغ سے۔" فون اٹھانے سے پہلے انہوں نے صندل کو کہنا ضروری سمجھا۔ اس نے جھک کر ان کا ہاتھ چوما اور پھر خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔ نگینہ اس کے ساتھ ہی کھڑی ہولی تھی۔

"میں بھی ذرا انگل ناز کی طرف جارہی ہوں اماں! بہت دن ہوگئے خالہ کو سلام کیے۔"

وہ ریڈیو کی طرف سے آیا فون ریسیو کر چکی تھیں' سو صرف اثبات میں سر ہلایا۔
تمینہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔
باہر پھر سے بارش کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ فون بند کرکے یوں ہی کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ پانی کی بوچھاڑ اندر تک آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی بند کرنے لگی تھیں کہ کوئی سیڑھیاں چڑھ کر ٹھیک ان کے کمرے میں داخل ہوا۔
شاید بخت یا صبیح کی نکلی ہوئی شامت۔
"کیوں اتنی بارش میں پھر رہے ہو تم لوگ؟ بیمار پڑ جاؤ گے تو۔" وہ بے نیازی سے کہتی ہوئی مڑیں تو بات پوری کرنا بھول گئیں۔
"تم!" حیرت کی ایک آخری حد کو بھی پار کرکے یہ لفظ ان کے منہ سے نکلا تھا۔ سامنے کھڑا شخص اگر دنیا کا آخری آدمی بھی ہوتا تو وہ اس کی یہاں اپنے گھر میں موجودگی کا تصور نہیں کر سکتی تھیں۔
"بہت اچھی یادداشت ہے آپ کی' ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ مجھے پہچان بھی نہ سکیں۔"
وہ دو قدم بڑھا کر کمرے کے وسط میں آ کھڑا ہوا۔ اس کے بال پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔
"دو چہرے آدمی کبھی نہیں بھلاتا یوسف! ایک وہ جس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو اور دوسرا وہ جس نے اسے کوئی نقصان پہنچایا ہو اور تم تو مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکے ہو..... کیسے بھول سکتی تھی تمہیں؟"
وہ اندر سے پوری طرح ہل گئی تھیں' مگر اعصاب پر قابو رکھنے کی برسوں پرانی مشق تھی۔
"وہ نقصان میں نے صرف آپ کو نہیں' خود کو بھی پہنچایا ہے' آپ سے کہیں زیادہ خسارہ میرے حصے میں آیا ہے' مگر آپ نہیں مانیں گی۔" سامنے کھڑے یوسف کمال افسردگی سے مسکرائے۔
نانی ستارہ کا چہرہ بے تاثر ہی رہا۔ "فیروزہ میری بیٹی تھی' میرا خون' جسے تم چوروں کی طرح اڑا کر لے گئے تھے یوسف۔ اور پھر کیا کیا اس کے ساتھ دنیا کی ٹھوکروں میں ڈال دیا اسے۔ رسوا کر دیا اس کی محبت کو۔ ایسا رسوا کہ پھر وہ جی ہی نہ سکی۔"
وہ اس شخص کے سامنے اپنی کمزوری کو بالکل بھی ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھیں' مگر اپنی زندگی کے سب سے دل گداز باب کو پڑھنا ان کے لیے آسان بھی نہیں تھا۔ کھڑا ہونے کے لیے بھی انہیں سہارے کی ضرورت پیش آ رہی تھی' سو وہ قریب ترین کرسی پر بیٹھ گئیں۔ وہ اب بھی کھڑے تھے اور نانی ستارہ کا انہیں بیٹھنے کے لیے کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
"میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ یہ ایسا نقصان ہے جس کا ازالہ بھی ناممکن ہے' پھر بھی اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔"
الفاظ کا الٹ پھیر بھی کب کا بے معنی ہو اتھا۔
نانی ستارہ نے محض ہاتھ کے اشارے سے بیزاری کا اظہار کیا۔ "تم اتنے سال بعد یہاں اگر صرف یہی کہنے آئے ہو تو میں تمہاری بات سن چکی ہوں' اب تم جا سکتے ہو۔"
"میں آپ سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔ کہاں ہے وہ؟" لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر انہوں نے بے تابی سے پوچھا تھا۔
ایک آخری زخم پر بے رحمی سے کھرنڈ اتری۔
"احسان ہو گا آپ کا مجھ پر۔ اسے مجھ سے نہ چھپائیں۔ میں تڑپ رہا ہوں اس کے لیے۔ ہاتھ جوڑتا ہوں آپ کے آگے۔ میری غلطیوں کی سزا اسے مت دیں۔"

. ا، میں پہلی بار یوسف کمال کے ہاتھ کسی کے آگے جڑے۔
ایہ وہ کہاں ہے' پلیز! میری برداشت کا اور امتحان مت لیں خیام کہاں ہے؟"
"ہ ام مر چکا ہے یوسف!"
ہ سے آئی تمینہ کی آواز پر نانی ستارہ اور یوسف کمال دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
معلوم نہیں کس کام سے وہ جاتے جاتے واپس پلٹ کر آئی تھی۔
"جھوٹ بول رہی ہو تم تمینہ!" یوسف کمال کی آواز قدرے اونچی ہوئی تھی' دل کسی بھی طرح یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔
"مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بچہ اپنی ماں کے بعد چند سال ہی زندہ رہا۔ اب تو اسے مرے ہوئے بھی کئی سال ہو گئے ہیں۔"
بہت وقار سے چلتے ہوئے تمینہ' یوسف کمال کے بالکل سامنے آکر کھڑی ہوئی تھی اور جس طرح وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی' وہ انداز اس کی مضبوطی کو اور بھی نمایاں کر رہا تھا۔
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ نہیں۔ میں نہیں مانتا۔"
"کیوں؟ کیا لوگ مرتے نہیں ہیں؟ فیروزہ بھی تو مر گئی تھی۔ ہم نے تو تم سے جا کر کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ ہم نے لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ پھر وہ تو ایک بچہ ہی تھا۔ اور ویسے بھی یہ تو تمہیں پتا ہی ہو گا یوسف! کہ پودے کو اس کی پرانی جگہ سے نکال کر دوبارہ کہیں لگاؤ تو وہ مشکل سے ہی اس مٹی کو قبول کر پاتا ہے۔ مرجھا جاتا ہے۔ وہ بھی قبول نہ کر سکا ہمارا ماحول' سو مر گیا۔" یوسف کمال کے چہرے پر پھیلتی تکلیف کا ذرا سا بھی اثر لیے بغیر اس نے اس کے بیٹے کی موت کی خبر کی تفصیلات جاری کیں۔
نانی ستارہ نے ایک دم ہی رونا شروع کر دیا تھا۔ ان کے بے آواز گرتے ہوئے آنسو نہ جانے کس کس غم کو منا رہے تھے۔
"اب تم جاؤ! مجھے امی اماں کو سنبھالنا ہے۔ یہاں اب تمہارے لیے کچھ نہیں رکھا۔ چلے جاؤ فوراً!" تمینہ نے بیزاری سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
یوسف کمال نے کچھ اور کہنا چاہا' مگر وہ سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔
"چلے جاؤ یوسف!"
یوسف کمال کو نہ چاہتے ہوئے بھی کمرے سے باہر آنا پڑا۔
"ان کا بیٹا مر چکا ہے۔" برآمدے کی محراب کے نیچے کھڑے ہو کر انہوں نے خود کو اس درد بھری حقیقت کا یقین دلانا چاہا' تب ہی ان کی نگاہ سامنے کے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے پر پڑی۔
خیام کی بڑی سی تصویر سامنے دیوار پر آویزاں تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عفیفہ محمد بیگ

جو تمہیں چاہے

"حدیقہ..... تمہارا سیل فون تمہیں مستقل تنگ کر رہا ہے تم اسے ___ تبدیل کیوں نہیں کر لیتیں؟"

عانیہ پلیٹ میں آلو کے چپس لیے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے حدیقہ کو سیل فون کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے پایا۔ حدیقہ سیل فون کے چارجر کو سوئچ میں سے بار بار نکال کر سیل فون پر نظریں ٹکائے ہوئے تھی۔

"ہاں! پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ یہ کمبخت چارج ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔" اس نے پھر سوئچ کو آن کیا۔ مگر سیل فون چارج ہونے کی علامت نہیں دے رہا تھا۔

عانیہ نے گرم گرم چپس کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی ___ اس نے ایک ہاتھ سے تھوڑے سے چپس اٹھا کر منہ میں ڈالے۔

"اوہو ___ ادھر دو ___ میں دیکھتی ہوں۔" عانیہ نے اس سے سیل فون لے لیا۔

عانیہ، حدیقہ کی چچا زاد تھی ___ دونوں ایک ہی گھر میں رہائش پذیر تھیں۔ عانیہ حدیقہ سے صرف چھ ماہ بڑی تھی۔ لہٰذا دونوں میں گہری دوستی بھی تھی۔ اسکول سے یونیورسٹی تک ساتھ پڑھتی رہی تھیں۔

عانیہ نے سیل فون آن کر کے دیکھا ___ مگر سیل فون چارج نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سیل فون کی بیٹری نکال لی۔

"بیٹری میں پرابلم ہے ___" اس نے حدیقہ کو بیٹری دکھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے؟" حدیقہ نے چپس سے ہاتھ روکے اور دوپٹے سے ہاتھ صاف کر کے بیٹری لے لی۔

"ارسلان کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔"

"ارسلان ___ یہ ارسلان کون ہے؟" حدیقہ مسکرائی۔

"اوہو ___ تم بھی ناں ___ بات کا سرا کہاں تک لے جاتی ہو۔ وہ ہی ارسلان ___ میرا کلاس فیلو ___" عانیہ چپس کھاتے ہوئے بولی۔

"اچھا ___ اچھا ___ وہ ارسلان ___ جس نے تمہیں فرینڈشپ بینڈ بھی دیا تھا۔" حدیقہ کو یاد آیا۔

"ہاں ___ میری سمجھ دار بچی ___ وہ ہی ارسلان۔" عانیہ نے مسکرا کر تصدیق کی۔

"ہائے ___ تو پھر نیا سیل لینا پڑے گا۔" حدیقہ نے سیل فون کو آف کر کے پھر سے چارجر کی پن سیل فون پر سیٹ کی اور سوئچ آن کیا۔ چارجنگ ہونی شروع ہو گئی ___ حدیقہ نے چیخ ماری۔

"کیا ہوا ___ کرنٹ لگ گیا ___؟ عانیہ نے گھبرا کر پوچھا اور جلدی سے سوئچ آف کر دیا۔

"اُفوہ! سوئچ کیوں آف کیا ___ چارجنگ ہوتے دیکھ کر میں نے خوشی سے چیخ ماری تھی۔"

"اللہ نے میری دعا سن لی ___ صبح سے تمہارا سیل چارج نہیں ہو رہا تھا۔ دیکھو! کیسے تمہارے سب کام ہونے لگے ہیں۔"

"ایسی بات ہے ___ تو پھر عامر سے بات کرو۔" حدیقہ نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ وہ کئی دنوں سے یہ کہہ رہی تھی کہ عانیہ، عامر سے بات کرے تاکہ پتا چلے

کے دل میں کیا ہے۔
عانیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "حدیقہ! پہلے بھی عامر کی وجہ سے ہم دونوں میں اختلاف ہو گیا تھا۔۔۔ میں عامر کے مسئلے سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں۔"
"ہاں! رہنے دو۔ میں مریم آپا سے کہوں گی' وہ بات کرلیں گی۔" اس نے بھی خفگی سے جواب دیا۔
"دیکھ لو۔۔۔ ہم دونوں میں جب عامر کا ذکر ہوتا ہے' فضا اسی طرح خفا ہو جاتی ہے۔" اس نے غصے سے چپس کی پلیٹ میز پر پٹخی۔
"پلیٹ ٹوٹ جاتی تو؟" حدیقہ نے آہستگی سے کہا۔
"وہ ہر روز تمہارا دل توڑتا ہے۔۔۔ اس کی تمہیں فکر نہیں۔۔۔ اور پلیٹ ٹوٹنے کا بڑا خیال ہے۔" عانیہ نے غصے سے جواب دیا۔
"یار۔۔۔ اب چھوڑو۔۔۔ میں پہلے ہی اس فون کی وجہ سے پریشان ہوں۔" حدیقہ نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ اسے پتا تھا کہ اب وہ اس کو ایک لمبا لیکچر دے گی۔
"اس عامر کے بچے سے اب تو ضرور بات کروں گی۔" عانیہ نے غصے سے سیل فون پکڑا۔
"عانیہ۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔ سیل فون میں چارجنگ بہت کم ہے۔۔۔ بات صحیح طریقے سے ہو نہیں پائے گی۔" حدیقہ نے اسے روک دیا پھر وہ یک دم افسردہ سی ہو کر بولی۔
"عانیہ! یہ بتاؤ' عامر کو مجھ سے محبت ہے؟"
"مجھے نہیں پتا۔۔۔" عانیہ نے خفگی سے جواب دیا۔ "یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔"
"ہاں۔۔۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں عامر کو سمجھ نہیں پا رہی۔"
عانیہ نے حدیقہ کا سیل فون پھر چارجر میں لگا دیا۔۔۔ اور سنجیدگی سے بولی۔ "اس سے شادی کی بات کی تم نے؟"
"لو۔۔۔ تم شادی کی بات کرنے کو کہہ رہی ہو۔۔۔ وہ تو دو ماہ سے مجھ سے بات ہی نہیں کر رہا ہے۔۔۔ روز فون کرتی ہوں۔۔۔ اور میسجز کا تو حساب ہی نہیں ہے۔" اس نے رونی صورت بنائی۔
"تو چھوڑ دو۔۔۔ بھول جاؤ۔۔۔ کہ کوئی عامر ہے۔۔۔ تمہاری زندگی میں۔"
عانیہ نے خفا ہو کر کہا۔
حدیقہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔
"ارے حدیقہ! تم تو رونے لگیں؟ اس میں رونے کی کیا بات ہے یار؟"
"پتا نہیں کیوں میرا دل بہت پریشان رہتا ہے۔"
اس نے خود کو سنبھالا اور سیل فون کی طرف متوجہ ہوئی۔ فون چارج ہو رہا تھا۔
"میں رونے کی وجہ پوچھ رہی ہوں۔۔۔ یہ نہیں کہا تھا کہ بس رونا بند کر دو۔" عانیہ نے بھی غصے سے کہا۔

"عانیہ! میں اس سے جتنی محبت کرتی ہوں۔۔۔ وہ مجھ سے اتنا ہی بھاگتا ہے۔۔۔ اور جب میں اس سے پوچھتی ہوں تو وہ صاف مکر جاتا ہے۔ اسے میری غلط فہمی کہتا ہے۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔
عامر اس کا ماموں زاد تھا۔ وہ ایک شوخ مزاج سا لڑکا تھا اس نے خود حدیقہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ حدیقہ کو پسند کرتا تھا' بلکہ وجہ یہ تھی وحید' حدیقہ کو پسند کرتا تھا۔ وحید بھی اس کا ماموں زاد تھا۔ بھائی ہونے کے باوجود دونوں کی شروع ہی سے نہیں بنتی تھی۔ وحید ہمیشہ پڑھائی میں اول آتا تھا جبکہ عامر بمشکل پاس ہوتا۔ عامر کے لیے گھر والوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور نصیحتیں ہوتیں اور وحید کے لیے تحائف اور تعریفیں۔ بچپن کا یہ حسد وقت کے ساتھ ساتھ جوان ہوا تھا۔ عامر' وحید کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا تھا۔ جوں ہی اسے اندازہ ہوا کہ وحید' حدیقہ کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے' اس نے فوراً" حدیقہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ اپنے حسد کی وجہ سے اس نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ حدیقہ اس کی پھوپھی زاد تھی۔
وحید کو پتا تھا کہ عامر اسے دھوکا دے رہا ہے۔ اس نے حدیقہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی ہر کوشش میں ناکام ہوا کیونکہ وہ حدیقہ سے اپنی محبت کا اعتراف کر چکا تھا۔ لہٰذا حدیقہ نے اسے غلط سمجھا۔
"وحید! میں عامر سے محبت کرتی ہوں اور مجھے یقین ہے' وہ بھی مجھے دھوکا نہیں دے گا۔"
حدیقہ اپنے ماموں زاد وحید کے کردار کو جانتی تھی۔ اسے پتا تھا' وہ ایک اچھا انسان ہے۔ مگر پھر جب عامر نے اپنے تیور دکھائے تو اس کا پہلا شک وحید کی طرف ہی گیا تھا۔
"عانیہ۔۔۔ کہیں وحید نے تو عامر سے کچھ نہیں کہہ دیا۔۔۔ جس کی وجہ سے عامر مجھ سے دور ہونے کی کوشش کر رہا ہے؟" اس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والا خدشہ عانیہ کے سامنے بھی ظاہر کیا۔
"پاگل ہوئی ہو کیا؟ فرض کرو! وحید نے کچھ کہہ بھی دیا ہے تو عامر کے دل سے تمہاری محبت ختم ہو گئی؟ ویسے بھی عامر بہت ہوشیار ہے۔ وہ کسی کی باتوں میں نہیں آسکتا۔ اور دوسری بات یہ کہ وحید اس طرح کا نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی ایسا نہیں کرے گا۔"
"تمہیں وحید پسند ہے کیا؟" اس نے عانیہ کو گھورا۔
"نہیں۔۔۔ مجھے تو ارسلان پسند ہے۔" وہ لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ سجا کر بولی۔
"کیا۔۔۔؟" وہ چونکی۔
"ہاں بابا۔۔۔ مجھے ارسلان پسند ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ "اچھا چھوڑو! میں کولڈ ڈرنک لے کر آتی ہوں۔"
عانیہ کچن میں چلی گئی۔ وہ سیل فون کو دیکھنے لگی۔۔۔ چارجنگ ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

عانیہ کولڈ ڈرنک لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کسی کو میسج کر رہی تھی۔۔۔ عانیہ نے گلاس اس کو تھمایا۔ اس نے گلاس لے کر میز پر رکھ دیا۔
"کس کو میسج کر رہی ہو؟" عانیہ کو حیرت ہوئی کیونکہ حدیقہ کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔
"عامر کو میسج کر رہی ہوں۔۔۔ کہ وہ مجھ سے کیوں بھاگ رہا ہے۔ کہیں کسی اور لڑکی سے اس کا چکر تو نہیں چل رہا۔" اس نے غصے سے کہا۔
عانیہ نے ایک گہری نظر حدیقہ پر ڈالی اور بولی۔ "اگر اس کا چکر کسی اور لڑکی سے ہوا تو کیا کرو گی؟"
"میں اس کو چھوڑ دوں گی۔"
"میرے خیال میں اس کا کوئی افیئر تلاش کرنے کے بجائے تم اسے خود ہی چھوڑ دو۔ یہی تمہارے لیے زیادہ بہتر ہوگا۔" وہ افسردہ سی اس کو تکنے لگی۔
"کیا دیکھ رہی ہو؟" عانیہ نے حیرت سے پوچھا۔
"دیکھ رہی ہوں۔۔۔ تم کتنی مطمئن رہتی ہو۔۔۔ جبکہ تم بھی اسی راہ کی مسافر ہو۔"
اس نے قہقہہ لگایا۔۔۔ "ہاں! میں بھی محبت کی مسافر ہوں۔۔۔ مگر مجھے محبت کے آداب یاد ہیں۔"
"کھانے کے آداب تو سنے تھے۔۔۔ یہ محبت کے آداب۔۔۔؟" حدیقہ کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔

"ہاں! ہر چیز کے آداب ہوتے ہیں۔ عورت کو ہمیشہ اس سفر میں اپنی عزت کا خیال پہلے رکھنا چاہیے۔ تم یہ کولڈ ڈرنک پی لو۔۔۔ ورنہ میں تمہارا گلاس بھی پی جاؤں گی۔" اس نے اپنا گلاس ختم کر کے کہا تھا۔

حدیقہ نے جلدی سے گلاس اٹھالیا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔۔۔ اور خاصی سمجھ دار بھی۔" عانیہ نے ہنس کر کہا۔ حدیقہ کی بھی ہنسی نکل آ گئی۔

☼ ☼ ☼

عظمیٰ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ حسب معمول سیل فون میں الجھی ہوئی تھی۔ انہیں غصہ آ گیا۔

"ہاں سارا دن کچن میں کام کرتی رہے۔ تمہیں خیال نہیں آتا۔۔۔ البتہ سیل فون پر میسج کس کس کا آیا ہے' یہ دیکھنے کے لیے تمہارے پاس بہت وقت ہے۔" انہوں نے کدو کی پرات ٹیبل پر پٹخی۔۔۔ اور اس کے پاس بیٹھ کر کدو چھیلنے لگیں۔

"اماں۔۔۔ میرے سیل فون کو آپ کی بددعا لگ گئی ہے۔۔۔ صبح سے چارجنگ پر لگایا ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی چارجنگ شروع ہوئی ہے۔" اس نے سیل فون پر نظریں جما کر کہا۔

"اچھا ہے۔۔۔ خراب ہی رہے۔" انہوں نے کدو غصے سے کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ معصومیت سے بولی۔ "اماں! آپ کو غصہ کیوں آ رہا ہے؟"

عظمیٰ بیگم نے تیزی سے کدو کے قتلے کرتے ہوئے کہا۔ "فروا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ نزہت کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"کیا ہوا۔۔۔ فروا نے کیا کر دیا؟" فروا اس کی خالہ زاد تھی۔ اپنی ماں کے منہ سے اس کے لیے ایسے الفاظ سن کر اسے حیرانی ہوئی۔۔۔ وہ ان کی پسندیدہ بھانجی تھی۔

"خالد سے منگنی توڑنے کا کہہ رہی ہے۔۔۔ نواب زادی کو یونیورسٹی میں اپنے لیے ایک ہیرو مل گیا ہے۔ اس لیے برسوں پرانی منگنی کو توڑنے کے درپے ہے۔۔۔ نزہت بہت پریشان ہے۔۔۔ کہ وہ کیسے فروا کو سمجھائے۔۔۔ کہ وہ جس محبت کے نشہ میں ہے۔۔۔ وہی محبت اس کی زندگی تباہ کر دے گی۔"

"مما۔۔۔ تو اس کی مرضی کے بغیر بھی تو منگنی نہیں کرنی چاہیے تھی نا۔" حدیقہ نے سیل سے نظریں اٹھا کر عظمیٰ کو جواب دیا۔

خدا کا شکر کرے۔۔۔ کہ باپ سر پر نہیں تھا۔ چچا نے بچپن میں سر پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔ ورنہ عظمت کی حالت دیکھو! ماریہ کے رشتہ کے لیے کتنی پریشان ہے۔"

عظمیٰ نے خفگی سے پرات اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"یہ ہمارے بڑے بھی خوب ہیں۔۔۔ فلم کے اختتام پر ہیرو ہیروئن کے ملنے پر بہت خوش ہوتے ہیں مگر حقیقت میں ایٹم بم بن جاتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر سوچا۔

☼ ☼ ☼

"میڈم! کیوں مسکرا رہی ہیں؟" عانیہ اپنا سیل فون اٹھائے اسی وقت کمرے میں داخل ہوئی۔

"ہاہا۔۔۔ فروا میری کزن بھی محبت کے سفر پر چل نکلی ہے۔" حدیقہ نے مسکرا کر خبر سنائی۔

"ہائیں۔۔۔ مگر اس کی تو منگنی ہو چکی ہے لندن میں۔" عانیہ نے چونک کر کہا۔

"ہاں' ہاں! وہ اب منگنی توڑنے کا کہہ رہی ہے۔" حدیقہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم ہنس رہی ہو۔۔۔ تمہاری کزن بے وقوفی کرنے جا رہی ہے۔" عانیہ کو فکر ہوئی۔

"یار۔۔۔ وہ محبت کرتی ہے۔۔۔ اس لڑکے سے۔"

"ہاں۔۔۔ جیسے عامر تم سے محبت کرتا ہے۔۔۔ اس کا میسج آیا؟" عانیہ نے خفگی سے پوچھا۔

"نہیں آیا۔۔۔ مصروف ہو گا۔" حدیقہ پھر اداس ہو گئی۔

لی مصروف نہیں ہے وہ۔۔۔ بس اس نے ں ٹائم پاس کے لیے رکھا ہوا ہے۔۔۔" عانیہ نے ل پر میسج ٹائپ کرتے ہوئے کہا۔

"کس کو میسج کر رہی ہو تم؟" حدیقہ نے پوچھا۔

"ارسلان کو۔" عانیہ نے مسکرا کر کہا۔

"کیا لکھ رہی ہو؟" حدیقہ نے تجسس سے پوچھا۔

"میں لکھ رہی ہوں۔۔۔ کہ سیل فون کی بیٹری ٹھیک طریقے سے چارج نہیں ہو رہی۔۔۔ کوئی مشورہ دو۔"

"اوہو۔۔۔ میں نے بھی عامر کو کئی روز سے اس سیل کا مسئلہ بتایا ہوا ہے۔ ابھی تک اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"وہ تمہاری نارمل باتوں کا جواب نہیں دیتا۔۔۔ تو پیدہ مسئلے پر کیا بات کرے گا۔" عانیہ نے میسج ان کر میسج پڑھا۔ ارسلان نے لکھا تھا۔

"ابھی اسی وقت سیل فون ایک طرف رکھ دو۔۔۔ تمہارے گھر کے نمبر پر کال کر رہا ہوں۔۔۔ بائے۔"

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا ارسلان کو؟" عانیہ نے حیرت سے میسج دوبارہ پڑھا۔

دونوں ٹی وی لاؤنج کی طرف بھاگیں۔ حدیقہ نے ت سے پوچھا۔

"گھر پر کال کیوں کر رہا ہے؟"

"مجھے کیا پتا۔" عانیہ بھی فکر مند تھی۔

دونوں لڑکیوں کو ٹیلی فون کے پاس منتظر کھڑا دیکھ کر ظمیٰ بیگم بولیں۔

"کیا بات ہے؟ ٹیلی فون پر چڑیلوں نے حملہ کیوں کیا ہوا ہے؟" ان کا موڈ خوشگوار تھا' مگر عانیہ پھر بھی گھبرا گئی۔

"ممی جان! وہ میری ایک دوست کا فون آنا ہے۔۔۔ اس لیے یہاں پر کھڑے ہیں۔" اس نے آنکھیں چرا کر کہا۔ حدیقہ نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

عظمیٰ بیگم ہنس کر بولیں "حدیقہ! تمہاری خالہ جان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے بتایا ہے۔۔۔ کہ فروا شادی کے لیے خود بخود راضی ہو گئی ہے۔۔۔ خدا نے ان کی دعائیں سن لی ہیں۔" وہ یہ کہہ کر خوشی خوشی کچن میں چلی گئیں۔

حدیقہ حیران تھی۔۔۔ "فروا نے اتنی جلدی فیصلہ کیسے تبدیل کر لیا؟" وہ منہ میں بڑبڑائی۔۔۔ اسی وقت عانیہ کا سیل فون بجنے لگا۔

"یہ کس کا نمبر ہے؟" کسی انجان نمبر سے کال آ رہی تھی۔ اس نے حیرانی سے نمبر دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فون ریسیو کرتی' اسی وقت گھر کا فون بھی بجنے لگا۔ اس نے جلدی سے حدیقہ کو فون پکڑایا اور بولی۔

"یار! تم یہ فون اٹینڈ کر لو۔"

حدیقہ نے فون پکڑا اور ٹی وی لاؤنج سے باہر آ گئی۔

"کون۔۔۔؟" حدیقہ نے فون ریسیو کیا۔

"عانیہ آپی۔۔۔!" دوسری طرف سے ایک لڑکی کی آواز ابھری۔ حدیقہ نے کرن کی آواز کو پہچان لیا۔ وہ عامر کی بہن اور اس کی ماموں زاد تھی۔ وہ چونک گئی' مگر پھر خود پر قابو پا کر اس کی بات سننے لگی۔

"وہ۔۔۔ مجھے آپ سے ایک بات شیئر کرنی ہے۔" اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

"بولو! کیا بات ہے؟" حدیقہ 'عانیہ کے لہجے میں بولی۔

وہ لرزتی آواز سے بولی۔۔۔ "میں حدیقہ آپی کی زندگی کو برباد نہیں دیکھنا چاہتی۔ عامر بھائی ان سے محبت نہیں کرتے۔۔۔ وہ وحید بھائی سے بدلہ لینے کے لیے یہ ڈراما رچائے بیٹھے ہیں۔۔۔ حتیٰ کہ انہوں نے وحید بھائی سے انتقام لینے کے لیے ان سے شادی تک کا فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔ جبکہ عامر بھائی' سدرہ سے پیار کرتے ہیں۔۔۔ بلکہ انہوں نے اس سے چھپ کر نکاح بھی کر لیا ہے۔۔۔ پلیز! آپ اپنی طرف سے حدیقہ آپی کو سمجھا دیں۔۔۔ کہ عامر بھائی سے دور رہیں۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔۔۔ اور پھر کسی کے آنے کی اطلاع دے کر اس نے فوراً فون رکھ دیا۔

حدیقہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عانیہ کمرے میں داخل ہوئی۔۔۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ عانیہ

اس پر توجہ دیے بغیر سیدھی حدیقہ کے سیل فون کی طرف بڑھی۔

"یہ بیٹری خراب ہو چکی ہے۔۔۔ ارسلان نے سیل فون سے بیٹری الگ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔۔۔ وہ سمجھا تھا کہ میرا فون خراب ہے۔ اس لیے اس نے سیل فون پر کال نہیں کی تھی۔ وہ گھبرا گیا تھا کہ کہیں بیٹری پھٹ نہ جائے۔۔۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔" اس کے لہجے میں پیار تھا۔ حدیقہ خاموش رہی۔ عانیہ نے اسے دیکھا تو گھبرا گئی۔ حدیقہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"کیا ہوا؟" عانیہ نے گھبرا کر پوچھا۔ "تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

"پلیز عانیہ! میں اس وقت تنہا رہنا چاہتی ہوں۔۔۔ پلیز!" اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔۔۔ عانیہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر قدم باہر کی طرف بڑھا دیے مگر اسی وقت حدیقہ نے اس کو پکارا۔

"عانیہ!۔۔۔ مجھے ایک فون کرنا ہے۔۔۔ وحید کو۔۔۔ کیا تم اپنا سیل فون دے سکتی ہو؟" وہ ابھی تک سنجیدہ تھی۔

"ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ وحید بھائی کو فون کرنے کے لیے تم میرا سیل فون کبھی بھی استعمال کر سکتی ہو۔" عانیہ نے اپنا فون اسے تھما کر کہا اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

حدیقہ نے وحید کا نمبر ملایا۔ اس نے فون ریسیو کیا تو حدیقہ نے اس سے اپنے سابقہ رویے کی معافی مانگی اور پھر کہا۔

"میں تمہاری محبت اور خلوص کو سمجھ نہیں پائی تھی۔۔۔ مگر اب مجھے عامر کی اصلیت کا پتا چل چکا ہے۔ میں جان چکی ہوں کہ تم نے اس کے متعلق جو کچھ کہا، وہ سب درست تھا۔"

وحید نے اس کی تمام بات سن کر کہا۔ "کیا ہم دونوں میں دوستی ہو سکتی ہے؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے ٹکا سا جواب دیا۔

"کیوں۔۔۔؟" وہ بوکھلا سا گیا۔

وہ سنجیدگی سے بولی۔ "ایک رشتے کو بناتے بنا[تے] میں نے ایک سیل فون خراب کر دیا ہے۔۔۔ اب دوسرا سیل فون نہیں خراب کرنا چاہتی۔"

اس کی بات سن کر اس کی جان میں جان آئی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ حدیقہ کا سیل فون اس کو پچھلے ماہ سے تنگ کر رہا ہے۔

وہ ہنس کر بولا۔ "میرے رشتے میں سیل فون نہیں آئے گا۔"

"وہ کیسے؟" وہ حیران ہوئی۔

"کیونکہ میں کل ہی اماں جانی کو آپ کے گھر بھیج [رہا] ہوں۔" اس نے پیار بھرے لہجے میں جواب دیا۔

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش رہی۔۔۔ اور پھر بولی۔

"مجھے انتظار رہے گا۔"

"اپنا خیال رکھنا۔۔۔" وحید نے پیار سے کہا اور فون بند کر دیا۔

حدیقہ کے دل و دماغ پر وحید کے یہ الفاظ چھا گئے۔۔۔ "اپنا خیال رکھنا۔"

عامر نے کبھی بھی اس کی ذات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فروا نے بھی اس محبت کو حاصل کرنے کے بجائے ایسے ساتھی کا انتخاب کیا ہے، جو اسے خوش رکھ سکتا ہے۔

حدیقہ نے اپنے سیل فون سے بیٹری نکال لی۔ اسے ہاتھوں میں لیے کچھ دیر گھورتی رہی اور پھر اس کچرے کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ وہ اب سمجھ چکی کہ جس طرح سیل فون کی بیٹری اس کو ڈسٹرب [کر] رہی تھی، عامر کا وجود بھی ہمیشہ اس کی زندگی میں ویسا رہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی محبت کی دنیا میں [کھو] جاتی۔۔۔ عانیہ کے سیل فون پر وحید کا فون آ رہا تھا۔ [اس] کے خیال رکھنے والے کا۔۔۔ وہ مسکرانے لگی۔۔۔ [کسی] کو خوش رکھنا۔۔۔ اور اس کا خیال رکھنا ہی سچی محبت [کی] نشانی ہے۔

قانتہ رابعہ

"عمرہ کا ٹکٹ مل رہا ہے کمپنی کی طرف سے۔" [نع]مان نے کھانا کھاتے ہوئے سرسری سے انداز میں [...] سے ذکر کیا۔

فائزہ کا چمچہ پلیٹ میں گر گیا۔ اس کے ہاتھ رک گئے [او]ر سانس تک اس نے روک لی۔

"کیا کہا آپ نے عمرہ کا ٹکٹ؟" اس کی آواز میں [ب]درجہ حیرت تھی۔

"ہاں! صرف دو افراد کو مل رہا ہے اس [...]" نعمان انتہائی مختصر بات کرنے کا عادی تھا۔

"آپ عمرہ پر جائیں گے؟" فائزہ کے لہجے میں اس [...] حیرت کے ساتھ بے پناہ عقیدت بھی تھی۔

"ہاں سوچ تو رہا ہوں۔" اس نے کھانا ختم کرکے [ک]ہا۔

"کیا کہا، ابھی سوچ رہے ہیں؟ آپ کو نہیں علم یہ [کمپ]نی کی طرف سے نہیں، اللہ کی طرف سے بلاوا ہے [او]ر جو اللہ کے بلاوے کو ٹھکرا دے یا نظر انداز کر دے، [...] آئندہ اس پر اپنے دروازے کم ہی کھولتا [ہے]۔" بے حد جذباتیت سے فائزہ نے کہا۔

نعمان ہلکا سا مسکرایا۔ "مجھے یہ سب علم ہے، بس [...] کام ضروری اٹکے ہوئے ہیں۔ سوچ رہا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں سوچنے کی؟" فائزہ نے بات [کا]ٹتے ہوئے کہا۔ "دادا جان مرحوم کہا کرتے تھے کہ جو [...] کاموں کی تکمیل میں اللہ کے گھر جانے کو ترجیح [...] رہتا ہے اس کے کام کبھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتے اور۔۔۔"

[نع]مان نے ہاتھ کی انگلی اٹھا کر اسے خاموش کیا۔

"یہ دادا جان کا فرمان نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ [وسل]م کی حدیث کا مفہوم ہے۔ مجھے سب علم ہے۔ رکے [...] سے مراد کمپنی کے معاملات نہیں بلکہ دین کے [...] ہیں اللہ کے گھر جانے سے پہلے یہ سب تو [...] نے چاہئیں، میری جذباتی بیگم صاحبہ!"

[...] گئے فائزہ کی سوئی نعمان کے عمرہ پر جانے اور [...] جانے پر رکی رہی۔ بالآخر اس نے موقع پاتے [...] اپنی درخواست پیش کر دی۔

"[می]ں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔۔۔؟"

"کہاں؟" نعمان نے پوچھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی اس وقت عمرہ پر جانے والا معاملہ نہیں تھا۔

"کہاں؟ کیسے انجان بن رہے ہیں۔ عمرہ پر اور کہاں؟" فائزہ نے خفگی سے کہا۔

"عمرہ پر؟ تم جانتی ہو میرے مالی معاملات اس فرمائش کو پورا نہیں کر سکتے اور بچے۔۔۔ وہ کہاں رہیں گے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہ کس کام آئیں گی؟" فائزہ نے سونے کی

چوڑیوں والا بازو آگے کیا۔ "کیا گھر بنانے پر عورت اپنا زیور نہیں بیچتی؟ اور رہے بچے تو امی سے بات کروں گی مجھے پوری امید ہے وہ مان جائیں گی۔"

نعمان خاموش رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملہ میں ایک لفظ مزید کہنا گناہ گار ہونا ہے۔ آپس میں صرف وہ چچا زاد ہی نہیں ایک ہی گھر میں پلے بڑھے تھے اور وہ جانتا تھا جب بچیوں کی کھیل کھیلنے کی عمر ہوتی ہے وہ "لبیک اللھم لبیک" کی آواز سننے کے لیے اسکول سے چھٹی کرکے ٹی وی اسکرین کے آگے بیٹھی رہتی تھی۔ اس کے پسندیدہ شہروں میں مکہ مدینہ اور مشروب میں آب زم زم شامل تھا۔

خاموشی نیم رضا کے مصداق۔ فائزہ نے گھڑی پر نظر ڈالے بغیر سیل فون اٹھایا۔

"السلام علیکم امی!"

"کیا بات ہے خیریت تو ہے امی! آپ کی آواز کچھ بھاری سی ہو رہی ہے۔" عمرہ پر جانے کی خوشی میں وہ قطعاً" بھول گئی کہ یہ وقت اس کے میکے میں "سویا ہوا محل" کا عملی نمونہ ہوتا ہے۔

"سو رہی تھی۔ خیریت تو ہے۔ اتنی رات گئے۔" امی نے باقی فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اوہ سوری امی! مجھے یاد نہیں رہا۔" فائزہ کے خوشیوں بھرے لہجے پر شرمندگی غالب آگئی۔ "اصل میں نعمان عمرہ پر جا رہے ہیں۔" اس نے بالآخر بات کہہ ڈالی۔

"اچھا۔!" امی نے خوشی سے کہا۔ "کب؟"

"وہ۔ امی۔ میں سوچ رہی ہوں۔ میں بھی ساتھ چلی جاؤں صرف ستائیس دن کا پیکیج ہے۔ نعمان کو تو کمپنی کی طرف سے ٹکٹ مل رہا ہے۔"

"ستائیس دن کا۔" امی نے خود کلامی کی "اور بچے؟"

"امی! آپ آجائیں ناں بچوں کے پاس۔ اب تو آپ فارغ ہی ہیں۔ آل اولاد سب گھر بار کی ہو گئی۔"

"ارے تو کیا یہ انعم رہ لے گی تمہارے بغیر؟" امی نے فائزہ کی تین سوا تین سالہ بیٹی کا ذکر کیا۔

"یہ نہیں سوچنا۔ کیا اسمٰعیل اپنی شیر خوارگی میں نہیں رہ لیے تھے باپ کے بغیر؟ بے آب و گیاہ وادی میں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس دلیل کے سامنے کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا۔ یہ تو کام بھی ثواب کا تھا۔ امی نے رضامندی سے کہا۔

شوق ہی شوق میں دو ہفتوں کے اندر سارے کام مکمل ہو گئے۔ امی کو اس نے ایک ہفتہ قبل بلا لیا تاکہ انعم اور صارم ان سے مانوس ہو سکیں۔

4 مارچ کی سہ پہر بھی آپہنچی۔ بچوں کی جدائی یا گھر سے دوری پر شوق محبت عقیدت غالب رہی۔ امی سے آنے بہانے آنسو پونچھتی رہیں۔

"ارے تم تو بچوں کے بغیر دو گھنٹے بازار نہیں گئیں اب کیسے رہو گی؟"

"جیسے ہاجرہ رہی تھیں۔" فائزہ نے دل ہی دل میں جواب دیا۔

بچوں کا پورا شیڈول اس نے امی کو دے دیا تھا۔ کام والی بھی بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرا رہی تھی۔ بچوں کو ایئرپورٹ لے جانے سے اس نے خود ہی منع کر دیا۔ جہاز پر بیٹھتے ہوئے ایک دفعہ بس دل کانپا، لیکن چشم تصور نے ہزاروں سال قبل کا وہ منظر سامنے لا کھڑا کیا، جب ایک عورت ویران علاقے میں بغیر ساز و سامان کے اپنے بیٹے کے ساتھ کھڑی تھی اور اس کا محرم راز، اس کا دم ساز اسے خدا کے آسرے چھوڑ رہا تھا۔ اس نے کون سا مشرکے دیکھا تھا۔

فائزہ کا کانپتا دل قابو میں آگیا اور وہ جہاز میں مسافروں کے مشاہدے میں مصروف ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

ستائیس دن کیسے گزرے پتا ہی نہ چلا اس نے ہر جگہ پر ممتا کو محسوس کیا۔

اللہ کا گھر۔ اتنی انسیت۔ کہ میکے جا کر بھی ہو۔ سگی بہن سے وہ سو باتیں چھپا جاتی تھی یہ تو اس ہستی کا گھر تھا جو دلوں کے بھید جانتا تھا۔ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا۔ یہ سوچ آتے ہی وہ ہنسی "دیکھا! یہاں بھی ممتا۔" صفا مروہ پر دوڑے تو اس کا وجود جیسے لوہے کا بن گیا تھا۔

"اوہ میرے خدایا۔ اتنی عظیم عورت!"

چپ چاپ تے موت کے منہ میں جانے کے بجائے پہاڑیوں پر دوڑتی ہے۔

کیوں؟ صرف بچے کے لیے۔

اوہ یہاں بھی ممتا!

"صرف ممتا ہی نہیں ممتا کے اس پیار کو، اس تڑپ کو اللہ نے قیامت تک کے لیے عبادت قرار دے دیا۔ دوڑو۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر نہ بیٹھو، کچھ کرو۔ سامان، اسباب، وسائل نظر نہ بھی آئیں تو۔ تو بھی کوشش کرو جیسے اماں ہاجرہ نے کی۔ اور دیکھا آپ نے۔" اس نے نعمان کو مخاطب کیا۔ "اللہ نے انسانوں کو قیامت تک کے لیے اس جدوجہد کے نتیجہ میں، جو صرف اولاد کے لیے کی گئی، زم زم کا چشمہ دے دیا آب شفا کی صورت میں۔"

فوراً" ہی ایک ممتا اور سامنے آگئی۔

"محبوب دو جہاں کی ممتا۔ امت کے لیے۔ ساری ساری رات رو رو کر اس امت مسلمہ کے لیے دعا کرنا، تڑپنا، بلکنا جو آج تن آسان ہو گئی ہے۔ بزدل، وہم کا شکار ہو چکی ہے۔ کیا کسی ماں کے اپنی اولاد کے لیے دعا کرتے کرتے پاؤں سوجے۔؟ جیسے میرے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں سوج جاتے تھے۔

امت مسلمہ کا درد سارے دکھوں پر حاوی ہو گیا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ بھی تو ماں تھی۔ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر بھی اپنے بچوں سے تعلق تھا۔ اس نے اپنی گھڑی، اپنے سیل فون پر ٹائم تک پاکستان کا معیاری رکھا تھا۔ بچوں کی سرگرمیاں اس وقت کے مطابق اس کے ذہن میں رہتیں۔ اکثر وہ فون کرتی، تو صارم اسکول سے گھر میں داخل ہو رہا ہوتا تھا۔

امی حیران ہوتیں۔ "ارے اتنا صحیح اندازہ تمہیں کیسے ہوا کیا کوئی خفیہ کیمرا نصب کر رکھا ہے۔"

وہ بس مسکرا کر رہ جاتی۔ اور کیا کہتی سوائے اس کے کہ

"ممتا۔"

ستائیسویں دن وہ اپنے گھر میں تھی۔ بچے شروع میں تو دور دور ہی رہے پھر قریب آگئے۔ ممتا کی خوشبو نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔ نہ کوئی تحفے تحائف، نہ کھلونے بس جتنی دعا وہ کر سکتی تھی، اس نے اپنے بچوں کے لیے کی۔ رات گئے ملنے جلنے والوں سے فراغت ملی تو وہ امی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

امی کے آنسو اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ ان کی بیٹی اپنے بچوں میں خیر و عافیت کے ساتھ آگئی تھی۔ یہ آنسو تو مالک کائنات کے حضور احساس تشکر کے تھے۔

بات کرتے کرتے اس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں۔ دو راتوں سے وہ سو نہ سکی تھی۔ کل کی رات اس نے حرم کعبہ میں گزاری تھی۔ تلاوت، نماز، روزہ، صدقہ خیرات سب جہاں چاہے، جتنا چاہے کر لو، یہ بندوں کے گناہوں کو سمیٹنے والا، انہیں پاک صاف کرنے والے کا گھر کہاں ملے گا؟

اس گھر کو دیکھتے دیکھتے رات بیت گئی۔ اب اس کا نیند سے برا حال تھا۔ اس نے وقت دیکھنے کے لیے سیل فون اٹھانا چاہا۔

"اوہو، وہ تو دوسرے کمرے میں ہے۔ امی! وقت کیا ہوا ہے۔ نیند بہت آ رہی ہے۔" اس نے سوال کر کے خود ہی امی کا سیل فون اٹھایا۔

"ہائیں! ابھی صرف دس بجے ہیں۔" اس کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

امی کے چہرے پر کچھ اور ہی طرح کا رنگ تھا۔

"میں نے اپنا وقت تمہارے وقت کے مطابق کر لیا تھا کہ کہیں تمہیں بے وقت فون نہ کر دوں جب تم نماز پڑھنے یا آرام کرنے میں مصروف ہو۔ کوئی بات نہیں اب یہاں کے وقت کے مطابق کرتی ہوں۔"

فائزہ ایک دم اٹھی۔

حسب سابق ممتا کا یہ جذبہ سب پر بھاری تھا۔ اس کے وہم و گمان سے بھی باہر۔ بس وہ تو ماں کا ہاتھ پکڑ کر چوم رہی تھی۔

☼

نایاب جیلانی

دل کی بات

"فاختہ! اے فاختہ! کیا سو گئی ہو؟" اس کے قریب بہت ہلکی آواز ابھری تھی' سہمی سہمی سی اندیشوں میں ڈوبی آواز۔ آواز میں نمی بھی گھلی ہوئی تھی یقیناً" لحاف میں منہ دے کر بہت دیر سے رونے کا شغل بھی جاری تھا۔ اسے کروٹ بدلنا ہی پڑی۔ اپنے ساتھ چپک کر سوئی عاتکہ کو زور سے کہنی مار کر اس نے زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں ذرا سا سر کو اونچا کر کے

مکمل ناول

دیکھا۔ وہ گول گول آنکھوں میں آنسوؤں کی نہر سمیٹے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر نجانے کون کون سے تکلیف دہ تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔

"ایں۔ تم ابھی نہیں سوئیں؟" فاختہ نے جان کر حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"نیند بھلا آسکتی ہے۔ آج تو سونا بڑا ہی دشوار کام لگ رہا ہے۔" عطیہ کی آنکھیں پھر سے لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"تم سو گئی تھیں کیا؟" وہ دل کی ساری بھڑاس باتوں کے ذریعے نکال دینا چاہتی تھی اور فاختہ اس کی دلی کیفیت سمجھتے ہوئے ایک دفعہ پھر ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گئی۔

"تمہاری انیس سو ساٹھ کی ہیروئن جیسی آہیں اور سسکاریوں کی آواز بھلا سونے دے سکتی تھی۔" فاختہ نے بیزاری سے کہا۔ "آہیں تو یوں بھر رہی ہو گویا اماں کے ہاتھوں تمہاری درگت بنی ہے۔"

"فاختہ! تم۔" اس نے آنسو پینے کی بمشکل کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کتنی کٹھور ہو تم۔"

"کچھ غلط نہیں کہا میں نے۔ بھلا تمہارے رونے دھونے کا کیا فائدہ ہے۔ وہ کون سا واپس چلا آئے گا۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

"آج تو ابا بھی گھر نہیں۔ اسے کون لے کر آئے گا۔" عطیہ کے آنسو پھر سے بھل بھل گرنے لگے۔

"تانی سے کہو' اس گھر میں تمہارے بعد تانی کے دل میں اس کے لیے بڑا درد بھرا رہتا ہے۔" فاختہ نے جمائی روک کر مفت مشورے سے نوازا۔

"تانی میں ہمت ہوتی تو اسے کبھی جانے ہی نہ دیتیں۔" اس نے بے ساختہ آنکھوں کو زور سے رگڑا۔ "نجانے رات بھر کہاں دھکے کھائے گا۔ سردی بھی تو ہڈیوں میں گھسے جا رہی ہے۔" اس نے دوپٹے کا

کونا آنکھوں پہ ڈال لیا۔ گویا آنسو چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔

"یہ بھی خوب کہی۔ ہٹا کٹا' مسٹنڈا سا تو ہے۔ سوجائے گا کسی کے چھپر تلے یا بیٹھک میں۔ آخر پورے گاؤں میں ماسی نوراں کے بیٹے اور اپنے عقیل کو چھوڑ کرباقی سارے اس کے یار ہی یار ہیں۔" فاختہ نے دانت کچکچا کر جواب دیا تھا اور اپنے عقیل کی دفعہ منہ میں خاصی مٹھاس بھر آئی تھی۔ عطیہ نے سرعت سے دوپٹا آنکھوں سے ہٹایا۔ ایک دفعہ پھر ہتھیلی کی پشت سے پلکوں کو مسلا اور آنکھیں میچ کے گہری رنجیدگی سے بولی۔

"تم اماں کی لاڈلی بیٹی ہو' پتا ہے کیوں؟"

"کیوں؟"

"تم اماں کی طرح ہی کٹھور' سنگ دل اور بے حس ہو۔"

عطیہ کی آواز پھر سے بھرا گئی۔ آنکھوں کی پتلیوں پر کئی منظر بننے بگڑنے لگے۔ ابھی ساڑھے تین گھنٹے پہلے ہی تو اماں نے عباس کو اس کے کپڑوں لتوں سمیت بڑے بڑے ڈنڈے مار کے گھر سے نکالا تھا۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ ہر تیسرے ہفتے اماں کا دماغ تپ اٹھتا تھا اور نجانے کس کس پر آیا غصہ' بے چارے عباس پر نکل جاتا اور اماں کے غصے کی آخری حد یہ ہوتی تھی کہ وہ عباس کا سامان اٹھا کر باہر پھنکوا دیتی تھیں۔ اکثر اس کے کپڑے بڑے بڑے تھیلوں میں ٹھونس ٹھانس کر فاختہ دیوار سے پار گرا دیتی۔ تب ہی تو وہ اماں کی چہیتی تھی۔

"تمہاری عباس کے ساتھ لڑائی بھڑائی اپنی جگہ' مگر اماں کے کہنے میں آکر اس کی توہین کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔" بہت دیر بعد اسے ایک پھر عطیہ کی آواز سنائی دی۔ اس نے عطیہ کے چہرے کی طرف دیکھا سرخ ہوتی پھولی سی ناک' سادہ سا چہرہ اور گیلی آنکھیں۔ وہ کچھ پل کے لیے اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی تھی۔

عطیہ فطرتاً" نرم دل' نرم مزاج تھی' تاآنکہ فطرتاً" بے نیاز' لاپروا اور اپنی ذات میں مگن رہتی تھی' اور وہ خود یعنی فاختہ بھلا کیا تھی؟ سچ مچ بے حس' کٹھور اور سنگ دل۔

"ایک بندہ فجر کی اذان کے ساتھ اٹھے' خالی پیٹ' خالی معدہ تمہارے ابا کے باڑے میں بھینسوں کی سیوا کرے' انہیں نہلائے دھلائے' پانی پلائے' مشین پر کٹی (باریک باریک کٹا ہوا چارہ) تیار کرے۔ بغیر کجاوے کے گھوڑی پہ بھوسے کی گانٹھ اٹھا کر لائے۔ ایک سو دس مرغیوں کے دانہ پانی' دوا دارو کا خیال رکھے۔ اور پھر اسکول میں بچوں کے ساتھ دماغ بھی کھپائے۔ ان سب کو چھوڑ کے تمہاری بکواس کا زہر بھی حلق میں اتارے اور اماں کی گالیوں کا امرت بھی خاموشی سے پیتا چلا جائے۔ ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ فاختہ! کسی کے صبر اور ضبط کو اتنا بھی نہیں آزماتے۔ یہ نہ ہو' کسی روز وہ سچ مچ اماں کا گھر سے نکالا ہوا ابا کے منانے پر بھی لوٹ کر نہ آئے۔"

عطیہ بھرائی آواز میں بولتی چلی گئی تھی اور لحہ بھر کے لیے فاختہ کی سانس رک گئی تھی' مگر یہ کیفیت صرف کچھ دیر کے لیے تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر سے پہلے کی طرح بے نیاز ہو گئی۔

"تو نہ آئے' میری جوتی کو بھی پروا نہیں۔ وہ معمولی پی ٹی ماسٹر میرے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔"

"عطیہ دہل کر رہ گئی۔ فاختہ کی زبان اور اس کی نوک جس کو چاہے' زخمی کر دیتی اسے پروا نہ ہوتی۔ نانی سچ ہی کہتی تھیں یہ صرف نام کی فاختہ تھی۔ فاختاؤں جیسا کوئی وصف اسے چھو کر نہیں گزرا تھا اور یہ اماں کی طرح ساری دنیا سے بیزار اس کی لاڈلی بہن اپنے نام تک سے الرجک تھی۔

"میرے لیے کوئی ڈھنگ کا نام نہیں ملا تھا اماں آپ کو؟" وہ اکثر اسکول سے آکر ماں کا دامن پکڑ لیتی۔ "ساری سہیلیاں مذاق اڑاتی ہیں میرا۔ میری

دفعہ کیا ناموں کا کال پڑ گیا تھا جو پکڑ کر پرندوں جیسا نام رکھ دیا؟" اس کے شکووں کی کوئی انتہا نہیں تھی اور بجائے اماں اس کے نام پر کوئی مدبرانہ دلیل یا تسلی دیتیں' الٹا اسے اور بھڑکا کر رکھ دیتی تھیں۔

"تمہارے باپ کو یہی نام سوجھا تھا ورنہ میں نے تو تمہارا نام فلک ناز یا شہزادی فرناز رکھنا تھا۔ آخر تمہارا رنگ روپ جو شہزادیوں جیسا تھا مگر کویت سے آگیا تمہارے ابا کا فون۔"

"فاختہ! کیا سو گئی ہو؟" کمرے کی مہیب خاموشی سے گھبرا کر عطیہ نے اس کا کندھا ہلایا۔

"نہیں۔" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی تھی۔

"ایک کام کرو۔" اسے خاموش دیکھ کر عطیہ نے ایک دفعہ پھر لجاجت سے کہا۔

"رات کے اس پہر کون سا کام آپڑا ہے؟" وہ جھنجلائی۔

"ذرا فون کر کے عباس سے پوچھو' وہ اس وقت ہے کہاں۔" اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا تھا۔

"بیلنس نہیں ہے۔" اس نے کورا سا جواب دیا۔

"جب مجھے ضرورت ہوتی ہے تب تم لوگوں کے موبائل بیلنس سے خالی ہو جاتے ہیں۔" وہ بری طرح تپ کر رہ گئی۔

"تم چاہتی ہو' میں کمرے سے نکل جاؤں؟" فاختہ دہاڑ کر بولی۔ عادتاً" اس کا مزاج برہم ہو گیا تھا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" عطیہ گھبرا گئی۔ "آہستہ بولو' نانی اٹھ جائیں گی۔ دوا کھا کر سو رہی ہیں۔" اس نے دبی آواز میں کہا تھا۔

"عطیہ بیٹا! عباس کے لیے دودھ لے آؤ۔" ابا کی آواز آئی

"عباس؟" عطیہ کے ساتھ ساتھ فاختہ بھی چونکی۔

"ابا عباس کو لے آئے۔" خوشی کے مارے عطیہ چھلانگ لگا کر بستر سے نکلی۔ ٹھٹھرا دینے والی ٹھنڈ کا اثر یک لخت زائل ہو گیا تھا۔ وہ پیروں میں چپل پھنساتی نانی کے کان میں "نانی عباس آگیا" کہہ کر جھکتے ہوئے باہر نکل گئی تھی جبکہ نانی بھی گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ

گئیں۔

"اے عطیہ! عباس آگیا کیا؟" خوشی کے مارے نانی کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"جی آگیا ہے عباس۔ اکیس توپوں کی سلامی تیار رکھیے۔ جہاد کرکے جو لوٹا ہے۔ بے ضمیر انسان' اتنی بے عزتی کے بعد پھر چلا آتا ہے۔"

فاختہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے لحاف میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼

نرجس خود کو ہمیشہ بدنصیبی کے چکر اور دائرے میں مقید ہی سمجھتی رہی تھیں۔ یہ ان کی بدنصیبی ہی تھی جو چونگی نمبر تین سے بیاہ کر اس چھوٹے سے گاؤں میں آنا پڑا تھا۔ سسرال لمبی چوڑی نہیں تھی۔ بس ایک سسر اور شوہر تھے یا پھر شوہر کا یتیم بھتیجا تھا' جس کی ماں شوہر کے مرنے کے بعد چھوٹے سے بچے کو دادا اور چچا کے حوالے کرکے خود میکے سدھار گئی تھی۔

دادا کا پولٹری فارم اور بھینسوں کا باڑا تھا۔ دودھ بیچ کر خوب گزر بسر ہو رہی تھی۔ بڑی بہو کے سنگ دلانہ اقدام پر صبر شکر کرنے کے بعد انہوں نے چھوٹے بیٹے ریاض کی شادی اپنی کزن کی بیٹی سے کروی تھی۔ نرجس فطرتاً" بدمزاج' غصیلی اور ناشکری عورت تھی کبھی بھی کسی حال میں خوش نہیں رہتی تھی۔ اپنے ماحول اور حالات سے ہمیشہ نالاں رہنے والی نرجس نے اچھی زندگی اور اچھی رہائش کے لیے شوہر کو مجبور کرکے کویت بھیج دیا تھا۔

ادھر ریاض کو بھی مجبوراً" نرجس کی بات ماننا پڑی تھی' ورنہ وہ بچیوں کو چھوڑ کر ہرگز نہیں جانا چاہتے تھے۔ ویزے کے لیے بھاگ دوڑ میں پولٹری فارم بیچنا پڑا۔ اگرچہ ریاض کے ابا فارم بیچنے کے لیے رضامند نہیں تھے مگر بہو کی خوشنودی کے لیے چپ کر گئے۔ اور یہ چپ ایک رات چپکے سے انہیں گہری نیند سلا گئی۔

دادا کے چلے جانے کے بعد عباس کو اندازہ ہوا تھا کہ اس کا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ بدمزاج چاچی کی مار پیٹ سہتے ہوئے اس کا بچپن گزر گیا تھا۔ تبدیلی تو شاید اس وقت آئی تھی' جب کویت سے چاچا ہمیشہ کے لیے واپس آگئے اور ان کے چلے آنے کے بعد طویل جھڑپوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ چاچا فطرتاً" خاموش طبع انسان تھے۔ چاچی بھڑاس نکالتی رہتیں اور وہ کان دبائے سنتے چلے جاتے۔ جب صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا تو اپنی لاڈلی بھینسوں کی سیوا کرنے چلے جاتے تھے۔ چاچی کی برہمی کچھ اور بڑھ جاتی اور پھر سارا عتاب عباس پر نازل ہوتا۔ وہ ڈنڈا اٹھا کر اسے پیٹ ڈالتی تھیں اور صرف عباس ہی نہیں' میٹرک سے پہلے تک تو اپنی سب سے فرماں بردار بیٹی عطیہ اور سب سے کام چور عاتکہ کی بھی چھترول کرنے سے باز نہیں آتی تھیں۔

نرجس غصے میں اپنی سگی ماں کو بھی باتیں سنانے سے باز نہیں آتی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے صرف دو ہی تارے تھے' ایک عقیل اور دوسری فاختہ۔ شکل و صورت سے لے کر مزاج تک' ہو بہو نرجس کی دوسری کاپی۔ نہ صرف ماں کی لاڈلی تھی بلکہ ماں کی غیر ضروری توجہ' بے جا حمایت کی وجہ سے خاصی منہ پھٹ بھی ہو گئی تھی۔

عطیہ کو جہاں نانی کی آمد سے خوب ڈھارس ہوتی تھی وہاں فاختہ کو نانی کا آنا خوب چبھتا۔ ہوا کچھ یوں کہ چونگی نمبر تین کا رہائشی اس کا اکلوتا ماما اپنے چاروں بیٹوں کو قطر بھیج کر خوب امیر ہو چکا تھا۔ جہاں لوگوں کی رہائش بدل گئی تھی' وہیں رشتے اور رویوں میں بھی فرق نمایاں ہو گیا تھا۔ ماما اور مامی نے آنکھیں ہی ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ ایک دن ابا شہر گئے تو واپسی پر نانی اور عقیل کو بھی لے آئے۔ نانی "اماں" کے گلے لگ کے خوب خوب روئیں جبکہ فاختہ کی اکلوتی خالہ کا یتیم و یسیر بیٹا بھی نانی کے ہمراہ آگیا' جسے دیکھ کر فاختہ نے اول اول ناک بھوں چڑھالیں۔

"کیا سارے یتیموں کا ہم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے۔" اس کا اشارہ عباس اور عقیل کی طرف تھا۔

عباس ہمیشہ کی طرح مسکرا دیا اور عقیل اس کی شکل دیکھنے لگا۔ تب تک اس نے بھی اپنے پنجے تیز نہیں کیے تھے ورنہ اس کی زبان کے آگے بھی گویا خندق تھی۔ بولنے پہ آتا' تو اسے کوئی خاموش کروا نہیں سکتا تھا۔

ابا' نانی اور ان کے نواسے کی' ماما کے گھر نوکروں سے بھی بدتر حالت دیکھ کر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ ابا بہت نرم اور خدا ترس انسان تھے اور نانی سے تو ان کے دوہرے رشتے بنتے تھے' سو نانی کی نازک حالت دیکھتے ہوئے ان سے رہا نہیں گیا تھا اور شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اماں' ابا کے کسی فعل پر دل سے خوش ہوئی تھیں اور عقیل سے تو اماں کی محبت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ خالہ کے انتقال اور خالو جی کی دوسری شادی کے بعد نانی نے ننھے سے عقیل کو جو کلیجے سے لگایا تھا آج تک نانی کے کلیجے سے ہی چمٹا ہوا تھا۔ خالو کے مرنے پر ان کی دوسری بیوی عقیل کو لینے آئی تو اس نے کورا سا جواب دے دیا تھا۔

نانی کے علاوہ اماں کی بے تحاشا محبتیں' ابا کی شفقت اور عطیہ سے ناز اٹھوانے کا جو چسکا پڑ گیا تھا وہ تو چھوٹنے سے رہا۔ اسی لیے وہ یہاں سے کہیں اور جانے کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

عطیہ کبھی کبھی حیران ہوتی تھی' کچھ لوگ سچ مچ قسمت کے دھنی ہوتے ہیں۔ جن پر لوگ اور وقت بھی مہربان رہتا ہے۔ دیکھا جائے تو ایک جیسے حالات کا شکار عقیل اور عباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

عباس ابا پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا سو اس نے ابا کی خواہش کے باوجود زیادہ نہیں پڑھا اور ان کا ڈیرہ سنبھال کر ان کی ذمہ داریوں کو بانٹ لیا۔ عقیل کی بھی شاید یہی سوچ تھی۔ وہ بھی اپنی تعلیم کا بوجھ ان پر ڈالنے سے کترانے لگا تھا۔ حالانکہ اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ابا نے ان دونوں کو بیٹوں سے بڑھ کر چاہا تھا اور ان کے حوالے سے بہت خواب بھی دیکھ رکھے تھے مگر ان دونوں نے تعلیمی سلسلے کو جلد خیرباد کہہ دیا تھا۔

عباس نے انٹر کے بعد ڈیرہ سنبھالا اور ایک مقامی پرائیویٹ اسکول میں پی ٹی ماسٹر کی جگہ خالی دیکھ کر انٹرویو دے آیا۔ عقیل نے ایک سال آوارہ گردی میں ضائع کر دینے کے بعد عطیہ کے مجبور کرنے پر پرائیویٹ بی اے کا امتحان دیا اور یہ اس کی خوش نصیبی تھی' جو اس کے ابا کے ایک دوست کی بھاگ دوڑ سے وہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر بن گیا اور اماں کو گویا عباس کی ذات پر طنز اچھالنے اور کچوکے لگانے کا سنہری موقع مل گیا۔ عقیل کی سرکاری نوکری نے اماں کی گردن میں گویا سریا فٹ کر دیا تھا۔ وہ ابا کو بھی باتیں سنانے سے باز نہیں آتی تھیں۔

"تمہارے بھتیجے سے تو میرا بھانجا قابل نکلا ہے۔ مہینے کے شروع میں مٹھی بھر نوٹ میرے ہاتھوں میں تھما جاتا ہے۔" اماں کی اتراہٹ دیکھ کر ابا نرم نرم مسکراہٹ دبا کر کہتے۔

"یہ میرا اور تمہارا کیا ہوا' دونوں ہمارے بیٹے ہیں اور جتنا نصیب میں رزق لکھا ہے' دونوں باعزت طریقے سے کما رہے ہیں۔"

"عقیل تو صرف نوکری بھگتاتا ہے۔ گھر کا سودا سلف لانے سے لے کر باڑے کے کام دھام تک سب میں عباس کی محنت اور پسینہ شامل ہے۔ ڈرم بھر کے دودھ گھر لاتا ہے چاٹی بھر کے دہی رڑک کے مکھن نکالنے اور ہم تک پہنچانے میں کس کی محنت شامل ہوتی ہے؟" عطیہ بول پڑی۔

"چل' جا۔ دماغ نہ چاٹ میرا۔ فوراً" نمک مرچ لگانے پہنچ جاتی ہے۔" اماں سے یہ سچائی ہضم نہیں ہوتی تھی اور ابا جھگڑا طویل ہونے سے پہلے ہی کان دبا کر نکل جاتے تھے۔ سچ تو یہ تھا' عقیل کی سرکاری نوکری کی اتراہٹ صرف اماں میں ہی نہیں خود عقیل میں بھی نظر آنے لگی تھی۔ پہلے پھر بھی عباس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کر لیا کرتا تھا' اب تو بالکل نواب زادوں کی طرح حکم چلاتا رہتا

اس دن بھی سویرے سویرے عقیل نے سارا گھر سر پہ اٹھا رکھا تھا۔

"میری وردی کہاں ہے؟" وہ برآمدے میں کھڑا چلا

رہا تھا۔ آلو کے پراٹھے بناتی عطیہ نے اور مکھن میں تلے پراٹھے کھاتی نانی نے عقیل کو گھور کے دیکھا تھا۔

"عطیہ! کیا بہری ہو گئی ہو؟ سنائی نہیں دے رہا کیا؟" جواباً اس نے گھور کر عقیل کو دیکھا تھا۔

"کیا تکلیف ہے؟ دیکھ نہیں رہے میں ناشتا بنا رہی ہوں۔"

"اور تم کیا سن نہیں رہی ہو میں کیا راگ الاپ رہا ہوں؟"

"ناشتا نہیں بناؤں گی تو بھوکے مرتے رہنا۔ اس گھر میں میرے علاوہ کوئی بھی چولہے کے قریب نہیں پھٹکتا۔" عطیہ نے غصے سے کہا۔

"میری وردی اٹھا کر لاؤ۔"

"دھو کر استری کر کے الماری میں لٹکا رکھی ہے۔ نکال کر غسل خانے تک نہیں لا سکتے؟" عطیہ نے چڑ کر کہا اور توا کھینچنے لگی۔ اسے عباس کے لیے ناشتا بنانے کی جلدی تھی۔ ابھی وہ سو رہا تھا اور اس کے اٹھنے سے پہلے عطیہ ناشتا تیار کر لینا چاہتی تھی۔

"ابھی عباس آواز لگائے گا تو فوراً اٹھ جاؤ گی۔ تب تمہیں چولہے پہ رکھا جلتا توا' ابلتی چائے بھی یاد نہیں رہے گی۔" عقیل عادتاً طنز کرنے پہ اتر آیا۔

"عباس میرا بھائی ہے۔ اس کے ساتھ مقابلے بازی نہ کیا کرو۔" عطیہ نے انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔ ادھر عقیل کی ہنسی ابل پڑی اور عاتکہ کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

"عباس بھائی ہے تو میں کیا ہوں؟" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ عطیہ کا سر کچھ جھک گیا۔ وہ فرش پر بکھرا آٹا سمیٹنے لگی۔

"بولو نا!" اس نے خشک آٹے کی مٹھی بھر کے اس کے بالوں کی طرف اچھالی۔ کالے بالوں پر سفید آٹا بکھر کر چمکنے لگا۔

"کیا بدتمیزی ہے؟" عطیہ اچھل کر پیچھے ہٹی۔ ہاتھ اوپر کر کے فوراً سر جھاڑنے لگی۔ عاتکہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ پاس ہی پیڑھی پر بیٹھی اپنے لیے آملیٹ بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔

"کٹ مستانہ ہو تو مسخریاں کرتا ہے۔ اٹھ جا ادھر سے۔" نانی نے جوتی پھینکی' جو بے احتیاطی میں عاتکہ کے سر پہ جا لگی اور اس ہری مرچ نے بھاں بھاں کر کے سارا گھر سر پہ اٹھا لیا۔

"نانی کو بھی پولیس میں بھرتی کروا دو عقیل بھائی!" اس نے روتے روتے چمک کر کہا۔ نانی اپنا نشانہ خطا جانے پر قدرے نادم سی بیٹھی تھیں' نواسی کا بھونپو بجتا دیکھ کر بولے بغیر نہ رہ سکیں۔

"نانی کیوں اس عمر میں رشوتیں کھائے؟" انجانے میں نانی نے اپنے نواسے کو چھیڑ دیا تھا۔ ان کے خیال میں پولیس کا کام صرف رشوت لینا ہے' وہ اسی لیے عقیل کی نوکری کے خلاف تھیں اور عباس ان کا منظور نظر تھا۔ اس کی نوکری ہر لحاظ سے صاف ستھری جو تھی۔

"نانی! میں رشوت لیتا ہوں کیا؟" عقیل وردی کے غم سے نکل کر چیخا۔ نانی فوراً گڑبڑا گئی تھیں۔

"میں پلس والوں کو کہہ رہی تھی۔" انہوں نے پلس یعنی پولیس پہ خاصا زور دیا۔

"تو میں پلس سے الگ ہوں؟" عقیل نے ناراضی سے کہا تھا۔ نانی فوراً نواسے کو بچکارنے لگیں۔ ابھی تو وہ ان کے لیے آملے کا مربہ لانے والا تھا۔

"سارے پلس والے کوئی تیرے جیسے نیک تھوڑا ہی ہوتے ہیں پتر! تو دل چھوٹا نہ کر' میں جانتی ہوں۔ میری تربیت تجھے حرام روزی کی طرف کبھی نہیں لے کر جائے گی۔" نانی کے مان بھرے لہجے نے عقیل کا مان بھی بڑھا دیا تھا۔

تب ہی بیرونی سیڑھیاں اتر کر عباس نیچے چلا آیا اور اسے غسل خانے کی طرف بڑھتے دیکھ کر عقیل بھی اٹھ گیا۔

"یار! ذرا گیزر کا بٹن نیچے کر دینا۔" اس کی آنکھوں میں مقابل کو زچ کر دینے والی چمک ابھر آئی۔ عباس نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا' پھر اس کے بکھرے بال دیکھ کر سمجھ گیا کہ گویا صاحب بہادر ابھی غسل فرمانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ عباس کو رکتا دیکھ کر

عطیہ بولے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"عباس کو اسکول سے دیر ہو جائے گی۔ پہلے اسے تیار ہونے دو' تم تو دس بجے سے پہلے گھر سے نہیں نکلتے اور پھر تین گھنٹے تمہارے میک اپ میں گزر جاتے ہیں۔"

"آج مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔" وہ سر کھجاتا الگنی سے تولیہ اتار کے باتھ روم میں گھس گیا تھا جبکہ عباس اس کی اس زبردستی پر دانت کچکچا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

سورج کی سنہری کرنیں کٹ گلاس کی شفاف سطح سے ٹکرا کر اندر گھس آئی تھیں۔ چہرے سے ٹکراتی نرم نرم کرنوں نے اس کی نیند اڑا دی تھی۔ کچھ دیر کسل مندی سے لیٹے رہنے کے بعد وہ جمائی روک کر اٹھ گئی۔ چپل پیروں میں پھنسا کر اس نے اپنا مفلر اٹھایا اور باہر نکل آئی۔

اماں کی طرح اس کی صبح کی آغاز بھی دن چڑھے ہوتا تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر گیلری میں چلی آئی۔ گیلری کے دونوں سروں پر اونچے لوہے جالی کے دروازے لگے تھے۔ اس سے آگے طویل برآمدہ تھا۔ برآمدے کے سامنے گرل لگی تھی۔ جس کے آگے پردے لٹک رہے تھے۔ کمروں کے فرش سے لے کر صحن کے فرش تک سبز اور سفید ماربل لگا تھا۔ چھت پر تین کمرے تھے جن میں سے دو کمرے عباس اور عقیل کے تھے۔ ایک کمرے میں ابا کا پلنگ رکھا ہوا تھا۔ ماربل کی سیڑھیاں صحن میں اترتی تھیں جس سے آگے اونچا سا چبوترا تھا سردیوں میں کچن کا سارا کام عطیہ صحن میں بنے چبوترے پر کرتی تھی۔ دھوپ میں بیٹھ کر گاجریں چھیل چھیل کر حلوے بناتی' مربے بناتی اور نانی کی دعائیں سمیٹتی۔

کویت سے آیا سارا پیسہ اماں نے اس گھر کی تعمیر اور تزئین و آرائش میں کھپا دیا تھا۔ تب ہی تو ان کا گھر دیکھنے والوں کی توجہ لازی اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ گھر کی صفائی ستھرائی کا سہرا عطیہ کو جاتا تھا' جو جی جان سے ایک ایک چیز کو چمکاتی تھی۔ باقی عاتکہ اور فاختہ تو شاید دنیا میں کھانے اور سونے کے لیے آئی تھیں۔

اس نے برآمدے کے ایک کونے میں بنے اسٹائلش سے کچن میں جھانکا۔

"لگتا ہے عقیل اور عباس رات کو گھر نہیں آئے۔ ورنہ ایسی ترتیب نظر آ سکتی تھی بھلا۔" وہ سوچتے ہوئے لوہے کی سفید پالش شدہ جالی کا دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگی تھی' اسی اثنا میں عباس نے اپنی جھونک میں دروازہ کھولا جو سیدھا اس کی ناک پر لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے تھے اور دوسرے ہی لمحے اس کا غصہ چمک اٹھا۔

"آنکھیں کھول کر چلا کرو۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔

"مشورے کا شکریہ۔" وہ کترا کر گزر جانا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔

"میرے کپڑے استری کر دو۔ آج بہت دیر ہو گئی۔ وہ کمینہ واش روم خالی نہیں کر رہا۔" اس کے انداز میں عجلت بھی تھی اور لجاجت بھی۔

"میں تمہاری نوکر لگی ہوں؟" فاختہ ترخ کر بولی۔ "عطیہ کو کہو' وہ شوق سے کر دے گی۔"

"عطیہ ناشتا بنا رہی ہے۔"

"تو عاتکہ سے کہو۔"

"وہ ناشتا کر رہی ہے۔" فاختہ نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ آگے بڑھ گیا۔ کچھ سوچ کر فاختہ پلٹ آئی۔ الماری کھول کر اس نے اپنا سوٹ نکالا اور گیلری میں رکھے استری اسٹینڈ کے پاس آ گئی۔ اور اپنے کپڑے استری کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد عباس آیا۔

"لائٹ چلی جائے گی' مجھے کپڑے استری کرنے دو۔"

"میں کام کر رہی ہوں' نظر نہیں آ رہا کیا؟" فاختہ نے ٹیڑھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ لبوں پر زچ کر دینے والا تبسم پھیلا ہوا تھا۔

"بہت کچھ نظر آ رہا ہے۔ استری فارغ کرو' مجھے دیر

ہو رہی ہے۔" اس نے کندھے پر رکھے کپڑے اسٹینڈ کے اوپر رکھے۔

"میں کپڑے پریس کرلوں۔ تھوڑا صبر کرلو۔" فاختہ نے ٹکا سا جواب دیا۔

"بات صبر کی نہیں۔ صبر تو نجانے کس کس بات پر کرلیتا ہوں' فی الوقت مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ادھر دو استری۔" اس نے زبردستی استری کی ہتھی پر اپنا ہاتھ جمایا۔ فاختہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ تلے دب گیا۔

"کیا بدتمیزی ہے۔ چھوڑو' میرا ہاتھ۔" بے ساختہ چیخی۔

"میں نے تمہارا ہاتھ نہیں پکڑا۔"

عباس نے پلگ نکالا۔ اور استری اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ فاختہ اسے زچ کرتے کرتے اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔ اور دھپ دھپ کرتی باہر نکل آئی۔

چبوترے پر محفل خوب گرم تھی۔ عاتکہ دوسرے پراٹھے پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ سنہرا سنہرا پھولا پھولا آملیٹ پلیٹ میں سجا رکھا تھا۔ پاس ہی میٹھی لسی کا جگ رکھا تھا۔ پراٹھے کے اوپر گول سا سفید مکھن کا پیڑا دیکھ کر اس نے اپنی مکھن سی انگلی کو پیڑے میں گھسایا اور انگلی سے لگا مکھن چاٹنے لگی۔

"خیر سے صبح ہو گئی تمہاری۔" عطیہ کی کسی بات پر پھڑکتا سا جواب دینے کے بعد عقیل اس کے پھولے سے منہ کو دیکھ کر بولا۔

"اس گھر میں کسی کی نیند پوری ہو سکتی ہے کیا؟" فاختہ نے تڑخ کر کہا۔

"عقیل بھائی! آج آپ نے ڈیوٹی پر نہیں جانا؟" ابا کے بہت دفعہ ڈانٹنے پر وہ عقیل کو تو بھائی کہہ لیتی تھی مگر عباس کے لیے اتنا احترام ہرگز نہیں لاسکتی تھی۔

"کیوں نہیں جانا۔ ویسے آج مجھے ایک کیس کی پیشی بھگتنے شہر بھی جانا ہے' تم نے کچھ منگوانا تو نہیں؟" عقیل کسی اور سے کچھ پوچھتا یا نہیں مگر فاختہ سے لازمی ایک لمبی لسٹ پکڑ کر شہر جاتا تھا۔ ویسے بھی اس چینی کی گڑیا سے سب ہی پیار کرتے تھے۔ اور وہ ان سب سے پیار اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی تھی۔ عقیل کے لاڈ پر پھیلتے ہوئے وہ فوراً" ضروری چیزوں کے نام لکھوانے لگی' جن میں کھانے پینے کا سامان زیادہ تھا۔

"اتنا کھاتی ہے تو' مگر ماس نجانے کیوں نہیں چڑھتا۔" نانی رنگ برنگے اسنیکس کے نام سن کر بولے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ عقیل نے نانی کے کان میں سرگوشی کی۔

"یہ ڈائٹنگ کرتی ہے نانی!"

"عباس کے لیے منقے کی کھیر بنا دینا عطیہ! دن بدن کاہش ہوتا جا رہا ہے۔"

"اتنا ہٹا کٹا آپ کو کاہش نظر آتا ہے نانی!" فاختہ اس سفید جھوٹ پر تلملا کر بولی تھی۔ نانی نے اس کے کندھے پر دوہتڑ جڑے۔

"کیسے منہ پھاڑ کے کہہ دیا ہے ہٹا کٹا۔ تیرے منہ میں خاک۔"

"صبح صبح نجانے کس کی شکل دیکھی تھی؟" عقیل نے اسے چھیڑا۔ اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ لوہے کے جنگلے کے پیچھے عباس کھڑا تھا۔ اس پہ نظر پڑی تو ہٹ گیا۔ تولیہ کندھوں پر پھیلائے شاید دھوپ سینک رہا تھا۔ اس نے فوراً" نظروں کا رخ موڑا۔

"بتاؤ نا کس منحوس کی شکل دیکھی تھی؟" عقیل نے پھر چرکا لگایا۔ وہ جنگلے کے پیچھے کھڑے عباس کو دیکھ چکا تھا۔ فاختہ جز بز سی ہو گئی۔

"کٹھار (اناج کے گودام) سے ایک بوری گندم نکال کر چھت پر رکھ دی ہے۔ صاف کر دینا تو آٹا پسوا لاؤں گا۔" عباس نے عطیہ کو مخاطب کیا۔

"ناشتا دوں؟" عطیہ نے سر ہلا کر جھٹ پٹ ٹرے سجائی۔ عاتکہ لپک کے بالائی کی کٹوری اٹھا لائی۔ سادہ روٹی' بالائی اور شہد' عباس کا پسندیدہ ناشتا تیار تھا۔ عطیہ کی پھرتیاں دیکھ کر عقیل کا منہ بن گیا۔ ویسے بھی اسے توجہ بٹی ہوئی پسند نہیں تھی۔

"تم آج دیر سے جاؤ گے؟" عطیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ارادہ تو نہیں تھا مگر۔۔۔" اس نے سر جھکائے عطیہ کی بات کا جواب دیا تھا اور پھر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ناشتے کے بعد عقیل اور عباس نکل گئے تھے۔ اماں بھی اٹھ کر آگئی تھیں۔ ان کی طبیعت کچھ خراب لگتی تھی۔ عطیہ نے اماں کو چائے دی تو فاختہ بھی اپنا مختصر سا ناشتا اٹھا کر نانی کے پاس آ بیٹھی۔

"برتن دھولو۔" اسے ناشتے سے فارغ ہوتے دیکھ کر عاتکہ نے کہا۔

"مجھ سے نہیں دھلتے برتن۔" وہ کاہلی سے بولی۔ طشتری میں عطیہ کتان (السی) ڈالے اٹھا لائی۔

"نانی! السی کو دھوپ لگ گئی ہے۔ اب اس میں سے کنکر اٹھانے ہیں۔" وہ چائنتی پہ ٹکتے ہوئے بولی۔

"یہ اس ویلی (فارغ) نکمی کو دے۔ اور کچھ نہیں' السی کو صاف کر دے۔" نانی نے خود سے چپکی فاختہ کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"اتنا مشکل کام نہیں ہوتا مجھ سے۔" اس نے بدک کر کہا۔

"تو کوئی آسان کام ہی کرلیا کرو۔" عاتکہ نے چمک کر جواب دیا۔

نانی نے بڑے دلار سے کہا مگر فاختہ کو کرنٹ لگ گیا۔

"اللہ نانی! میرے تو ہاتھ دکھ جائیں گے۔ کپڑے تو میں دھو ہی نہیں سکتی۔" اس نے فوراً" کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔ عقیل اور عباس کی بھاری پینٹس' شرٹس' جرسیاں' سویٹر اور گرم چادریں آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی تھیں۔ کپڑوں سے ابلتی مشین کے تصور نے ہی اسے ہراساں کر دیا تھا۔

"تو پھر گندم ہی بھون کے پیس دو۔" نانی نے ایک اور کام اس کے سامنے رکھا تھا۔ السی کے لیے گندم کو بھی آج ہی بھون کے پیسنا تھا۔

"رہنے دیں اماں! فاختہ کو ان کاموں کی عادت کہاں ہے۔ عطیہ خود ہی کرلے گی۔" نرجس کی مداخلت سے نانی کلس کر رہ گئیں۔ ان کے سر پہ گویا کنک کا ٹکڑا جا لگا۔

"اس پھلاں رانی کو تم نے اگلے گھر نہیں بھیجنا؟ اپنے کلیجے سے چمٹائے رکھنا ہے کیا؟"

"ادھر ہی رہے گی اماں یہ۔ کہیں نہیں بھیجوں گی اسے۔ میری بیٹی اتنی نازک سی لاڈلی سی تو ہے۔ یہ کہاں بھرے پرے سسرال میں رہ سکتی ہے۔ میرا کون سا بیٹا ہے کوئی۔" نرجس نے نرم نرم نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تو وہ بہت کچھ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگیں۔ گویا انہیں نرجس کی خواہش پہ کوئی اعتراض نہیں تھا مگر ان کے اردگرد بیٹھے وہ تین نفوس ایکدم دھک سے رہ گئے تھے۔

"عقیل یا عباس؟" عاتکہ کے ساتھ ساتھ فاختہ کی سوچ بھی ٹکرا گئی تھی۔ تینوں ایک دوسرے کی طرف ٹکر ٹکر دیکھنے لگیں۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"اماں کی لاڈلی کا' اماں کے لاڈلے عقیل کے ساتھ ہی رشتہ ہوگا۔ عباس کو تو وہ کسی گنتی میں شمار نہیں کرتیں۔۔۔" تینوں کی سوچ بھی ایک ہی نکتے پر ٹھہر گئی تھی۔ عاتکہ حیران تھی' فاختہ عجیب سی سرخوشی کی کیفیت میں مبتلا تھی اور عطیہ ذرا گم صم اور ششدر تھی۔

☼ ☼ ☼

سنہری دھوپ کی کرنیں ماربل کے سفید فرش سے ٹکرائیں تو فرش کی چکنی شفاف سطح کچھ اور چمک گئی تھی۔ دیوار کے پار لگے درختوں کے کچھ پتے چھت پر آگرے تھے۔ عطیہ نے جھاڑو پکڑ کر پوری چھت کی گندگی اور گرد سمیٹ ڈالی تھی۔ اب گندم کے دانوں کا ڈھیر لگائے صاف کر رہی تھی۔ عاتکہ قریب ہی ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کرنے میں مصروف تھی۔ اسے اپنے نئے سوٹ کے لیے منفرد سے ڈیزائن چاہیے تھے۔ فاختہ چارپائی پہ اوندھی لیٹی موبائل پہ اپنی سہیلی سے چیٹ کرنے میں مصروف تھی۔ قریب ہی نانی کونڈی میں کنیا (خاردار بوٹی) کو کوٹ رہی تھیں۔ انہیں اپنے گھٹنوں کے درد کے لیے کوئی دوا

بنائی تھی۔

"فاختی! اے فاختی!" نانی نے پاس پڑی کنکس سے بھری طشتری فاختہ کی سمت بڑھائی۔ اس نے موبائل اسکرین سے نظریں ہٹا کر نانی کی طرف دیکھا تھا اور پھر اشارے سے پوچھا۔

"کیا ہے نانی!"

"یہ کنکی کو کوٹ ذرا۔" وہ ہاتھ چلا چلا کے ہانپ رہی تھیں۔ فاختہ نے آنکھیں پھیلا کر اس کالی گرہ دار جڑ کو دیکھا تھا اور پھر مرے مرے لہجے میں بولی۔

"نانی! یہ تو بہت سخت ہے۔ اس پتھر سی جڑ کو کیسے کوٹوں؟"

"جیسے میں نے یہ سب پیس کے پیالہ بھرا ہے۔ چل اٹھ بھی جا' ابھی کپور کچری (خوشبودار گھاس) کو بھی پیسنا ہے۔" نانی نے پیار سے اسے پچکارا تھا۔ فاختہ کی آنکھیں مارے صدمے سے کچھ اور پھیل گئیں۔

"نانی! یہ کاہو (بیج) اور کائی پھل (درختوں کی چھال) کے مکسچر سے اگر کوئی زہریلی دوا بن گئی۔ مر مرا گئیں آپ۔ اور میں ہر گز بھی آپ کو مرنے نہیں دینا چاہتی۔ سو میری طرف سے صاف معذرت قبول کرلیں۔" اس نے بہت سوچ سمجھ کے جان چھڑوانے کے لیے بہت اچھا جواز ڈھونڈ لیا تھا۔

"شاباش فاختی! شرم سے ڈوب مرو۔ بوڑھی نانی اپنے لیے دوا بنا رہی ہیں اور حکیم سلمان کے اعلیٰ نادر دیسی نسخے کا استعمال کررہی ہیں۔ اور تم صرف "مشقت" سے بچنے کے لیے بہانے بازی سے کام لے رہی ہو۔ تف ہے تمہارے اس بے کار وجود پر۔ جسے شوکیس میں سجا دینا چاہیے۔" عاتکہ کے طنزیہ لفظوں نے فاختہ کو ڈنک سا مارا تھا۔ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھی۔

"زبان سنبھال کے بات کرو۔ بیکار ہوگی تم خود' اور نہ اتنا جلا کرو' پہلے ہی رنگت ماشاء اللہ خاصی سفید ہے۔ جل جل کے کچھ اور سفید ہوجائے گی۔ یہ کپڑوں کی ڈیزائننگ کو گولی مارو اور کسی کریم یا دیسی ٹوٹکے کا استعمال کرو' شاید رنگت کچھ نکھر جائے۔ اور جو تم سل کی طرح اماں کے سینے پہ بوجھ بنی بیٹھی ہو کسی کھونٹے سے بندھ جاؤ۔" فاختہ بھی دو بدو حساب چکتا کرکے دوبارہ تکیے پہ سر ڈالے لیٹ گئی تھی۔

"ہمت ہے یا لگاؤں دو ہاتھ۔" انہوں نے سچ مچ "ہاتھ" لگانے کی تیاری کرلی تھی۔ فاختہ اسپرنگ کی طرح سے اچھل کر فرش پہ آبیٹھی۔

"لائیے ادھر۔" وہ ان کی ہدایات کے مطابق دوا پیسنے میں ان کی مدد کروانے لگی۔ مگر پتھریلی جڑوں پر کوئی بھی ضرب ٹھیک سے نہیں پڑ رہی تھی۔ لیکن نانی کو ذرا بھی ترس نہیں آیا۔

"شاباش! اگلے گھر بھی جانا ہے۔ لڑکیوں کو سارے کام آنے چاہئیں۔" نانی خوشی خوشی ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ اگلے گھر کے ڈراوے بھی دیتی رہیں۔

"میں نے تو اسی گھر میں رہنا ہے نانی!" فاختہ کے لبوں پر جواب بس مچلتا ہی رہ گیا تھا۔ وہ کن اکھیوں سے نانی کو دیکھنے لگی جو اس کے بہت قریب ہی بیٹھی تھیں۔ اب وہ اتنے قریب سے تھپڑ کھانے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

"چل اٹھ' ہانڈی چڑھا۔ ابھی عباس اور عقیل آجائیں گے۔" نانی نے عاتکہ کو چارپائی پہ پھیلا دیکھ کر گھر کا۔

"آج فاختی نے ہانڈی پکانا ہے۔ میری تو طبیعت ٹھیک نہیں۔" وہ صاف بہانہ کرکے دوپٹہ منہ پر لپیٹ کر لیٹ گئی تھی۔ فاختہ نے بغیر برا مانے گویا ان سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

"میں سالن پکالوں گی نانی! ڈونٹ وری" فاختہ کے جواب نے عطیہ کو حیران کردیا تھا وہ کچھ مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"خیر تو ہے؟ آج طبیعت تو ٹھیک ہے جناب کی۔" عاتکہ نے بھی آنکھیں منہ پھاڑ کے حیرانی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ نانی کی نظر بچا کر گری پھانکنے لگی تھی۔

"اب میں ایسی بھی پھوہڑ نہیں۔" وہ برا مان گئی تھی۔

"نہ بیٹی! چولہا چوکی کون سا پہاڑ کاٹنے کے برابر ہے۔ ہم تو کچے صحنوں میں کھیگل (بھوسے اور مٹی کا پلستر) بھی خود اپنے ہاتھوں سے پھیرا کرتے تھے۔ تمہارے باوا نے تو صحن میں سارا پتھر لگوا دیا چھت تک یہ ٹائلیں سجا دیں۔ اب تو اتنی سہولتیں اور آسانیاں ہی بہت ہیں۔ بجلی کی ہانڈیاں (اوون) گیس کے تندور، ٹھنڈے پانی کے لیے فریج، کمرہ ٹھنڈا کرنے کے مشین... ہمارے زمانے کتنے سادہ سے تھے۔ سارا وقت یہ برابر کے احاطے میں درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے وقت گزر جاتا۔ آس پڑوس سے ساری سہیلیاں آجاتی تھیں پھر مل بیٹھ کر تندور تپا کے روٹیاں لگائی جاتیں، نوراں لسی اٹھا لاتی، اچار، چٹنی اور تندور کی روٹیاں..."

نانی کو ماضی کے بھولے بسرے منظر یاد آنے لگے۔ چھت پہ آنے کے بعد ان کی یادیں بھی تازہ ہو جاتی تھیں۔ یہ برابر والا احاطہ نانی کے نام تھا۔ برسوں پہلے وہ سب یہ جگہ چھوڑ کر چونگی نمبر تین میں اپنا گھر بنانے کے بعد گاؤں چھوڑ گئے تھے۔ مگر وقت نے ایک دفعہ پھر انہیں اپنے "اصل" کی طرف لوٹا دیا تھا۔ اور وہ یہاں آکر ایک دفعہ پھر سے جی اٹھی تھیں۔

"نانی! آج آپ کو تندوری روٹی کھلاؤں گی۔" عطیہ نے نانی کے دل کی خواہش کو زبان دی تو وہ فوراً" ہی نہال ہو اٹھیں۔

"جیتی رہو میری بیٹی!"

"اللہ! جلدی نصیب کھولے اس کے نانی! یہ ٹکڑا بھی لگائیں۔" فاختہ کی زبان پر کھجلی ہونے لگی تھی اور ابھی نانی کے منہ میں جواب مچل ہی رہا تھا جب عباس گلا کھنکار کے سیڑھیاں چڑھ آیا۔ وہ اپنے آنے کی پیشگی اطلاع لازمی دیا کرتا تھا تاکہ گھر کی معزز خواتین سنبھل کر دوپٹے سیدھے کرلیں۔ نانی کو عباس کی یہ عادت بھی بہت پسند تھی بلکہ نانی کو تو عباس کی ہر عادت پسند تھی۔ سچ تو یہ تھا وہ عقیل سے بھی زیادہ نانی کا لاڈلا ہو چکا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں ضروری سامان رکھ کر واپس صحن میں چلا آیا۔ ایسا تو کم ہی ہوتا تھا وہ ان کے درمیان آکے بیٹھ جاتا۔ اس کی اپنی مصروفیات ہی بے حساب تھیں۔ اب بھی شاید کسی مستری سے فون پہ بات کر رہا تھا۔ نانی سے رہا نہ گیا تو پوچھنے لگیں۔ ادھر جنگلی فاختہ اپنی چونچ تیز کرنے لگی تھی۔

"کچھ نیا کرنے کا ارادہ ہے بیٹا!" فاختہ کے بولنے سے پہلے ہی نانی نے سوال داغ دیا۔

"جی نانی!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "پچھلے سال جو پلاٹ خریدا تھا، بستی والوں نے اسے کھود کھود کے جوہڑ بنا دیا ہے۔ اب برسات کے دنوں میں سارا پانی ادھر اکٹھا ہو جاتا ہے۔ سوکھنے کے بعد جگہ جگہ کائی جم جاتی ہے۔ ادھر میں نے مٹی ڈلوا کے سبزی لگوا دی ہے۔"

"ارے یہ تو بڑا اچھا کام کیا ہے۔ تازہ سبزی کھانے کو ملے گی۔" نانی بے ساختہ خوش ہو گئیں۔

"ہائے... میں بھی دیکھنے جاؤں گی۔ ابا نے تو صحن میں ذرا خالی جگہ نہیں چھوڑی، ورنہ میں موسم کی ہر سبزی اگاتی۔" عطیہ خوشی سے نہال ہو گئی۔

"تو اب شوق پورے کرلینا۔" فاختہ نے طنزیہ کہا۔

"میں ابھی ہی سوچ رہا تھا تم اپنی چونچ جنگل میں بھول آئی ہو۔" عباس بغیر اس کی طرف دیکھے مسکرا کر بولا۔

"بس سوچتے ہی رہنا! اسکول کی چار دیواری میں بیٹھ کر۔ دنیا ستاروں پہ پہنچ گئی ہے" فاختہ بھی چوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

"مجھے ستاروں پہ جانے کا شوق بھی نہیں۔ ستارے آل ریڈی میری ہتھیلی پہ سجے ہیں۔" اس کے لبوں پر زچ کر دینے والی مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔ عطیہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

"فاختی! چائے بنا لاؤ..."

"پھر تو اگلے چار دن تک چائے ملنا مشکل ہے۔" عباس نے تاسف سے کہا۔

"تمہیں تو میں دودھ میں نیلا تھوتھا ملا کر دوں گی۔" اس نے آواز ذرا دھیمی کرلی تھی تاکہ نانی تک اس کی

بکواس نہ پہنچ جائے۔

"ستم گر سے اور بھلا امید بھی کیا کی جا سکتی ہے۔" عباس نے آہ بھری۔

"ستم گر بھلا کسے کہا ہے؟" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

"میں چلا جاؤں کیا؟ چائے تو نہیں ملے گی آج۔"

"فاختی سے کہو نا..." عاتکہ نے جان کر اسے اکسایا۔

"ادھر سے تو زہر ہی ملے گا۔" وہ ٹھنڈی آہ بھر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ نانی سے اس کا سوکھے منہ اٹھنا دیکھا نہیں گیا فوراً" ہی نواسیوں پر چڑھ دوڑیں۔

"زمانے بھر کی نکمیاں بیٹھی ہیں یہاں۔ اٹھتی ہو یا لگاؤں دو ہاتھ؟"

"نانی! آج تو فاختی چائے بنائے گی۔" عاتکہ بھی ڈھیٹ بن کر بولی۔ عباس جو اسے منع کرنا چاہتا تھا کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ ادھر فاختہ بھی دھپ دھپ کرتی اٹھ کر نیچے چلی گئی تھی۔ غصہ تو بلا کا آیا تھا مگر نانی کے سامنے کچھ پھوٹ نہیں سکتی تھی۔ اب سارا غصہ چائے پہ اتار کر حلوہ پلیٹ میں نکالے جب اوپر آئی تو نانی نے خفگی سے کہا۔

"عباس سوجی کا حلوہ نہیں کھاتا۔"

"میں تو کھاتی ہوں نا..." اس نے سب کے ہاتھ میں احتیاط سے چائے کے کپ پکڑائے تھے۔ آخر میں عباس کی سمت پیالی بڑھائی۔ عطیہ نے نظر بچا کر اپنا کپ عباس کو تھمایا اور اس کا کپ خود اٹھا لیا۔ وہ فاختہ سے اچھی طرح سے واقف تھی اور اس کے خدشے بے بنیاد بھی نہیں تھے۔ پہلا گھونٹ بھرنے پہ اس کا منہ کڑواہٹ سے بھر گیا تھا۔ اس نے بے دلی سے کپ پیڑھی کے پیچھے کھسکا دیا۔

"چائے پسند آئی کسی کو؟" اب فاختہ فردا" فردا" سب سے تعریفیں بٹورنے پہ تلی تھی۔ لبوں پہ مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ عباس اس مسکراہٹ کے پس منظر سے خوب واقف تھا۔ عطیہ کے کپ بدلنے کو بھی دیکھ چکا تھا۔ سو بڑے اطمینان سے بولا۔

"تم سے اچھی چائے کوئی بنا ہی نہیں سکتا... میرے بس میں ہوتا تو تمہیں کوئی ایوارڈ ضرور دیتا... بہر حال اتنی مزے کی چائے پلانے کا شکریہ۔" اس نے تعریف اوپری دل سے نہیں کی تھی۔ چائے واقعی خوشبودار اور بہت اچھی بنائی گئی تھی مگر فاختہ کے حلق میں یہ تعریف پھنس گئی تھی۔

"تمہیں بھی چائے پسند آئی ہے؟" اس نے ہونق پن سے ایک الٹا سیدھا سوال جڑا۔ عباس جو سیڑھیاں اتر رہا تھا ایکدم گردن موڑ کے اسے دیکھنے لگا۔

"ظاہر ہے، تم نے چائے بنائی ہی بہت اچھی تھی۔" اس نے کمال سنجیدگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"تم صرف زبان کی کڑوی ہو۔ ہاتھ میں تمہارے بہت مٹھاس ہے۔"

وہ مزے سے بولتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا تھا جبکہ فاختہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"تم بیٹیوں میں ہمیشہ تفریق کرتی ہو۔ اور مجھے تم سے ہمیشہ یہی گلہ رہا ہے۔"

نانی سامنے رکھے کپڑوں کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھیں اور یہ ان کے غصے کا بڑا معصوم سا اظہار ہوا کرتا تھا۔ جب غصہ آتا تو پاس رکھی ایک ایک چیز کی شامت آجاتی تھی۔ حالانکہ ابھی یہ سارے سوٹ وہ ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھ رہی تھیں اور انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق تینوں نواسیوں کے لیے ایک ایک سوٹ منتخب کیا تھا۔ یعنی ہر کلر اپنی پسند کے مطابق چنا۔

"گلابی عاتکہ کے لیے، فیروزی فاختہ کے لیے اور کاہی عطیہ کے لیے۔" انہوں نے پیار سے ایک دفعہ پھر ایک ایک سوٹ کو دیکھا۔ یہ کپڑے رات کو عقیل لے کر آیا تھا۔ تینوں سوٹ نفیس اور قیمتی تھے۔ نانی اور نواسیوں کو بے حد پسند آئے تھے۔ مگر تقسیم کے وقت نانی نے رنگ اپنی مرضی سے تینوں کے لیے پسند کیے تھے جس پر ان تینوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا مگر اماں نے ساری ترتیب اچانک آکر الٹ دی تھی۔

"گلابی رنگ عطیہ پہ سجتا ہے' اس کی رنگت گندمی ہے۔ عاتکہ ہمیشہ فیروزی رنگ پسند کرتی ہے۔ ویسے بھی ہلکا رنگ ہے' ہر ایک پہ سج جاتا ہے۔ اور کاہی رنگ تو بنا ہی فاختی کے لیے ہے۔ اس کی رنگت اجلی ہے۔ گہرے رنگ اسے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ سیاہی مائل ہلکا سبز رنگ اس کی گلابی رنگت کو اور نکھار دیتا ہے۔" اماں نے سوٹ اٹھا کر ان کے ہاتھ میں تھمائے تو نانی بولے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔

"تم ہر دفعہ بچیوں کے دل دکھاتی ہو۔" نانی نے عاتکہ اور عطیہ کا پھیکا پڑتا رنگ دیکھ کر اماں کو گھرکا۔ "شروع سے دیکھتی آئی ہوں تمہاری ناانصافیاں۔ عاتکہ کو گلابی رنگ پسند تھا' وہ تم نے عطیہ کو پکڑا دیا ہے اور عطیہ کو کاہی پسند تھا وہ تم نے فاختہ کو تھما دیا ہے۔" نانی نے عینک ناک پر جما کر بیٹی کو گھورا تھا۔

"اس میں ناانصافی کی کیا بات ہوئی۔" اماں جز بز سی ہو کر بولیں۔ "جو چیز ان کے لیے مناسب تھی بس دے دی۔ بات ختم۔"

"بات ختم کیوں؟" نانی چمک کر بولیں۔ "ابھی عقیل کو بلاؤ اور وہ خود آ کر بہنوں کے لیے جو سوٹ لایا ہے' اپنے ہاتھ سے دے۔" نانی نے گویا فیصلہ سنا دیا تھا۔ عطیہ نے بات بڑھتی دیکھ کر بڑے سبھاؤ سے مداخلت کی۔

"نانی! اماں کی پسند ہماری پسند ہے۔ رنگ بھی برے نہیں۔"

"عطیہ! تم چپ کرو' میں نے جو کہا ہے وہ اصول کے عین مطابق ہے۔" نانی نے میٹھے لہجے میں اپنی فرماں بردار نواسی کو دیکھ کر کہا۔ "اپنا حق ہرگز نہیں چھوڑتے۔" ان کا انداز بڑا ناصحانہ تھا۔ ادھر مذاکرات طویل ہوتے دیکھ کر فاختہ سے رہا نہیں گیا تھا۔ اسی لیے کچھ غصے بھرے لہجے میں بولی۔

"میری پسند تو کسی نے نہیں پوچھی' نہ کسی کو میرا خیال آیا ہے۔ پچھلی دفعہ بھی نانی نے میرے لیے زرد' شوخ رنگ کا سوئٹر عاتکہ کو پکڑا دیا تھا۔"

"یہ اونی شال اور جو سرمہ ویلویٹ کا مفلر لپیٹا ہوا ہے' یہ تم نے بھاگ کے اٹھا لیا تھا۔ اب سارا کچھ تمہاری پسند کا تو نہیں ملتا تمہیں۔" نانی بھی چمک کر بولی تھیں۔ فاختہ اس منہ توڑ جواب پر بڑبڑا کے رہ گئی پھر پاؤں پٹختی باہر نکل آئی۔ موڈ کا ستیاناس ہو چکا تھا۔ وہ پچھلے صحن کی طرف آئی تو سامنے عباس کو موٹر کے ساتھ مصروف دیکھ کر مزاج اور بھی برہم ہو گیا۔ صبح وہ اسے سہیلی کے گھر جانے پر جھاڑ کر گیا تھا سو موڈ کا بگڑنا لازم تھا۔ اسے الٹے قدموں واپس پلٹتا دیکھ کر عباس نے ہلکی آواز میں اسے روکا تھا۔

"فاختی! ٹول باکس میں سے اسکرو ڈرائیور تو لا دو۔" وہ سولڈر اٹھائے جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے موٹر کے پائپ کو ٹانکے لگا رہا تھا۔ فاختی نے سن کر بھی ان سنی کا تاثر دیا تھا اور وہیں رکھے موڑھے پر بیٹھ کر کینو کھانے لگی۔ کینو بھی ٹوکری میں پڑے مل گئے تھے یقیناً نانی نے اپنے لیے تازہ منگوا کر رکھے تھے۔

"سنا نہیں تم نے؟" اب کہ عباس نے گردن موڑ کر ذرا اونچی آواز میں کہا تھا۔

"نہیں سنا۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔ وہ کینو چھیل چھیل کے کھاتی رہی۔

"اپنے کانوں کی صفائی کراؤ' کہو تو یہ کام میں کروا دیتا ہوں۔"

عباس کو خود ہی اٹھ کے جانا پڑا تھا۔ وہ واپس آیا تو یہ ابھی تک سابقہ مشغلے میں مصروف تھی۔

"آج تو لگتا ہے بارش ہو گی۔" فاختہ نے آسمان پر بکھرتے بادلوں کو دیکھ کر ایسے ہی بات بڑھانے کی غرض سے کہا تھا گویا یہ جتانا مقصود تھا کہ اس نے عباس کی کوئی بات سرے سے سنی ہی نہیں۔

"کیا فائدہ بارش کے برسنے کا۔ یہ بارش کون سا دلوں کے میل کچیل دھوتی ہے۔" عباس نے زیر لب بڑبڑا کے کہا تھا۔ اب فاختہ کی سماعتیں تو ادھر ہی لگی تھیں' پھر بھلا کیسے نہ سن پاتی۔

عباس نے فارغ ہو کر اپنے میلے ہاتھ صابن سے رگڑ رگڑ کر دھوئے تھے۔ پھر واپس آ کر سارا سامان ٹول

باکس میں سمیٹ کر رکھا' تب ہی اس کے چہرے پر آسمان سے ایک بوند گری۔

"لو آ گئی بارش۔"

"ابھی کہاں۔" فاختہ نے منہ بنا کر کہا۔ "ویسے یہ دل کے میل کی بات تم نے کس کے لیے کہی ہے؟" اس کا دھیان بارش میں نہیں اس کی بات میں اٹکا ہوا تھا۔

"تمہارے لیے نہیں کہی۔"

"تو پھر؟" اس نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔ "اماں کے لیے؟" فاختہ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا' عباس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"میری توبہ! جو میں بھڑوں کے چھتے کو ہاتھ لگاؤں۔" عباس کے لفظ ابھی منہ میں ہی دبے تھے جب اماں جالی کا دروازہ کھولے باہر نکل آئیں۔

"اماں! دیکھ لیں' عباس آپ کو بھڑوں کا چھتہ کہہ رہا ہے۔" اس نے چیخ کر اماں کو بتایا تھا اور اماں نے اپنا مشہور زمانہ ڈنڈا اٹھاتے لمحہ بھی نہیں لگایا تھا مگر یہ عباس کی خوش نصیبی تھی جو لمحوں میں اماں کو گھما کر بھاگ نکلا۔

"چاچی! آپ کا نشانہ اب ٹھیک نہیں رہا۔" جاتے جاتے بھی وہ انہیں چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

"تو آ تو سہی' روٹی پانی بند ہے تیرا۔ نوراں سے کون کون سے گلے کرتا رہا ہے تو۔ میں تجھے کچا پکا کھلاتی ہوں؟"

اماں کا ازلی جلال عود آیا تھا۔ ماسی نوراں بلا کی کٹنی خاتون تھیں۔ لگائی بجھائی میں ماہر' اماں کے کان بھرنے میں پیش پیش رہتی تھیں اور ان کا بیٹا تنویر تو ایک نمبر کا کمینہ تھا۔ اس کی آگ لگانے والی عادت نے عقیل اور عباس کو ایک دوسرے سے خاصا دور کر دیا تھا ورنہ ایک زمانے میں ان دونوں کی آپس میں خوب گاڑھی چھنتی تھی مگر جب سے کالج چھوٹے تھے اور عقیل کو ڈھنگ کی نوکری ملی تھی تب سے وہ عباس سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔

"رہنے دیں چاچی! آپ کے گلے کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے تو بھلے وقتوں میں بھی آپ کو چولہے کے قریب جاتے نہیں دیکھا۔ پہلے اللہ نے نانی کو فرشتہ بنا کر بھیج دیا تھا پھر عطیہ نے چولہا سنبھال لیا۔ میں نے آپ کے گلے کیا کرنے ہیں۔" وہ مسکراتا ہوا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا تھا جبکہ اماں کو جلنے کلسنے کا موقع مل گیا۔

"دیکھ لیا اماں آپ نے' کیسے زبان چلتی ہے اس کی۔ ذرا لحاظ مروت نہیں۔ اتنی باتیں سنا گیا ہے مجھے۔" اماں نے ہمدردیاں بٹورنے کے لیے نانی کے کمرے کی طرف رخ کیا تھا۔

"اب کیا ہوا ہے؟" نانی پرانی کترنوں اور دھجیوں کا تھیلا کھولے بیٹھی تھیں۔ اس مصروفیت اور انہماک میں خلل انہیں بھایا نہیں۔

"عباس کی بکواس سنی ہے آپ نے؟" اماں نے خود پر رنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

"وہ عباس کا بچہ زبان چلا کر گیا ہے میرے سامنے۔ آج تو رات کو گیٹ نہیں کھولوں گی میں۔" اماں نے اپنے خطرناک ارادوں کے متعلق نانی کو خبردار کیا تو وہ کترنوں کے غم سے نکل کر چونک اٹھیں۔

"تیرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ کیوں گیٹ نہیں کھولے گی؟ یہ اس کے باپ دادا کا گھر ہے۔ میں نے تجھے جہیز میں نہیں دیا تھا۔" نانی کے کڑک دار لہجے نے اماں کو گڑبڑانے پر مجبور کر دیا۔

"گھر بنوایا تو ہم نے ہے۔ میرے شوہر کی کمائی سے بنا ہے۔ اس کے باپ کا تو صرف ایک کچا کوٹھا تھا۔" اماں نے سنبھل کر جواب دیا تھا۔ ماتھے پر کئی ایک بل پڑ گئے تھے۔

"تمہارا شوہر اس کا سگا چاچا ہے۔ خبردار! جو بکواس کی تو۔" نانی نے اماں کو بری طرح سے جھڑک دیا تھا۔ فاختہ سے اماں کی پتلی حالت دیکھی نہیں گئی' تڑپ کر بولی۔

"نانی! اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ کیوں اس کی بے جا حمایت کرتی ہیں؟"

"تو چپ کر کے اپنا کام کر' کچھ کھا لے یا سو جا۔ ماں

نے صرف دو کام ہی تو سکھائے ہیں۔" نانی کا غصہ ابل پڑا تھا۔ "ہزار مرتبہ سمجھایا ہے جب بڑے بول رہے ہوں تو بکواس نہیں کرتے بیچ میں۔"

"آپ اماں کی انسلٹ نہ کیا کریں۔" فاختہ جلبلا کر بولی۔

"لڑکی! زبان سنبھال کے بات کر اور میرے ساتھ انگریزی بولنے کی ضرورت نہیں۔" نانی کا انداز وارننگ دینے والا تھا۔ وہ پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔ منہ سوجا ہوا تھا۔ آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔ تب ہی سامنے سے آتا عقیل اسے دکھائی نہیں دیا تھا۔ زور کا تصادم ہوا۔ عقیل کے ہاتھ سے شاپر گر پڑے۔

"کیا ہوا ہے؟" عقیل نے حیرانی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ کترا کر گزر جانا چاہتی تھی جب عقیل نے ہاتھ آگے کر کے اسے روک لیا۔

"خالہ نے کچھ کہا ہے؟" وہ نرمی سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ گویا اس کی خفگی اور غصے کی وجہ جاننا چاہ رہا تھا۔

"نہیں۔"

"تو پھر نانی نے کچھ بولا ہے؟"

"ہاں۔" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

"اف فاختی! تم بھی نا۔۔۔" عقیل جھنجلا کر رہ گیا تھا۔ پھر آگے بڑھتی فاختہ کا ہاتھ پکڑ کے بولا۔ "اچھا، غصہ تھوک کر ادھر آؤ، میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" فاختہ نے حیرت سے پوچھا۔

"چھت پہ۔" اس نے اونچی آواز میں عطیہ اور عاتکہ کو بلایا۔ وہ دونوں بھی اپنے اپنے حجروں سے باہر نکل آئیں۔ عقیل نے عطیہ کے ہاتھ میں شاپر پکڑائے۔

"یہ پلیٹوں میں نکال کر لے آؤ۔"

"کیا لائے ہو؟" فاختہ نے بے تابی سے پوچھا تھا۔ کچھ دیر پہلے والی ناراضی بھلائے وہ متجسس سی شاپر دیکھنے لگی۔

"سموسے، پکوڑے، جلیبی۔۔۔" وہ بولتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ عاتکہ اور فاختہ بھی اس کے پیچھے بھاگی تھیں۔

"عقیل بھائی! رکنا ذرا۔" وہ سب سے اوپر پہنچا تو فاختہ نے چیخ کر اسے آگے جانے سے روکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اس کا ہاتھ پکڑے سادگی سے کہہ رہی تھی۔

"عقیل بھائی! آپ بہت اچھے ہیں۔" اس نے دل سے محبت بھرے انداز میں کہا تھا۔ وہ بہت اچھا تھا اور اسے بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ وہ عطیہ اور عاتکہ پر اسے فوقیت دیتا تھا۔ اور اہمیت و توجہ کسے بری لگتی ہے۔

"اب مسکہ نہیں چلے گا۔" عقیل نے مسکرا کر اس کے گال تھپتھپائے۔ اس کا مقصد تو پورا ہو چکا تھا۔ سامنے موجود احاطے میں بھینسوں کے ساتھ مصروف عباس یہ منظر دیکھ ہی چکا تھا۔ اس کے اندر جلن بڑھا کر عقیل فاتحانہ سا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"خالہ سے لے کر فاختی تک، تمہاری جگہ کسی کے دل میں نہیں۔ چاہے جتنی مرضی خدمتیں کر لو۔" عقیل نے کمینی سی خوشی دل میں اترتی محسوس کی تھی اور گنگناتے ہوئے اپنے پلنگ پر لیٹ گیا تھا۔ ذہن میں تنویر کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

نجانے کیوں آنکھوں کی شفاف سطح پر نمی سی ابھرنے لگی تھی۔ چاچی کے تلخ رویے فاختہ کی دل زخمی کر دینے والی باتیں اور عقیل کی بکواس سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی بڑھتی جا رہی تھی۔

"آخر رویوں اور رشتوں میں تبدیلی کہاں سے آنا شروع ہوئی تھی؟"

اس کی تلخ سوچوں نے کروٹ بدلی تو بہت سے منظر واضح ہوتے چلے گئے تھے۔ آج سے چند سال پہلے بھی چاچی نرجس کا مزاج روکھا اور ترش ہوا کرتا تھا مگر تب ان کی آنکھوں میں بیزاری نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں سے لے کر عقیل اور عباس تک پہ ہاتھ اٹھا لیتی تھیں اور ان کی ماریں تنبیہہ اور شفقت بھی نظر آتی تھی مگر اب کچھ عرصے سے ان کا رویہ بالکل بدل گیا

شاید جب سے چاچا نے واضح لفظوں میں چاچی کو کہا تھا کہ وہ فاختہ کا رشتہ عباس کے ساتھ طے کر چکے ہیں۔ کیونکہ عباس اسی گھر کا بیٹا تھا۔ شاید تب سے ہی چاچی کو عباس کا وجود کھٹکنے لگا تھا۔ فاختہ کے لیے ان کے خواب بہت اونچے تھے۔ وہ اسے کسی اونچے گھرانے میں بیاہنے کا سوچتی تھیں یا پھر عقیل کی نوکری کے بعد ان کے خیالات اور سوچ کا رخ بدل گیا تھا۔

جو بھی تھا، عباس کے لیے چاچی کے رویے میں بہت تلخی آ گئی تھی۔ اکثر غصے میں وہ اس کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیتی تھیں۔ خصوصاً اس وقت جب ماسی نوراں کے ساتھ چاچی کی طویل میٹنگ ہوتی تھی تب تو ان کا غصہ سوا نیزے پہ پہنچ جاتا تھا۔ ماسی نوراں کچھ عرصے سے ان کے گھر بہت آ رہی تھی اور چاچی سے بھی خوب دوستانہ گانٹھ رکھا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے عقیل اور عباس کی آپس میں بہت دوستی تھی مگر پھر عباس کو یوں لگا تھا گویا عقیل اس سے کھنچا کھنچا رہنے لگا ہے۔ اس کے مزاج میں بدلاؤ دیکھ کر عباس بھی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پہلے پہل ان کی بول چال بند ہوئی پھر طعنے طنز کا سلسلہ شروع ہو گیا، پھر معاملہ ایسا بگڑا کہ دونوں کسی بھی چھوٹی سی بات پر ہاتھا پائی پہ اتر آتے تھے۔ یہاں پر نرجس کی بے انصافی عباس کو بہت متنفر کر دیتی تھی، وہ عقیل کی بے جا حمایت کرتی تھیں اور اسے ہمیشہ قصور وار ٹھہراتیں۔ خیر، چاچی کی بے انصافیوں کے کیا کہنے، وہ تو اپنی سگی بیٹیوں میں تفریق کرنے والوں میں سے تھیں۔ اور عباس کا وجود تو انہیں پہلے دن سے ہی کھٹکتا تھا۔ اب کچھ اور کھٹکنے لگا تھا۔

اس دن بھی چاچی کو اپنے کمرے کی تلاشی لیتے دیکھ کر عباس حیران رہ گیا تھا۔ انہوں نے اس کے تکیوں کے غلاف تک اتار رکھے تھے، پھر عباس کو بے وقت گھر میں دیکھ کر وہ بوکھلا گئی تھیں۔ عباس چاچی کی حیرت پہ اتنا حیران نہیں ہوا تھا جس قدر فاختہ کو اپنے پلنگ کے نیچے سے نکلتا دیکھ کر حیران بلکہ گم صم رہ گیا تھا۔

"اماں! یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ خواہ مخواہ مجھے نیچے گھسایا ہے۔ وہ کچے چوروں کی طرح ثبوت چھوڑنے والا ہرگز نہیں۔" فاختی نے ہاتھ جھاڑ کر پاٹ دار آواز میں کہا تھا اور اماں کے اشارے کرنے پر بھی چپ نہ ہوئی۔

"میں تو کہتی ہوں احاطے سے پتا کرواتے ہیں۔ وہ گھر میں بہت کم رہتا ہے ایسی چیزیں احاطے میں ہی رکھ آتا ہوگا۔" فاختہ نے باآواز بلند اپنا خیال ظاہر کیا تھا جب اپنی پشت کی طرف سے آتی آواز سن کر بوکھلا اٹھی۔

"کیسی چیزیں؟" عباس نے حیرت پر قابو پا کر سادگی سے پوچھا۔

"تم کب آئے ہو؟" چاچی نے جھاڑ پونچھ والا کپڑا اٹھا کر صوفے جھاڑنے شروع کر دیے تھے۔

"ابھی آیا ہوں، دو منٹ پہلے۔ آپ کیا ڈھونڈ رہی تھیں؟" وہ تپائی اٹھا کر پلٹا اور جیب میں سے بلب نکال کر ہولڈر میں لگانے لگا۔

"میرے کمرے کا بلب لائے ہو؟" فاختہ نے چمک کر پوچھا۔

"لایا ہوں۔" وہ مختصر بتا کر زیرو پاور کے بلب کو ہولڈر میں پھنسانے لگا تھا۔ پھر چپکے سے دروازے کی طرف بڑھتی چچی کو دیکھ کر بولا۔

"چاچی! آپ نے بتایا نہیں۔ کیا ڈھونڈ رہی تھیں آپ؟" وہ ابھی تک ان کے اپنے کمرے میں آنے کی وجہ جاننے سے قاصر تھا کیونکہ چاچی بہت کم اوپر آتی تھیں۔ اگر وہ خود ہی سوچ لیتا کہ فاختہ شاید کمرے کی صفائی کرنے آئی ہوگی تب بھی یہ خیال سراسر غلط تھا۔ وہ تو مر کر بھی اس کے کمرے میں قدم نہ دھرتی وہ بھی صفائی کی غرض سے۔ ایسے کام عطیہ اور عاتکہ کے ذمے تھے۔

"آں۔ ہاں، کچھ نہیں۔" وہ کچھ گڑبڑا کر باہر نکل گئی تھیں اور جاتے جاتے انہیں فاختہ کو بلانا بھی یاد

نہیں رہا تھا۔
"چاچی کو کیا ہوا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"وہ چپ۔۔۔" فاختہ کچھ بولتے بولتے زبان دانتوں تلے دبا کر خاموش ہو گئی۔
"کیا؟" اب کے عباس کچھ مشکوک ہو گیا تھا۔
"کچھ نہیں۔" اس نے یہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا تھا مگر عباس نے اسے ایک دم روک لیا۔
"میرے کمرے سے آخر کیا تلاش کر رہی تھیں تم؟"
"کچھ بھی نہیں۔" وہ صاف مکر گئی۔
"تو پھر چاچی یہاں کیا کر رہی تھیں؟"
"تکیے کے غلاف اتار رہی تھیں۔ تم نجانے کیا سمجھ رہے ہو۔" فاختہ نے بھنا کر کہا تھا اور پھر دھپ دھپ کرتی نیچے چلی آئی۔ اماں صحن میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسے سیڑھیاں اترتے دیکھ کر لپک کر قریب آگئیں۔
"اسے شک تو نہیں ہوا؟"
"بہت کمینہ ہے وہ' کرید کرید کے پوچھ رہا تھا۔" فاختہ نے لاپروائی سے بتایا۔
"تم نے بتایا تو نہیں؟" انہوں نے فکر مندی سے پوچھا۔
"اتنا احمق سمجھ رکھا ہے مجھے؟"
"کچھ کم احمق بھی نہیں ہو۔" اماں مطمئن سی ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئی تھیں۔ فاختہ بھی ان کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ عطیہ نے کچن سے نکل کر گاجروں کے ڈھیر کو اس کے سامنے رکھا اور بولی۔
"ان کو چھیل دو' مجھے ابھی چڑھانی ہیں چولہے پر۔"
"ہائے عطیہ! پلیز' مجھ سے نہیں ہو گا۔" وہ رو دینے کو تھی۔ تب ہی عباس بھی نیچے چلا آیا۔ اماں نے اسے دیکھ کر دوپٹہ منہ پہ کر لیا تھا اور کروٹ بھی بدل لی۔ عباس باہر جانے سے پہلے کچھ دیر کے لیے ان کے پاس رکا تھا۔ پھر ایک سرخ گاجر اٹھا کر اماں کی طرف ذرا جھکتے ہوئے بولا۔
"چاچی! مجھے آج تک کسی نے لو لیٹر نہیں لکھا' سو ایسی کوئی چیز میرے کمرے کے کسی کونے سے آپ کو ہرگز نہیں ملے گی۔ سو اس مشقت میں وقت ضائع مت کیجیے گا۔" اس کے لبوں پر ایک شرارتی مسکراہٹ چمک رہی تھی' ادھر اماں نے جوتی اٹھاتے دیر نہیں لگائی۔
"اور اگر میں کسی کو خط لکھوں گا تو آپ کی اجازت سے لکھوں گا ورنہ تو میری زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئیں گے۔ آخر خط لکھ کر یہیں کسی نہ کسی منڈیر پہ جو رکھنا ہے۔" فاختہ کو ایک گہری نظر سے دیکھا وہ اماں کی دوسری جوتی اٹھانے سے پہلے ہی بھاگ نکلا تھا جبکہ اماں زیر لب بڑبڑاتی ایک دفعہ پھر چارپائی پہ لیٹ گئیں۔
"خواب دیکھو اس نشئی کے بھلا یہ اس قابل ہے جو اسے گھر داماد بناؤں۔" اماں کے زہریلے الفاظ نے کچن کی کھڑکی میں سے جھانکتی عطیہ کو ساکت کر دیا تھا۔
"نشئی۔" وہ حیرت زدہ سی اماں کا تکر تکر چہرہ دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

یہ برسات کی دو تگڑی نما بارش تھی۔ ابھی مینہ زور سے برستا اور ابھی مطلع صاف' سورج چمک اٹھتا اور بادل چھٹ جاتے آج صبح بھی اماں کا پارہ ہمیشہ کی طرح چڑھا ہوا تھا۔ وہ بات بے بات عاتکہ اور عطیہ کو جھڑک رہی تھیں۔ نانی سے بھی لڑائی ہو چکی تھی۔ ان دنوں اماں کو عباس پر شدید غصہ تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا' ورنہ ہمیشہ کے لیے عباس کو گھر سے نکال دیتیں۔
ماسی نوراں کے وہ ہی صبح و شام کے پھیرے تھے۔ نجانے انہوں نے اماں کے کان میں کیسا اسم پھونکا تھا۔ اماں تو بس عباس کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھیں۔ جہاں بھی نظر آتا بس تکرار شروع۔ گھر کا ماحول ان دنوں سچ مچ بہت افسردہ تھا۔ اور اسی افسردہ سی ایک صبح ماموں اور مامی چلے آئے تھے۔ قدرے

شرمندہ اور پشیمان سے۔ مامی نے نانی کے پیر پکڑ کر رو رو کے معافی مانگی تھی۔ اپنے غلط رویوں اور بدسلوکی پر آنسو بہائے تھے۔ ماموں بھی غمگین اور اداس تھے۔ سدا کی نرم دل نانی کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے فوراً" ہی بیٹے اور بہو کو معاف کر دیا۔
وہ نانی کو لینے آئے تھے مگر نانی نے معذرت کر لی۔ وہ یہ گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھیں۔ ویسے بھی شہر کے ماحول میں اب ان کا دل لگنے والا نہیں تھا مگر اصل فساد تب شروع ہوا' جب مامی کے اصرار پر نانی نے چند دن کے لیے شہر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اماں سب کے سامنے تو خاموش رہی تھیں مگر تنہائی پاتے ہی بھڑک اٹھیں۔ انہوں نے نانی کو بے بھاؤ کی سنائی تھیں۔
"خبردار! جو آپ اس کٹنی کے ساتھ گئیں تو۔۔۔ دیکھیں اماں! یہ بغیر مقصد کے نہیں آئی۔ اتنے سال آپ کی خبر نہیں لی۔ گھر سے بے گھر کیا۔ اب جو عقیل کی نوکری کا پتا چلا ہے تو پرانی محبتیں یاد آگئیں۔ میں آپ کو ہرگز نہیں جانے دوں گی۔"
اماں نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔ نانی بے چاری عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھیں۔ ایک طرف بیٹا بہو' دوسری طرف بیٹی۔ ادھر اماں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیسے ماموں اور مامی کو چلتا کرتیں۔ ایسے آڑے وقتوں میں ہمیشہ فاختہ ہی ان کے کام آتی تھی۔
"آپ فکر نہ کریں اماں! آپ دیکھتی رہنا' میں کیا کرتی ہوں۔"
اس نے میدان میں کود پڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ ہمیشہ اماں کی ڈھال بنتی آئی تھی۔ پہلے ابا کی ایک کزن ان کے پڑوس میں رہتی تھیں۔ سننے میں آیا تھا' وہ ابا سے ایک زمانے میں خاصی انسیت رکھتی تھیں۔ اماں کو جب خبر ہوئی ابا کی ان سے نسبت بھی رہ چکی ہے' تب اماں نے اپنے دل میں ان کے لیے کینہ پال لیا تھا۔ وہ جب تک ان کے پڑوس میں رہی تھیں' فاختہ نے ان کا جینا دوبھر کیے رکھا۔ اماں عادتاً" اسے ہی آگے کر دیتی تھیں۔
"جاؤ! چھت پہ کھڑے ہو کر ثمینہ سے کہو' اب وقت گزر گیا ہے' او چھی حرکتوں سے باز آجاؤ۔"
اماں کا پڑھایا سبق وہ من و عن دوہرا دیتی تھی' ادھر اماں اسے جی بھر کے پیار کرتیں' پانچ دس روپے پکڑا دیتیں۔ آخر وہ ان کی ہر بات مانتے ہوئے سب کے سامنے جو کھڑی ہو جاتی تھی۔ فاختہ فطرتاً" نڈر اور پُراعتماد تھی جبکہ عاتکہ اور عطیہ کم گو اور بامروت قسم کی لڑکیاں تھیں۔ اماں اگر ڈنڈا اٹھا کر بھی کوئی بات منوانا چاہتیں تو یہ دونوں ہرگز نہیں مانتی تھیں البتہ فاختہ اماں سے بھرپور توجہ' اہمیت اور پیار حاصل کرنے کے چکر میں ان کی ناجائز باتوں پر بھی سر تسلیم خم کر دیتی تھی۔
عطیہ کو یاد تھا جب ابا کویت جانے کے لیے مان نہیں رہے تھے تب اماں نے فاختہ کو خوب سکھا پڑھا کر ابا کے سامنے جا کھڑا کیا تھا۔ اور فاختہ نے رو رو کے ابا کو باہر بھیجنے پر تیار کر ہی لیا۔
فاختہ کا شمار ایسے ہی بچوں میں ہوتا تھا جو انگلی پکڑ کر اندھا دھند چلنے لگتے تھے جبکہ عطیہ اور عاتکہ فطری طور پر ان بچوں میں سے تھیں جو ذہنی طور پر عمر سے پہلے سمجھ دار' باشعور ہو جاتے ہیں۔ جنہیں اچھائی یا برائی میں تمیز اور فرق واضح پتا چل جاتا ہے۔ جو غلط کو غلط سمجھنے کے لیے کسی کی نشاندہی یا سمجھانے کے منتظر نہیں رہتے۔
نرجس شروع سے ہی دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کے گولی چلاتی تھیں۔ پہلے سسر سے کچھ منوانا ہوتا تھا تو شوہر کو آگے کر دیتی تھیں پھر بیٹیاں پیدا ہوئیں تو ان کو ذریعہ بنا لیا۔ عطیہ اور عاتکہ تو کم کم ہی ان کے ہتھے چڑھتی تھیں' تاہم فاختہ ان کی ہر بات پر ایمان لے آتی تھی۔
جب انہوں نے دیکھا کہ نانی سچ مچ بیٹے' بہو کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی ہیں تب انہوں نے ہمیشہ کی طرح فاختہ کو آگے کر دیا تھا اور خود خاموشی سے ایک کمرے میں گھس گئیں۔ فاختہ نے اگلے پچھلے سارے طعنے تشنے اور شکوے شکایات کے رجسٹر کھولنے کے بعد اطمینان سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"نانی سے اب کون سا فائدہ حاصل کرنا ہے؟ پہلے انہیں دھکے دے کر گھر سے نکالا' انہیں ذلیل کیا۔ بے گھر کیا اور اب نیک پروین بن کے انہیں لینے چلی آئی ہیں۔ ساری مکاری جانتی ہوں میں۔ یقیناً" اپنی نسیمہ کو عقیل بھائی کے کھونٹے سے باندھنا چاہ رہی ہیں آپ' مگر افسوس آپ کی خواہش پوری نہیں ہوسکتی۔ آپ یہاں سے جاسکتی ہیں۔ کبھی نہ آنے کے لیے۔"

فاختہ کی باتیں سن کر نانی کو جلال آگیا تھا اور ادھر ماسی خفت و شرمندگی سے گڑ گئیں مگر جاتے جاتے اماں کو بے بھاؤ کی سنا کر گئیں۔

"خوب تربیت کی ہے بیٹی کی۔ اس کی اچھی صورت اور اس گھر کے لالچ میں ہی کوئی اسے بیاہنے کی غلطی کرے گا ورنہ کسی شریف آدمی کے لیے اس بار کو اٹھانا ممکن نہیں۔"

☼ ☼ ☼

وہ بہت برے دل کے ساتھ آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی عطیہ بھی بیٹھی تھی۔ اس سے بے حد خفا اور ناراض۔ عطیہ ہی کیا اس سے تو نانی اور عاتکہ بھی خفا تھیں' سو اس کا مزاج خاصا برہم نظر آرہا تھا۔ اس نے آٹا گوندھ کر چنگیر سے ڈھکا تو ابا کی آواز آئی۔

"فاختی بیٹا! ذرا ادھر آؤ۔"

"جی ابا! ابھی آئی۔" اس نے ہاتھ دھوئے اور دوپٹے سے خشک کرتی ابا کے کمرے میں چلی آئی۔ انہوں نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلایا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے پاس آبیٹھی۔

"میں کام کررہی تھی ابا! جلدی بولیے۔" اس کے انداز میں خاصی عجلت نظر آرہی تھی۔

"میں جانتا ہوں' آج میری بیٹی کو کام کرنا پڑرہا ہے۔" ابا کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔

"اب بولیے نا ابا! مجھے دیر ہورہی ہے۔" اس نے ان کی محبت کے جواب میں خاصی بیزاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ بیزاری صبح صبح نیند سے جگائے جانے پر بھی تھی۔

"بیٹا! مجھے تم سے ضروری بات کرنی تھی۔ یہاں اطمینان سے بیٹھو۔" انہوں نے اپنے قریب اس کے لیے جگہ بنائی تھی۔ مجبوراً" فاختہ کو بیٹھنا پڑا۔

"فاختی بیٹا! تم نے آگے پڑھائی نہیں کرنی؟" انہوں نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے نرمی سے گفتگو کے لیے تمہید باندھی تھی۔ فاختہ نے چونک کر ابا کے چہرے کی طرف دیکھا تھا پھر سرعت سے سر جھکالیا۔

"پڑھنا ہے ابا!" اس نے فوراً" جواب دیا تھا۔

"اور کتنا پڑھو گی؟" انہوں نے لمبا سا کش لے کر نرمی سے پوچھا۔

"سولہ نہ سہی چودہ جماعتیں تو لازمی پڑھوں گی۔" اس نے تفاخر سے اپنے ارادوں کے متعلق آگاہ کیا تھا۔ ابا کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے تھے۔

"اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟" بہت دیر کی خاموشی کے بعد ابا نے اپنے سابقہ لب و لہجے میں پوچھا تھا۔

"ڈگریاں ملیں گی ابا! اس سے بڑا فائدہ کیا ہوگا۔ میں آپ کے خاندان کی پہلی گریجویٹ ہوں گی۔" فاختہ فخریہ بتاتے ہوئے عباس اور عقیل کو بھول گئی۔

"صرف ڈگریاں؟" ابا نے حیرت کا برملا اظہار کیا۔

"کیا پتا وظیفہ بھی مل جائے۔ محنت تو میں بہت کرتی ہوں ابا!" اس نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا تھا۔ وہ اس کی سادگی پر دھیرے سے مسکرادیے۔

"بیٹا! ایک بات تو بتاؤ۔۔۔"

"جی ابا! (اچھا ہے۔ ابا نے مجھے بلالیا۔ ناشتے کی مصیبت سے تو جان چھوٹ جائے گی) اس نے دل ہی دل میں جوڑ توڑ کیا اور پرسکون ہوگئی۔

"بندہ علم کیوں حاصل کرتا ہے؟" ابا کی آواز اسے زیادہ دیر پرسکون نہیں رہنے دیا تھا۔

فاختہ ہونق پن سے ابا کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ بات کچھ اس کے پلے نہیں پڑی تھی مگر پھر بھی وہ کچھ کھٹک ضرور گئی تھی۔

"بندہ کتاب اس لیے پڑھتا ہے' علم اس لیے سیکھتا ہے کہ اس میں سمجھ بوجھ' عقل' شعور اور تہذیب آجائے۔ وہ گفتگو کا سلیقہ سیکھ جائے۔ اسے بولنے کا فن آجائے۔ مقابل کو متاثر کرنے کا طریقہ آجائے۔ ادب اور احترام کی رمزوں کو سمجھنے کے لیے علم پڑھا جاتا ہے۔ علم صرف ڈگریاں جمع کرنے کا نام نہیں۔"

ابا کی آواز بہت نرم اور پراثر تھی۔ فاختہ کا دل عجیب سا ہوگیا۔

"کیا تم اپنی بہنوں کو نہیں دیکھتیں' دونوں نے میٹرک کے بعد اپنی مرضی سے تعلیم کے سلسلے کو منقطع کردیا تھا مگر ان سے زیادہ سلیقہ مند' باشعور بچیاں ہمارے خاندان میں نہیں۔۔۔ دیکھو بیٹا! آدمی کی پہچان اس کی ڈگریوں سے نہیں' اس کے اخلاق سے ہوتی ہے۔ اپنا اخلاق اچھا کرلو' لہجہ دھیما اور آواز نرم رکھا کرو۔ ترش روئی اچھی عادت نہیں' اور بدخلقی سے بچو بیٹا! سب سے بڑی بات' بڑوں کی عزت کرنا سیکھو۔۔۔" وہ لمحہ بھر کے لیے حقے کا کش لینے کے لیے رکے تھے۔ فاختہ کا سانس سینے میں ہی اٹک گیا تھا۔

"تو کیا میرا اندیشہ ٹھیک تھا' اس عباس کے بچے نے میری شکایت لگادی ہے۔" اس نے زہرخند لہجے میں زیرلب کہا۔

"میں نے تمہارا نام فاختہ اس لیے رکھا تھا کہ تمہارے نام کا کچھ اثر تمہاری شخصیت پر بھی پڑے گا حالانکہ میں تمہارا نام فخر بھی رکھنا چاہتا تھا اور مجھے یقین تھا تم میرا سچ مچ کا "فخر" بن جاؤ گی۔ مگر تم نے میرے یقین کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ تم ضدی ہو' غصہ ور ہو' مزاجاً" اپنی ماں پہ پڑی ہو۔ ہر وقت تلخ رہتی ہو۔۔۔ یہ سب بھی خیر ہے مگر تم بداخلاق اور بدزبان ہوچکی ہو' یہ چیز میرے لیے باعث تکلیف ہے۔۔۔ تم نے عباس کو ذلیل اور بیہودہ کہا۔ تم نے اسے بے ضمیر اور بے غیرت کہا۔۔۔ کیا یہ کہنا درست تھا؟" وہ عجیب ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ان کی آواز بھیگ رہی تھی۔ آنکھوں کے فرش گیلے ہورہے تھے۔

"تم نے اسے گھر سے نکل جانے کو کہا۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ حالانکہ کئی دفعہ نرجس نے غصے میں آکر عباس کو گھر سے نکالا مگر میں اسے منا کرلے آتا تھا۔ وہ میری مان بھی جاتا تھا اور نرجس کے لیے اس کے دل میں کوئی میل بھی نہیں۔ وہ اسے ماں سمجھتا ہے اور ماؤں کی ہر بات اولاد سہ لیتی ہے مگر تم نے اس کا دل کیوں دکھایا؟ اس کے دل کو ٹھیس کیوں پہنچائی؟"

ابا نے شکستہ لہجے میں کہا تھا۔ فاختہ کا مارے شرم کے سر جھک گیا تھا۔ اس کے پاس اپنی صفائی کے لیے کوئی دلیل نہیں تھی۔

"ابا! مجھے اماں نے کہا تھا۔۔۔" بہت دیر بعد اس نے کھکھیائے سے لہجے میں کہا۔

"اماں تمہیں کنویں میں چھلانگ لگانے کے لیے کہیں گی تو کیا چھلانگ لگادو گی بیٹا!" ابا نے سابقہ تحمل بھرے لہجے میں پوچھا۔ اس کے پاس پھر کوئی جواب نہیں تھا۔ سولب سمیٹے بیٹھی رہی۔

"کیا تم جانتی ہو' تمہاری اس دن کی بدزبانی سے تمہاری بہن کے رشتے پر کیا اثر پڑا ہے؟" ابا نے گہری رنجیدگی کے اثر سے نکل کر دھیمی آواز میں کہا۔ "وہ لوگ جواب دے گئے ہیں' اور یہ پیغام بھیج دیا گیا ہے جس گھر کی چھوٹی بیٹی انتہائی بدزبان ہے اس گھر کی بڑی بیٹیوں کے مزاج کیسے ہوں گے۔ تم نے مہمانوں کا لحاظ بھی نہیں کیا۔"

ابا کا سانس کھینچ کھینچ کر چلنے لگا تھا۔ شاید وہ ان لفظوں کی تکلیف کو ابھی تک محسوس کررہے تھے۔

"ابا! کیا عباس واپس نہیں آیا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے آہستگی سے پوچھا۔

"واپس کیوں نہیں آیا۔ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ مگر وہ بہت غصے میں ہے۔ تم اس سے معذرت کرو۔ اپنی غلطی تسلیم کرو۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا ہے مگر آئندہ محتاط ہوجانا پڑے گا۔ اپنے مزاج کو بدلو بیٹا! ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔ کیونکہ ہر بدزبان عورت کو تمہارے باپ جیسا شوہر نہیں ملتا۔" ان کی نظریں دروازے میں کھڑی نرجس پر جمی تھیں' جو خونخوار نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"کیوں فاختہ کو دھمکیاں دے رہے ہو؟ آخر اس نے کون سا جرم کردیا ہے؟" وہ چیل کی طرح لپک کر اندر آگئیں۔

"ابھی کچھ کرنا باقی ہے؟ عاتکہ کا رشتہ بننے سے پہلے ٹوٹ گیا ہے۔ عباس کے ساتھ اس نے اتنی بدتمیزی کی ہے۔ یہ کیا کم ہے تمہاری نظر میں؟"

ابا نے چبھتے لہجے میں کہا' ساتھ ہی فاختہ کو باہر نکل جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اجازت ملتے ہی سر پہ پیر رکھ کے بھاگی۔ اور دوسرا سانس اپنے اور بہنوں کے مشترکہ کمرے میں جاکر لیا تھا مگر ادھر عباس کو بیٹھا دیکھ کر اسے اپنے اندر چلے آنے پہ غصہ آگیا تھا۔ عاتکہ اور عباس کوئی بات کررہے تھے۔ عطیہ ان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ کچن میں کوئی نہیں تھا۔ یقیناً" ناشتا بھی کسی نے نہیں بنایا تھا۔ وہ الٹے قدموں لوٹ جانا چاہتی تھی مگر عطیہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

"بات سنو فاختی!" عطیہ کے لہجے میں بڑی بہنوں والا تحکم پہلی مرتبہ نظر آرہا تھا۔ وہ کراہ بھی گئی اور مڑ بھی آئی۔

"کیا ہے؟" اس نے اپنے ناخن کھرچتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

"عباس سے معافی مانگو فاختہ!" اب کے عطیہ نے قدرے نرمی سے کہا تھا۔ ان لوگوں کے نرم رویے ہی اسے خواہ مخواہ گردن تان کر چلنے پہ مجبور کردیتے تھے۔

"معافی؟" وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ "میں کیوں معافی مانگوں؟"

"تم نے سنا نہیں؟" عطیہ کو غصہ آگیا۔

"نہیں۔" اسے بھی غصہ آگیا۔ "میں ہرگز عباس سے معافی نہیں مانگوں گی اس لیے کہ میں نے جو کہا ہے' بالکل ٹھیک کہا ہے۔"

"فاختی!" عطیہ نے غصے سے فاختہ کے منہ پر کس کے تھپڑ مارا۔

"یہ تھپڑ دراصل تمہیں ابا یا اماں مارتیں تو بہتر تھا۔ تم ان کی نہیں' سب کی نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو اور یہ تھپڑ تمہیں اسی وقت ماردینا چاہیے تھا' جب تم نے مامی اور ماموں کو بے عزت کرکے گھر سے نکالا تھا۔ جیسی بدزبان لڑکیاں ہمیشہ نقصان ہی اٹھاتی ہیں۔" عطیہ کی آواز غم و غصے کے احساس سے بھرا رہی تھی۔ جبکہ فاختہ کے تو آنسو بھی آنکھوں میں جم کر رہ گئے تھے۔

"اماں نے ہمیشہ تمہیں اپنا سپورٹر بنائے رکھا ہے۔ وہ اپنی ہر غلط بات تمہارے توسط سے منوالیتی' اس بات کو جانے بغیر کہ تمہارا یہ منہ پھٹ انداز خاندان بھر میں بدنام کررہا ہے۔ ہر ایک کی زبان تمہاری بدزبانی اور زبان درازی کا قصہ ہے۔ تم اماں حمایت نہیں کرتیں بلکہ اپنا نقصان کرتی ہو۔" نے آنکھوں سے نکلے آنسو بے دردی سے پونچھ ڈالے تھے۔ اور فاختہ کو بولنا بھی بھول گیا تھا۔

"سیرت نہ ہو تو صورت کا بھلا کیا فائدہ۔" عاتکہ نے بھی دل کی جلن باہر نکالی تھی۔ وہ سب اسے لعن طعن کررہے تھے۔ عباس تو کب کا کمرے سے نکل چکا تھا۔ کچھ دیر بعد عاتکہ بھی چلی گئی پھر عطیہ بھی باہر آگئی جبکہ فاختہ غصے کے مارے پلنگ پر ڈھے کے دھواں دھار رونے لگی تھی۔

"آخر میں نے کیا کیا ہے؟ ابا' نانی' عطیہ' عا- سب مجھ سے خفا ہیں۔ میں نے کون سی غلط بات کہہ دی ہے؟ وہ ہی تو بولا ہے جو اماں اور ماسی نوراں نے تھا۔ مگر انہوں نے کیا کہا تھا؟" اسے ذہن پر زور ڈالنا نہیں پڑا تھا۔ ابھی کل کی تو بات تھی جب مامی اور ماموں کے چلے جانے کے بعد ماسی نوراں چلی آئی تھیں۔

ہوا کچھ اس طرح سے تھا۔ مامی سے اس کی جنگ کے بعد اماں مسرور جبکہ نانی آگ بگولہ بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اماں سے بول چال بند کررکھی تھی۔ ا- غصہ تھا کہ ان کی بیٹی اپنی بیٹی کی بیہودہ گوئی پر خاموش کیوں ہے؟ اب ڈنڈا کیوں نہیں اٹھاتی۔

"اب تمہارے ہاتھ ٹوٹ پڑے ہیں۔ اس کو لگا کیوں نہیں دو ہاتھ' گز بھر لمبی زبان ہے اس کی۔ نہ کسی آئے کی شرم نہ لحاظ نہ مروت۔ باپ جیسے ماموں

ت کرکے گھر سے نکال دیا ہے۔ نہ شرم ہے نہ ایسی زہر اگلتی زبان۔" نانی اب اگلے کئی ہفتوں اس ہی غم کو طاری رکھنے کا ارادہ کیے ہوئے تھیں بالآخر جانتی ہی تھی۔

"اگر کوئی اپنے سابقہ عمل پر شرمندہ ہوکر لوٹ معافی مانگے تو اس پر بھی اسے بے عزت کردیا ہے۔" ان کا دل ایک ماں کا دل تھا' ماموں کی مسکین صورت ان کے ذہن سے ہٹ نہیں رہی تھی۔

"شرمندہ نہیں تھے وہ۔ لالچ میں آئے تھے۔ اپنے عقیل بھائی کو ورغلا کرلے جاتے۔" فاختہ ابا کے سمجھانے بجھانے اور نصیحتوں کو بھول کر چمک کے بولی تھی۔ اسے پتا نہیں چلا تھا' عقیل سیڑھیاں اتر کر آخری زینے پر اس کے برابر آبیٹھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ فاختہ کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

"عقیل بھائی بچہ نہیں تھا فاختی! جو کسی کے بہکاوے میں آجاتا۔ تم نے ماموں اور مامی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

وہ اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ نانی کی طرف دیکھ رہا تھا جو خفا سی بیٹھی تھیں اور اشارے سے اسے کہہ رہی تھیں کہ وہ فاختہ کو سمجھائے' جبکہ اس کا سارا دھیان پڑوس کے مکان کی طرف تھا جہاں سے کھٹو پٹر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"خالو جی نے تمہارا نام فاختہ اس لیے رکھا تھا کہ یہ پرندہ ہے نہ صرف بے ضرر' شریف' معصوم بلکہ محبت کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ تمہیں نرمی اور محبت کا پیکر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ تم ان کی نسل کی صحیح معنوں میں امین بن سکو۔ تمہیں اس گھر میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے اور وہ چاہتے تھے۔ تم اپنی دوسری دو بہنوں کے لیے بھی محبتوں کا مان بن جاؤ۔ ان کا میکہ تمہارے دم سے آباد رہے گا اور یاد رکھنا جس کے ساتھ تم انتہا کی تلخ کلامی کرتی ہو اسی کے ساتھ تمہارا نصیب جڑنے والا ہے۔ میں ایک مرد ہوں اور جانتا ہوں کہ مرد کا ظرف کتنا ہوتا ہے۔"

عقیل کے سنجیدہ لہجے میں ایسی ٹھہراؤ دینے والی کوئی بات تو تھی جس نے فاختہ کو متوحش کردیا تھا۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھ پائی عقیل بھائی!" فاختہ نے ہکلا کر اپنی بات اس تک پہنچائی تھی۔

"ابھی نہیں سمجھو گی۔ سمجھائیں گے بھی تو نہیں سمجھو گی۔ تاہم وقت سب سے بڑا استاد ہے۔ سب کچھ سمجھا دیتا ہے وہ بھی جو انسان سمجھنا نہیں چاہتا۔" عقیل کی آواز اب بھی روکھی سی تھی۔ گویا عباس کے ساتھ ہونے والی اس کی جھڑپ عقیل تک بھی پہنچ گئی تھی مگر ان دونوں کو بھلا ایک دوسرے سے کیسی ہمدردی؟ وہ ان کے گزشتہ رویے سوچتی کچھ حیرت زدہ تھی۔ کہاں تو عباس اور عقیل ایک دوسرے کی جان لینے پہ تلے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ لڑ پڑتے تھے اور کہاں اب عباس کی حمایت کی جارہی تھی۔ آخر سارے لوگوں نے اس کے خلاف "ایکا" کیوں کرلیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک دن ماسی نوراں کی نانی کے ہاتھوں بہت درگت بن گئی۔ اور ساتھ اماں کی بھی شامت آگئی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ ماسی نوراں عطیہ اور عاتکہ کے لیے بہت اچھے رشتے لائی تھیں مگر نانی نے ان رشتوں میں سو سو کیڑے نکال کر جواب دے دیا تھا۔ ماسی نوراں اس توہین پر تلملا اٹھیں۔

"آپ کی نظر میں تو کوئی جچتا نہیں بڑی بی! کیا نواسیوں کو بوڑھا کروگی؟"

"تمہیں میری نواسیوں کے غم میں کمر جھکانے کی ضرورت نہیں۔" نانی نے بھی بھنا کر جواب دیا تو ماسی نوراں کو ذرا لہجہ نرم کرنا پڑا۔

"خالہ جی! ذرا میری بات تو سنیں۔" ماسی نوراں نے لجاجت سے کہا۔

"نہ میں تیری خالہ کہاں سے ہوگئی؟" نانی اور بھی تلملا گئی تھیں انہیں تو ویسے بھی اس مکار کٹنی پر بہت غصہ تھا جو ان کی بیٹی اور نواسی کو بھڑکانے اور کان

بھرنے میں لگی رہتی تھی۔
"اماں! اس کی بات سن تو لیں۔" نرجس نے لجاجت سے کہا۔
"رہنے دو بی بی! میں نہیں کوئی بات وات سنتی۔ اس عورت کو چلتا کردو۔ ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔" آج تو تائی نے لگی لپٹی رکھے بغیر ماسی نوراں کو خوب کوسا تھا' وہ بھی مزید عزت افزائی کروائے بغیر بھاگ نکلی تھیں۔ تائی ماسی کے چلے جانے کے بعد ابھی ڈھنگ سے لیٹی بھی نہیں تھیں کہ حواس باختہ سی عاتکہ وھپ سے ان کے قریب آ بیٹھی۔
"تائی! یہ پڑوس میں ثمینہ آنٹی آگئی ہیں۔ کل سے گھر کی صفائیاں کروائی جارہی تھیں' آج وہ لوگ آبھی گئے ہیں۔" عاتکہ نے ایک ہی سانس میں معلومات بہم پہنچائی تھیں' تائی لیٹنا بھول کر اٹھ بیٹھیں۔
"ثمینہ آگئی ہے کیا؟" انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔
"جی تائی! ان کے شوہر ریٹائر ہوگئے ہیں نا۔ کل ابا بتا نہیں رہے تھے۔" عطیہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔
"اچھا' یہ تو بہت عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے ثمینہ نے۔ اپنے گھر اپنے گاؤں لوٹ آئی ہے۔" تائی نے خوش ہو کر کہا تھا پھر عاتکہ کو ساتھ لے کر اماں کے منع کرنے کے باوجود بھی ثمینہ سے ملنے چلی گئی تھیں۔ کچھ رشتے داری کا لحاظ تھا اور کچھ انہیں ثمینہ سے خصوصی لگاؤ بھی تھا۔ ثمینہ بہت خوش اخلاق' وضع دار سی خاتون تھیں۔ جب بھی ملتیں بھرپور تپاک سے ملتیں۔ ان کے شوہر چیف پٹی آفیسر سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ دونوں بچے تائی کو بہت پسند آئے۔ سمجھ دار' تعلیم یافتہ اور مہذب۔ تائی دو گھنٹے بعد بہت مسرور سی لوٹی تھیں۔
"ثمینہ کا بیٹا طاہر اور بیٹی نائلہ بہت لحاظ مروت والے بچے ہیں۔ مانو میرا تو دل خوش ہوگیا ہے۔" تائی کی خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔ انہوں نے عطیہ کو آتے ہی حکم دیا۔
"ثمینہ کی دعوت کا انتظام کرو۔ ناشتا' کھانا سب ادھر سے ہو گا۔"
"اماں! کیا ضرورت ہے اتنی رشتے داری بنانے کی۔" نرجس نے دبے لفظوں میں منع کرنا چاہا تھا' ثمینہ سے گزشتہ بد مزگیاں یاد آگئی تھیں۔
"تم اپنے کام سے کام رکھو' ہم جو کر رہے ہیں کرنے دو۔" تائی نے رکھائی سے جواب دیا تھا پھر عطیہ اور عاتکہ سے اپنی پسند کا کھانا پکوایا۔
ثمینہ تو اتنا اہتمام دیکھ کر شرمندہ ہو گئی تھیں۔
"آپ نے کیوں اتنا تکلف کیا ہے۔ اور بچیوں کو بھی کچن میں لگائے رکھا۔"
"تکلف کیسا بیٹی! اور بچیاں کون سا پہلی مرتبہ کچن میں گھسی ہیں۔" تائی نے محبت سے جواب دیا تھا۔
ادھر نرجس اوپری دل سے محفل میں بیٹھی رہیں۔ ہمیشہ کی طرح خاموش مگر اندر سے ابلتی ہوئی۔ کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا پھر عطیہ سب کے لیے چائے بنا لائی تھی۔ ثمینہ بچیوں کے اخلاق' سلیقے قرینے سے خوب متاثر ہوئی تھیں۔ نائلہ اور طاہر کی عطیہ اور عاتکہ سے خوب دوستی ہو گئی تھی۔ تاہم بچوں سمیت ثمینہ کو بھی فاختہ کا روکھا رویہ بھایا نہیں تھا مگر ثمینہ سمجھدار بہت تھیں' سمجھ گئی تھیں کہ تینوں بچیوں میں سے کسی ایک نے تو ماں کا مزاج چرانا ہی تھا سو سب کا شکریہ ادا کرکے ہنسی خوشی برابر والے گھر میں لوٹ گئی تھیں اس امید کے ساتھ کہ اب آنا جانا' ملنا ملانا تو ہمیشہ کے لیے ہے۔
ادھر ان کے چلے جانے کے بعد فاختہ بہنوں کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔
"ان لوگوں سے ربط بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کھڑے کھڑے ہی فتویٰ جاری کیا تھا۔ وہ جو دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد تھکی ہاری لیٹی تھیں۔ فاختہ کے تلخ انداز کو دیکھ کر چونک گئیں۔
"خیر تو ہے۔" عطیہ نے پوچھا۔
"سب خیر ہے' بس اماں نے منع کیا ہے۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔
"کیوں منع کیا ہے؟" عطیہ نے ماتھے پہ بل ڈال کر پوچھا۔

"مجھے کیا خبر۔"
"آپ ایسی بھی انجان نہ بنو۔ اماں ہر بات تمہیں ہی تو بتاتی ہیں' چاہے وہ جھوٹی ہو یا سچی۔"
"بغیر تصدیق کیے جھوٹی باتیں کرنا تو آتی ہیں ناں تمہیں۔" عطیہ کا اشارہ عباس پر لگائے جانے والے الزام کی طرف تھا۔
"میں نے کوئی جھوٹی بات نہیں کہی۔" فاختہ نے غصے سے کہا۔ "جو سچ تھا' اس کے منہ پر کہہ دیا ہے تاکہ وہ خیالی تصور نہ باندھ لے خواہ مخواہ۔"
"تمہیں اپنے بارے میں بہت خوش فہمی ہے۔" اب کے عاتکہ نے بھی اندر کی بھڑاس باہر نکالی تھی۔ "مگر خیال رکھنا' خوش فہمیوں کے اونچے ٹیلے زمین بوس بھی ہو جاتے ہیں۔"
"مجھ سے کیوں لڑ رہی ہو۔ اماں نے جو کہا تھا تو میں نے اس تک بات پہنچا دی تاکہ جب بھی ابا اس سے منگنی یا شادی کی بات کریں تو وہ صاف صاف انکار کر دے' میری ناپسندیدگی کو مد نظر رکھ کے۔ اس میں میں نے کیا گناہ کر دیا ہے جو تم سب مجھ پر تلواریں لے کر کھڑے ہو چکے ہو؟" فاختہ روہانسی ہو کر چلا اٹھی تھی۔
"اور جو تم نے جھوٹی باتیں عباس سے منسوب کی ہیں' وہ کس کھاتے میں جائیں گی؟" عطیہ نے تیکھے انداز میں اسے گھورتے ہوئے کہا تھا۔
"میں نے کوئی جھوٹی بات نہیں کی۔ ماسی نوراں سے پوچھ لینا' وہ تمہیں ثبوت بھی لا دیں گی۔" فاختہ نے زہر بھرے لہجے میں اپنی بات ان تک پہنچائی تھی۔
"تم عباس کو اتنا ناپسند کیوں کرتی ہو؟" عاتکہ نے پوچھا۔
"تو اس میں کون سی ایسی بات ہے' جو اسے پسند کیا جائے۔ شکل و صورت ایک طرف' جو شخص اسکول کی لڑکیوں سے غیر اخلاقی رابطے بڑھائے۔ افیون' چرس جیسی چیزوں کا نشہ کرے' وہ بندہ کہاں سے پسندیدگی کی سند پا سکتا ہے؟ آئم سوری میری بہنو! میں ابا سے فرماں برداری کا ایوارڈ لینے کی خاطر اپنی زندگی جہنم میں نہیں جھونک سکتی۔ میں عباس سے شادی نہیں کر سکتی۔ اور اماں کو بھی اس کے کالے کرتوتوں کی خبر پہنچ چکی ہے تب ہی وہ اس بد کردار آدمی کو اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتیں۔" وہ فراٹے سے زہر پھونکتی تن فن کرتی باہر نکل گئی تھی۔ جبکہ عطیہ اور عاتکہ گویا ہکا بکا رہ گئیں۔
"یہ کیا بکواس کر رہی ہے عاتی!" عطیہ نے بہت دیر بعد سنبھل کر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔
"دماغ خراب ہو گیا ہے فاختہ کا۔ اور اماں کو دیکھو کیسے نوراں کٹنی کی باتوں کے جال میں پھنس گئی ہیں۔" عاتکہ کے خود بھی حواس جاتے رہے تھے۔
"یہ ساری بکواس اس نے عباس کے سامنے کی ہے تب ہی تو وہ یہاں سے جا رہا تھا' مگر ابا کی محبت نے اسے باندھ لیا' اور وہ ایک دفعہ پھر رک گیا مگر دیکھو! اتنے دن ہو گئے ہیں۔ عباس گھر نہیں آیا۔ رات کو اسٹے میں ہی سوتا ہے۔ اپنا کھانا بھی ادھر منگوا لیتا ہے۔"
"آخر یہ ہمارے ارد گرد کیا ہو رہا ہے؟" عطیہ کا ذہن الجھ گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔
"سازش۔۔۔" عاتکہ نے ہونٹوں کو سکیڑ کر آہستگی سے کہا تھا۔ "ہمارے ارد گرد سازش کا جال تانا جا رہا ہے۔"

☆ ☆ ☆

"میں نے اڑتی اڑتی ایک خبر سنی تھی۔" اسے اپنے قریب ہی تنویر کی بھونڈی آواز سنائی دی تھی۔ وہ جو اسکول سے لائی بچوں کی کاپیاں چیک کر رہا تھا' بغیر اس کی طرف دیکھے اپنا کام کرتا رہا۔
"کتنے دن سے یہاں ڈیرہ لگا رکھا ہے؟ گھر کیوں نہیں جا رہے؟" تنویر ایک ہی ڈھیٹ تھا۔
"تم سے مطلب؟" اس نے رکھائی سے کہا۔
"یار ہو میرے۔ تمہارا درد میں نہیں محسوس کروں گا تو اور کون کرے گا؟ میں جانتا ہوں تمہاری بہت تضحیک کرکے گھر سے نکالا گیا ہے۔ فاختہ بی بی کو ایسا

نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ایسے گندے الزام لگانے سے پہلے کچھ تو سوچتیں۔" تنویر نے چاپلوسی سے کہا۔ عباس کی سانولی رنگت کچھ اور گہری پڑ گئی۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" بہت ضبط کے بعد اس نے غرا کر پوچھا تھا۔

"تمہیں اپنے گھر لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ یہ بھینسوں کا باڑہ کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ گوبر کی بدبو سے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ چلو میرے ساتھ' آخر میری بیٹھک کس لیے ہے۔" تنویر نے ہمدردی سے کہا۔ عباس نے سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"تم اپنی ہمدردی سمیت یہاں سے چلے جاؤ۔" اس کے لہجے میں عجیب سی پھنکار تھی۔

"عباس یار! حوصلہ پکڑو۔ آخر چاچے کے مکان' دکان کے مالک بننے والے ہو' چاچے کی بیٹی کا غصہ سہنے کا بھی حوصلہ پیدا کرو۔ کچھ پانے کے لیے ضمیر کو گہری نیند سلانا ہی پڑتا ہے۔" تنویر نے اس کے غصہ کو ہوا دی۔

"تم اپنی بکواس بند نہیں کر سکتے؟" عباس نے پھر سے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اس سے بگاڑ کر کوئی فساد کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید یہ ذلت برداشت نہ کرتے ہوئے وہ سچ مچ ہی گاؤں چھوڑ دیتا مگر پھر چاچا کے بندھے ہاتھ آنکھوں کے سامنے آ جاتے تھے۔

"وہ نادان ہے بیٹا! اس کی نادانی کو نظر انداز کر دو۔" چاچا کی بھیگی آواز اسے ہر انتہائی فیصلے سے روک رہی تھی۔ ورنہ اب تک تو وہ اپنا حصہ لے کر جا چکا ہوتا۔ اسے ابھی تک وہ دوپہر نہیں بھولی تھی۔ جس دوپہر عباس کو گھر میں آئے مہمانوں کے سامنے فاختہ نے بے عزت کیا تھا۔

وہ بھی برسات کی دوپہر تھی۔ دو نگوڑی کا مینہ آیا' برسا اور دھوپ چھوڑ گیا۔ اس دوپہر عاتکہ کو دیکھنے کچھ مہمان بغیر اطلاع دیے گھر آ گئے تھے۔ عطیہ اور اماں بازار گئی تھیں۔ بس عاتکہ اور نانی گھر میں تھیں۔ مہمان آئے تو عاتکہ نے اسے احاطے سے بلوا لیا تھا۔

وہ مہمانوں کی تواضع کا سامان لے کر آیا تو فاختہ اسے سیڑھیوں کے پاس ٹکرا گئی۔

"پھونک آئے ہو پڑیاں؟" عجیب تمسخرانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عباس اس وقت فاختہ کا انداز نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ بہت دیر تک تو وہ اس کی بات کا مفہوم بھی نہیں سمجھا تھا۔ فاختہ کے انداز بس بدلے بدلے لگ رہے تھے اور اس بدلاؤ کی کوئی کڑی ماسی نوراں کے اس ثبوت سے بھی ملتی تھی جو سویرے سویرے اماں کے ہاتھوں میں وہ دبا کر گئی تھی اور اماں نے اسے تھما کر واضح لفظوں میں سمجھا دیا تھا۔

"تمہارا باپ بھتیجے کی محبت میں اندھا ہو چکا ہے۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ یہ عباس غلط صحبت میں رہ کر بگڑ چکا ہے مگر تمہارے ابا کچھ سنتے نہیں۔ یہی ہے' خود عباس کو کہو' وہ راستے سے ہٹ جائے ورنہ مجھے کچھ اور ہی کرنا پڑے گا۔ ایک بات تو طے ہے۔ تمہاری شادی عباس سے نہیں' عقیل سے ہوگی۔"

اماں نے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اس کے اندر دور دور تک ہریالی پھیل اٹھی۔ عقیل کے حوالے سے اگرچہ اس نے کبھی کوئی خواب تو نہیں دیکھا تھا مگر وہ اسے سوچنے ضرور لگی تھی۔ اپنی گنگناتی' مہکتی سوچوں میں مگن اسے عطیہ کی سرخ آنکھیں نظر ہی نہیں آئی تھیں۔ اماں کے اظہار کے بعد اس نے عباس سے دو ٹوک بات کرنے کے لیے بڑے نامناسب وقت میں بڑی نازک بات چھیڑ دی تھی۔ پہلے تو عباس کچھ سمجھ نہیں پایا تھا جب بات کچھ پلے پڑی تو وہ بھڑک اٹھا۔

"کیا بکواس ہے یہ؟"

"بکواس نہیں' حقیقت ہے یہ۔ سچ ہے۔" وہ بھی بھڑک اٹھی تھی اس نے مٹھی میں دبائی بسو کی پڑیاں اس کے منہ پر دے ماریں۔

"تم نشہ کرتے ہو اور نجانے کب سے کر رہے ہو۔ ذرا اپنی شکل آئینے میں دیکھو' پھٹکار برس رہی ہے تمہارے منہ پر۔ کالا سیاہ رنگ ہو رہا ہے چہرے کا۔ یہ اب سے۔ ابا کے سامنے نجانے کیسا خول چڑھا رکھا ہے تم نے۔ انہیں کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔" وہ غضبناک ہو کر چیخ پڑی تھی۔

"آہستہ بولو' نیچے مہمان آئے بیٹھے ہیں۔" عباس کو لمحہ بھر میں ہی اس نازک صورت حال کا احساس ہو گیا تھا کہ فی الحال فاختہ کا منہ توڑ جواب دے کر بات بڑھانا نری بے وقوفی تھی۔ نیچے مہمان بیٹھے تھے اور مہمانوں کے سامنے وہ کوئی بدمزگی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔" فاختہ نے احمقانہ انداز میں زہر خند لہجے میں کہا۔

"تم خود غرض ہو' یہ تو میں جانتا ہوں' مگر اپنی بہن کے لیے بھی بے حس ہو گی' یہ خبر نہیں تھی مجھے۔ وہ مہمان عام نہیں ہیں۔ نہ تمہارے مامے اور مامی کی طرح تمہاری اصلیت اور بدزبانی کو پہلے سے جانتے ہیں۔ وہ عاتکہ کو دیکھنے آئے ہیں۔ تمہاری بکواس ان کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے۔" وہ دھیمے مگر غراتے لہجے میں بولا تھا۔ فاختہ جاہلانہ انداز میں تمسخر اڑاتے ہوئے بولی۔

"اوہ... تو تمہارے کچے چٹھے ان کے کانوں تک نہیں پہنچنے چاہئیں۔ اس میں تمہاری توہین اور بے عزتی ہو گی مگر میں آج تمہاری "اصلیت" کھول کر رہوں گی۔" فاختہ پھر سے چلائی۔

"زبان سنبھال کے بات کرو۔"

"تم بھی مجھ سے تمیز سے بات کرو' بدکردار بے ہودہ انسان! اسکول کی استانیوں سے فلرٹ کرنے والے' نشئی' جواری۔ میں تمہیں سخت ناپسند کرتی ہوں۔ نفرت کرتی ہوں تم سے۔" زہر اگل رہی تھی۔ بدحواس باختہ سی عاتکہ بھاگی بھاگی آئی۔

"میں اماں کو فون کرنے گئی تھی۔ تم نے ادھر کیا تماشا لگا رکھا ہے؟ نیچے مہمانوں تک آوازیں جا رہی ہیں۔ بکواس بند کرو اور نیچے آؤ۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لینا چاہتی تھی مگر فاختہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑوا لیا۔

"ابا اور تم جو اونچے اونچے منصوبے بنا رہے ہو' یہ سوچنا بھی مت کہ میں تم سے شادی کروں گی۔ خود سے انکار کر دو گے تو اسی میں تمہاری بھلائی اور عزت ہے ورنہ میرا انکار تو پوری برادری سنے گی۔ اتنی بے عزتی کروں گی تمہاری کہ منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی تمہیں۔"

فاختہ نے غرا کر اپنی بات مکمل کی تھی' تب ہی اس کی نظر جالی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتی خواتین پر پڑی تھی اور ان کے چہرے پر پھیلے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ گویا وہ اس کی ساری "بکواس" سن چکی ہیں۔ جب تک گرتی پڑتی نانی اس تک پہنچیں اتنی دیر میں مہمان خواتین کانوں کو ہاتھ لگائے اس کی زبان کے جوہر دیکھ کر توبہ توبہ کرتے ہوئے باہر نکل گئیں' جاتے جاتے انہوں نے نانی کو بے شمار باتیں سنائیں۔

"ایسی تربیت کی ہے اپنی نواسیوں کی۔ جیسی چھوٹی ہے ویسی ہی بڑی لڑکیاں بھی ہوں گی۔ آخر بچے بڑوں سے ہی سیکھتے ہیں۔ ہماری طرف سے جواب ہے' ایسے بد تہذیب خاندان میں ہم تو رشتہ جوڑنے سے باز آئے۔"

مہمان خواتین اسے کوستی چلی گئیں تو نانی کا جلال عود آیا تھا مگر عباس مارے خفت و شرمندگی سے سر ہی نہ اٹھا سکا۔ وہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا سیڑھیاں اتر کر باہر نکل گیا۔ پیچھے سے نانی کی محبت بھری پکاریں ابھرتی رہیں مگر وہ لوٹ کے گھر آ ہی نہیں سکا۔ حتیٰ کہ چاچا خود اس سے معافی مانگنے چلے آئے۔ چاچا کی محبت اور عاجزی نے اس کا نرم دل پھر سے پگھلا دیا تھا مگر فاختہ کو معاف کرنے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی لغت میں کم از کم فاختہ کے لیے معافی کا اب کوئی لفظ نہیں بچا تھا۔

"میرے لیے اس کے دل میں اتنا زہر بھرا ہے؟" رات کو سوتے میں بھی اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ بے قراری سے گرم بستر چھوڑ کر ٹہلنے لگتا تھا۔ پھر رات بھر اسے نیند ہی نہیں آتی تھی۔

"اتنی ذلت' ایسی رسوائی... اتنے گندے الفاظ؟" ضبط کرتے کرتے بھی اس کی آنکھیں چھلک پڑتی

تھیں۔ اندر کی بے قراری کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی۔ اس کا کام سے بھی دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ بس زہریلی سوچوں کے زہر نے دل سے ہر جذبے کو نوچ کر پھینک دیا تھا۔ گھر کی وہ بات جو چار لوگوں کے درمیان تھی' ماسی نوراں کے توسط سے نجانے کس کس تک پہنچ گئی۔ فاختہ کا ہر لفظ اس کے اندر خون کے آنسو گرا رہا تھا۔ لبوں پر خاموشی کا قفل تھا۔

☆ ☆ ☆

"عطیہ اور عاتکہ دونوں ذرا کم رو ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ عقیل کا ان کی طرف کچھ رجحان ہو گا جبکہ فاختہ کے لیے یقیناً" وہ بھی انکار نہیں کر سکتا۔ میری خواہش ہے' فاختی کو عقیل سے بیاہ دوں گی تو میرا بھانجا گھر بار کا مالک بن جائے گا اور عطیہ کے لیے تو شاید ریاض کی کزن ثمینہ کا ارادہ ہے۔ اماں بتا رہی تھیں کئی مرتبہ ثمینہ نے ڈھکے چھپے لفظوں میں بات بھی کی ہے' رہی عاتکہ تو اس کی مجھے فکر نہیں۔۔۔ بھائی سے صلح کر لوں گی تو بھابھی ایک بیٹے کو لازمی ادھر بیاہ دے گی۔ اسے برادری سے باہر رشتے کرنے کے بعد کچھ ہوش آ ہی گیا ہے۔ اب چھوٹے لڑکے کے لیے خاندان ہی میں رشتہ دیکھ رہی ہے۔ بس میں آج ہی عقیل سے دوٹوک بات کر کے فاختی کی منگنی کا اعلان کرتی ہوں۔"

اماں فون پر مگن سی اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں اور ادھر فاختہ گویا سچ مچ ہوا میں اڑنے لگی۔ کتنا خوبصورت' روشن اور کھلا کھلا سا سماں تھا۔ وہ اڑتے اڑتے بہت بلندی پر پہنچ گئی تھی جب کسی نے ایک جھٹکے کے ساتھ فاختہ کے پر کھینچ لیے۔ وہ گویا نیند سے ہڑبڑا کر جاگی تھی۔ اس کے شانے پر پنجے جمائے عاتکہ خونخوار تیور لیے اسے گھور رہی تھی۔

"تم۔۔۔" اس نے گہری سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔ "ڈرا کر رکھ دیا ہے مجھے۔" وہ اپنی خفت مٹاتے زیر لب بڑبڑائی۔

"تم ڈرتی بھی ہو کسی سے؟" عاتکہ کا لہجہ بلا کا طنزیہ تھا۔

"کیوں میں انسان نہیں ہوں؟" اسے بھی غصہ آگیا۔

"جو کسی کے جذبات کا خون کرے' وہ انسان کہلانے کا حق دار تو نہیں۔" عاتکہ نے تنفر سے کہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت چھت پر موجود تھیں برابر والے گھر سے حلوے کی خوشبو آ رہی تھی۔ ابھی وہ ثمینہ آنٹی کی گاجروں کے ڈھیر کو چھیل کر آ رہی تھی۔ فاختہ کو چھت پر دیکھ کر اس سے رہا نہیں گیا تھا سو اس کے چودہ نہ سہی دس بارہ طبق روشن کرنے چلی آئی۔

"آخر تم دونوں کو ہو کیا گیا ہے؟ بس مجھے کاٹنے کو دوڑتی رہتی ہو۔ عباس والا معاملہ تو اب ٹھنڈا ہو گیا ہے" فاختہ نے عجیب زہریلے لہجے میں کہا تھا۔

"تمہارے نزدیک معاملہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ یعنی کسی کا دل' سوچ اور جذبات کو زخمی کر دینے کے بعد یہ سوچ لیا جاتا ہے کہ اگلا بندہ آپ کی ہر بات کو بھول چکا ہے۔ اس کی خاموشی کو معاملہ فہمی کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جا سکتا' ورنہ بھولا تو وہ کچھ بھی نہیں۔"

"اس میں دل دکھانے والی کون سی بات ہے۔ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا' میں نے اسے صاف صاف بتا دیا ہے۔" وہ گنے کو چھیل کر اس کا "رس" چوستے ہوئے بولی تھی۔

"یہ بات کسی طریقے سے بھی تو اس تک پہنچائی جا سکتی تھی پھر تم نے اس پر چرس پینے کے بھی الزام لگائے تھے۔ ابھی بھی کہتی ہو تم نے اس کا دل نہیں دکھایا؟" عاتکہ نے چبھتے لہجے میں کہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ سی کر گئی۔

"میں نے اس پر جھوٹا الزام نہیں لگایا" اس کی بے نیازی کے بھلا کیا ہی کہنے تھے۔

"وہ نشہ کرتا ہے۔ میں نے احاطے سے وہ پڑیاں منگوا کر اس کے منہ پر ماری تھیں اور پھر اسکول میں اس کے لو لیٹرز بھی پکڑے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" عاتکہ گویا اچھل ہی پڑی۔

"وہ ایک وقت میں تین تین استانیوں کے ساتھ فلرٹ کر رہا تھا۔ بات کھلی تو اس کے خط بھی پکڑے گئے۔ میری بات پر یقین نہیں آتا تو اماں سے پوچھ لو۔" فاختہ نے اس کی حیرت سے ابلی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"مائی گاڈ! اور اماں کو وہ خطوط یقیناً" ماسی نوراں نے لا کر دیے ہوں گے؟" عاتکہ نے تلخی سے پوچھا۔

"ویسے اماں جو کر رہی ہیں' بالکل ٹھیک نہیں کر رہیں۔" عاتکہ کی بوجھل سی آواز نے اس کے چھلکے اٹھاتے ہاتھوں کو پل بھر کے لیے ساکت کر دیا تھا۔

"اماں نے کیا ٹھیک نہیں کیا؟"

"تم جانتی ہو فاختہ! مگر پھر بھی انجان بن رہی ہو۔" اس نے آملوں سے بھری ٹوکری اٹھا کر نیچے دے ماری تھی۔ غم و غصے کی شدت سے اس کی آنکھیں سرخ ہو کر آنسوؤں سے بھرنے لگی تھیں۔ آواز نم تھی اور لہجہ بھرا رہا تھا۔ فاختہ کا دل پھر سے سکڑ کر سمٹ گیا۔ وہ یک ٹک اس کے سرخ رخساروں پر پھسلتے آنسوؤں کو دیکھنے لگی۔

"تم بہت خود غرض ہو فاختہ! صرف اپنا سوچتی ہو۔ اپنے آرام اور سکھ کو دیکھتی ہو۔ اپنی خوشی اور جذبات کا احساس رکھتی ہو۔ باقی سب جہنم میں جلیں' تمہیں کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔" وہ سانس لینے کو رکی تو فاختہ نے گھبرا کر کہا۔

"یہ ٹھیک نہیں۔ یہ حقیقت بھی نہیں۔" اس نے کمزور سا احتجاج کیا تھا۔

"تو پھر حقیقت کیا ہے؟" عاتکہ نے ضبط کرنے کے باوجود پھٹی آواز میں غرا کر کہا۔

"پتا نہیں۔" وہ گھبرا کر چھلکے وہیں فرش پر پھینکے بھاگ کر نیچے کسی کمرے میں چھپ جانا چاہتی تھی مگر اس سے اٹھا ہی نہیں گیا۔

"تمہیں کیسے پتا ہو سکتا ہے۔ تم اپنے خوابوں کے دائرے سے کبھی نکل کر دیکھنا۔ عطیہ کی بھیگی پلکوں' ویران آنکھوں اور بند ہونٹوں کے سارے راز کھل کر نظر آ جائیں گے۔"

☆ ☆ ☆

موسم بدلتے ہی دھوپ چبھنے لگی تھی۔ درختوں کی کونپلیں پھوٹیں تو بہار کی آمد کا پتا چلا تھا۔ ورنہ تو ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ ثمینہ آنٹی کے طاہر کی ان کے گھر آمد و رفت خاصی بڑھ گئی تھی اور مقام حیرت تو یہ تھا کہ اماں کو اس کا آنا جانا برا نہیں لگتا تھا بلکہ وہ خود بھی کبھی کبھار کسی نہ کسی بہانے سے ثمینہ آنٹی کی خیریت معلوم کرنے چلی جاتی تھیں۔ طاہر نیوی میں کمیشنڈ آفیسر تھا' شکل و صورت بھی ٹھیک تھی' سب سے بڑھ کر ثمینہ جیسی باسلیقہ' وضع دار عورت کا سلجھا ہوا بیٹا تھا اور شاید اماں کو عطیہ کے لیے دل و جان سے پسند آگیا تھا' تب ہی پرانے اختلاف بھلا کر وہ نئی رشتہ داری کے متعلق بہت کچھ سوچ چکی تھیں حالانکہ ثمینہ آنٹی جتنے سال ان کے پڑوس میں رہی تھیں' وہ کوئی یادگار اور خوشگوار عرصہ نہیں تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ سوچ میں تبدیلی تو آ ہی جاتی ہے جیسے اماں کی سوچ بھی خاصی بدل گئی تھی۔ انہوں نے خود ہی ثمینہ کے بیٹے طاہر کو عطیہ کے لیے فائنل کر لیا تھا۔ رہی عاتکہ۔۔۔ تو اس کے لیے وہ اپنے بھائی سے صلح کرنے کا سوچ بیٹھی تھیں اور فاختہ تو عقیل کے لیے ہی تھی مگر بڑی دو کو چھوڑ کر چھوٹی کی منگنی یا نکاح ان کے رشتوں میں رکاوٹ کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ شاید اسی لیے وہ عقیل سے فی الحال فائنل بات کرنے سے کترا رہی تھیں۔ اور ویسے بھی ان دنوں عقیل ان سے بہت کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا اور عطیہ بھی بس کام کیے جاتی۔ نہ بولتی تھی نہ مسکراتی تھی۔ چاہے وہ جتنی بھی لاپروا تھیں' مگر عطیہ کی گہری خاموشی ان کے دل کو وسوسوں کا شکار بھی کر رہی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح فاختہ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو وہ ازلی بے نیازی سے بولی تھی۔

"وہم ہے اماں آپ کا۔ عطیہ پہلے کون سا بہت بولتی تھی۔" اماں کی پریشانی کسی طور کم نہیں ہو سکی تھی۔

"ایسی خاموش بھی نہیں رہتی تھی۔ نجانے اسے کیا ہوا ہے۔" انہوں نے فکرمندی سے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔

"کچھ نہیں ہوا اماں! آپ ٹینشن نہ لیں۔ بس عطیہ کے رشتے کی بات چلائیں۔ کوئی ہلا گلا ہونا چاہیے۔"

"رشتے کی بات خود سے کیسے چلاؤں؟ ثمینہ روز تو آتی ہے مگر اس نے اشارتاً بھی ابھی تک مجھ سے بات نہیں کی۔" اماں نے اپنی پریشانی کی ایک اور وجہ بتائی تھی۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر اماں کے متفکر چہرے کی طرف دیکھا اور بولی۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ کرلیں گی بات۔ ابھی تو انہیں آئے کچھ عرصہ ہوا ہے' اچھی طرح سیٹ تو ہولیں۔"

"جلدی نہ کروں تو اور کیا کروں؟ عقیل سے بات بھی کرنی ہے۔ کہیں تمہارے ابا عباس سے تمہاری بات نہ طے کردیں' آخر تم نے ایک غیر مناسب وقت میں عباس کے ساتھ جھگڑا کھڑا کرلیا تھا۔ میں نے خود ایک طریقے سے اس کے سارے کرتوتوں کے کچے چٹھے کھول کر تمہارے ابا کو دکھانے تھے مگر تمہاری جلد بازی نے معاملہ بگاڑ دیا ہے۔" اماں نے خفگی سے بڑبڑا کر کہا۔

"آپ نے خود ہی تو کہا تھا عباس کو بتادینا کہ اسے پسند نہیں کرتی۔" وہ فوراً چمک کر بولی۔

"یہ تو نہیں کہا تھا کہ نوراں آپا کی لائی افیون اور چرس کی پڑیاں بھی اس کے منہ پر دے مارو۔" اماں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اماں! یہ تو بہت اچھا ہوا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں' وہ خود ہی راستے سے ہٹ گیا ہے۔ اب تو گھر بھی کم کم آتا ہے۔" فاختہ نے خوش دلی سے کہا۔

"ہاں' یہ تو تم نے ٹھیک کہا ہے۔" انہوں نے فوراً اثبات میں سرہلا کر تائیدی انداز میں کہا۔ "ویسے رشتے کی بات تمہارے ابا نہ کرتے تو عباس اتنا بھی برا نہیں تھا' مجھے تو نوراں آپا کی عباس کے متعلق بتائی باتیں جھوٹ لگتی ہیں۔ وہ نشے وغیرہ سے دور ہی رہنے والا ہے' اوپر سے جو استانیوں کے ساتھ عباس کے چکر کا قصہ آپا نے بتایا تھا' وہ بھی نری کہانی کے علاوہ کچھ نہیں۔ بھلا سوچو تو اگر اس کا کردار ٹھیک نہ ہوتا تو اسے اسکول سے نکال دیا جاتا مگر وہ تو اب بھی روزانہ اسکول جاتا ہے۔ ایسی باتیں کوئی ڈھکی چھپی رہتی ہیں؟" اماں کے پرسوچ انداز میں بولنے پر فاختہ کچھ حیران اور کچھ پریشان رہ گئی تھی۔

"مگر اماں! ماسی کو کیا ضرورت تھی جھوٹ بولنے کی؟ اور پھر آپ ہی تو بڑھ چڑھ کے اسے بے ہودہ ذلیل' نشئی اور نجانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ اب آپ کو عباس میں اچھائیاں نظر آنے لگی ہیں۔" اس نے مشکوک انداز میں اماں کو غور سے دیکھا تو بے ساختہ نظر چرا کر اسے ڈپٹنے لگیں۔

"چل ہٹ' بکواس نہ کر۔"

"میں نے اس کے اسکول سے پتا کروایا ہے۔ ایسی کوئی بات سرے سے ہے ہی نہیں۔ نجانے نوراں آپا نے یہ جھوٹ کیوں بولا ہے۔" اماں آہستگی سے زیر لب بڑبڑائی تھیں۔ "ویسے فاختی! میں نے رات کو ایک اور بات بھی سوچی ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اماں نے ذرا دبی آواز میں شرمندگی چھپاتے ہوئے کہا۔ فاختہ اپنی عادت کے مطابق فوراً متجسس ہوگئی تھی۔

"کون سی بات؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ اماں کا چہرہ قدرے سرخ سیاہ ہوگیا تھا۔ عجیب سی خفت اور ندامت سی پھیلی ہوئی تھی۔

"میں سوچ رہی تھی اگر ثمینہ' عطیہ کا رشتہ طا کے لیے مانگ لے تو عاتکہ کے لیے عباس ٹھیک رہے گا۔ بس رات کو سوچتے سوچتے ایسے ہی ذہن میں خیال سا گزرا تھا۔ تم... تم کیا کہتی ہو؟" فاختہ کا منہ حیرت سے کھل کر رہ گیا۔

"عاتکہ اور عباس؟" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "عباس میں راتوں رات خوبیاں کیسے کھل گئیں؟"

"پھر وہی بکواس۔" اماں کو یہ سچائی ہضم نہیں ہوئی تھی۔ "میری بات غور سے سن۔" وہ اسے ڈپٹ کر کندھے پر جھانپڑ لگا کر سیدھی ہوئی تھیں جبکہ فاختہ آنکھیں پھاڑ کر ان کا چہرہ دیکھے جارہی تھی۔

"تمہارے ذمہ بس ایک کام ہے۔" اماں سابقہ ندامت اور پشیمانی کے چنگل سے نکل کر رواں لہجے میں بولی تھیں۔

"کون سا کام؟" اس نے ہکلائی آواز میں پوچھا۔

"بس تم نے اپنے ابا کے ذہن میں ایک بات ڈالنی ہے۔ پہلے وعدہ کرو' ابا سے منوا کر ہو گی۔" اماں اب کچھ پرجوش ہوگئی تھیں۔ فاختہ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔

"کون سی بات؟" اس کی الجھن کسی طور پر کم نہیں ہو پارہی تھی۔

"میں نادان اتنے سالوں سے کچھ سمجھی ہی نہیں۔ سوچا تھا گھر سے باہر اچھے رشتوں کی قطار لگی ہے' سو گھر کے لڑکے کو چھوڑ کر باہر ڈھونڈنے لگی' مگر ہاتھ سوائے ناکامی کے کچھ بھی نہیں آیا۔ شاید میری آنکھیں پھر بھی نہ کھلتیں۔ بس رات کو اماں نے ایک بات کی تھی' جو میرے بھی بھیجے میں سماگئی۔ وہ کہہ رہی تھیں' عاتکہ اور عباس کی شادی ہوجائے تو ہماری ساری فکریں' غم دور ہوجائیں۔ اب تمہیں اپنے ابا تک یہ بات پہنچانی ہے اور مجھے یقین ہے' عباس انکار نہیں کرسکتا۔ بس تم اپنے ابا کو منالو کسی طریقے۔ وہ تو تمہارا اور عباس کا سوچے بیٹھے ہیں' مگر میں ایسا نہیں چاہتی۔"

اماں نے سر جھکائے پہلی مرتبہ ذرا پست آواز میں ندامت سے چور لہجے میں کوئی بات کی تھی۔ فاختہ کو پہلی دفعہ اماں کی کوئی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اپنی بہن کی خاطر اسے اپنے ابا کو منانا تو پڑے گا۔ مگر دل کچھ بجھ سا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اماں اور ماسی نوراں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے۔"

یہ خبر فاختہ تک اس وقت پہنچی تھی جب وہ نائلہ اور عاتکہ کے ہمراہ ثمینہ آنٹی کی چھت پر بیٹھ کے چار مغز کا حلوہ بنارہی تھی۔ اس کام پہ انہیں نانی نے لگا رکھا تھا بقول نانی کے اس خیرے کی طاقت سے ثمینہ آنٹی کے جوڑوں کا درد بالکل غائب ہوسکتا تھا سو وہ صبح سے بادام توڑنے' ناریل کدوکش کرنے اور پستہ کوٹنے میں مصروف تھیں۔

"یار! نانی کے ٹوٹکے بڑے آزمائے ہوئے ہیں۔ کیا خیال ہے اس خیرے سے بھرا ایک ایک چمچ ہم بھی نہ کھالیں تاکہ بڑھاپے میں جوڑوں کی تکلیف میں مبتلا نہ ہونا پڑے۔" نائلہ نے سارے بادام چھلکوں سے نکال لیے تو خالی چھلکے اٹھا کر پچھلے صحن میں پھینک آئی۔

"مشورہ ویسے برا نہیں۔" عاتکہ نے فوراً تائید کی تھی۔

"کیا کہتی ہو امن کی فاختہ!" نائلہ نے سوچوں میں گم بیٹھی فاختہ کو بھی گفتگو میں گھسیٹنے کی کوشش کی تھی۔

"آں... ہاں' مجھ سے کچھ کہا ہے؟" وہ چونک کر حال کی دنیا میں لوٹی تھی۔

"نہیں' تمہارے "ان" سے مخاطب ہوں۔" نائلہ نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا۔ ویسے بھی وہ خاصی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ اس کا مزاج عاتکہ سے بہت ملتا تھا سو دونوں کے درمیان گہری دوستی دنوں میں پروان چڑھی تھی کہ ایک دوسرے کے بغیر اب سانس لینا بھی محال تھا۔ کبھی عاتکہ ثمینہ آنٹی کے گھر پہنچی ہوتی تو کبھی نائلہ ادھر آٹپکتی۔

"فاختہ کی غمگین صورت اور کھوئے کھوئے انداز کچھ اور ہی راز افشا کررہے ہیں۔" نائلہ نے ہنس کر چھیڑا۔

"کیسے راز؟" عاتکہ نے چونک کر پوچھا۔

"یہ فاختہ جو اداسی کی شاخ پر جھول رہی ہے اس کی کھوئی کھوئی صورت بتاتی ہے جناب کو محبت کا روگ لگنے والا ہے یا لگ چکا ہے۔" نائلہ نے بہت مزے سے جھوم جھوم کر اپنی بات مکمل کی تھی جبکہ عاتکہ تو اچھل ہی پڑی۔

فاختہ ان کی چھیڑ چھاڑ سے بے نیاز بے خیالی میں ہی

اٹھ کھڑی ہوئی تھی جب گود میں رکھی ساری کشمش فرش پر جاگری۔ اس نے نائلہ اور عاتکہ کے حیران چہروں پر نظر ڈالے بغیر جوتی پیروں میں پھنسائی اور دو چھتوں کو علیحدہ کرنے والی چھوٹی سی دیوار کو پھلانگ کر اپنی چھت پہ کود پڑی مگر پیر زمین پر جمے نہیں تھے اس لیے وہ قدرے لڑکھڑا گئی تھی۔

"محبت۔" اس نے کپکپاتے ہونٹوں پر ہاتھ پھیر کر آہستگی سے کہا تھا۔ "بھلا مجھے کس سے محبت ہے؟" وہ سر جھٹکتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی تھی مگر نظریں عباس کے کمرے کی طرف غیرارادتاً اٹھ گئیں۔ کمرے کا دروازہ آج بھی بند تھا اور روٹھا ہوا کمرے کا مکین آج بھی گھر نہیں لوٹا تھا۔ وہ بھرے دل سے سیڑھیاں اترتی نیچے چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا! آخر تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟" انہوں نے آنکھوں میں اتری پریشانی کو چھپاتے ہوئے پوچھا تھا۔ یہ ان کی نرمی اور اعلا درجے کی شرافت و محبت کا اظہار تھا' جو اس کے منہ پھاڑ کر اپنے رشتے سے انکار کی بات پر بھی وہ خاموشی سے معاملہ سنبھالے ہوئے تھے۔ مگر اندرونی طور پر ان کے دل میں عجیب سی توڑ پھوڑ شروع ہو چکی تھی۔ شاید انہیں توقع نہیں تھی کہ ان کی بے تحاشا نرمی اور ڈھیل اسے اتنا بے ادب اور منہ پھٹ بنا دے گی۔

"بس ابا! مجھے عباس بھائی اچھے نہیں لگتے۔" ابا کے سامنے آج عباس کو قابل احترام رشتے سے بلانا ضروری تھا۔

"یہ تو انکار کے لیے کوئی جواز نہ ہوا۔" ابا کی آنکھوں میں حیرانی اتر آئی۔

"عباس بھائی بچپن میں مجھے بہت مارتے تھے۔ یاد کریں! اماں جو مجھے جیب خرچ دیتی تھیں' وہ چھین کر چھپا دیتے تھے اور ویسے بھی ابا! ماسی نوراں کہتی ہیں عباس بھائی صرف نشئی ہی نہیں' بلکہ ان کے استاثیوں کے ساتھ چکر۔۔۔" ماسی نوراں کی زبان میں فراٹے سے بولتی وہ یکدم زبان دانتوں تلے دبا گئی تھی جب ابا نے حیرانی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"عباس نشئی ہے؟ یہ تم سے کس نے بکواس کی ہے؟" اس نے پہلی مرتبہ ابا کا رنگ سرخ ہوتے دیکھا تھا اس لیے ذرا گھبرا گئی۔

"ماسی نوراں نے۔"

"اچھا' تو یہ ساری پٹیاں ماسی نوراں کی پڑھائی ہوئی ہیں اور اسی نے تمہاری ماں کے دل میں بھی عباس کے خلاف زہر بھر دیا ہے۔" ابا گویا ساری الجھی گتھیوں کو سمجھ چکے تھے۔ اب بس انہیں عقیل کو ساری بات سمجھانی تھی جو پہلے ہی غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔ "اس انکار کو فی الحال اپنے تک محدود رکھنا۔" انہوں نے کہا تو صرف اتنا۔

وہ اٹھ کر چلے گئے تھے۔ بات یہیں پہ دب گئی تھی مگر نانی تک نجانے کیسے اس کا انکار پہنچ گیا' سو اسی وجہ سے وہ اس پر خوب تپی ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اس نوراں مکار' کٹنی کا کام دیکھو! کیسے منہ پھاڑ کر رشتے کی بات کر گئی ہے۔ اس کی اتنی جرأت کیسے ہوئی؟" اماں غصے سے بے حال بیٹھی تھیں۔ فاختہ نے ذرا آگے کو جھک کر دیکھا تو اسے ثمینہ آنٹی کی بھی جھلک نظر آ گئی تھی۔ کہاں تو کل تک ثمینہ آنٹی کو اماں اپنی سب سے بڑی دشمن سمجھتی رہی تھیں اور کہاں آج ثمینہ آنٹی سے اپنے دکھڑے روئے جا رہے تھے۔ اماں کی بھی مثال نہیں ملتی تھی۔ پل میں تولہ' پل میں ماشہ۔

پچھلے کئی سالوں سے اماں کی ہمدردیاں' دکھ' پریشانیاں بانٹنے کا ٹھیکا نوراں نے لے رکھا تھا۔ ماسی نوراں کی محبت میں تو وہ ابا اور نانی تک سے الجھ پڑتی تھیں۔ جب بھی ابا یا نانی ماسی نوراں کو اپنے گھر آنے سے روکتے اماں نیا فساد کھڑا کر دیتی تھیں۔

"آپ لوگ تو چاہتے ہی نہیں۔ میں اپنے دکھ سکھ کسی سے بانٹ لوں۔ ایک ہی میری سہیلی ہے۔ اس کی آپ کو کھٹکتا ہے۔" اماں کا جذباتی حملہ دیکھ کر ابا تو خاموش ہو جاتے تھے تاہم نانی چمک کر بول پڑتیں۔

"کوئی ڈھنگ کی سہیلی بنا لیتا تھی۔ تجھے بھی اس کے علاوہ پورے پنڈ میں کوئی اور سہیلی نظر نہیں ملی۔" نانی کہتی تو سچ ہی تھیں مگر اماں کو ان کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اور جب بات سمجھ میں آئی تو بات ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اب صرف شرمندگی' پچھتاوا اور غصہ باقی رہ گیا تھا۔ فاختہ نے نا سمجھی کے عالم میں کان دروازے کے ساتھ چپکا دیے تھے جب ثمینہ آنٹی کی نرم اور خلوص سے بھری سنجیدہ آواز سنائی دی۔

"نرجس! اس میں غصہ کرنے والی کیا بات ہے؟ جس گھر میں بیری ہوتی ہے' وہاں پتھر تو لازمی آتے ہیں۔ اگر نوراں اپنے بیٹے کے لیے رشتہ ڈال گئی ہے تو تم سلیقے سے انکار کر دو۔"

"انکار۔۔۔ میں تو اس کے چیتھڑے اڑا دوں' ذلیل عورت نہ ہو تو' کبھی عقیل کی برائیاں کرتی تھی کبھی عباس کے بارے میں شرانگیز باتیں پھیلاتی تھی۔ کئی مرتبہ اس کے کہنے پر میں نے عقیل کی بے عزتی کی' عباس کو گھر سے نکالا۔ مجھے تو اب اس کے ارادے سمجھ میں آئے ہیں۔ میں احمق اس کی باتیں مانتی چلی گئی۔ فاختہ کے لیے رشتہ ڈال کے گئی ہے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں فاختہ کا عقیل سے رشتہ طے کیے بیٹھی ہوں۔ سارے زمانے کا نکھٹو تنویر' جس پر سال کے گیارہ مہینے قرض چڑھا رہتا ہے۔ ہمارے مکان اور پولٹری فارم پر نظر لگائے بیٹھا ہے۔ خود سوچو' اگر اسے لالچ نہ ہوتا تو فاختہ کے بجائے عطیہ یا عاتکہ کے لیے رشتہ ڈالتی مگر اسے پتا تھا ہم فاختہ کو گھر میں رکھنے والے ہیں اور جو گھر داماد ہو گا وہ ہی گھر بار سنبھالے گا۔"

اماں کی آواز شدت غم سے پھٹ رہی تھی۔ ماسی نوراں کی اصلیت کھل کر سامنے کیا آئی تھی اماں کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

"تم غصہ نہ کھاؤ۔ اور بچیوں کے لیے بھی فکر مت کرو۔ جوان کے نصیب کا ہو گا۔ ضرور مل کر رہے گا۔" ثمینہ آنٹی نے نرمی سے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"کیسے فکر نہ کروں؟ مجھے تو خفت اور شرمندگی سر نہیں اٹھانے دے رہی۔ ہائے میں کیسے اپنے یتیم بچے کا سامنا کروں گی۔ ایک ہزار مرتبہ تو میں نے اس کا دل دکھایا ہے۔" اماں نے پھپک پھپک کر روتے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کی تھی۔ انہیں اپنی ترش روئی' بدمزاجی اور عباس کے ساتھ کی جانے والی زیادتیاں اب منہ پر طمانچے مار رہی تھیں۔

"بیٹے ماؤں سے ناراض نہیں ہوتے۔ تم اسے مناؤ' یقیناً" وہ تمہاری طرف سے پہل کا منتظر ہو گا۔" ثمینہ آنٹی کی تسلی نے اماں کے دل کو ذرا ڈھارس پہنچائی مگر دروازے کے باہر فاختہ آنکھوں میں آنسو بھرے سن کھڑی تھی۔

"آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا اماں! اور ماسی نوراں! تیری قبر میں تو اللہ کرے کیڑے پڑ جائیں۔"

☼ ☼ ☼

اگر زمین اچانک ہلنے لگتی تو تب بھی وہ اتنی گھبراہٹ کا شکار ہرگز نہ ہوتیں مگر اس وقت تو ان کے وجود پر ٹھٹھرا دینے والی کپکپی طاری ہو چکی تھی۔ زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ وہ کبھی بول ہی نہیں پائیں گی' کبھی دیکھ ہی نہیں پائیں گی۔ کچھ سوچ بھی نہیں سکیں گی اور شاید ان کا سر کبھی اٹھ ہی نہیں سکے گا۔

سامنے بیٹھا ہوا لڑکا ان کا سگا بھانجا تھا' جسے ہمیشہ انہوں نے بیٹوں سے بڑھ کر چاہا تھا۔ اسے ہمیشہ عباس پر فوقیت دیتی رہی تھیں۔ عباس سے زیادہ اچھے لباس اور خوراک سے نوازا جاتا رہا تھا۔ اسے ہر معاملے میں عباس سے آگے رکھا جاتا تھا اور آج وہ ہی عزیز از جان بھانجا ان پر سنگ باری کر رہا تھا۔

"آپ کو میری بات بری لگی ہو تو میں ہاتھ جوڑ کے معافی مانگتا ہوں خالہ! لیکن آج مجھے کہنے ہی دیں کہ آپ نہ اچھی بیوی بن سکی ہیں نہ اچھی ماں۔۔۔ میں نے

آپ کو ہمیشہ صرف شکوے کرتے ہی دیکھا ہے ہر آسائش سے سجا یہ گھر آپ کے لیے جہنم ہے۔ ماں کے روپ میں بھی رشتوں ناتوں میں تفریق کرتی ہیں۔ ہمیشہ عطیہ اور عاتکہ پر فاختہ کو فوقیت دی۔ فاختہ آپ کا دوسرا روپ ہے خالہ! مزاج عادتوں سے لے کر شکل و صورت تک۔۔۔ مگر ہر کسی میں خالو جی جتنا حوصلہ نہیں ہوتا۔

آپ میرا اور فاختہ کا رشتہ طے کرنا چاہتی ہیں تو میں معافی چاہتا ہوں خالہ! میرا اور فاختہ کا مزاج نہیں مل سکتا۔ وہ مجھے چھوٹی بہنوں کی طرح ہمیشہ عزیز رہے گی مگر بیوی کے روپ میں عطیہ کے علاوہ کوئی نہیں۔ اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں تو عطیہ کے حوالے سے مجھے اپنا داماد بنالیں اور رہی بات فاختہ کی تو اس کے لیے عباس سے بہتر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ وہ خالو جی کا بھتیجا ہے اور سچ بات تو یہ ہے ان کی ہر شے کا وارث بھی عباس کو ہی ہونا چاہیے۔ مجھے کسی چیز کا لالچ نہیں ہے۔ جو بھی آپ کی عباس کے متعلق غلط فہمیاں ہیں انہیں دور کرلیں۔۔۔ یہ ساری ماسی نوراں اور اس کے بیٹے کی سازش تھی جنہیں آپ اپنی کم عقلی کے باعث سمجھ نہیں پائیں۔ تنویر کی وجہ سے میں اور عباس بھی بدظن ہوئے مگر جلد سنبھل گئے۔ مگر آپ نے تو رشتے توڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔" اپنا سارا غصہ اتار کر وہ باہر نکل گیا جبکہ نرجس کے وجود میں جان تک باقی نہیں رہی تھی۔ ان کا پورا وجود تیز بگولوں کی زد میں تھا اور یہ بگولے باہر کھڑی فاختہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے سسکتے ہوئے دیوار سے لگتی زمین پر بیٹھتی جارہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میرا کیا قصور تھا اماں! بس آپ کی نظر میں اچھا بننے کے لیے۔ آپ سے عطیہ اور عاتکہ سے بھی زیادہ محبت وصول کرنے توجہ لینے کے چکر میں آپ کی ہر بات مانتی چلی گئی تھی۔ کبھی نانی کے سامنے کھڑا کردیتی تھیں آپ۔ کبھی ابا کے سامنے، کبھی ماموں مامی کے سامنے۔ مجھے سب کی نظروں میں بُرا بنا دیا ہے آپ نے۔"

وہ ماں کی گود میں سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور نرجس کے پاس اسے تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ نہیں بچا تھا۔ یہ انسانی ذہن بلکہ ایک ماں کے ذہن کی سب سے کمزور ترین سوچ تھی۔ بچوں میں سے ایک خاص بچے کو جو ان سے زیادہ قریب ہوتا ہے غیر محسوس طریقے سے اپنا ہتھیار بنالیتی ہیں۔ پھر اس بچے کو کبھی باپ، کبھی دادی، چچی، تائی کے سامنے کھڑا کرکے خود خاموش تماشائی بن جاتی ہیں۔ اس بات سے بے خبر کہ ایسے بچے منہ پھٹ، بدزبان اور خود سر ہوجاتے ہیں۔ معاشرے میں انہیں کوئی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔۔۔ ان کی بدزبانی کے باعث کوئی ان سے کلام نہیں کرتا اور اگر بات بیٹی کی ہو تو سب سے مسئلہ اس کی شادی کے وقت ہاتھ پیر پھولا دیتا ہے۔ جب نوراں جیسی عورتیں ہی سامنے کھڑے ہو کر انگلی اٹھا کہتی ہیں۔

"تمہاری یہ بیٹی اس قابل نہیں کہ کوئی عزت دار بندہ اسے بیاہے۔ ایسی تیز طرار اور بدزبان لڑکیاں بس گھر کی دہلیز پر بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ میں نے تم پر ترس کھا کر اپنے ہیرے بیٹے کا رشتہ ڈالا تھا مگر تم دونوں ماں بیٹی اس قابل ہو ہی نہیں۔۔۔"

نوراں اپنی بے عزتی کے جواب میں خاموشی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی اس کی تو چال ہی الٹ گئی تھی۔ ادھر تنویر ماں کو ناکام آتا دیکھ کر اور نرجس کے انکار آخری مرتبہ عباس کو خوب بھڑکانے احاطے میں گیا تب ہی عقیل بھی وہاں پہنچ گیا۔ تو عقیل اور عباس نے تنویر کی خوب پھینٹی لگائی۔

"اچھا، تو یہ ہم دونوں کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ اس کی ستی ماں نے مجھے نشئی مشہور کر رکھا تھا۔ جھوٹے لو لیٹر اس سے لکھوا لکھوا کر چاچی کو دکھاتی تھی اور ان کے کان بھرتی تھی، جس کی وجہ سے میری بھولی، معصوم، نادان اور کانوں کی کچی چاچی ڈنڈا اٹھا کر میری شامت لے آتی تھیں۔ سو میرا سامان روز سڑک پر پڑا ہوتا تھا۔۔۔ آج تو ماسی نوراں کا لعل میرے ہاتھوں جلا ہوا کباب بن کر جائے گا۔۔۔" عباس لاتیں گھونسے مار مار کر جب تنویر کا بھرکس نکال چکا تب تنویر نے ان دونوں کے پیر پکڑ لیے۔

"میرے بچپن کے یارو، میرے پیارو! مجھے معاف کردو۔ میں لالچ میں آگیا تھا۔"

"اسے خالو کے مرغی خانے میں ایک رات کے لیے بند کردو۔۔۔ اس کی سزا کے لیے بس ایک رات ہی کافی ہے۔" عقیل گلی محلے کے بچوں کو اکٹھا کرکے تنویر کو مرغی خانے لے گیا تھا۔ جب واپس آیا تو بان کی چارپائی پر غصہ ضبط کرتے عباس کو لیٹا دیکھ کر چونک گیا۔

"یار عباس!" وہ اس کے پیروں کی طرف بیٹھ گیا۔

"ہاں۔" عباس اسی کے انداز میں بولا تھا۔

"مان بھی جا اب۔۔۔ اور کتنی منتیں کروائے گا تو؟" عقیل نے اس کے مٹی میں لتھڑے پیروں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے۔ وہ اپنے پیر سمیٹ کر اٹھ گیا۔

"پیروں کو ہاتھ کیوں لگا رہے ہو؟" اس نے خفگی سے ٹوکا۔

"تجھے منانے کے لیے۔"

"منانے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا۔" عباس نے کہا۔

"تو پھر۔۔۔؟" اس نے پریشانی سے پوچھا تھا اور پھر اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر خود بھی اٹھ گیا۔

"منانے کا طریقہ یہ ہوتا ہے۔" عباس نے پریشان کھڑے عقیل کو کھینچ کر گلے لگالیا تھا۔ وہ بے اختیار نم آنکھوں سے مسکرا دیا۔

"میرا دل کبھی بھی تمہاری طرف سے میلا نہیں ہوا۔ بے شک تنویر جتنی مرضی گرد اڑاتا رہا تھا تمہارے خلاف۔" عقیل اس کے سینے سے لگا زیر لب بڑبڑایا تھا۔

"اور میرا بھی۔۔۔" عباس نے بھی مسکرا کر کہا۔

"تو پھر آؤ گھر چلتے ہیں، خالہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔" عباس خاموش کھڑا رہا تو وہ گھبرا گیا۔

"تم خالہ کو معاف کردو گے نا۔۔۔" عقیل نے ذرا تشویش سے انداز میں پوچھا تھا۔

"چاچی میری ماں ہیں۔ میں ان سے ناراض نہیں ہوسکتا۔ اگر ان سے خفا ہوتا تو اتنی مرتبہ انہوں نے مجھے گھر سے نکالا ہے اتنی بے عزتی کے بعد کبھی واپس نہ آتا۔ میرے دل میں ان کے خلاف ذرا بھی غصہ نہیں۔ بس گھڑی بھر کے لیے صدمہ ہوتا تھا پھر ختم بھی ہوجاتا تھا۔"

وہ سادگی سے اس کے برابر چلتا ہوا بول رہا تھا۔ عقیل نے ذرا رک کر اس کے سادہ سے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور پھر آہستگی سے بولا۔

"اور فاختہ کے لیے تمہارے دل میں کیا ہے؟"

"اس کا میرے سامنے نام بھی مت لو۔" عباس نے اتنے ٹھنڈے لہجے میں کہا تھا کہ اس کے برابر چلتا عقیل لمحہ بھر کے لیے سن ہو کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

عباس کی واپسی سے گھر میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اتنے دن سے جو سوگوار سی فضا قائم تھی وہ ایک ہی چھناکے سے ٹوٹ کر رہ گئی۔ اماں اور عباس کی صلح کا منظر بھی خاصا ابر آلود تھا۔ برابر سے ثمینہ آنٹی اور نائلہ وغیرہ بھی آگئی تھیں۔ عطیہ کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی اور عاتکہ خواہ مخواہ شرمائے جارہی تھی۔ آخر بات ہی کچھ ایسی تھی۔ ثمینہ آنٹی نے عباس کی موجودگی میں ابا اور اماں سے بڑے سلیقے اور سبھاؤ کے ساتھ عاتکہ کا رشتہ طاہر کے لیے مانگ لیا تھا اور ادھر عقیل بول رہا تھا۔

"میری ماں کو تو میری پروا نہیں اور نانی کو دیکھو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی ہیں۔ اب قبر میں سے اپنے ماں باپ کو کیسے اٹھا کر لاؤں جو..." اسے کلستا دیکھ کر عباس نے دھیرے سے اس کا پیر دبایا تھا۔

"ذرا چھری تلے دم لو۔" عباس کی ڈپٹ کے بعد اس نے چھری تلے دم لیا ہی تھا جب ابا اور اماں نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ اکٹھے بیٹھ کر ایک فیصلے پر متفق ہونے کے بعد عطیہ اور عقیل کے رشتے کا بھی اعلان کردیا تھا۔ کب سے گم صم بیٹھی نانی گویا کھل اٹھی تھیں۔ مبارک سلامت کے شور کی آواز اندر سسکتی فاختہ کو اور بھی رلانے کا باعث بن رہی تھی۔ اسے اپنے رونے کا کوئی بھی ٹھوس جواز نہیں مل رہا تھا۔

"کیا وہ اس لیے رو رہی تھی کہ کم رو عاتکہ کو ثمینہ آنٹی نے اپنے قابل بیٹے کے لیے پسند کرلیا تھا؟" جواب نفی میں پاکر اس کے رونے کی شدت میں اور بھی اضافہ ہوچکا تھا۔

"تو کیا میں اس لیے رو رہی ہوں، عقیل نے مجھے ٹھکرا کر عطیہ کو پسند کیا ہے؟" اندر سے آتی آواز نے ایک مرتبہ پھر اس کے سر کو نفی میں ہلا دیا تھا۔

"مامی نے نانی کے کہنے پر بھی مجھے اپنے بیٹے کے لیے پسند نہیں کیا۔ کیا میں اس لیے رو رہی ہوں؟" سوال ایک دفعہ پھر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا اس نے بے اختیار روتے ہوئے چیخ چیخ کر کہا۔

"نہیں... نہیں"

"تو یہ آنسو اپنی بدزبانی اور تلخ کلامی کے باعث بہا رہی ہوں کہ خاندان بھر میں میری زبان درازی کا قصہ مشہور ہوچکا ہے؟"

اس نے ایک مرتبہ پھر سسکتے ہوئے خود سے کہا۔ جواب اب بھی نفی میں تھا۔ وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی۔ بھیگی پلکوں، سرخ ناک اور سوجے پپوٹوں نے اس کے نقوش عجیب سے کردیے تھے۔ آئینے کے اندر ایک اور عکس ابھرا تھا۔ جس کے استہزائیہ لفظوں نے فاختہ کو دم بخود کردیا۔

"یہ آنسو عباس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھ کر نکل رہے ہیں۔ اس لیے کہ تم عباس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت و بیگانگی دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ تم سے اپنا نظر انداز کیا جانا برداشت نہیں ہورہا تھا..."

آئینے میں ابھرتے عکس نے سچائی میں لتھڑا ایک ایک لفظ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ پتھر کی مورتی بنی زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تو پھر... یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے بیٹا!" اماں نے عجیب ٹوٹے لہجے میں افسردگی سے کہا تھا۔ ان کے ذہن میں جو رشتوں کے دھاگے جڑے تھے، وہ تو تقدیر نے خود بخود توڑ ڈالے تھے۔

"جی، چاچی! یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں بس عطیہ اور عاتکہ کی شادی کے لیے رکا ہوا تھا۔ اب ویزا لگ گیا ہے جانا تو ہے ہی۔" عباس نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ اپنے کپڑے ایک بیگ میں جمع کررہا تھا۔

"عباس بیٹا! کیا تم نے اپنا دل ابھی بھی صاف نہیں کیا؟" نرجس نجانے مطمئن کیوں نہیں تھیں۔ شاید فاختہ کی اداس صورت انہیں پرسکون نہیں ہونے دیتی تھی۔

"میرا دل تو صاف ہے چاچی! اس میں گرد، میل کچھ بھی نہیں۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔

"تم... تم فاختہ کی لغزش درگزر نہیں کرسکتے؟" بہت مشکل سے ہی سہی ان کے لبوں سے دل کی بات نکل ہی پڑی۔

"اس بات کو نہ چھیڑیں چاچی!" عباس نے فوراً ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا تھا۔ "میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔"

اس کا انداز دو ٹوک قسم کا تھا۔ نرجس مزید اصرار کر ہی نہیں سکی تھیں۔ اس کے کمرے سے نکل کر جب نیچے آئیں تو نانی کو آم کے درخت کی چھاؤں میں چارپائی ڈالے لیٹا دیکھ کر وہیں کھڑی ہوگئیں۔ نانی نے کچھ دیر بعد دوپٹا اپنے منہ پر سے ہٹا کر بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا، جہاں مایوسی کے بادل چھائے تھے پھر ان کی نظریں جالی کے دروازے تک گئیں۔ انہوں نے ڈال پر بیٹھی اپنا گھونسلہ خود اپنے ہاتھوں سے توڑنے والی فاختہ کو دیکھا اور زیر لب بڑبڑائیں۔

"اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

☼ ☼ ☼

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ سو اسی سہارے کو کافی جانتے ہوئے وہ اماں، نانی، عطیہ اور عاتکہ کے بے تحاشا اصرار پر بڑے بھاری دل کے ساتھ عباس کے کمرے میں آخری مرتبہ بات کرنے کے لیے آئی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کا جرم بڑا ہے، غلطی بڑی ہے۔ اب معاف کرنے والے کا ظرف دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ عباس اسے آتا دیکھ کر ذرا چونکا تھا مگر پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ آج اس کی روانگی تھی۔ سو وہ تیاری کرنے میں لگا ہوا تھا۔ کافی دیر تک جب وہ کچھ نہ بولی تو عباس کو الجھن سی ہونے لگی۔ اسی الجھن کے پیش نظر اس نے خود ہی بات کرنے کی شروعات کی تھیں۔

"کیوں آئی ہو یہاں؟ کیا کچھ باقی رہ گیا ہے؟" اس کے لفظوں کی کاٹ نے فاختہ کی پیشانی تر کردی۔ ندامت کے بوجھ سے اس کی نظریں گڑی جارہی تھیں۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے عباس!" بہت دیر بعد اس نے لبوں کے قفل کو توڑتے ہوئے دھیرے سے کہا تھا۔

"مگر مجھے تم سے کچھ بھی نہیں سننا۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"پلیز عباس! صرف ایک دفعہ میری بدتمیزیوں کو نظر انداز کردو... آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" فاختہ نے لجاجت سے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا تھا۔ آواز نم اور لہجے میں گڑگڑاہٹ تھی۔

"آئندہ کس نے دیکھا ہے؟ میں آج چلا جاؤں گا۔ تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" اس کی رکھائی ہنوز قائم تھی۔ فاختہ کی آنکھوں سے آنسو پھسل پڑے۔

"میں اگر تمہیں روکنا چاہوں، تب بھی نہیں رکو گے؟" وہ بڑی آس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔" وہ سب کچھ معاف کرسکتا تھا، مگر اپنے کردار پر آیا ایک حرف بھی اس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ جان چکا تھا، فاختہ شرمندہ ہے، نادم ہے، مگر وہ ایک لفظ "معافی" اس کے ہاتھ میں تھما کر اسے جال کی

طرح جکڑے ہوئے پچھتاوے ـــــ سے نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ اس کا ذرا سا نرم رویہ ہلکی سی شہہ پر وہ ایک دفعہ پھر اپنے پرانے لبادے میں جاسکتی تھی۔ کیونکہ کہنے والوں نے خوب ہی کہا ہے۔ فطرت بدل ہی نہیں سکتی۔

"میں خود کو بدل لوں گی عباس! بدتمیزی نہیں کروں گی، تمہارے سامنے کبھی زبان نہیں چلاؤں گی۔۔۔ جو ہوچکا ہے۔ اسے بھول جاؤ صرف ایک دفعہ ابا کی خاطر ہی بھول جاؤ۔ نانی کی خوشی کی خاطر ہی بھول جاؤ۔ ابا کے اس خواب کو مت توڑو، جو انہوں نے میرے اور تمہارے حوالے سے دیکھا ہے۔"

وہ نانی کے سبق کو ہو بہو ان کے انداز میں کسی توتے کی طرح دوہرا رہی تھی۔ عباس نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر جوتے کے تسمے باندھتا بیگ کندھے پر اٹھائے باہر نکل آیا۔ فاختہ کا دل ایکدم بیٹھ گیا تھا۔

"اماں، ابا کے ساتھ بہت جھگڑا کرتی تھیں، مگر میں تمہارے ساتھ جھگڑا نہیں کروں گی۔۔۔ اماں، ابا کو ضروریات زندگی کی چیزیں خریدنے پر تنگ اور مجبور کرتی تھیں، میں ایسا نہیں کروں گی۔ اماں، ماسی نوراں جیسی عورتوں کے جال میں پھنس کر اپنے لیے مشکلات کھڑی کرلیتی تھیں، مگر میں کسی کی باتوں میں نہیں آؤں گی۔۔۔"

عطیہ کا رٹایا پورا پیراگراف اس نے جوں کا توں اس کی سماعتوں میں انڈیل دیا تھا مگر اس کے چلتے قدم رکے نہیں تھے۔ فاختہ کا دل کچھ اور بیٹھ گیا۔

"اماں کا مزاج تلخ تھا، مگر میں اپنے مزاج میں تبدیلی لاؤں گی۔۔۔ اماں کاہل، کام چور اور سست تھیں، مگر میں عطیہ اور عاتکہ کی طرح ڈھیروں کام کروں گی۔ فجر کی اذان کے ساتھ اٹھوں گی، سارا گھر چمکاؤں گی، سب کے کپڑے دھوؤں گی، برتن دھوؤں گی۔ نانی کے لیے حلوے اور مربے بھی بنایا کروں گی۔۔۔"

عاتکہ کی بتائی لائنیں بھی اس نے جلدی جلدی بول دی تھیں مگر وہ پھر بھی نہیں رکا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اپنے کمرے میں بیٹھی عطیہ کو گھسیٹ کر باہر لے آئے اور اسے دکھائے کہ وہ کتنا کٹھور، بے رحم اور سنگدل بنا کھڑا ہے۔

"میں نے تمہارے ساتھ جیسا بھی رویہ رکھا، مجھے اس پر ندامت ہے۔ میں صرف تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے توجہ اور اپنائیت دیکھنا چاہتی تھی۔"

عقیل کے سکھائے جملے بھی آزما لیے۔ اب کے وہ رک گیا تھا، ذرا ٹھٹھک بھی گیا تھا۔ کچھ چونک بھی گیا تھا۔ فاختہ کے دل کو ذرا تسلی ہوئی۔

"لگتا ہے اس کے پتھر سے دل پر کچھ تو اثر ہوا ہے۔" فاختہ کو عقیل بھائی کی ذہانت پر پیار آگیا۔ آخر یہ ان کے بتائے گئے ڈائیلاگ تھے۔

"فطرت کبھی بدل نہیں سکتی۔" اس نے کہا بھی تو صرف اتنا۔۔۔ فاختہ کا خوشی سے جھولتا دل پھر سے بیٹھ گیا۔ اب تو سارے لفظ ختم ہوگئے تھے۔ پھر اچانک اسے طاہر بھائی کی بتائی بات یاد آئی۔

"میں اس ندامت کے بوجھ تلے دب کر مرجاؤں گی۔" اس نے کپکپاتی آواز میں اپنی بات مکمل کی تھی۔ فاختہ اب ہر لفظ اور ہر سبق سے خالی ہوچکی تھی۔ کسی کا بتایا کوئی ایک حرف بھی ذہن کے کونے سے چپکا نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر زردیاں سی چھا گئیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"میں نے کہا تھا نا، فطرت کبھی نہیں بدل سکتی۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ فاختہ نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بیگ دوسرے کندھے پر منتقل کرتا آہستگی سے بولا۔

"کوئی اپنے دل کی بات ہے تو کہہ دو۔ دوسروں کی پٹی نہ پڑھو۔"

اس کے مضبوط لفظوں نے فاختہ کو قدرے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ گویا اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ اس نے بمشکل اپنے دھڑکتے دل کو ڈپٹ کر کہا۔

"میرے دل کی بات تم سنتے ہی نہیں۔۔۔ میں دوسروں کی پٹی نہیں پڑھوں گی۔ تم اپنی پٹی پڑھا دو۔

میں تمہاری انگلی پکڑ کر چلوں گی، تم ذرا سا ہاتھ تو تھامو۔ میں تمہاری نظر سے دیکھوں گی، تم نظر بھر کے دیکھ لو۔ میں تمہارے ذہن سے سوچوں گی، تم اپنے ذہن کی ہر سوچ میں مجھے شریک کرلو۔ میں تمہارے دل کی مانوں گی، مجھے اپنے دل میں کنک دانے جتنی جگہ دے دو۔۔۔ میں تم سے محبت کروں گی، تم اپنے دل کی بات کہہ دو۔ اس محبت کی جو عرصے سے تمہارے دل میں دبی ہے، خاموشی سے میری گڑگڑاہٹ کا تماشا دیکھ رہی ہے۔۔۔" اس کی زبان اتنی روانی اور سلیقے سے لفظوں کی مالا پرو رہی تھی کہ فاختہ خود بھی حیران رہ گئی۔

"شاید تم نے پہلی مرتبہ اپنے دل کی آواز کو لفظوں کا پیراہن پہنایا ہے۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتے ہوئے، تمہاری شرمندگی اور ندامت کو دیکھتے ہوئے تمہیں معاف کرنے پر ضرور غور کروں گا۔۔۔ ابھی مجھے دیر ہو رہی ہے، سوچتا ہوں۔۔۔ یہ تمہارا ذاتی مکالمہ تھا، مجھے بہت پسند آیا۔۔۔"

عباس نے ایک جھٹکے سے دوبارہ اسے نیچے لا پھینکا۔ وہ شکستگی کے عالم میں سیڑھیوں پر سر جھکائے بیٹھ گئی۔

"میں ہار گئی۔۔۔" اس کے آنسو بے آواز گرتے رہے۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد اس کے قریب ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ اس نے روئی روئی آنکھوں کو اٹھا کر دیکھا۔ اس کے قریب ہرے دھنیے کی گٹھی، گاجروں کا ڈھیر اور مٹی میں لتھڑے شلجم پڑے تھے۔

"میرے پاس تمہیں دینے کے لیے یہی تحفہ ہے۔ قطر سے آؤں گا تو کچھ اور بھی لے کر آؤں گا۔ اب تمہاری روتی صورت دیکھی نہیں جارہی۔۔۔ سو دل کو غم کی قید سے آزاد کرلو۔ اور ندامت کے بوجھ تلے دب کر مرنہ جانا۔۔۔ میں لوٹ کر جلدی آؤں گا۔"

وہ اس کے قریب دوزانو بیٹھا تھا۔ پھر اس نے ایک مٹی سے بھرا شلجم اٹھا کر اسے پکڑایا۔ سبزیوں کے ڈھیر کو آس پاس پھیلائے، اتنی ہریالی کے درمیان بیٹھی فاختہ ایکدم ہنسی تو پھر ہنستی ہی چلی گئی تھی۔ عباس مسکراتا ہوا اٹھ گیا۔ اس نے بے ساختہ ہنسی روک کر پوچھا تھا۔

"کہاں جارہے ہو؟"

"نانی کے پاس جارہا ہوں انہیں بتانے کہ کھیت میں محبت کے بیج بو آیا ہوں۔ چڑیاں ہماری محبت کے کھیت کو چگ کر کبھی خالی نہیں کرپائیں گی۔"

اس کی سماعتوں سے عباس کی گنگناتی آواز ٹکرائی تھی اور وہ پہلی مرتبہ گندے شلجم اور گاجروں کا ٹوکرا اٹھائے نل کی طرف بھاگی۔

سونیہ نوید

عہدِ وفا

اسمارہ اور رعنا بہنیں ہیں۔ رعنا کی اکلوتی بیٹی عرشی اسمارہ کے اکلوتے بیٹے حذیفہ سے محبت کرتی ہے لیکن حذیفہ اسے صرف اچھی دوست سمجھتا ہے۔ حذیفہ لنز میں زیرِ تعلیم ہے۔ وہاں اس کی ملاقات جویریہ سے ہوتی ہے۔ ڈری سہمی جویریہ کا کوئی دوست نہیں ہے۔ ایک بار حذیفہ اس کی مدد کرتا ہے۔

حذیفہ پارک میں جاتا ہے تو وہاں اس کو جویریہ اور اس کے والد ملتے ہیں۔ حذیفہ ان سے بات کرتا ہے۔ جویریہ کے والد ندیم بہت خوش اخلاق اور اچھے انسان ہیں۔

کالج ڈرامے میں جویریہ کو ایک چھوٹا سا رول ملتا ہے لیکن عین وقت پر وہ اسٹیج پر جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ حذیفہ اس حرکت پر اسے ملامت کرتا تو وہ بتاتی ہے کہ اس نے ناظرین میں اپنی ماں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ حذیفہ کو اپنی ماں کے بارے میں بتاتی ہے۔

جویریہ کی ماں ایک بڑی زمین دار فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ جویریہ کے نانا نے ان کی شادی اپنے دوست کے یتیم بیٹے سے کر دی جس کو انہوں نے پالا تھا۔ جویریہ کی ماں نے اس شادی کو قبول نہیں کیا۔ اور طلاق لے کر دوسری شادی کر لی۔ جویریہ اپنی نانی کی وفات پر ماں سے ملنے گئی تو انہوں نے جویریہ کو نہ صرف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ برا بھلا بھی کہا۔ وہاں موجود جویریہ کے کزنز نے بھی باپ کے حوالے سے اس کا مذاق اڑایا۔ جویریہ کے دل پر یہ ذلت نقش ہو گئی۔

حذیفہ کے والد دانش کام کے سلسلے میں لندن جا رہے تھے اسمارہ بھی ان کے ساتھ چلی گئیں۔

حذیفہ اپنے دوستوں کے ساتھ پاکستان ٹور پر جاتا ہے تو راستے میں جویریہ سے ملنے کے لیے راہوالی اتر جاتا ہے۔ وہاں

ناولٹ

ندیم صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہوجاتی ہے۔ حذیفہ انہیں اسپتال لے کر جاتا ہے۔ وہ جویریہ کے حوالے سے پریشان ہوتے ہیں کیونکہ ادھیڑ عمر اور عیاش مختار وڑائچ جویریہ کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ ندیم صاحب حذیفہ کی رضامندی سے ایمرجنسی میں حذیفہ اور جویریہ کا نکاح پڑھوا دیتے ہیں۔ ندیم صاحب کا انتقال ہوجاتا ہے۔ حذیفہ اپنے باپ دانش کو آگاہ کرتا ہے۔ وہ راضی ہوجاتے ہیں مگر اچانک انتقال کرجاتے ہیں۔ حذیفہ، جویریہ کو راہوالی چھوڑ کر لندن سے دانش کی میت لاتا ہے اور اسمارہ کو شادی کا بتاتا ہے۔ اسمارہ اور رعنا بہت خفا ہوتی ہیں، عرشی نیم پاگل ہوجاتی ہے۔

مختار وڑائچ، حذیفہ کی غیر موجودگی میں جویریہ پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے۔ وہ عزت بچا کر بتول خالہ کے گھر پناہ لیتی ہے۔ بتول خالہ کا بیٹا منیر، جویریہ کو لاہور میں حذیفہ کے گھر لے کر آتا ہے۔

تیسری قسط

"یہ لڑکی کون ہے خان؟" اسمارہ نے گاڑی کا شیشہ اتارتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا۔ کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ آج اسمارہ کے دروازے پر بھی ایک مسکین و لاوارث قسم کی لڑکی کو کھڑا دیکھ کر رعنا کے اندر کی سوشل ورکر پھڑک اٹھی۔

"اس کو چھوٹے صاب (حذیفہ) سے ملنا ہے۔ ام بتایا وہ گھر پر نئیں اے۔" گل خان نے بتایا۔

اسمارہ گاڑی سے اتر آئیں۔ چوکیدار کے برابر کھڑی لڑکی اور اس کے پیچھے کھڑے شلوار قمیص میں ملبوس گاؤدی قسم کے آدمی کو سر سے پیر تک تنقیدی نظروں سے دیکھا۔

"کون ہو تم؟ حذیفہ سے کیا کام ہے تمہیں؟" رعنا بھی اسمارہ کی تقلید میں گاڑی سے اتر آئیں۔

"میرا نام جویریہ ہے، میں راہوالی سے آئی ہوں۔" جویریہ نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے تھکے لہجے میں کہا۔

اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ پچھلے دس منٹ اس نے اس گرمی میں ایک ایسے چوکیدار کے ساتھ مغز ماری کرنے میں گزارے تھے، جسے اتنے سالوں کی نوکری میں اندازہ ہوچکا تھا کہ کس حلیے کے مہمانوں کو بلا روک ٹوک اندر جانے کی اجازت ہوتی ہے اور کون سے لوگوں کو دروازے پر ہی ٹھہرا کر پوچھ گچھ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

"ہیں، جویریہ؟" رعنا نام سن کر چونک گئیں۔

"اسمارہ یہیں ہے۔" وہ اس لڑکی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کے اچھے بھلے گھر کا سکون درہم برہم ہوگیا تھا۔

رعنا نے سر سے پیر تک جویریہ کو گھور کر دیکھا، جو نڈھال کھڑی تھی۔

اس کے پیروں میں سستی سی ربڑ کی چپل تھی، جسے رعنا گھر میں بھی پہننا پسند نہیں کرتی تھیں۔

"حذیفہ نے ساری دنیا چھوڑ کر چنا بھی تو آخر کس کو چنا؟" رعنا نے ناگواری کے ساتھ سوچا۔ اسمارہ کو بھی اسے دیکھ کر مایوسی ہوئی تھی۔ مانا کہ لڑکی شکل و صورت کی بری نہیں تھی، لیکن حذیفہ شکل و صورت پر فریفتہ ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ اپنے سامنے کھڑی اس لڑکی کو دیکھ کر اسمارہ کو واقعی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس میں آخر ایسا کیا ہے جو ان کا بیٹا کسی صورت اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہو رہا۔

"تمہیں معلوم ہوچکا ہے نا کہ حذیفہ گھر پر نہیں ہے، پھر کبھی آنا۔" اسمارہ کا لہجہ ایسا تھا جو دروازے پر آنے والے کسی سوالی سے ہوتا ہے۔ بے زاری اسمارہ کے چہرے اور انداز دونوں سے عیاں تھی۔

اسمارہ کی بات پر جویریہ کی رگ و جاں میں رچی بسی تھکن میں ایک دم سے کئی گنا کا اضافہ ہوگیا۔

"شاید حذیفہ نے آپ کو میرے بارے میں بتایا نہیں، میں۔۔۔"

"بتایا تھا اس نے تمہارے بارے میں۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ تم اس کی وہ غلطی ہو جس کا وہ نادانی میں ارتکاب کر بیٹھا ہے۔" رعنا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

رعنا کے الفاظ پر جویریہ کو اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں کوئی غلطی نہیں، حذیفہ کی بیوی ہوں، ہماری شادی ہوچکی ہے۔" جویریہ نے کانپتے لبوں کے ساتھ رعنا کی تصحیح کی۔

"شادی۔۔۔ اچھا مذاق ہے۔" رعنا استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔ "مان گئے تمہاری صلاحیتوں کو، اپنے حسن و جوانی کو کتنی مہارت سے استعمال میں لا کر تم نے حذیفہ کو اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسایا تھا، واہ۔"

رعنا نے تنفر سے کہا تو جویریہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

اتنا رکیک الزام۔

"آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں، میں ایسی نہیں ہوں۔" وہ رو دینے کو ہوگئی۔

"رئیلی۔۔۔ جبکہ میرا خیال ہے کہ میں ہی تمہیں ٹھیک سمجھی ہوں۔ میں چاہوں تو تمہیں اسی وقت پولیس کے حوالے کردوں۔ تم پر دو منٹ میں اتنے کیس بنوا دوں کہ تمہاری ساری عمر سزا بھگتنے میں نکل جائے، مگر تمہاری کم سنی پر ترس آرہا ہے، اس لیے صرف تنبیہہ کررہی ہوں کہ حذیفہ کی جان چھوڑ دو اور جا کر کوئی دوسرا شکار تلاش کرو۔ حذیفہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوچکا ہے اور وہ تم سے جڑے ہر تعلق کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ ویسے بھی اس کی شادی میری بیٹی کے ساتھ طے ہوچکی ہے۔ تم اس کا پیچھا چھوڑ دو، میں اس کے بدلے تمہیں منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔" رعنا نے رعونت سے کہا۔

جویریہ سکتے کے عالم میں رعنا کو تک رہی تھی۔ اس کے وجود پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی لرزش کو روکنے کے لیے انہیں ایک دوسرے میں اتنی زور سے پیوست کیا کہ ہاتھوں کی پشت پر نیلگوں رگیں نمایاں ہوگئیں۔

"مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے صرف حذیفہ سے ملنا ہے۔ اگر اس نے کہا کہ وہ واقعی مجھ سے تعلق ختم کرنا چاہتا ہے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں خود ہی یہاں سے چلی جاؤں گی، لیکن آپ پلیز مجھے صرف ایک بار حذیفہ سے مل لینے دیجیے۔" جویریہ نے التجا کی۔

رعنا کو اپنی اتنی فراخ دلانہ پیش کش کے بعد اتنے صاف انکار کی توقع نہ تھی۔ وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہوگئیں۔

"ڈھیٹ لڑکی! میری اتنی باتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخر تم ہو کیا؟ اوقات دیکھی ہے اپنی؟ دو ٹکے کی لڑکی۔ گل خان اس کو یہاں سے دھکے دے کر دفع

کرو۔" رعنا نے تلملا کر گیٹ کے پاس کھڑے چوکیدار کو مخاطب کیا۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ واقعی جویریہ کو اٹھوا کر نظروں سے دور پھینکوا دیں۔

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں' یہ خود ہی چلی جائے گی۔" اسمارہ نے اچانک مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر سے کی جانے والی لعن طعن اب تک رعنا نے ہی کی تھی۔ اسمارہ ان کے برابر یوں خاموش کھڑی رہیں جیسے اس سارے قصے سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

حالانکہ سب سے گہرا تعلق تو ان ہی کا تھا۔

اسمارہ اور حذیفہ کے نقوش میں بہت زیادہ مشابہت نہیں تھی۔ حذیفہ نے خود ایک بار جویریہ کو بتایا تھا کہ وہ قدرت میں بالکل اپنے باپ جیسا دکھتا ہے۔ پھر بھی جویریہ اپنے سامنے کھڑی دونوں عورتوں کو دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ ان میں سے کون سی حذیفہ کی ماں ہے۔ ویسے ہی جیسے اسمارہ نے پہلی نظر میں ہی جویریہ کی شناخت کرلی تھی۔

"ایک بات دھیان سے سن لو لڑکی! یہ میرا گھر ہے اور میری مرضی کے بغیر تم اس گھر کے اندر قدم بھی نہیں رکھ سکتیں۔ تمہارا حذیفہ پر کتنا بھی کنٹرول کیوں نہ ہو' مگر میں حذیفہ کی ماں ہوں اور میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ دنیا کی کسی بھی لڑکی کو کبھی اپنی ماں پر فوقیت نہیں دے سکتا۔" اسمارہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

فقط تھوڑی دیر پہلے اسمارہ نے رعنا کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ حذیفہ کو اس لڑکی کو گھر میں لے کر آنے سے نہیں روک سکیں۔ وہ اتنے دن سے خود کو ایک ناپسندیدہ ہستی کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔ لیکن اس وقت اس لڑکی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر غم و غصے کی ایسی شدید لہر ان کے اندر ابھری جس نے ان کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

انہیں غصہ کس پر آ رہا تھا؟

سامنے کھڑی لڑکی پر جو ان کے بیٹے کی پسند تھی؟

اپنے بیٹے کی ہٹ دھرمی پر جو ان کی بات ماننے پر راضی نہیں تھا؟

حالات پر' جنہوں نے انہیں اس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا؟

یا پھر ان حالات کے سامنے اپنی بے بسی پر؟

یا پھر شاید ان تمام چیزوں پر؟

غصہ جس پر بھی تھا' بہت شدید تھا اور ان کے اسی غصے نے اس وقت جویریہ پر گھر کے دروازے بند کر دیے۔

اسمارہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے جویریہ کو رعنا کی دی ہوئی دھمکیوں سے کہیں زیادہ خوف زدہ کر دیا۔ اسے اپنی ہمت جواب دیتی محسوس ہوئی۔

"اگر آپ حذیفہ کو جانتی ہیں تو میں بھی اسے اچھی طرح جان چکی ہوں۔ وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دے سکتا۔ چاہے وہ آپ ہوں یا میں۔"

جویریہ کی آنکھیں اور الفاظ دونوں ہی بھیگے ہوئے تھے' مگر لہجہ مضبوط تھا۔

جویریہ کے اس یقین کے آگے تھوڑی دیر کے لیے اسمارہ بھی چپ رہ گئیں۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ زیادتی کون کر رہا ہے اور کس کے ساتھ ہو رہی ہے' فی الحال تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم وہیں چلی جاؤ' جہاں سے آئی ہو' کیونکہ نہ تو ہمارے گھر میں اور نہ ہی ہماری زندگیوں میں تمہارے لیے کوئی گنجائش نکل سکتی ہے۔"

اسمارہ نے سختی کے ساتھ کہا تو اس انتہائی گرم سہ پہر کی ساری حدت جیسے اس ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی جہاں جویریہ کھڑی تھی۔ جویریہ آنسوؤں سے بھیگتے چہرے کے ساتھ اس بڑے سے گھر کے باہر کھڑی رہ گئی' جس کے اندر قدم رکھنے تک کی اجازت اسمارہ نے اسے نہیں دی تھی' پھر بھلا حذیفہ کی زندگی میں شمولیت وہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں؟

آج ایک بار پھر اپنی ذات اور اپنی حیثیت کے غرور میں جکڑی دو امیر عورتوں نے جویریہ کو اس کی اوقات یاد دلائی تھی۔

کچھ سال پہلے یہی کام اس کی اپنی ماں نے کیا تھا' اپنے اور جویریہ کے بیچ کسی رشتے کا لحاظ کیے بغیر۔

جویریہ کو اپنا آپ ایک بار پھر اس مقام پر کھڑا محسوس ہوا' جہاں وہ بارہ برس کی عمر میں کھڑی ہوئی تھی۔ بے قصور اور بے خطا ہوتے ہوئے بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنے سے قاصر۔

جویریہ کی ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔

کئی سال پہلے ایک ایسے ہی موقع پر اس کے بابا نے آکر اس کو سہارا دیا تھا۔ اپنے قدموں پر کھڑا رہنے کی ہمت عطا کی تھی۔ آج پھر اسے اپنے بابا کے سہارے کی ضرورت تھی۔ لیکن بابا تو اسے حذیفہ کے حوالے کر کے گئے تھے۔ اس کا خیال رکھنے اور اس کی حفاظت کرنے کا وعدہ لے کر تو پھر حذیفہ کہاں تھا؟

"بہن! میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ اب یہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" جویریہ کے ساتھ کھڑے منیر نے اپنے لہجے میں بردباری پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ جویریہ پر تو خدا جانے اثر ہوا یا نہیں' پر جب رعنا نے پولیس بلانے کی دھمکی دی تو منیر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ رعنا واقعی پولیس کو بلا لیتیں۔ وہ یہاں سے جویریہ کو لے کر جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔

اس نے منتظر نظروں سے جویریہ کی طرف دیکھا۔ جویریہ بے جان ہوتے قدموں کے ساتھ اس گھر کے دروازے سے پلٹی' جسے وہ اپنا سب سے محفوظ سائبان سمجھ کر آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ آخر گئی کہاں؟" حذیفہ نے راہوالی سے واپس آکر شدید اضطراب کے عالم میں رعنا کو بتایا۔

"گھر کی ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے۔ کوئی کہتا ہے' وہ لاہور آنے کے لیے نکلی تھی تو کوئی کچھ اور کہتا ہے۔ اگر وہ لاہور آنے کے لیے نکلی بھی تھی تو اب تک تو اسے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ پھر آخر وہ گئی کہاں؟"

حذیفہ پریشان تھا۔

"مجھے اسے وہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ اسے پہلے ہی اپنے ساتھ یہاں لے آتا تو یہ نوبت نہ آتی۔" حذیفہ کو اب احساس ہو رہا تھا کہ جویریہ کو راہوالی میں تنہا چھوڑ آنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ مگر دانش کی موت کی اچانک خبر نے اسے اس بری طرح سے جھنجوڑ دیا تھا کہ وقتی طور پر اس کے سوچنے اور سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفقود ہو گئی تھیں۔

حذیفہ کو جویریہ کے لیے اتنا پریشان دیکھ کر رعنا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"بہت خوب! اس لڑکی کی اتنی فکر اور ماں کا ذرا بھی خیال نہیں تمہیں؟ جس لڑکی کا صرف ذکر سن کر اسمارہ شدید ٹینشن کا شکار ہو جاتی ہے' اسے اپنے گھر میں دندناتا ہوا دیکھتی تو کیا حالت ہوتی اس بے چاری کی؟"

رعنا نے تلملا کر کہا تو حذیفہ چپ ہو گیا۔ چہرے پر اب بھی کرب کے آثار تھے۔ یہ وہی بھانجا تھا جس کی ذرا سی تکلیف پر رعنا بے چین ہو جایا کرتی تھیں۔ آج انہیں اس سے ذرا بھی ہمدردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک طرف حذیفہ کی ہٹ دھرمی' دوسری طرف عرشی کا دن بدن بڑھتا ہوا دیوانہ پن اور ان دونوں کے بیچ پھنسی رعنا کی جان۔

رات میں بھی ان کی عرشی کے ساتھ اسی موضوع کو لے کر اچھی خاصی بحث ہو گئی۔ رات جب رعنا اپنے بیڈ روم سے ملحق ڈریسنگ روم میں سے شب خوابی کا لباس پہن کر باہر نکلیں تو عرشی ان کے بستر کے کنارے موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ ان کے کمرے میں نیند کی گولیاں لینے آئی تھی جو رعنا کثرت سے استعمال

کرتی تھیں۔
رعنا کو تو خیر نیند نہ آنے کی بیماری کئی برسوں سے تھی مگر عرشی۔
عرشی کو نارسائی کا روگ لگ گیا تھا۔ دونوں ہی کی راتیں گولیوں کے بنا بے سکون گزرنے لگی تھیں۔
"یہ کیا ہے؟" عرشی نے ہاتھ میں پکڑا موبائل ہوا میں لہرایا جو سائیڈ ٹیبل کی دراز سے گولیاں تلاش کرتے ہوئے اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔
"سیل فون ہے۔" رعنا نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔
"وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے، مگر یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"
"حذیفہ راہوالی جاتے وقت اسے گھر پر ہی بھول گیا تھا۔" رعنا نے گہرا سانس لے کر کہا۔
"اور آپ اٹھا کر یہاں لے آئیں، کیوں؟" عرشی نے پوچھا۔
"تاکہ وہ لڑکی اس سے فون پر بات نہ کرسکے۔" رعنا زچ ہوتے ہوئے بولیں۔
عرشی کچھ دیر رعنا کو دیکھتی رہی، پھر بولی۔
"آپ کو کیا لگتا ہے کہ جس لڑکی کو حذیفہ نے اپنی زندگی میں شامل کرلیا ہے، اسے اپنے گھر کے دوسرے فون نمبر نہیں دیے ہوں گے؟"
"تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے؟" رعنا چڑ کر بولیں۔
"جو کچھ آپ کر رہی ہیں، وہی میرا سب سے بڑا پرابلم ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے کہ اگر حذیفہ اپنا موبائل ساتھ لے جانا بھول گیا تو اسے ساری زندگی اپنا موبائل یاد ہی نہیں آئے گا؟ اگر آپ حذیفہ کی غیر موجودگی میں الٹے سیدھے جھوٹ بول کر اس لڑکی کو دروازے سے چلتا کردیں گی تو وہ کبھی دوبارہ واپس نہیں آئے گی؟ وہ ضرور واپس آئے گی اور ضروری نہیں ہے کہ اگلی بار بھی حذیفہ گھر پر موجود نہ ہو۔ اس طرح سے یہ معاملہ سلجھنے والا نہیں ہے، کوئی ٹھوس اور حتمی حل تلاش کیجیے اس مسئلے کا۔"
"کیا حل تلاش کروں؟" "اس لڑکی کو اغوا کروالوں، یا پھر جان سے مروا دوں؟ کسی غیر قانونی گروہ کا سرغنہ سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟" رعنا بھڑک کر بولیں۔ "جو کچھ میرے بس میں تھا، میں نے کیا۔ اس لڑکی کو پیسوں کا لالچ تک دے کر دیکھ لیا۔ وہ ڈھیٹ تب بھی نہیں مانی۔ ظاہر ہے جب پورا سمندر نظروں کے سامنے ہو تو چند بوندیں لے کر کون پیچھے ہٹتا ہے؟"
رعنا نے زہر خند لہجے میں کہا۔ انہیں بھی اپنی ناکامیوں پر غصہ آرہا تھا۔ حذیفہ کا موبائل اٹھا لانا ایک اضطراری حرکت تھی جو انہوں نے بلا سوچے سمجھے کردی تھی ورنہ مسئلے کا ٹھوس اور حتمی حل تو ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ کسی طرح حذیفہ کا دل جویریہ سے پھیر دیا جاتا۔ مگر یہ رعنا کے بس کی بات نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

حذیفہ کو راہوالی سے آئے کتنے ہی دن ہوچکے تھے اور ابھی تک جویریہ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ وہ ہر اس جگہ پر جاکر اسے ڈھونڈ آیا جہاں اسے لگتا تھا کہ جویریہ جاسکتی ہے، مگر وہ کہیں بھی نہ تھی۔ ان گزرے چند دنوں کے دوران حذیفہ اپنے اور جویریہ کے درمیان فون پر ہونے والی آخری گفتگو کو سیکڑوں بار اپنے ذہن میں دہرا چکا تھا۔ وہ روزانہ صبح شام ہونے والی بات چیت کی طرح بالکل عام سی گفتگو تھی۔ حذیفہ کو یہ بھی یاد تھا کہ راہوالی کے لیے نکلنے سے قبل آخری دن اس کی جویریہ سے بات نہیں ہوسکی تھی۔ اس نے اپنے پہنچنے کی اطلاع بھی مختار وڑائچ کے گھر فون کرکے دی تھی۔
حذیفہ نے مختار وڑائچ کے بارے میں سوچ کر جھرجھری لی، جس کی بارش کے دوران برساتی نالے میں گرنے سے موت واقع ہوگئی تھی۔ لاش چار دن تک نالے میں پانی کے ساتھ جمع ہونے والے گند اور غلاظت کے بیچ پھنسی رہی۔ بارشوں کے بعد جب

نالے کا پانی کم ہوا تو لاش دریافت ہوئی، پر تب تک اس کی اتنی بری حالت ہوچکی تھی کہ پہچاننا مشکل ہوگیا تھا۔ جیب سے نکلنے والے شناختی کارڈ سے پتا چلا کہ مرنے والا بدنصیب کون تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ موسلادھار بارش کے دوران کیچڑ والی زمین پر پیر پھسل کر نالے میں گر جانا موت واقع ہوجانے کا سبب بنا تھا۔ مختار اتنی تیز و تند بارش کے موسم میں گھروں کے پیچھے کچے میدان میں بہنے والے برساتی نالے کے پاس کیا کرنے گیا تھا، یہ محلے میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ خود حذیفہ کو مختار کے انجام کی تب خبر ہوئی جب وہ دوسری بار اس امید پر راہوالی گیا تھا کہ شاید جویریہ واپس لوٹ آئی ہو۔

پتا نہیں مختار کو اس کا پیغام جویریہ تک پہنچانے کا موقع بھی ملا تھا یا نہیں؟ حذیفہ نے شرٹ کا آخری بٹن بند کرتے ہوئے پولیس میں جویریہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے کا سوچا۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد اب یہی راستہ بچا تھا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی گھڑی اٹھا کر کلائی میں پہنی اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کرکے باہر نکل آیا۔ سامنے اسمارہ کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اسمارہ ان دنوں اتنی دیر تک سونے لگی تھیں، جب تک کہ حذیفہ ناشتا کرکے گھر سے باہر نہیں چلا جاتا تھا۔ یہ عادت کچھ ہی دنوں سے اسمارہ نے اپنائی تھی۔
حذیفہ سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل میں جانے کے لیے اسمارہ کے کمرے کے پاس سے گزرا تو اندر سے رعنا کی آواز سنائی دی۔
رعنا کی اتنی صبح صبح اسمارہ کے کمرے میں موجودگی پر متجسس ہوکر وہ کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔
اندر گھستے ہی اس کی نظر اسمارہ پر پڑی تھی جو پلنگ پر لمبی اکھڑی سانسیں لے رہی تھیں۔
"کیا ہوا؟" اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔
"اسمارہ کی طبیعت خراب ہے۔ میں اسے اسپتال لے کر جارہی ہوں۔" اسمارہ کی بجائے رعنا نے جواب دیا۔ وہ اسمارہ کی حالت دیکھ کر گھبرائی ہوئی تھیں۔ حذیفہ نے ایک لمحے کے لیے ماں کے سفید چہرے پر سے نظر ہٹا کر رعنا کے متوحش چہرے پر نظر ڈالی، پھر بولا۔
"آپ مام کی رپورٹس پکڑیے، میں انہیں نیچے لے کر جاتا ہوں۔"
اسمارہ کو بازوؤں کے حلقے میں سمیٹ کر سیڑھیوں سے نیچے لے جاتے ہوئے حذیفہ کو احساس ہوا کہ اسمارہ کا وزن پچھلے چند دنوں میں خطرناک حد تک کم ہوچکا ہے۔
اسمارہ کو رعنا کے برابر پچھلی سیٹ پر بٹھا کر وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔
اسمارہ کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ حذیفہ کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اسمارہ نے پندرہ منٹ کی دوری پر رہنے والی رعنا کو فون کرکے بلایا اور محض پندرہ

سیکنڈ کے فاصلے پر دوسرے کمرے میں موجود حذیفہ کو آواز نہیں دی۔ وہ اس سے اتنی ناراض تھیں۔ اسٹیرنگ پر حذیفہ کی گرفت ایک دم سے سخت ہو گئی۔

نہ جانے کتنی دیر اسپتال کی لمبی راہ داری میں ٹہل کر گزارنے کے بعد حذیفہ آخر تھک کر وہیں رکھے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

حذیفہ کے سامنے شیشے کی دیوار کے پار بنا کمرا سائنس کی ایجاد کردہ ایسی مشینوں سے بھرا تھا جو کسی بھی ایسے انسان کی سانسیں چلتی رکھنے میں معاون ثابت ہو سکتی تھیں، جس کے اپنے خود کے اعضا اس کی زندگی کا بوجھ اٹھانے سے احتراز برتنے لگے ہوں۔

آج کے بعد اسمارہ کو بھی ان ہی میں سے ایک نعم البدل کے سہارے اپنی باقی ماندہ زندگی کو گزارنا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق اسمارہ کے گردوں کی کارکردگی دس فیصد سے بھی کم ہو چکی تھی۔ انہیں اب باقاعدگی کے ساتھ ڈائیلانسس کروانے کی ضرورت تھی۔

صوفے پر بیٹھے ہوئے حذیفہ نے اضطراری انداز میں سر کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ کیا وہ واقعی اپنی ذاتی پریشانیوں اور الجھنوں میں گم ہو کر اتنا غافل ہو گیا تھا کہ ماں کی تیزی سے گرتی صحت کا اسے پتا ہی نہیں چلا۔

رعنا اس کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔ وہ بھی صبح سے یہیں تھیں۔ پچھلے کئی گھنٹوں کی تھکن ان کے چہرے پر بھی رقم تھی۔

"اگر مام کو کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" حذیفہ جیسے خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"تمہیں کرنا بھی نہیں چاہیے۔" رعنا نے ترشی سے کہا۔ "اس وقت اس کی جو حالت ہے' وہ اس ذہنی انتشار کا نتیجہ ہے جو تمہاری ضد نے اسے بخشا ہے۔"

رعنا نے تھوڑے توقف کے بعد یوں کہنا شروع کیا' جیسے کچھ بھی نہ کہنے کا عہد کرنے کے باوجود وہ خود کو یہ سب کہنے سے روک نہیں پا رہی ہوں۔

"اتنا بڑا قدم اٹھاتے وقت تمہیں اس بات کا ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ اس کا تمہاری ماں پر کیا اثر پڑے گا؟ تم اکلوتے بیٹے ہو اس کے۔ کتنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہوں گی اس نے تمہاری ذات سے تم کیا ایک ماں کی حیثیت سے اس کا تم پر اتنا بھی حق نہیں کہ تمہارے اس فیصلے میں وہ بھی شامل ہوتی یا اپنی رائے کا اظہار کر سکتی؟ کم از کم اس کے لوٹنے تک تو انتظار کیا ہوتا تم نے۔ اپنی ماں کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے تھے تم؟"

رعنا نے کہا تو حذیفہ شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ رعنا درست کہہ رہی تھیں۔

"مام کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"سوائے اس لڑکی کو چھوڑنے کے۔" رعنا تلخی سے بولیں۔ حذیفہ کے چہرے پر پھیلے کرب میں یک دم کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

"اگر اتنا بڑا فیصلہ بنا سوچے سمجھے کیا تو میں نے کیا' جلد بازی کی تو میں نے کی' جویریہ تو خطاوار نہیں' پھر اسے اس کی سزا کیوں دی جائے؟" وہ بولا۔

ایسے موقع پر بھی کسی کے ساتھ زیادتی کر جانے کے احساس نے حذیفہ کو کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے باز رکھا ہوا تھا۔

"ٹھیک کہا تھا اس لڑکی نے۔ حذیفہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ یہ اس کی سرشت میں ہی نہیں۔" رعنا نے سر جھکا کر سوچا تھا۔

"اگر میں تم سے یہ کہوں کہ وہ لڑکی اتنی معصوم اور بھولی بھالی نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو تو؟"

"آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟" حذیفہ نے حیران ہو کر رعنا کی شکل دیکھی۔ رعنا نے گہرا سانس لے کر خود کو وہ کہنے کے لیے تیار کیا جس پر عرشی کے مستقبل کا دارو مدار تھا۔

"تم نے ٹھیک سنا تھا۔ وہ لڑکی تمہارے راہوالی جانے کے بعد یہاں آئی تھی۔ تم سے ملنے نہیں' بلکہ

تم سے جڑے رشتے کی قیمت وصول کرنے جو ہم نے اسے دے دی۔ اب وہ واپس نہیں آئے گی کیونکہ اس کے پیروں میں نوٹوں کی زنجیریں پڑ چکی ہیں۔"

"یہ غلط ہے، جویریہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔" حذیفہ نے دبے دبے غصے کے ساتھ کہا۔

"تمہیں لگتا ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" رعنا نے پوچھا۔

"یہ آپ کو بہتر پتا ہوگا۔" وہ تنک کر بولا تو رعنا چپ ہو گئیں، پر وہ بھی اتنی جلدی ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہ تھیں۔

"اگر یہ غلط ہے تو پھر تم ہی بتاؤ کہ وہ اب تک لوٹ کر کیوں نہیں آئی؟ وہ تمہارے لیے گمشدہ ہے، تم تو اس کے لیے گمشدہ نہیں ہو، پھر ایسی کیا چیز ہے جو اسے تم تک پہنچنے سے روکے ہوئے ہے؟" رعنا کی اس بات پر حذیفہ کے چہرے پر پہلی بار تذبذب کے آثار نظر آئے۔

"میں نہیں مان سکتا۔ جویریہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔" حذیفہ نے ایک بار پھر زور دے کر کہا۔ مگر اس بار اس کے لہجے میں پہلے جیسا یقین نہیں تھا۔

"تمہیں کیا معلوم، وہ کیسی لڑکی ہے، تم اس کے بارے میں جانتے ہی کتنا ہو؟ کتنے عرصے کی ملاقات ہے تمہاری اس سے؟ پھر بھی میری بات کا یقین نہیں کرنا چاہتے ہو تو مت کرو، لیکن تمہارے نہ ماننے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔"

رعنا خاموش ہو گئیں۔

وہ اپنا پتا پھینک چکی تھیں۔ بازی ان کے حق میں جاتی تھی یا نہیں، یہ اب قسمت پر منحصر تھا۔

"اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو آپ نے مجھے یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا؟" اس نے رعنا سے پوچھا۔

"بتا دیتی تو کیا تم یقین کر لیتے؟" رعنا نے الٹا سوال کیا تو حذیفہ ایک بار پھر چپ ہو گیا۔

یقین تو اسے اب بھی نہیں تھا، مگر حالات و واقعات جویریہ کے خلاف جا رہے تھے۔ اگر جویریہ واقعی حق پر تھی تو آ کر اپنا حق ثابت کیوں نہیں کر رہی تھی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو حذیفہ، رعنا کی کہی باتوں پر دوسری بات سوچتا بھی نہیں، مگر اس وقت اسمارہ کی حالت کے پیش نظر دل میں ابھرنے والے احساس جرم کا پلڑا، دیے گئے وعدے کے پلڑے سے کہیں بھاری ہو چکا تھا۔

حذیفہ نے کچھ عرصہ پہلے اپنا باپ کھویا تھا۔ وہ باپ جس نے اس مشکل فیصلے میں اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اگر دل سے راضی نہ ہوتے تو کبھی اس معاملے میں حذیفہ کی معاونت کا اقرار نہ کرتے۔ یہ بات اچھی طرح سے جان لینے کے باوجود حذیفہ گزرے چند دنوں کے دوران خود کو یہ سوچنے سے باز نہیں رکھ پایا کہ کہیں اس کے باپ کی اچانک موت کے پیچھے بھی اس کے اٹھائے قدم کا ہاتھ تو نہیں ہے۔

لیکن اسمارہ کی اس وقت جو حالت تھی۔ اس کے پیچھے کسی نہ کسی حد تک حذیفہ کے اٹھائے قدم کا ہاتھ بھی ضرور تھا، یہ بات حذیفہ رعنا کے جتائے بنا بھی جانتا تھا۔

باپ کے بعد وہ اپنی ماں کو نہیں کھونا چاہتا تھا۔

"پھر آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟" اس نے رعنا کی طرف رخ کرتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔

"اسمارہ کو اس کا بیٹا، اس کا غرور واپس لوٹا دو۔" رعنا نے کہا۔

"مگر کیسے؟"

"اس کی بات مان کر، اس کی خواہش کو پورا کر کے۔" رعنا بولیں۔ "تم عرشی سے شادی کر لو، اسمارہ یہی چاہتی ہے۔"

"لیکن۔۔۔" حذیفہ نے کچھ کہنا چاہا، پر رعنا نے کہنے کا موقع نہ دیا۔

"میں جانتی ہوں کہ تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔ تم اب بھی ایک ایسی لڑکی سے وفاداری نبھانے پر بضد ہو جس کے لیے تم دولت حاصل کرنے کے ذریعے کے علاوہ اور کچھ نہ تھے۔ تمہارا دل اس لڑکی کی اصلیت کو جان لینے کے باوجود اسے ماننے کو تیار نہیں ہے، لیکن میری تم سے صرف ایک گزارش ہے،

ایک نظر اپنی ماں کے چہرے پر بھی ڈال کر دیکھو اور اس کی اذیت اور تکلیف کا اندازہ لگاؤ، پھر بولو کہ تمہارا دل کیا کہتا ہے۔"

رعنا نے نرمی سے کہا تو حذیفہ نے شیشے کے پار دیکھا جہاں اسپتال کے مخصوص سفید کپڑوں میں ایک نرس اسمارہ کا بی پی چیک کر رہی تھی۔

اسمارہ کا چہرہ زرد اور آنکھیں بند تھیں لیکن ایک چیز اتنے فاصلے سے بھی حذیفہ کو صاف دکھائی دے رہی تھی وہ یہ تھی کہ اسمارہ نیند یا بیداری، جس بھی حالت میں تھیں، پرسکون ہرگز نہیں تھیں۔

ان کے چہرے کے خدوخال کے درمیان پچھلے چند دنوں میں جن پریشان کن لکیروں کا اضافہ ہوا تھا۔ ان کا ان کی بیماری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

حذیفہ کے چہرے پر پھیلتی فکر و تردد کی پرچھائیوں کو دیکھ کر رعنا کو اچانک چھ فٹ کے حذیفہ کی جگہ وہی دو سالہ سال کا بچہ نظر آنے لگا، جسے وہ تب اپنی پیاسی ممتا سیراب کرنے کے لیے گود میں لیے لیے پھرتی تھیں۔ ایک لحہ کے لیے رعنا کا دل چاہا کہ اپنے اپنے جھوٹ واپس لے لیں۔

پھر وہ لحہ گزر گیا۔

خالہ کی محبت پر ایک ماں کی خودغرضی غالب آ گئی۔

"ٹھیک ہے خالہ۔ اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو یہی سہی۔ میں عرشی سے شادی کے لیے تیار ہوں۔" حذیفہ نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

☼ ☼ ☼

عرشی کو زندگی کبھی اتنی حسین نہیں لگی تھی جتنی اب۔ اسے وہ شخص مل گیا تھا جسے پانے کی تمنا سالوں سے اس کے دل میں بسی تھی۔

وہ بہت بہترین نہ سہی، پر کچھ ایسا برا شوہر بھی نہیں ہو رہا تھا۔ عرشی کے ساتھ اس کے برتاؤ کو کسی طور نامناسب قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آتا اور ہر ممکن حد تک اس کا خیال بھی رکھتا۔ پھر بھی اس کے رویے میں وہ چاہت یا خوشی چھلکتی دکھائی نہیں دیتی تھی جو ایک نوبیاہتا جوڑے کو ممتاز کر کے بھرے مجمع میں بھی اس کی شناخت کرا دیتی ہے۔

اپنی فتح کے نشے میں چور ہو کر عرشی کو اس کمی کا احساس نہ ہوا ہو، پر گھر کا ایک فرد ایسا ضرور تھا جسے یہ کمی بہت بری طرح سے کھٹکتی تھی۔

اور وہ تھیں اسمارہ۔

اسمارہ کو اب باقاعدگی سے اسپتال جانا پڑتا تھا۔ جس دن ان کو جانا ہوتا، اس دن حذیفہ اپنی تمام مصروفیات کو ترک کر کے انہیں خود لے کر جاتا، وہ اب ویسے ہی اسمارہ کا خیال رکھنے لگا تھا، جیسے وانش رکھا کرتے تھے، ہر پل، ہر وقت۔

حذیفہ عملی زندگی میں قدم رکھ کر گھر سے آفس اور آفس سے گھر کی لگی بندھی روٹین میں جت گیا اور عرشی بھی ان سرگرمیوں میں پھر سے گم ہو گئی، جو شادی سے پہلے اسے مصروف رکھا کرتی تھیں۔

لیکن اسمارہ کو یہ ساری روٹین بہت عجیب لگنے لگی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہوا تھا۔

رعنا نے ٹھیک کہا تھا، اسمارہ یہی تو چاہتی تھیں، پھر کیا وجہ تھی کہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتا کرتے یا رات کا کھانا کھاتے ہوئے یا پھر کسی بھی ایسے وقت جب وہ تینوں ایک جگہ پر اکٹھے موجود ہوتے تھے، ان کے درمیان گونجنے والی آواز صرف عرشی کے موبائل فون کی بیپ یا پھر اس کی موبائل پر کی جانے والی گفتگو کی ہوتی۔ عرشی کی اس یکطرفہ بات چیت کے دوران وہاں موجود باقی کے دو فریقوں کے درمیان چھائی خاموشی کا احساس اور بھی بڑھ جاتا۔

کئی بار اسمارہ نے وحشت زدہ ہو کر اس خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی، مگر توڑ نہیں پائیں۔

ایسا نہیں تھا کہ حذیفہ ان سے بات نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ اب بھی اسمارہ کی ہر بات کا جواب اتنی ہی عزت اور محبت کے ساتھ دیتا جتنا پہلے دیا کرتا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اب وہ محض "جواب" ہی دیا کرتا تھا، عرشی کے اور اسمارہ کے پوچھے سوالوں یا ان کی کہی باتوں کا۔ اس کے پاس جیسے خود سے کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

حذیفہ کی وہ بذلہ سنجی جو کبھی سارے گھر میں جان ڈال دیا کرتی تھی' اب خاموشی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کی شوخی پر سنجیدگی کا پردہ پڑ چکا تھا۔

حذیفہ نے ہمیشہ جو بھی محسوس کیا' کھل کر کیا۔ کبھی بھی اپنی خوشی و انبساط یا پھر کسی اور دلی کیفیت کو کسی سے چھپا کر رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی بولتی آنکھیں اس کے ہر جذبے عیاں کر دیا کرتی تھیں۔ اب اسمارہ کو اس کی آنکھوں میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی تاثر نہیں ملتا تھا۔

عرشی نے شاید اس کی اس تبدیلی کو ابھی تک محسوس نہیں کیا تھا اور اگر کیا بھی تھا تو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

عرشی کا خیال تھا کہ حذیفہ کا یہ نیا روپ ایک فطری چیز ہے جس کے لیے پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اب حذیفہ کوئی نوعمر لڑکا نہیں رہا بلکہ ایک میچور شادی شدہ مرد ہے۔ زندگی میں اتنی بڑی تبدیلی آنے کے بعد شخصیت میں بدلاؤ آنا کوئی غیر معمولی بات تو نہیں۔

یہ بدلاؤ عرشی کے لیے بھلے اہمیت نہ رکھتا ہو مگر اسمارہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ عرشی کوشش کر کے اس پرانے حذیفہ کو واپس لے آئے۔ آخر وہ حذیفہ کی بیوی تھی۔ اس سے بہتر طور پر اس کام کو کون سرانجام دے سکتا تھا۔

ایک بار جذبات کی رو میں آ کر اسمارہ نے عرشی کو یہ سب سمجھانے کی بے کار سی کوشش بھی کی۔ حذیفہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت بتانے' اس کی دن بھر کی مصروفیات میں دلچسپی دکھانے اور جہاں تک ممکن ہو سکے ان مصروفیات میں خود کو شامل کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

"جب حذیفہ کو میرے لائف اسٹائل پر اعتراض نہیں' نہ ہی اس کو میرے کہیں آنے جانے سے کوئی پرابلم ہے تو پھر آپ پابندیاں لگانے والی کون ہوتی ہیں۔ آپ خالہ ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کو اپنی زندگی میں دخل اندازی کی اجازت دے دوں گی۔"

عرشی نے انہیں ٹکا سا جواب دے دیا تو اسمارہ اپنا سا لے کر رہ گئیں۔

آخر عرشی کو انہوں نے اور رعنا نے ہی مل کر سر چڑھایا ہوا تھا۔ وہ اسے کچھ کہتیں بھی تو کیا کہتیں؟

شاید اس نئے رشتے کے رنگوں میں واقعی کچھ ایسا تھا جو پرانے رشتوں کے ہر رنگ پر چڑھ کر اسے رنگ کر دیتا تھا۔

یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اسمارہ کے لاشعور میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ عرشی شادی کے بعد ایک بہترین بیوی کے روپ میں خود کو ڈھال کر دکھائے۔ اسمارہ یہ بھول چکی تھیں کہ شادی کے بعد خود کو شوہر کے پسندیدہ روپ میں ڈھالنے کا زمانہ عرصہ ہوا بیت چکا ہے۔ اب کون کسی کے لیے اتنا تردد کرتا ہے اور پھر ان کے طبقے میں تو اس کا رواج ہی نہیں تھا۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جاتا تو قصور عرشی کا بھی نہیں تھا۔ اسمارہ کے ہی گلے بے معنی تھے۔

اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حذیفہ کا پسندیدہ روپ کیا تھا؟ یہ کسے معلوم تھا۔ اس نے تو اپنی ذات کو پسند و ناپسند کے جھنجھٹ سے ہی آزاد کرا لیا تھا۔ اس کے لیے ہر چیز "بس ٹھیک ہے" کی حد تک رہ گئی تھی۔ اچھا یا برا جیسے الفاظ اور ان کے معنی اس کے لیے اجنبی ہو چکے تھے۔

وہ تو جیسی گزر رہی تھی بس گزارے جا رہا تھا۔ اسمارہ کو اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ عرشی کو زندگی میں شامل کر لینے کے باوجود حذیفہ کی تنہائیوں میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہو گیا ہے اور سب سے زیادہ پریشان کن سوچ یہ تھی کہ اس کی ذمہ دار کوئی اور نہیں .

اپ۔

☼ ☼ ☼

اسمارہ کو اب اپنی تمام عمر اس مرض کے ساتھ گزارنی تھی' اس بات کے لیے حذیفہ خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔ مگر باقاعدگی کے ساتھ ڈائیلائسس کروانے کے باوجود اسمارہ کی دن بدن گرتی صحت کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھا۔

"ایک تو اسمارہ کے کیس میں کڈنی کے علاوہ چند اور فزیکل مسئلے بھی ہیں جو ان کے کیس کو پیچیدہ کرتے ہیں اور دوسرا۔"

ڈاکٹر ناصر حذیفہ کو بتاتے بتاتے رک گئے۔

"اور دوسری چیز ہے اسمارہ کی مینٹل کنڈیشن۔ دیکھو بیٹا! مجھے یہ کہنے میں عار نہیں ہے کہ کسی بھی بیماری کے علاج میں آدھا کام ڈاکٹر کرتا ہے اور باقی کا آدھا کام خود مریض۔ مسئلہ یہ ہے کہ تمہاری والدہ اپنے حصے کا کام نہیں کر رہی ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں' آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

حذیفہ نے الجھ کر ان سے پوچھا۔

"مریض کی صحت یابی میں ایک بہت بڑا حصہ اس کی مثبت سوچ کا ہوتا ہے۔ تمہاری والدہ شدید ڈپریشن کا شکار ہیں۔ دانش کی جدائی نے ان کے ذہن پر بہت اثر ڈالا ہے۔ کچھ بھی کر کے انہیں اس ڈپریشن سے باہر لے کر آؤ' ان میں جینے کی امنگ پیدا کرو۔ ورنہ بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔" ڈاکٹر ناصر نے کہا۔

"یہ میرے بس میں نہیں ہے انکل!" حذیفہ کے لہجے میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح جھنجھلاہٹ تھی۔ "میں سب کچھ کر کے دیکھ چکا ہوں۔ یہاں تک کہ اپنی پوری زندگی ان کی خواہش اور مرضی کے تابع کر چکا ہوں۔ لیکن میں ڈیڈ کو واپس نہیں لا سکتا۔"

وہ بے بسی سے بولا۔

"میرا خیال ہے کہ تم ان کو علاج کے لیے باہر لے جاؤ۔"

"اپنی تسلی کے لیے لے جانا چاہتے ہو تو بے شک لے جاؤ۔ میں تمہیں کچھ اچھے ڈاکٹروں کے ریفرنسز دے دیتا ہوں۔ تمہیں آسانی رہے گی۔" انہوں نے حذیفہ کے چہرے پر پھیلی فکر کو دیکھ کر نرمی سے کہا۔

☼ ☼ ☼

اسمارہ کو باہر لے جانے کے انتظامات حذیفہ نے بہت تیزی کے ساتھ مکمل کیے تھے۔

باہر کے ڈاکٹروں نے بھی اسمارہ کی بگڑتی حالت کے بارے میں وہی کچھ کہا جو پاکستان میں ڈاکٹر ناصر نے کہا تھا۔ اسمارہ خود صحت مند نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ ان کا ڈپریشن ان کی شفایابی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

ڈاکٹر اور حذیفہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اسمارہ کے ڈپریشن کی وجہ دانش کی اچانک موت ہی نہیں' کچھ اور بھی ہے، جو انہیں کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔

حذیفہ کو اس "کچھ اور" کے بارے میں اس دن علم ہوا جس دن اسمارہ نے حذیفہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کانپتی آواز میں اس سے معافی مانگی۔

"آپ کس بات کی معافی مانگ رہی ہیں؟" ان کے بستر کے ساتھ کرسی پر بیٹھے حذیفہ نے شدید حیرت کے عالم میں کہا۔

"تمہیں' تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے دور رکھنے کی معافی۔" اسمارہ کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔

"آپ سے کس نے کہا کہ میں خوش نہیں ہوں؟" حذیفہ اسمارہ کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔

"مجھ سے کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ماں ہوں تمہاری۔ اتنا تو سمجھ سکتی ہوں۔"

"ہم انسان بہت بے وقوف ہوتے ہیں۔ اپنی انا اور غرور میں ہمیں سامنے کی حقیقت نظر نہیں آتی اور جسے حقیقت سمجھتے ہیں وہ محض ایک سراب ہوتا ہے۔ ہمیں ہوش آتا ہے تو وقت آگے نکل چکا ہوتا ہے۔"

اسارہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی تھیں اور حذیفہ الجھ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔

"وہ تمہیں ڈھونڈتی گھر تک آئی تھی۔ میں نے اسے اندر ہی نہیں آنے دیا۔"

اسارہ نے ہمت کر کے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

اسارہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھے ہوئے حذیفہ کا ہاتھ لحہ بھر کو لرزا مگر اس کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑی۔

"اس وقت میں نے جو کچھ بھی کیا۔ یہ سوچ کر کیا کہ اسی میں تمہارا بھلا ہو گا۔ میرا عمل ضرور کھوٹا ہو گا مگر میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ بس یہی چیز دھیان میں رکھ کر اپنی ماں کو معاف کر دینا۔"

اسارہ نے آنکھیں موند کر کہا تو دو آنسو ان کی آنکھوں کے کناروں سے پھسل کر تکیے میں جذب ہو گئے۔

اسارہ کو یاد آیا کہ بچپن میں حذیفہ جب کوئی کھلونا یا کوئی اور چیز پسند کرتا تھا تو وہ اسے رد کر کے اس کی توجہ مہنگی اور قیمتی شے کی طرف دلانے کی کوشش کرتی تھیں جبکہ دانش انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے تھے۔

"ضروری نہیں کہ مہنگی چیز بہتر بھی ہو۔ چیزوں کو ان کی قیمت کے حساب سے نہیں، اپنے بیٹے کی پسند کے حساب سے تو لیے۔" مگر ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی اور جب آئی تب بہت دیر ہو چکی تھی۔

اسارہ کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔ حذیفہ کی طرف دیکھنے کی ہمت ان میں نہیں تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ آنکھیں کھولنے پر اگر اپنے بیٹے کے چہرے پر اپنے لیے نفرت یا ملامت نظر آئی تو وہ برداشت نہیں کر پائیں گی۔

حذیفہ کا دوسرا ہاتھ جو کافی دیر سے ان کے ماتھے کو ہولے ہولے سہلا رہا تھا، ایک دم سے ہٹ گیا۔

اسارہ کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔

اور پھر.....

اس ہاتھ کی جگہ حذیفہ نے اپنے لب رکھ دیے۔ اسارہ کی بند آنکھوں سے آنسو اب روانی کے ساتھ بہنے لگے۔

"میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کر ڈالی نا؟"

"آپ نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ پھر بھی اگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو سمجھ لیجیے گا کہ حساب برابر ہو گیا۔ اس احسان کا بدلہ اتر گیا جو آپ نے پال پوس کر مجھے بڑا کرنے میں میری ذات پر کیا تھا۔"

"پاگل کہیں کے۔" اسارہ تکلیف کے باوجود مسکرا دیں۔ "ماں اولاد کو پال کر احسان نہیں کرتی۔"

"تو پھر ماں اولاد کے ساتھ زیادتی بھی نہیں کر سکتی۔" حذیفہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر....."

"بس....." حذیفہ نے اسارہ کے ہونٹوں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔

"جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ اگر میری قسمت میں جوریہ سے ملنا لکھا ہے تو وہ ایک دن مجھے ضرور ملے گی۔" حذیفہ نے کہا۔

اسارہ نے کچھ دیر حذیفہ کے چہرے پر پھیلے یقین کو دیکھا پھر اپنے لبوں پر رکھی اس کی انگلی کو چوم لیا۔

☼ ☼ ☼

جوریہ پالک کے پتوں کو تسلے میں ڈال کر صحن لگے نل کے نیچے دھونے کے لیے لے آئی۔

پالک ندیم صاحب کی پسندیدہ سبزی ہوا کرتی تھی پالک گوشت وہ بہت شوق سے کھاتے تھے۔ اب پالک گوشت پسند کرنے والے ندیم صاحب رہے نہ ہی وہ گھر جہاں یہ پکتا تھا۔

جوریہ اب خالہ بتول کے ساتھ منیر بھائی کے گھر میں رہائش پذیر تھی۔

"دیکھ بیٹا! اب تیرا اس گھر میں اکیلے رہنا نہیں۔" خالہ بتول نے جوریہ سے کہا تھا۔ "جس میں مرد کا سایہ نہ ہو، وہاں ایک چھوڑ کئی مختار والی نظریں لگی رہتی ہیں۔ میں ٹھہری بڑھی، بیمار عورت، میرے ساتھ رہ بھی جاؤں تو کہاں تک تیری حفاظت کرتی پھروں گی۔" وہ اسے اپنے بیٹے کے پاس لے آئی تھیں۔

مختار والے واقعے کے بعد جوریہ اس قدر ڈر گئی تھی کہ چاہ کر بھی خالہ سے اختلاف نہ کر سکی۔ لاہور سے واپسی پر وہ اس قدر پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی کہ خود سے کوئی بھی فیصلہ لینے کے قابل نہ رہی تھی۔ ایسے میں خالہ کا احسان کم نہ تھا کہ انہوں نے جوریہ کے سر پر ہاتھ رکھنے کی ہامی بھر لی تھی۔

"اے..... یہ کیا کر رہی ہو؟" کسی نے جوریہ کے ہاتھ سے جھپٹ کر تسلہ چھینا جس کے کناروں سے پانی کے ساتھ پالک کے پتے بھی بہہ کر نالی میں تیرتے جا رہے تھے۔

"ستیاناس مار دیا ساری سبزی کا۔ اب بچا ہی کیا ہے جو پکاؤں۔"

یہ خالہ کی بہو نسرین تھی جو پانی سے بھرے تسلے میں ہاتھ مار کر بچی کچی پالک کا اندازہ لگاتے ہوئے غصے سے بڑبڑا رہی تھی۔

جوریہ شرمندہ ہو گئی۔ اپنی سوچوں کے سمندر میں ڈوب کر اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کتنی پالک پانی کے ساتھ بہہ کر ضائع ہو چکی تھی۔

نسرین کو تو خالہ کا وجود ہی گوارا نہ تھا۔ اس کا گھر کون سا مکمل تھا دو افراد کی گنجائش نکالنے میں اسے کافی تنگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اوپر سے بیٹھے بٹھائے جوریہ مفت میں نسرین کے سر پر آ پڑی تھی۔ وہ جوریہ کو کبھی کبھی ایسی عجیب نظروں سے دیکھتی کہ جوریہ گھبراہٹ میں آدھا ہو جاتی۔

گرمیوں میں چھٹیوں کے لیے راہوالی جانے سے قبل جوریہ (Lums) کے سمر کوا رٹر ________ کے لیے رجسٹریشن کروا کر گئی تھی مگر جوریہ کے راہوالی پہنچتے ہی حالات نے جس طرح رخ بدلا اس کو مد نظر رکھتے ہوئے جوریہ کا فوری طور پر پڑھائی کے لیے واپس آنا ممکن نہیں رہا۔ جوریہ نے اس آپشنل کوارٹر کو چھوڑ دینے کی اس وقت حذیفہ نے بھی پذیرائی کی تھی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ ندیم صاحب کی موت کے فوراً بعد جوریہ ذہنی طور پر اس قابل نہیں کہ یونیورسٹی کی ٹف روٹین اور مشکل پڑھائی کو برداشت کر سکے۔

منیر بھائی کے گھر میں لینڈ لائن نہیں تھی مگر جوریہ نے منیر کے موبائل سے حذیفہ کو متعدد بار فون کرنے کی کوشش کی مگر یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ کامیاب نہ ہو سکی۔

"منیر بھائی! ایک بار پھر میں لاہور جا کر کوشش کرنا چاہتی ہوں۔" حذیفہ سے رابطے میں ناکامیوں سے تنگ آ کر جوریہ نے آخر منیر سے کہا۔

"وہاں جانے کا ابھی کوئی فائدہ نہیں۔ جس سے ملنا ہے وہ وہاں ہے ہی نہیں۔ اپنی ماں کو علاج کے لیے ملک سے باہر لے کر گیا ہوا ہے۔"

منیر نے یہ بتا کر جوریہ کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

وہ اس بار لاہور سے واپسی پر پوری خبر لے کر آیا تھا۔

حذیفہ کے چلے جانے کا سن کر جوریہ کا رہا سہا حوصلہ بھی جواب دینے لگا۔

آخر وہ اسے اس طرح بیچ منجدھار میں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔

"صبر کر بیٹا! جہاں اتنا انتظار کیا، تھوڑا سا اور کر لے۔ اپنی ماں کو علاج کے لیے لے کر گیا ہے، جلد یا بدیر لوٹ کر آ ہی جائے گا۔ فکر نہ کر۔" خالہ بتول بھی جوریہ کو تسلی دیتیں۔

پر فکر نہ کرنا جوریہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ البتہ صبر وہ تب سے اب تک کیے ہی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"حذیفہ کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل نہیں ہو سکی۔ وہ لوگوں کے سامنے مطمئن ہونے کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ خالہ کی یہ سب کہنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ میرے ساتھ اس کی زندگی میں کس چیز کی کمی ہے۔ جس کا وہ سوگ منائے گا؟"

عرشی کو اسارہ پر سخت غصہ تھا جنہوں نے کمرے میں اس کی موجودگی کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے حذیفہ سے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ اس وقت عرشی نے نجانے کیسے اپنی طبیعت کے خلاف خود کو کچھ بھی کہنے سے روکے رکھا پر اب وہ شدید طیش کے عالم میں سارے کمرے میں یہاں سے وہاں پھر رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے خالہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" عرشی نے دانت پیستے ہوئے بدتمیزی سے کہا۔

"چھوڑو بھی اب۔ وہ بیمار ہے۔ بیماری میں انسان الٹی سیدھی باتیں کر جاتا ہے۔ غصہ تھوکو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اتنی ٹینشن تمہارے لیے اچھی نہیں ہے۔"

رعنا نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ عرشی امید سے تھی اور ہر ماں کی طرح اس حالت میں رعنا کو بھی اس کی بہت زیادہ فکر رہتی تھی۔

حذیفہ جب اسارہ کو علاج کے لیے باہر لے جانے لگا تھا تو عرشی بھی ساتھ ہولی۔ ویسے بھی وہ اور حذیفہ شادی کے بعد کہیں گھومنے کے لیے نہیں گئے تھے۔ ان کی شادی ہی اتنی ایمرجنسی میں ہوئی تھی' پھر اسارہ کی طبیعت بھی اس عرصے کے دوران کچھ ایسی بگڑتی سنورتی رہی کہ اگر کہیں جانے کا کوئی موقع میسر آتا بھی تو حذیفہ اسارہ کو ایسی حالت میں چھوڑ کر کبھی نہیں جاتا۔

پر اب یہ سبب خود سے ہی بن گیا تھا۔

عرشی کا خیال تھا کہ اسارہ کے علاج کے بہانے ان کی تفریح بھی ہو جائے گی پر وہاں جا کر وہ الٹا بور ہو گئی۔ حذیفہ تو اسارہ کو لے کر ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے بیچ گھن چکر بنا رہتا اور عرشی پہلے کی دیکھی بھالی ساری جگہوں پر بار بار اکیلے جا کر اکتا گئی۔

اس نے ایک بار حذیفہ سے ساتھ چلنے کو بھی کہا' مگر حذیفہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کے پاس بالکل بھی وقت نہیں۔ عرشی کو جہاں جانا ہے وہ شوق سے جا سکتی ہے۔

"پر تم بھی تو ساتھ چلو نا۔ سیر کا مزا تب ہی آتا ہے جب کوئی ساتھ دینے والا ہو۔" عرشی نے حذیفہ کے پاس بیٹھتے ہوئے لگاوٹ سے کہا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ میں یہاں سیر سپاٹے کے لیے آیا ہوں؟" جواب میں حذیفہ نے برف سے ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ عرشی مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔

لندن قیام کے دوران حذیفہ کی پوری توجہ اسارہ کی طرف ہی رہی۔ رفتہ رفتہ یہ چیز بھی عرشی کو کھٹکنے لگی۔

اس میں خود غرضی کا عنصر ضرورت سے زیادہ تھا۔ تمام عمر ہر ایک کی توجہ کا بلا شرکت غیرے مرکز بنے رہنے کے بعد اس کی خود کو اولین اہمیت ملتا دیکھنے کی عادت بھی پختہ ہو چکی تھی۔ ایسے میں وہ ایک شخص جس کی سوچوں پر بھی عرشی حاوی ہو جانے کی خواہش رکھتی تھی' اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف متوجہ رہے' چاہے وہ دوسرا اس کی بیمار ماں ہی کیوں نہ ہو عرشی کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگا۔

اسی بات کو لے کر عرشی اور حذیفہ کے درمیان شادی کے بعد پہلا جھگڑا ہوا اور عرشی شدید غصے کے عالم میں اپنا سارا سامان سمیٹ کر پہلی فلائیٹ سے پاکستان واپس آ گئی۔

اس کی اس جلد بازی پر رعنا نے اسے خوب کھری کھری سنائیں۔

"میں نے تمہیں یہاں سے جاتے وقت سمجھایا تھا کہ حذیفہ کو راضی کرو کہ وہ لندن والا اپنا آفس سنبھال لے۔ وہاں مستقل رہائش اختیار کرنا تمہارے لیے کتنا ضروری ہے۔ مجھے تمہیں سمجھانے کی ضرورت ہے کیا؟ اس کے باوجود تم نے کیا کیا؟ لڑ جھگڑ کر یہاں آ گئیں۔"

"آپ نے بھی تو کتنی کوشش کی تھی کہ وہ وہاں رہائش اختیار کر لے۔ اس نے آپ کی ہاں میں ہاں ملائی جو میری مانے گا؟ ایک نمبر کا ضدی ہے وہ۔ ویسے بیمار ماں کے سرہانے ساری عمر بیٹھا رہے گا مگر سیٹل ہونے کی بات کرو تو صاف انکار۔ اب جب واپس آئے گا تو آپ خود سے کوشش کر کے دیکھ لیجیے گا۔" عرشی نے بے زاری سے کہا۔

عرشی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ دنیا کے بہترین ڈاکٹروں اور اعلیٰ سے اعلیٰ طبی سہولیات کی موجودگی میں حذیفہ کو اسارہ کی دیکھ بھال خود کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

☼ ☼ ☼

اپنی زندگی کی لڑائی تو اسارہ بہت پہلے ہی ہار چکی تھیں۔ یہ حذیفہ ہی تھا جو ہتھیار پھینکنے پر رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ اس دن جب لندن میں خلاف توقع بہت خوب صورت دھوپ نکلی تھی' اسارہ ساتھ چھوڑ گئیں۔ حذیفہ کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے ایک چہرہ بار بار آ جا رہا تھا۔ اور وہ تھا' اسارہ کا چہرہ۔

کبھی کھانے میں نخرے کرتے دس سالہ حذیفہ کے منہ میں نوالے بنا کر ڈالتیں اسارہ تو کبھی سائیکل پر سے گر کر چوٹ لگوا آنے پر حذیفہ کے زخموں کو صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی لاپروائیوں پر اسے ڈانٹتی ہوئیں اسارہ۔ حذیفہ کی کبھی کوئی آیا نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے والدین کے بہت قریب رہا تھا اور بہت تھوڑے وقفے سے دونوں ہی اس سے جدا ہو کر ابدی سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ دکھ کی انتہائی کیفیت میں تنہا بیٹھا حذیفہ انہیں یاد کر کے بے تحاشا رویا۔

☼ ☼ ☼
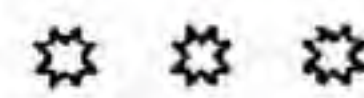
عرشی نے لاؤنج سے گزرتے رعنا کو سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ فون پر بات کرتے سنا۔ وہ حذیفہ سے اسارہ کی میت کو پاکستان واپس لانے کے انتظامات کے بارے میں استفسار کر رہی تھیں۔

حذیفہ کے بعد جس دوسری شخصیت پر اسارہ کی موت کا سب سے زیادہ اثر ہوا' وہ رعنا تھیں۔

انہیں حذیفہ کے درد کا بھی احساس تھا۔

اتنے قلیل عرصے کے دوران یہ دوسری ڈیڈ باڈی تھی جسے حذیفہ پاکستان لے کر آ رہا تھا۔

پہلے باپ' پھر ماں۔ حذیفہ کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی' یہ رعنا سمجھ سکتی تھیں۔

عرشی' رعنا کو رومال سے آنکھیں پونچھتا چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ اسارہ کی موت کا افسوس اسے بھی تھا لیکن اس کے غم میں وہ شدت نہیں تھی جو حذیفہ اور رعنا محسوس کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب جویریہ کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔

کچھ عجیب سا خواب دیکھا تھا۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی پر خواب سے منسلک کوئی منظر' کوئی بات ذہن کے پردے پر اب منعکس نہیں ہو رہی تھی۔ اس سے بمشکل دو ڈھائی فٹ کے فاصلے پر بچھی چارپائی کے اوپر منیر بھائی کے ساتھ سات سالہ گڈو اور نو سالہ پپو بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔

جویریہ پانی پینے کے لیے اٹھی۔

کچن کا دروازہ بند تھا۔ مانو بلی کی ستائی نسرین سونے سے پہلے اسے مقفل کرنا کبھی نہیں بھولتی تھی۔ مانو کے لیے تو خیر دروازہ بند کر دینا بھی کافی تھا۔ قفل لگانے کی اضافی ضرورت صرف مانو کے لیے تھی یا پھر۔۔۔؟

خالہ کے دروازے کے باہر برآمدے میں پانی کی بھری گھڑونچی رکھی رہتی تھی۔ خالہ کو گھڑے کا پانی پسند تھا۔ وہ بہت اہتمام کے ساتھ روزانہ گھڑونچی میں پانی بھر کر اس کی گردن پر کیاری سے توڑے موتیے کے پھولوں کا ہار سجاتی تھیں۔

خالہ کے کمرے کا دروازہ پوری طرح سے بند نہ تھا۔ روشنی کی باریک لکیر کے ساتھ اندر سے باتوں کی دھیمی دھیمی آواز بھی آ رہی تھی۔

خالہ کو اکثر راتوں کو نیند نہیں آتی تھی' اس لیے ان کا دیر تک جاگتے رہنا جویریہ کے لیے حیرانی کی بات نہ تھی۔ حیرت اسے اندر سے آتی باتوں کی آواز پر ہوئی۔

کون تھا جو اتنی رات گئے خالہ کی شب بیداری میں ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

نسرین بھابھی سے تو اس کی توقع نہیں کی جا سکتی

تھی۔ شاید منیر بھائی۔۔۔؟

اس نے گھڑے کے اوپر اوندھے دھرے اسٹیل کے گلاس کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اندر سے آتی آوازوں میں اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی۔

"جویریہ لاہور جانے کے لیے بہت بے چین ہو رہی ہے۔ کسی دن یہاں سے نکل کر خود ہی پہنچ گئی تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔" یہ خالہ بتول کی آواز تھی۔

"کیے کرائے کو چھوڑ اماں! یہ بات کھل گئی تو جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔" یہ منیر تھا جو بولا تھا۔

"تجھے یاد نہیں اماں! لاہور سے واپسی پر جویریہ کو یہاں چھوڑ کر جب تجھے لینے گیا تھا تو اس کا شوہر اسے وہاں پہنچ کر ڈھونڈ رہا تھا۔ کم بخت محلے والوں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں ہی جویریہ کو لاہور لے کر گیا ہوں پر میں بھی اڑ ہی گیا کہ میں تو جویریہ کو اڈے پر چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ آگے مجھے کچھ نہیں پتا توبہ! کس مشکل سے اس سے جان چھڑائی تھی میں نے۔" اندر منیر نے شاید کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"یہ سب تو گزری ہوئی باتیں ہیں۔ اب آگے کی سوچ! آخر اسے کب تک یہاں بہانے بنا کر روکے رکھیں گے؟ ابھی تک تو تیرے میرے بھروسے پر بیٹھی ہوئی ہے پر کبھی نہ کبھی تو اسے شک پڑ ہی جائے گا۔" خالہ نے کہا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں اماں کہ ذرا دھیان رکھا کر۔ بس تھوڑے عرصے کی بات ہے۔۔۔ بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ وہ سب جلد ہی باہر رہائش اختیار کرنے والے ہیں۔ ایک بار وہ لوگ یہاں سے نکل گئے تو پھر جاتی رہے جہاں اس کا دل کرتا ہے۔"

"ائے ہائے منیر! یہاں سے چلے جانے کے بعد بیگم صاحبہ ہمیں پیسے بھجوانے بند تو نہیں کر دیں گی نا؟" خالہ کو نئی فکر نے آگھیرا۔

"تو فکر نہ کر اماں! ان کے جانے سے پہلے ہی میں اتنی رقم بٹور لوں گا کہ سالوں عیش کریں گے۔" منیر نے تسلی دی۔

"یہ ٹھیک ہے۔" خالہ کو اطمینان ہوا۔

"ویسے منیر! ہے تو عقل کا پورا۔ کتنی ہوشیاری سے کام لیا۔ جو واپس جا کر اس بیگم سے سارا معاملہ طے کر لیا۔"

"ہاں اماں! میں نے سوچا کہ بیگم صاحبہ اس بات کی منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہیں کہ جویریہ ان کے لڑکے سے نہ ملے تو کیوں نہ اس بات کا فائدہ اٹھایا جائے۔ میں نے جا کر بیگم صاحبہ کو سمجھایا کہ ڈرانے دھمکانے یا زور زبردستی کرنے سے یہ لڑکی پیچھے ہٹنے والی نہیں۔ اس کو دور رکھنے کے لیے پیار بھرے بہلاووں سے کام لینا ہو گا اور یہ کام ہم لوگ کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ ہمیں اس کام کے دام دے دیے جائیں شکر ہے کہ بیگم صاحبہ کو میری بات سمجھ میں آ گئی۔" منیر نے کہا۔

"اللہ بھلا کرے بیگم صاحبہ کا۔ اس بار جو پیسے دیں گی ان سے میں پورے پانچ تولے کے کڑے بنواؤں گی۔" خالہ نے پرشوق لہجے میں کہا۔

"اماں! تیری عمر ہے کڑے پہن کر پھرنے کی؟" منیر نے بے زاری سے کہا۔

"کیوں میری عمر کو کیا ہوا؟ ابھی بھی پہننے اوڑھنے میں تیرے سے اچھی ہوں۔ اپنی شکل دیکھی ہے کبھی۔ ایسا لگتا ہے باندر (بندر) کے منہ پر مونچھیں اگ آئی ہیں۔" خالہ بدک کر بولیں۔ عمر کا طعنہ دل لگا تھا۔

"تو ناراض کیوں ہو رہی ہے اماں! میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔" منیر ماں کو جلال میں آتا دیکھ کر سٹپٹا گیا۔

کمرے کے اندر ناراضی بھری خاموشی طاری ہو گئی۔

کمرے کے باہر کھڑی ہوئی جویریہ کا پورا وجود پسینے سے بھیگ چکا تھا۔

کچھ دیر پہلے اس نے ایک خواب دیکھا تھا جو اسے بالکل بھی یاد نہیں تھا مگر اس خواب کی دہشت نے اسے نیند سے بیدار ہونے پر مجبور کر دیا تھا پر اب اس نے سنا وہ خواب سے کہیں زیادہ بھیانک تھا کیونکہ نہ تو وہ بیدار ہو کر اس حقیقت سے فرار حاصل کر سکتی

تھی اور نہ ہی اسے کبھی بھلا سکتی تھی۔

جویریہ لرزتے قدموں کے ساتھ دروازے سے ہٹ کر مڑی اور دھک سے رہ گئی۔

اس کے پیچھے خالہ کی بہو نسرین کھڑی تھی۔

"تو آخر تم نے سب کچھ خود ہی سن لیا۔ اچھا ہوا کم از کم تمہاری آنکھوں پر سے پٹی تو اتر گئی۔" نسرین نے مدھم آواز میں کہا تو جویریہ حیرت سے گنگ اسے دیکھے گئی۔

"تم کس قدر بے وقوف لڑکی ہو۔" نسرین تاسف سے سر ہلاتی ہوئی بولی۔

"تمہیں تب بھی کچھ سمجھ نہیں آیا جب منیر تمہیں لاہور سے واپسی پر تمہارے گھر لے جانے کے بجائے یہاں لے کر آ گیا اور اماں جو میرے دروازے پر ٹوکنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں وہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اماں نے تمہیں یہاں لے کر آنے کی کیا وجہ بیان کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اماں تمہیں وہاں اپنے یا تمہارے گھر میں رہنے دینے کا مول نہیں لے سکتی تھیں۔ وہاں پڑوسیوں اور محلے داروں سمیت بے شمار لوگ تمہارے جاننے والے تھے جبکہ یہاں پر کوئی بھی تم سے واقف نہیں اور تمہارے ان بے شمار جاننے والوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ تم اس وقت کہاں ہو۔ کوئی تمہیں ڈھونڈنا بھی چاہے تو نہیں کھوج سکتا۔ اماں اور منیر نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ سارا کام نپٹایا ہے۔ یہ وہ لوگ جنہیں تم آج تک اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھتی رہی ہو، تمہارے ہمدرد یا خیر خواہ نہیں ہیں، بلکہ تمہاری نگرانی پر مامور ہیں اور تم ان ہی پر بھروسا کر کے بیٹھی رہیں۔" نسرین دبی آواز میں جویریہ کو سرزنش کر رہی تھی اور جویریہ فق چہرہ لیے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"مگر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟" جویریہ بمشکل یہ کہنے میں کامیاب ہوئی۔ گلے میں آنسوؤں کا گولہ پھنسنے لگا تھا۔

"بات بگاڑنے یا سنوارنے کی نہیں ہے۔ بات پیسے کی ہے۔ پیسہ اچھے اچھوں کا ایمان خراب کر دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جب اماں نے تمہیں پناہ دی ہو تب ان کے ذہن میں نفع نقصان کا کوئی خیال نہ آیا ہو پر اب ایسا نہیں ہے۔ اب منیر ہر مہینے جا کر اس بیگم سے اتنی رقم لے آتا ہے جو ان دونوں ماں بیٹے کے ضمیر کی عدالت پر تالا ڈال دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ لیکن میں اپنے بچوں کی پرورش حرام مال پر نہیں کرنا چاہتی۔" نسرین آہستہ آواز میں انکشافات کر رہی تھی۔

"میں اسی لیے تمہیں یہاں رکھنے کے بالکل بھی حق میں نہیں تھی۔ اماں اور منیر پر تمہارے اندھے اعتماد کو دیکھ کر مجھے چڑ ہوتی تھی لیکن میں چاہ کر بھی تمہیں کچھ نہیں بتا پائی۔ اس وقت منیر اور اماں کے سروں پر دولت کا بھوت سوار ہے۔ میں ان کی مرضی کے خلاف ذرا سا بھی کچھ کروں گی تو یہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔۔۔ پر اب تو تمہیں سب کچھ خود ہی پتا لگ گیا ہے اب اگر اپنے شوہر سے ملنا چاہتی ہو تو کسی بھی طرح ان دونوں کے چنگل سے نکل جاؤ۔" نسرین نے اسے مشورہ دیا۔

"مگر کیسے؟ یہ لوگ مجھے یہاں سے جانے نہیں دیں گے۔" جویریہ نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ بتول خالہ اور منیر کی اصلیت جان لینے کے بعد وہ ان سے کسی بھی انتہائی قدم کی توقع کر سکتی تھی۔

جویریہ کی بات سن کر نسرین سوچ میں پڑ گئی پھر کہنے لگی۔

"کل منیر نے میرے ساتھ کاکے کو حفاظتی ٹیکہ لگوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ گھر پر صرف اماں ہی ہوں گی۔ ان کا دھیان جیسے ہی ادھر ادھر ہو تم موقع پا کر نکل جانا۔"

نسرین کے کمرے کی طرف سے کسی بچے کے کسمسا کر رونے کی آواز سنائی دی۔ شاید کاکا جاگ گیا تھا۔ نسرین نے بتول خالہ کے کمرے کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھا پر دروازے کے پیچھے سے کسی قسم کی حرکت کی کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

نسرین جویریہ کے قریب ہوتی ہوئی جلدی سے بولی۔
"تم اس وقت اپنے کمرے میں واپس چلی جاؤ اور دیکھو کسی کو پتا نہ لگے کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہے۔"
نسرین کے منت بھرے انداز پر جویریہ نے اثبات میں سرہلایا۔ اسے واقعی لوگوں کی پہچان نہیں تھی، جسے وہ الھڑ سمجھتی رہی وہ اپنی گرہستی کو خطرے میں ڈال کر اسے خبردار کر گئی تھی۔
اور بتول خالہ...... جنہیں جویریہ نے فرشتہ سمجھا، وہ کیا نکلیں؟
بتول خالہ اور منیر نے کس کس طریقے سے جویریہ کی سادہ لوحی کا فائدہ اٹھایا، یہ سوچ کر بھی اب جویریہ کو حیرت ہو رہی تھی۔ اسے اب سمجھ میں آرہا تھا کہ اس کے کسی کو بھی لکھے خطوط کے جوابات آج تک کیوں موصول نہیں ہوئے کیونکہ منیر کبھی وہ خط پوسٹ ہی نہیں کرتا ہوگا۔
اس کی فون نمبروں والی ڈائری کئی بار یاد دلانے کے باوجود منیر پرانے گھر سے لا کر دینا ہر بار کیوں بھول جاتا تھا۔
بتول خالہ اور منیر نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ نہ صرف اس کی کسی سے بھی رابطہ کرنے کی کوششوں کو ناکام بنایا تھا بلکہ اسے اپنے جھوٹے خلوص اور اپنائیت کے جال میں کچھ اس طرح پھنسایا کہ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔
بتول خالہ اور منیر کے پیار و الفت کے پیچھے چھپی اصلی کہانی جان کر جویریہ کو ان سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ مکروہ چہرے پر خوب صورت چہرہ سجائے رکھنے والے دوغلے لوگ۔
نسرین کاکے کو سلانے جا چکی تھی۔ جویریہ نے بھی اپنے تلاطم بھرے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔
اماوس کی رات تھی۔ صحن اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت فضا میں گونجنے والی واحد آواز اس جھینگر کی تھی جو کسی کونے میں چھپا نہایت مستقل مزاجی سے بول بول کر اپنی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔
پھر نجانے کیسے احتیاط کے ساتھ اندھیرے میں قدم رکھتی ہوئی جویریہ کا پاؤں اچانک سخت اور ٹھنڈی زمین کے بجائے کسی نرم اور جان دار چیز پر جا پڑا۔ فضا میں جھینگر کی یکسانیت بھری آواز کو دباتی ہوئی ایک ہولناک قسم کی چیخ کے ساتھ وہ چیز جویریہ کے پیر کے نیچے سے اتنی تیزی کے ساتھ نکلی کہ خود کو گرنے سے بچانے کی کوشش کے باوجود جویریہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی اور دھپ سے زمین پر جا گری۔
"ارے یہ مانو کیوں چلائی؟ جا کر دیکھ کہیں منڈیر سے گر تو نہیں گئی...... اب اٹھ بھی جا ہڈ حرام۔" چیخ کی آواز پر کمرے کے اندر سے بتول خالہ نے منیر کو جگایا۔ ان کے پیر دابتے دابتے وہیں اونگھ گیا تھا۔
"کیا ہے اماں...... بلی ہی تو ہے۔ گر بھی گئی تو زیادہ سے زیادہ کیا بگڑ جائے گا اس کا؟" منیر کچی نیند ٹوٹنے پر جھلا گیا۔
"جاتا ہے یا نہیں۔" خالہ نے غالباً پیٹھ پر دھمو جڑا۔
"جاتا ہوں اماں! کم بخت سوتی بھی تو دیوار پر چڑھ کر ہے۔ گرے گی نہیں تو اور کیا ہوگا۔" منیر بلی کو کوستا کمرے سے باہر نکلا۔
جویریہ کا کمرا بتول خالہ کے کمرے کے پار تھا۔ کے دروازے پر آجانے کے بعد وہ اپنے کمرے واپس نہیں جا سکتی تھی اور صحن میں سوائے اندھیرے کے اسے چھپانے والی اور کوئی چیز بھی نہ تھی۔
"ارے مانو تو ٹھیک ہے نا؟" اندر سے خالہ کی آواز آئی۔
"مانو یہاں نہیں ہے۔" منیر نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔
پھر اس کی نظر اندھیرے میں دم سادھے زمین پر گری ہوئی جویریہ پر پڑی۔
"یہاں پر تو جویریہ ہے اماں!" وہ بولا۔
"ہیں؟...... جویریہ...... ارے کہیں اس

ن تو نہیں لیا؟"
بتول خالہ کو اپنے اور منیر کے بیچ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی گفتگو یاد آئی تو وہ گھبرا کر ننگے پیر ہی پلنگ سے اتر کر باہر آگئیں۔
باہر آکر انہوں نے کھٹ سے برآمدے کا بلب جلا کر اندھیرے کو روشنی میں بدلا۔
جویریہ کی بہت ساری خامیوں میں ایک خامی یہ بھی تھی کہ اسے خود پر جھوٹ کا خول چڑھانا نہیں آتا تھا۔ صرف ایک نظر اس کی اڑی ہوئی رنگت پر ڈالتے ہی بتول خالہ کو اپنے سوال کا جواب خود بخود مل گیا۔
اس کے بعد صرف ایک لمحہ ایسا آیا جس میں صحن میں موجود تینوں نفوس اپنی اپنی جگہ پر بت بنے خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف تکتے رہے، پھر رات کے سناٹے کو بتول خالہ کی چنگھاڑتی آواز نے توڑا۔
"منیر! پکڑ اسے...... جلدی۔" خالہ کا یہ حکم سن کر جویریہ کی جان نکل گئی۔ وہ تیزی کے ساتھ اٹھ کر باہر کے دروازے کی طرف دوڑی۔ منیر بھی فوراً" خالہ کے حکم کی تعمیل میں اس کے پیچھے لپکا۔
اندھیرے میں کچھ دیر پہلے سنائی دینے والی ولدوز چیخ ایک بار پھر گونجی۔ اس بار منیر تھا جس کا پاؤں مانو کے اوپر آیا تھا جو اپنی مخصوص منڈیر کو چھوڑ کر آج زمین پر سونے کا تجربہ کر رہی تھی۔
منیر نے لڑکھڑاتے ہوئے ایک موٹی سی گالی مانو کی شان میں بیان کی اور اسے لات مار کر اپنے راستے سے ہٹایا۔ زندگی میں پہلی بار بتول خالہ نے اپنی چہیتی بلی کے ساتھ ہونے والے ظالمانہ سلوک پر نہ تو احتجاج کیا نہ ہی اس کی پروا کی۔ ان کا دھیان مکمل طور پر دروازے کی کنڈی کھول کر باہر نکلتی جویریہ کی طرف تھا۔
"منیر...... پکڑ اسے۔ یہ نکل گئی تو ہم برباد ہو جائیں گے...... جلدی۔"
خالہ صحن میں کھڑی چیخ رہی تھیں۔
جویریہ کو یہاں کے راستوں کا صحیح علم نہیں تھا، پھر بھی وہ رکی نہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ تنگ گلیوں سے نکل کر کھلی جگہ پر پہنچ گئی۔ گھر، چوبارے، تھڑے پیچھے رہ گئے۔ قدموں کے نیچے پتھروں اور اونچی نیچی ڈھیریوں والی زمین آگئی اور اس کے بعد تارکول کی بنی سیدھی سڑک۔ مگر جویریہ کو گھبراہٹ میں شاید ہی دونوں کا فرق محسوس ہوا ہو۔
جویریہ کو معلوم تھا کہ منیر اس کے پیچھے آرہا ہے۔ اس نے ایک دوبار اسے مڑ کر دیکھنے کی کوشش بھی کی۔ اسی پیچھے مڑ کر دیکھنے کے چکر میں اسے سامنے سے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائیٹس بھی نہیں نظر آئیں جو اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔
گاڑی کے بریک جویریہ سے دو فٹ کے فاصلے پر چرچرائے۔ جویریہ کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور وہ وہیں سڑک پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔
"او مائی گاڈ۔ رشید! یہ تم نے کیا کر دیا؟" گاڑی کے اندر بیٹھے پروفیسر اختر محمود نے حواس باختہ ہو کر اپنے ڈرائیور سے کہا۔
"میرا کوئی قصور نہیں ہے سر! یہ خود ہی بھاگتی ہوئی ایک دم سے گاڑی کے سامنے آگئی تھی۔" رشید نے فوراً" اپنی صفائی پیش کی۔
"اچھا! جلدی سے اتر کر دیکھو۔ کہیں گاڑی سے ٹکرا کر زخمی تو نہیں ہو گئی؟"
"گاڑی تو اسے لگی ہی نہیں۔ وہ تو پہلے ہی سڑک پر گر گئی تھی۔" رشید نے کہا۔
"اچھا! اب اتر کر دیکھو تو سہی، اسے ہوا کیا ہے؟" پروفیسر صاحب نے کہا۔
"سر جی! میرا خیال ہے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" رشید ہچکچاتے ہوئے بولا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا؟ اس کو ادھر ہی پڑا چھوڑ جائیں؟" پروفیسر صاحب بگڑ کر بولے۔ "حد ہوتی ہے بے حسی کی۔"
"میں صحیح کہہ رہا ہوں جی۔ آپ باہر سے آئے ہیں۔ آپ کو نہیں پتا، یہاں اسی طرح بہانے سے گاڑیاں رکوا کر مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔"

رشید گاڑی کو گیئر میں ڈال کر وہاں سے بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔

جب پروفیسر صاحب گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر خود باہر نکل آئے۔ باول نخواستہ رشید بھی اترا۔

سڑک کے بیچ میں بے سدھ پڑی لڑکی کم از کم بے ہوش ہونے کا ڈراما نہیں کر رہی تھی' اس کا اندازہ پروفیسر صاحب کو اسے دیکھتے ہی ہو گیا۔ رشید کی مدد سے لڑکی کو اٹھا کر انہوں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔

"گاڑی واپس موڑلو رشید! اسے فی الحال سینٹر لے جاتے ہیں۔" پروفیسر صاحب نے پیچھے بے ہوش پڑی جویریہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

جویریہ کا پیچھا کرتے منیر نے بڑی بے بسی سے دیکھا تھا۔ اس کے پہنچنے تک وہ دونوں آدمی جویریہ کو گاڑی میں ڈال کر لے جا چکے تھے۔

واپس پلٹتے ہوئے اس نے تشویش کے ساتھ سوچا کہ وہ رعنا بیگم کو یہ بات کس طرح بتائے گا کہ جویریہ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔

پروفیسر اختر محمود نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو بند کر کے دیکھا اور میز سے دوسری فائل اٹھائی جو پہلے سے بھی زیادہ ضخیم تھی۔

اس وقت جس کمرے میں پروفیسر صاحب بیٹھے تھے اس میں ان کی بڑی میز کرسی اور اس کے پیچھے کھڑی فائلیں رکھنے والے جہازی سائز کیبنٹ کے بعد بہت کم جگہ بچتی تھی۔ اپنی آدھی سے زیادہ عمر انہوں نے پڑھنے لکھنے کی نذر کر ڈالی تھی۔

وہ طویل عرصے تک مقامی کالج میں سوشل سائنسز کے مضامین پڑھاتے رہے تھے۔ بیوی عرصہ پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ اولاد خدا نے دی نہیں تھی۔ اسی لیے جب انہیں بیرون ملک کی ایک یونیورسٹی سے پڑھانے کی پیشکش ہوئی تو انہوں نے بلا جھجک قبول کرلی۔ باہر کی زندگی پروفیسر صاحب کو راس آئی۔

نہ کوئی گڑبڑ نہ کوئی افراتفری۔

کئی سال تک پروفیسر صاحب گوروں کو سوشل سائنسز کی تھیوریاں پڑھاتے رہے اور سماجی الجھنوں کو سنوارنے کے گر سکھاتے رہے۔ شاید ان کی باقی زندگی بھی ایسے ہی گزر جاتی اگر ان کی ملاقات ہانز سے نہ ہوتی۔

ہانز کا تعلق ڈنمارک سے تھا اور وہ ایک سوشل ورکر تھا۔ جب پروفیسر صاحب کی اس سے ملاقات ہوئی' اس وقت وہ یورپ میں کام کر رہا تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد ایسی تنظیموں کو بے نقاب کرنا تھا جو یورپ کے کم ترقی یافتہ ممالک سے کم عمر لڑکے لڑکیوں کو جھانسا دے کر دوسرے ممالک میں اسمگل کرتے اور قحبہ خانوں کی زینت بنا دیتے۔ اس کی ریسرچ اور محنت کی وجہ سے کئی ایسے گروہوں کی نشاندہی ممکن ہو سکی تھی جو ان قبیح کاموں میں ملوث تھے۔

ہانز سے مل کر پروفیسر کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ سماج کو بدلنے کے لیے بڑی بڑی کانفرنسوں میں پیپر پڑھ دینا' معتبرین کی تھیوریز رٹ لینا اور چند ایک پراجیکٹس کی سپرفیشل سرپرستی کرلینا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ پاتال ہے جس کے اندر اتر کر اپنے ہاتھوں سے گندگی کو صاف کرنا پڑتا ہے۔

ہانز کی سنگت میں پروفیسر صاحب نے بہت کچھ دیکھا' وہ کچھ سیکھا جو دنیا کی تمام کتابیں مل کر بھی نہیں سمجھا سکتی تھیں۔ وہ جو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اس عمر میں اگر وہ فقط اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہی آنے والی نسل میں منتقل کرنے کے قابل رہ گئے ہیں' خود نئے تجربوں سے روشناس ہونے لگے۔ انہیں اس بات سے بھی اتفاق ہو گیا کہ انسان کی عمر وہیں ٹھہرتی ہے جہاں وہ ٹھہرا دے۔ اسی لیے کچھ لوگوں کی زندگی تیس' پینتیس برس کی عمر میں ہی رک جاتی ہے۔ صرف عمر آگے بڑھتی ہے' زندگی نہیں اور کچھ لوگ سو سال کے ہو کر بھی بہتے پانی کی طرح آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

"کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اس کام کو ختم کرنے کی مہلت ملے گی

بھی یا نہیں۔ کام کو نیک نیتی سے شروع کرنا انسان کا فرض ہے اور اسے مکمل کرنے کا وقت دینا خدا پر منحصر ہے۔" یہ ہانز کا فلسفہ تھا۔

پروفیسر صاحب کو اپنے سے کہیں کم عمر اس نوجوان کا خدا کی رحمت پر بھروسا شرمندہ کر گیا اور وہ اپنی عمر رفتہ کے بیتے سالوں کی تعداد بھلا کر تن دہی کے ساتھ کام میں جت گئے۔

پروفیسر صاحب کو وطن واپس بھجوانے کا سہرا بھی ایک طرح سے ہانز کے ہی سر جاتا تھا۔

کچھ عرصے سے ہانز نے اپنے کار خیر کا دائرہ وسیع کرنا شروع کیا تھا۔ اب اس کی توجہ صرف یورپ اور یہاں ہونے والی زیادتیوں پر نہیں رہی تھی بلکہ اس کی سرپرستی میں چلنے والی تنظیم کا جال تیسری دنیا کے ان ترقی پذیر ممالک میں بھی پھیلنا شروع ہو گیا تھا جو ان گھناؤنے جرائم میں ملوث تھے۔

"پروفیسر! میں کمبوڈیا جا رہا ہوں۔" ہانز نے ایک دن پروفیسر صاحب سے کہا۔

"مگر کیوں؟" پروفیسر صاحب نے پوچھا۔

"کیونکہ وہاں میری ضرورت ہے۔ وہاں قدم قدم پر افلاس و غربت ہے۔ وہاں جسم فروشی کے اڈے صرف رغلا کر یا جھانسا دے کر نہیں چلائے جاتے بلکہ اکثر اوقات ماں باپ خود پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے نو عمر اولادوں کو اس پیشے میں دھکیل دیتے ہیں۔"

"لیکن تم اکیلے کیا کرو گے؟" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"اکائی کی طاقت کو کبھی کم مت سمجھنا پروفیسر! اگر میرے جانے سے کسی ایک فرد کی زندگی میں بھی بدلاؤ یا بہتری آجاتی ہے تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔" ہانز متانت سے بولا۔

"تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے پروفیسر؟" ہانز نے اچانک کہا تو پروفیسر صاحب نے اسے چونک کر دیکھا۔

"میں؟"

"ہاں یہاں کا کام تو کوئی بھی دیکھ لے گا۔ ہمیں ان لوگوں کی مدد کا بیڑا اٹھانا چاہیے جو حالات کی چکی میں پس کر خود اپنی مدد کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ جرم مٹانے کے لیے اس بھوک کو ختم کرنا ہو گا جو جرم کرنے پر اکساتی ہے۔ ہمیں اس ماحول کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا ہو گی جو ناانصافیوں کو پنپنے کی اجازت دیتا ہے۔" ہانز نے جذب کے عالم میں کہا تو پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر چل رہے ہو میرے ساتھ؟" ہانز نے پوچھا۔

"ضرور چلوں گا۔" پروفیسر صاحب مسکرائے۔

"مگر تمہارے ساتھ نہیں۔ کہتے ہیں کہ نیک کام کی ابتدا اپنے گھر سے کرنی چاہیے۔ اگر بات ناانصافی کو ختم کرنے کی اور ماحول میں تبدیلی لانے کی ہے تو اس کی ضرورت میرے ملک میں بھی کم نہیں۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

یوں ہانز کمبوڈیا کے لیے روانہ ہوا اور پروفیسر صاحب ایک بار پھر اسی سرزمین پر لوٹ آئے جسے وہ برسوں پہلے الوداع کہہ گئے تھے۔ یہ ہانز کی سنگت کا اثر تھا کہ محض لمبی میزوں پر بیٹھ کر بحث و مباحثہ کرنے کے بجائے وہ عملی طور پر فلاحی کاموں میں خود کو مصروف رکھتے تھے۔

کام کی لگن میں نہ انہیں گرمی کا پتا چلتا نہ سردی کا اور نہ ہی دوسری کسی قسم کی دقتیں ان کو پریشان کرتیں جو ان سے کہیں کم عمر سوشل ورکرز تک کی راہ میں اکثر رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔

ڈنمارک جیسے صاف ستھرے اور سرد ملک میں پل کر جوان ہونے والا ہانز اگر کمبوڈیا کو برداشت کر سکتا ہے تو پھر یہ تو ان کی اپنی دھرتی تھی جس پر انہوں نے زندگی کے کئی سال بتائے تھے۔

پروفیسر صاحب نے آخری فائل بند کر کے میز پر رکھی اور سگریٹ سلگا کر لبوں سے لگاتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

سینٹر کی حالت دن بدن ناگفتہ بہ ہوتی جا رہی تھی۔ پانچ کمروں اور چھوٹے سے احاطے پر مشتمل یہ دومن سینٹر ایک مقامی این جی او کے تحت عورتوں کی فلاح و

بہبود کے لیے چلائے جانے والے ادارے کی ایک چھوٹی سی شاخ تھی۔

چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں کے قریب ایسی کئی آؤٹ پوسٹ بنائی گئی تھیں تاکہ اندرون اور پسماندہ حصوں میں رہنے والی خواتین کو اپنے مسائل لے کر یہاں پہنچنے میں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

وہ عورت جس کو مارا پیٹا جاتا تھا' وہ جسے جلایا گیا ہوتا تھا' وہ جس کے بچے چھین کر اسے گھر سے باہر نکال دیا جاتا تھا اور وہ بھی جس کی مرضی کے خلاف اس کے اپنے ہی گھر والے اسے کسی کے ہاتھ شادی کے نام پر بیچ دیتے تھے۔

کسی نہ کسی طرح لمبی مسافتیں طے کرتی ہوئی وہ اس جگہ پر انصاف کی امید لے کر پہنچتی تھیں۔ ان میں سے اکثر خواتین کے گھر والے ان کے پیچھے آکر ان سے صلح صفائی کرکے انہیں واپس لے جاتے تھے۔ اگر وہ خواتین بھی واپس لوٹ کر جانا چاہتیں تو انہیں روکا نہیں جاتا تھا۔ بعض معاملات کی نوعیت ایسی ہوتی تھی کہ انہیں طول دیے بنا ہی نپٹا دینا ان عورتوں کے حق میں بہتر ہوتا۔ البتہ اگر ان پر ڈھائے گئے مظالم انتہائی سفاکانہ اور سنگدلانہ نوعیت کے ہوتے تو پھر ان عورتوں کا اندراج کرکے انہیں لاہور سینٹر بھجوا دیا جاتا جہاں ان کے نسبتاً" طویل عرصے تک قیام و طعام کا بہتر انتظام تھا۔

پروفیسر صاحب جب سے یہاں آئے تھے' سب جگہوں کا باقاعدگی سے دورہ کیا کرتے تھے۔ کئی ایسی باتیں' ایسے مسئلے جو دور بیٹھے پتا نہیں چلتے تھے' یہاں آکر آنکھوں کے سامنے آجاتے۔ اس وقت بھی پروفیسر صاحب اس چھوٹے سے کمرے میں دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے سینٹر کی حالت میں بہتری لانے کے لیے فنڈز جمع کرنے کے مختلف طریقوں پر غور کررہے تھے۔

دستک کی آواز پر پروفیسر صاحب نے اپنے خیالات کی دنیا سے نکلتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔

"میں اندر آسکتی ہوں؟" جالی کے دوسری طرف کھڑی لڑکی جھجکتے ہوئے اندر آنے کی اجازت طلب کررہی تھی۔

"ہاں' شیور! آجاؤ۔"

پروفیسر صاحب سیدھے ہوتے ہوئے مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے تو وہ جالی کا دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

یہ وہی لڑکی تھی جسے رات پروفیسر صاحب بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر سے اٹھا کر یہاں سینٹر لے کر آئے تھے۔

اس چھوٹی سی آؤٹ پوسٹ کا بجٹ کسی سندیافتہ ڈاکٹر کو رکھنے کا متحمل تو نہیں ہوسکتا تھا البتہ ایک لیڈی ہیلتھ ورکر اور گورنمنٹ اسپتال کی ایک ریٹائرڈ نرس کسی بھی قسم کی ایمرجنسی سے نپٹنے کے لیے چوبیس گھنٹے یہاں موجود رہتی تھیں۔

نرس کی ماہرانہ رائے کے مطابق اسے کوئی سنگین مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ وہ فقط بے ہوش تھی اور تھوڑی دیر میں اسے بنا کسی تردد کے خود ہی ہوش میں آجانا چاہیے تھا۔

نرس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ صبح تک لڑکی کو ہوش آگیا اتنا اندازہ تو پروفیسر صاحب کو اس کے بنا کچھ بتائے ہی ہوچکا تھا کہ وہ کسی اچھے گھر کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔

"سر! آپ سے ایک ریکوئسٹ کرنا تھی۔ آپ لاہور جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے جاسکتے ہیں؟"

جویریہ کو اپنے ایک دن کے قیام کے دوران یہ بات پتا چل چکی تھی کہ سینٹر میں موجود دوسرے لوگوں کی طرح پروفیسر صاحب یہاں کے مستقل رہائشی نہیں ہیں۔

"بالکل لے جاسکتا ہوں۔" پروفیسر صاحب جویریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس کے چہرے پر سرخی تھی اور دروازے کے پاس کھڑی ہوکر انگلیوں کو مسلتے ہوئے وہ کافی نروس بھی لگ رہی تھی۔

"لیکن میرے ایک سوال کا جواب تمہیں بھی دینا ہوگا۔" وہ کرسی پر سیدھے ہوتے ہوئے بولے۔ "تم رات گئے سڑک پر اکیلی کیا کررہی تھیں؟"

"کسی سے بچ کر بھاگ رہی تھی۔" جویریہ نے آہستہ سے کہا۔

"کس سے؟" پروفیسر صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تھے کچھ بے ضمیر لوگ جن کے لیے دولت انسانیت سے زیادہ اہم ہوچکی تھی۔"

"ہوں۔" پروفیسر صاحب سمجھ گئے تھے کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتی۔ وہ خاموش ہوگئے۔

"ہم کل صبح ہوتے ہی لاہور کے لیے نکل پڑیں گے۔ تم تیار رہنا۔" قدرے توقف کے بعد یہ کہتے ہوئے انہوں نے سامنے رکھی فائل پھر سے کھول لی۔

جویریہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

جویریہ نے سرسری انداز میں کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا بہت پُر آسائش تو نہیں' البتہ آرام دہ ضرور تھا۔

کمرے کے باہر وقفے وقفے سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو گھر میں کام کرنے والے نوکروں کی تھیں۔

جویریہ اور پروفیسر صاحب صبح پانچ بجے سینٹر سے نکلے تھے اور اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔ راہوالی وومن سینٹر سے لاہور تک کا راستہ پانچ گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا مگر پروفیسر صاحب راستے میں چند کام نپٹانے کے لیے کئی جگہوں پر رکتے آئے جس کی وجہ سے اتنی دیر لگ گئی۔

ایک تو لمبا سفر' دوسرا راستے میں کئی جگہوں پر حد سے زیادہ خراب اور ٹوٹی پھوٹی سڑکیں' دونوں چیزوں نے مل کر جویریہ کو لاہور پہنچنے تک نڈھال کردیا۔

جویریہ کو حیرت ہورہی تھی کہ اچھے خاصے عمر رسیدہ ہونے کے باوجود پروفیسر صاحب لاہور پہنچنے کے بعد گھر میں چاق و چوبند پھر رہے تھے۔ یہ پروفیسر صاحب کا آبائی گھر تھا۔ باہر سے لوٹ کر آنے کے بعد وہ یہیں رہتے تھے۔

"جویریہ!" پروفیسر صاحب نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے پکارا پھر کوئی جواب نہ پاکر نیم وا دروازے سے اندر جھانکا۔

اندر پلنگ پر جویریہ دنیا و مافیہا سے بے خبر بے سدھ سو رہی تھی۔ وہ غالباً" ستانے کے لیے بستر پر لیٹی تھی کہ نیند آگئی۔

پروفیسر صاحب کو اس کا سویا ہوا تھکا ماندہ چہرہ دیکھ کر بے اختیار ترس آیا۔ وہ تو اس ساری بھاگ دوڑ کے عادی تھے مگر اس بے چاری لڑکی کو اپنے ساتھ اونچے نیچے راستوں اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر گھنٹوں گھماتے رہنا اس کے ساتھ زیادتی تھی۔ انہیں چاہیے تھا کہ اسے راہوالی سے سیدھا لاہور لے آتے۔ کام کسی اور دن پر ٹالے جاسکتے تھے۔

باہر ملازمہ نے میز پر ناشتے کے لوازمات لگا دیے تھے مگر انہوں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے دروازہ بند کرکے واپس چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

گھر کا بڑا سا آہنی گیٹ کھلا ہوا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت بلا روک ٹوک جاری تھی۔ صرف جویریہ تھی جو گھر کے سامنے خاموش کھڑی تھی۔ خوف اور بے اعتمادی اس کی فطرت کا حصہ تھی جس میں گزرتے وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

وہ اتنی دور سے یہاں تک پہنچ گئی پر اب اندر جانے کی ہمت نہیں پارہی تھی۔ بڑی مشکل سے حوصلہ کرتے ہوئے اس نے گھر کے اندر قدم رکھا اور اس دہلیز کو پار کرلیا جس کے دوسری طرف جانے کی اجازت اسے پچھلی بار نہیں دی گئی تھی۔

گیٹ سے داخل ہوتے ہی سامنے کچھ فاصلے پر گھر کا داخلی دروازہ تھا اور اس دروازے کے عین درمیان میں اس وقت رعنا کھڑی تھیں۔ بے اختیار اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ رعنا وہ ہستی تھیں جن سے سامنا نہ ہونے کی دعائیں جویریہ سارا راستہ مانگتی آئی تھی۔ اس نے

سر پر اوڑھی چادر کو انگلیوں کی مدد سے چہرے کے سامنے لا کر اپنے آپ کو چھپانے کی بے حد فضول سی کوشش کی۔

رعنا چونکی تھیں۔ جویریہ کی اضطراری حرکت نے انہیں اس کے بارے میں اور بھی متجسس کر دیا۔ ایسا کون تھا ان کے حلقہ احباب میں اتنا باحیا اور پابند حجاب! رعنا آگے بڑھیں۔

"تم؟" وہ اسے دیکھ کر شاک کے عالم میں اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئیں۔ منیر نے یقیناً "جویریہ" کے ہاتھ سے نکل جانے کی اطلاع دے کر ان کے ہاتھوں بے عزت ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

جویریہ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر رعنا اتنی ہی خوفزدہ ہو گئی تھیں، جتنی شاید جویریہ انہیں دیکھ کر تھی۔

وہ ایک جست میں جویریہ تک پہنچیں اور اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک طرف کو لے گئیں جہاں وہ گیٹ سے "وقتاً فوقتاً" اندر آنے والوں کی نظروں سے قدرے اوجھل ہو گئے۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی دوبارہ یہاں آنے کی؟ اتنی بڑی بڑی رقمیں ہضم کر لینے کے بعد بھی تم لوگوں کا پیٹ نہیں بھرا جو پھر سے یہاں پہنچ گئی ہو؟ بے شرم، بے غیرت کہیں کی۔" رعنا غصے سے تلملا رہی تھیں۔

ان کی بات پر جویریہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی شرم سے پانی پانی ہو گئی رعنا شاید اسے بھی لالچ کے اس گھناؤنے کھیل میں حصہ دار سمجھ رہی تھیں۔

"میرا یقین کیجیے مجھے ان پیسوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ آپ سے جو کچھ لیا منیر اور خالہ نے لیا۔ میں اس سارے معاملے سے قطعی لاعلم تھی۔" جویریہ نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بکواس بند کرو۔" رعنا بگڑ کر بولیں۔

جویریہ کو دور رکھنے کا معاہدہ کس کے ساتھ طے ہوا تھا اور اس معاہدے کی شرائط کیا تھیں۔ یہ رعنا جویریہ سے زیادہ بہتر جانتی تھیں۔ انہیں رقم جانے کا افسوس نہیں تھا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ جس مقصد کے لیے رقم صرف کی گئی تھی وہ پورا نہ ہو سکا۔ گھر اس وقت لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ رعنا ایسے موقع پر کوئی شور شرابہ یا کسی قسم کا کوئی تماشا کھڑا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھیں۔

تھوڑی دیر میں حذیفہ بھی آ جانے والا تھا اور اس کے بعد سب کھیل ختم۔ وہ جویریہ کو حذیفہ سے ملنے سے اب نہیں روک سکتی تھیں۔ انہیں اپنے تن بدن میں شدید تھکاوٹ سی اترتی محسوس ہوئی۔ ایک ایسی تھکاوٹ جو انسان پر اپنی یقینی شکست کو سامنے دیکھ کر طاری ہوتی ہے۔

"آخر تم کیوں ہماری زندگیاں برباد کرنے پر تلی ہو لڑکی؟" انہوں نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں کسی کی بربادی نہیں چاہتی۔" جویریہ نے کہا۔

"میں تو خود بربادی کے دہانے پر کھڑی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ میرے بارے میں اچھا نہیں سوچتیں لیکن میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے حذیفہ کی دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ میرا دنیا میں حذیفہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ خدارا میری حالت پر رحم کیجیے۔ مجھے ایک بار حذیفہ سے مل لینے دیجیے۔" جویریہ نے رعنا کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ وہ خاموش رہیں۔ جویریہ نے جو کہا انہوں نے نجانے سنا بھی تھا یا نہیں ان کی سوچ کا رخ عرشی کی طرف مڑ چکا تھا۔

اب جب کہ تھوڑی دیر میں سارا کھیل ہی ختم ہو جانے والا تھا تو وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ کیا عرشی اپنی زندگی میں جویریہ کی وجہ سے آنے والی تبدیلی کو قبول کر پائے گی؟ شاید نہیں، عرشی مرضی کے خلاف کچھ بھی تو قبول نہیں کرتی تھی اور پھر یہ تبدیلی آئے گی کس حد تک؟ رعنا کو یہ بھی نہیں معلوم تھا۔ جویریہ کے حذیفہ کی زندگی میں پھر سے شامل ہو جانے کے بعد عرشی کا کیا مقام ہو گا؟ رعنا یہ بھی نہیں جانتی تھیں۔

اتنی محنت، اتنی پلاننگ کا فائدہ؟

رعنا تھک کر پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ گئیں جو عام ڈرائیوروں یا نوکروں کے ستانے کے لیے وہاں رکھی ہوئی تھیں۔

انہیں بے اختیار اسمارہ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ وہ ہوتیں تو شاید کوئی راستہ نکل سکتا تھا۔ وہ حذیفہ کو قابو کر سکتی تھیں۔

پر اب اسمارہ کہاں؟ آج سب انہیں بھی دفنانے لے گئے۔ پہلے دانش پھر اسمارہ اتنے کم عرصے میں دونوں ایک دوسرے کے پیچھے چلے گئے۔ اس گھر کے در و دیوار پر رعنا کو اب تک ان دونوں کا عکس جھلملاتا محسوس ہوتا تھا۔

"بہت شوق تھا تمہیں اس گھر پر راج کرنے کا تو جاؤ! اب اس خالی گھر پر راج کرو اور یہ جان کر خوش ہو جاؤ کہ تمہاری نحوست نے ایک ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دیا۔" رعنا نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" جویریہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کبھی اس گھر میں اس کے مکینوں کے دم سے خوشیاں بھری رہتی تھیں۔ اب نہ وہ مکین رہے نہ ہی خوشیاں۔ دونوں کو تمہاری نحوست کھا گئی۔" رعنا نے بھرائی آواز میں کہا۔

جویریہ کی حالت ایسی ہو گئی جیسے کسی نے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

ایک دم بہت سی ایسی باتیں اور منظر واضح ہونے لگے جو اس نے گیٹ سے داخل ہوتے وقت دیکھے یا سوچے تھے، مگر پھر رعنا کا اچانک سامنا ہونے کی گھبراہٹ میں انہیں بھلا دیا تھا۔ گھر میں لوگوں کی آمد و رفت، گھر کے اندرونی حصے کے علاوہ لان میں لگائی ڈھیروں کرسیوں پر تعزیت کے لیے آنے جانے والوں کے بیٹھنے کا انتظام۔

ایک شدید کپکپی جویریہ کے جسم پر طاری ہو گئی۔ یہ کپکپی خوف کی لہر تھی جو اس کے وجود میں سے ہو کر گزری تھی۔

"گھر خالی ہو گیا۔ مکین ہی نہ رہے۔" جویریہ کے ذہن میں رعنا کے کہے الفاظ گونجنے لگے۔

"تو کیا حذیفہ بھی؟" جویریہ نے رکتی ہوئی سانسوں کے ساتھ سوچا۔

لیکن نہیں! یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ اس کا تو دل اب حذیفہ کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حذیفہ کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے اور جویریہ کو پتا بھی نہ چلے۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" جویریہ نے لرزتی آواز میں کہا۔ جو سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ "حذیفہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے لینے آئے گا۔ وہ اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتا۔ وہ مجھے اس طرح اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"ایسا ہی ہوا ہے۔ تمہارے نہ ماننے سے حقیقت بدل۔۔۔" رعنا کو بیچ فقرے میں اندازہ ہوا کہ جویریہ ان کی بات کا کیا مطلب سمجھ رہی ہے تو وہ ٹھٹک کر رک گئیں۔

ان کا سب سے پہلا اور فطری ردعمل یہ تھا کہ وہ ایسی نامعقول بات سوچنے پر جویریہ کے منہ پر کس کر تھپڑ لگا دیں۔

لیکن اگلے ہی لمحے ایک دوسری سوچ نے ان کے اندر اٹھنے والے اشتعال کو دبا لیا۔ شاید یہی طریقہ ہو اس لڑکی سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کا۔۔۔

اگر اسے یہ یقین دلا دیا جائے کہ حذیفہ ہی نہیں رہا تو۔۔۔

"یہ کب۔۔۔ کیسے ہوا؟" جویریہ نے بے تحاشا کپکپاتے لبوں کے ساتھ رعنا سے پوچھا۔

"اسمارہ کو علاج کے لیے باہر لے کر گیا تھا۔ وہیں پر ایکسیڈنٹ ہو گیا۔"

رعنا نے چہرے کو سپاٹ رکھتے ہوئے کہا تو جویریہ سُن رہ گئی۔

کبھی اسے لگا کرتا تھا کہ اس کی زندگی میں حذیفہ کا انتظار، اس سے ملنے کی آس باقی نہ رہی تو وہ زندہ نہیں رہ پائے گی۔ وصل کی امید ہی اس کے جینے کا بہانہ تھی، مگر آج یہ امید بھی ٹوٹ گئی۔

پھر بھی وہ ابھی تک زندہ تھی۔ کس قدر سخت جان اور ڈھیٹ تھی وہ۔ جویریہ نے پتھرائی آنکھوں کے ساتھ سامنے منڈیر پر دھوپ میں کھیلتی ننھی چڑیا کو دیکھا۔

سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا جیسے کچھ لمحے پہلے تک تھا۔

پرندے اسی طرح چہچہا رہے تھے۔ دھوپ اتنی ہی چمکیلی تھی۔ زمین اب بھی اپنے مدار پر پہلے کی طرح گھوم رہی تھی۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی اور کسی چیز پر ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا۔

"باجی' باجی جی!" گھر کی ایک نوکرانی رعنا کو آوازیں دیتی پھر رہی تھی۔ بیسیوں کام تھے جو رعنا کو نپٹانے تھے۔ سینکڑوں مہمان تھے جو رعنا کے منتظر تھے' پر اس وقت رعنا کا دھیان ان میں سے کسی کی طرف نہیں تھا۔ وہ اس وقت جویریہ کی آنکھوں سے لمحہ بہ لمحہ خارج ہوتی ہوئی زندگی کی رمق کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

رعنا کو حیرت ہو رہی تھی کہ جویریہ نے ان کی بات کو اتنی آسانی سے کیسے قبول کر لیا۔ رعنا نہیں جانتی تھیں کہ جویریہ اپنی زندگی میں آنے والی مایوسیوں اور ناکامیوں کی اتنی عادی ہو چکی ہے کہ اسے خود بھی اپنی بدبختی کا یقین ہو چکا ہے۔

جویریہ کے لیے ان حالات میں کسی خوش خبری پر یقین کرنا' کسی بری خبر کو مان لینے سے زیادہ دشوار کام تھا۔

رعنا نے ایک بار پھر بہت بڑا جوا کھیلا تھا۔ حذیفہ سمیت تمام مرد کسی بھی وقت اسارہ کو دفنا کر واپس آ سکتے تھے' مگر اس کے باوجود رعنا نے عرشی کی خاطر یہ خطرہ مول لیا۔ اولاد کی محبت ماں باپ سے کیا کچھ نہیں کروا ڈالتی۔

"دیکھو لڑکی! ہم پر ابھی بہت مشکل وقت آیا ہوا ہے۔" رعنا نے سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ "اس لیے بار بار یہاں آ کر ہماری مشکلات میں اور اضافہ مت کرو۔ اگر تمہارے دل میں حذیفہ کے لیے واقعی اچھے جذبات تھے تو پھر اس قصے کو یہیں ختم کر دو۔ جانے والے اس دنیا سے جا چکے۔ اب اپنا نام ان کے ساتھ جوڑ کر ان کی بنی بنائی عزت کو خراب مت کرو۔" رعنا دھیمی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

جویریہ نے رعنا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

"امینہ۔۔۔ بی بی کو باہر تک چھوڑ آؤ۔" رعنا نے نوکرانی سے کہا جو انہیں ڈھونڈتی ہوئی بالآخر ان تک پہنچ ہی گئی تھی۔

رعنا نے امینہ کے ساتھ بنا کسی مزاحمت کے جاتی جویریہ کی پشت کو دیکھ کر بے اختیار جھرجھری لی۔ انہیں اچانک ایسا محسوس ہوا تھا کہ جو لڑکی ابھی ابھی ان کے سامنے دروازے سے باہر نکل کر گئی ہے اس کا شمار زندہ لوگوں میں نہیں کیا جا سکتا۔

☼ ☼ ☼

دن ڈھلنے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا جب پروفیسر صاحب نے اسے دیکھا۔ وہ ٹخنوں سے اوپر جاتی گھاس اور جھاڑیوں کے بیچ کھڑی سیمنٹ کی ٹوٹی سلیب پر بیٹھی ہوئی تھی۔

صبح پروفیسر صاحب اس لڑکی کو اپنے گھر کے ایک کمرے میں سوتا چھوڑ کر باہر گئے تھے۔ واپس لوٹے تو وہ جا چکی تھی۔

"جی! انہوں نے جاتے وقت کچھ نہیں بتایا۔" گھر کی ملازمہ سے استفسار کرنے پر انہیں جواب ملا تھا۔ انہیں لڑکی کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر کوفت ہوئی تھی اور اب محض چند گھنٹوں کے قلیل وقفے کے بعد وہی لڑکی انہیں سڑک کے کنارے ماحول و گردونواح سے قطعی بے نیازیوں بیٹھی ہوئی ملی کہ پروفیسر صاحب کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔

"سر! گاڑی چلاؤں؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے رشید نے پوچھا جسے ابھی تک گاڑی سڑک کے کنارے اچانک رکوانے کی وجہ ہی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

پروفیسر صاحب تذبذب کا شکار ہو گئے۔

یہ لڑکی ان کی ذمہ داری نہیں۔ سوائے اس کے نام کے وہ اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے تھے' لیکن ان کا دل گوارا نہیں کر رہا تھا کہ اس لڑکی کو اس طرح سڑک پر بے اماں چھوڑ کر چلے جائیں۔

"سر! چلیں؟" رشید نے ایک بار پھر اکتا کر پوچھا۔

"نہیں! ایک منٹ رکو۔" پروفیسر صاحب نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"آپ کو بالکل اندازہ نہیں کہ یہ لڑکی کون ہے؟" مسز ملک کمرے کی کھڑکی کے باہر برگد کے پیڑ تلے بیٹھی جویریہ کو مشکوک نظروں سے دیکھتی ہوئی بولیں۔

جواب میں پروفیسر صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بھی مسز ملک کے برابر کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگے جہاں جویریہ ایک بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کے گرد لپٹی گرم شال کھل کر فقط اس کے کندھوں پر ٹکی رہ گئی تھی اور شال کے دونوں کونے زمین تک لٹک رہے تھے۔

"اس کی یہ حالت کب سے ہے؟" مسز ملک نے اس کی گم صم کیفیت کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"جب سے اسے یہاں لے کر آیا ہوں۔" پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔ "اگر میں اس سے پہلے مل نہ چکا ہوتا تو میں بھی یہی سمجھتا کہ یہ ہمیشہ سے ایسی ہی ہے مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ پتا نہیں' اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے' جس نے اس کے ہونٹوں پر قفل لگا دیے ہیں۔ جب سے آئی ہے' ایک بار بھی اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی۔"

پروفیسر صاحب جویریہ کی طرف دیکھتے ہوئے بول رہے تھے جو کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں گاڑے بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ وہ اکثر اس طرح موسم کی شدت سے بے نیاز ایک ہی جگہ پر بیٹھے بیٹھے گھنٹوں گزار دیا کرتی تھی۔

"اگر یہ خود سے کچھ جتانے کے قابل نہیں تو آپ کسی اور ذریعے سے اس کے بارے میں پتا لگانے کی کوشش کرتے۔ کسی تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ' جہاں سے یہ ملی ہے اس کے گردونواح میں پوچھ گچھ وغیرہ۔" مسز ملک نے کہا۔

پروفیسر صاحب مسز ملک کو جویریہ کے راہوالی کے قریب سڑک پر بے ہوش ملنے کا قصہ بھی سنا چکے تھے۔

"اپنے طور پر پتا لگانے کی کوشش کی تھی میں نے۔"

"پھر؟" مسز ملک نے سوالیہ نظریں پروفیسر صاحب پر گاڑیں۔ جواب میں پروفیسر صاحب نے کندھے اچکا کر اس ضمن میں اپنی شکست کا اعتراف کیا۔

"تو پھر آپ اسے یہاں کیوں لائے ہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ ہماری این جی او ان مظلوم اور لاچار عورتوں کی مدد کرتی ہے' جو حالات کا شکار ہو کر ہم سے مدد مانگنے آتی ہیں۔ ہم خود کسی کے پاس نہیں جاتے' نہ ہی کسی کو زبردستی آنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ ہماری این جی او کا اصول ہے۔ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم اپنی تنظیم کے بنائے اصولوں سے انحراف نہ کریں۔" مسز ملک کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہو گیا۔

مسز ملک اس این جی او کی سرپرست اعلیٰ تھیں۔ راہوالی والی آؤٹ پوسٹ' لاہور کا یہ وومن سینٹر اور اس جیسے کئی ادارے اُن کی سرپرستی میں چلتے تھے۔

قصور مسز ملک کا نہیں تھا' ماضی میں ناتجربہ کاری کے ہاتھوں کھائی ایک چوٹ کا تھا' جس کی تکلیف مسز ملک کو آج بھی محسوس ہوتی تھی۔

اپنے کام کے ابتدائی دنوں میں مسز ملک نے ایک ایسی لڑکی کو پناہ دی تھی جس کا ہاتھ ایک خطیر رقم کے عوض اس کی مرضی کے خلاف ایک بڑی عمر کے آدمی کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا اور جس کو اس فیصلے کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت کرنے کے جرم میں جرگے نے موت کی سزا سنائی تھی۔

اس سنگ دلانہ فیصلے پر مسز ملک کے اندر کی عورت جوش میں آ گئی۔ پسماندہ علاقوں کی معصوم اور کم عمر لڑکیوں کو پیسوں کے لالچ میں عمر رسیدہ آدمیوں سے بیاہ دینے کی رسم کے خلاف انہوں نے زوردار آواز اٹھائی۔ جب خوب ہاہاکار مچ گئی تو انکشاف ہوا کہ وہ بھولی اور معصوم نظر آنے والی لڑکی گھر سے فرار ہونے سے قبل اپنے بوڑھے شوہر کو کھانے میں زہر دے کر

اگلے جہاں پہنچانے کا بندوبست کرکے آئی تھی۔

مسز ملک کے ہوش اڑ گئے۔ جرم کی نوعیت ایسی تھی کہ آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہرائی گئیں۔ اخباروں میں اس قصے کو جس طرح اچھالا گیا اس سے مسز ملک کی تنظیم کی نیک نامی خطرے میں پڑ گئی۔

"میں آپ کے قائم کردہ اصول و ضوابط سے واقف ہوں اور ان کی قدر کرتا ہوں مگر اصولوں کی پاس داری میں اصل مقصد کو نظر انداز مت کیجیے۔۔۔ اور وہ ہے ضرورت مند کی مدد کرنا۔ مشکل وقت اور مشکل حالات میں سہارا فراہم کرنا۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔

"ضرورت مند کی مدد سے مجھے انکار نہیں مگر ہم وسائل کی کمی کی بدولت ایک حد سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ جانتے ہیں کہ سینٹر میں موجود خواتین کی تعداد گنجائش سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔ ایسے میں ایک اور فرد کا اضافہ؟" مسز ملک نے پریشانی سے کہا۔

یہ بات پروفیسر صاحب بھی جانتے تھے کہ ان کے پاس فنڈز کی تھی کی تھی۔

"میرا خیال ہے ہمیں اس لڑکی کو مسز خان کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ان کی تنظیم لاوارث اور لاپتا افراد کے کیس ہینڈل کرنے کا زیادہ تجربہ رکھتی ہے۔" مسز ملک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"مسز خان کی تو آپ بات ہی مت کیجیے۔ وہ عورت این جی او کے نام پر کیا کچھ کر رہی ہے میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔" پروفیسر صاحب ایک دم ہی بھڑک گئے۔

"جن فنڈز کو جمع کرنے کے لیے ہم دن رات خوار ہوتے پھرتے ہیں ان کا مسز خان فقط دو دن میں انتظام کر لیتی ہیں۔" مسز ملک نے زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ مسز خان کو باہر سے بڑی بڑی رقومات ملتی تھیں اور وہ این جی او کی آڑ میں ملک دشمن سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھیں۔

"مسز خان کے اس ٹیلنٹ سے تو میں بھی بہت اچھی طرح واقف ہوں۔" پروفیسر صاحب نے دبے غصے کے ساتھ کہا۔ "اگر آپ اس لڑکی کو یہاں نہیں رکھ سکتیں تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا مگر مسز خان جیسی دو غلی عورت کے حوالے ہرگز نہیں کروں گا۔"

"پروفیسر صاحب! اس ملک میں ہزاروں لاکھوں لڑکیاں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی مسئلے کا شکار ہیں۔ آپ کس کس کو سپورٹ کریں گے؟" مسز ملک نے ان سے پوچھا۔

"میں ساری دنیا کو نہیں بدل سکتا لیکن اگر میری کوشش سے کسی ایک شخص کی زندگی میں بہتری آ سکتی ہے تو میں اسے اپنی کامیابی سمجھوں گا۔" پروفیسر صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

یہ بھی ہانز کے فلسفوں میں سے ایک تھا جو اس نے کمبوڈیا روانگی سے قبل پروفیسر صاحب کے گوش گزار کیا تھا اور جسے انہوں نے اپنی زندگی کے سنہری اصولوں میں شامل کر لیا تھا۔

"مسز ملک کم از کم اس ضمن میں آپ کو میرا ہم خیال ہونا چاہیے تھا۔ آپ جیسی مخلص سماجی کارکن کے منہ سے ایسی ناامیدی کی بات سن کر مجھے حقیقتاً مایوسی ہوئی ہے۔" پروفیسر صاحب نے مسز ملک کو ان کی منفی سوچ پر شرمندہ کیا تو وہ واقعی شرمندہ ہو گئیں۔

"اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ یہ لڑکی یہاں رہے تو ٹھیک ہے۔ میں اس کی اجازت دے دیتی ہوں مگر یہ اکیلی نہیں رہے گی میری ایک ملازمہ اس کی نگرانی کے لیے اس کے ساتھ رہے گی۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ہمیں اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل نہیں ہو جاتیں۔"

مسز ملک نے کہا تو پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے اس انتظام پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ نے اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دی آپ کی یہی مہربانی بہت ہے۔ آئیے! میں آپ سے اس کی ملاقات کرواتا ہوں۔"

"پھر کبھی سہی، اس وقت مجھے وزیر صاحب کے ساتھ میٹنگ کے لیے جانا ہے۔" مسز ملک نے اپنا موبائل اور ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔
"میں جاتے ہی اپنی ملازمہ کو بھجوادوں گی۔ میرے بہت اعتبار کی عورت ہے۔"
مسز ملک یہ کہتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ دیکھو یہ بڑے والے اس طرف۔ چھوٹے دوسری طرف اور جو پھٹے ہوئے نکلیں گے، انہیں اس ٹوکری میں ڈال دینا۔ آئی سمجھ؟" بے تحاشا گھنگھریالے بالوں والی صفیہ نے جویریہ کو سمجھایا۔
موسم سرما کے بہت سارے کہر میں لپٹے دھندلے دنوں کے بعد آج صاف اور اجلا دن نکلا تھا۔ سینٹر کی بہت ساری عورتیں ایک بڑے سے روشن کھڑکیوں والے کمرے میں موجود تھیں، جہاں جگہ جگہ پرانے اخبارات اور رسالوں کے ڈھیر لگے تھے۔ زمین پر پرانی دریاں بچھی تھیں جو کہیں کہیں سے ادھڑی ہونے کے باوجود فرش کی ٹھنڈک سے بچانے میں کافی مددگار ثابت ہو رہی تھیں۔ دریوں کے اوپر کاغذ کے ڈھیروں کے نزدیک چند عورتیں لفافے بنانے میں مصروف تھیں۔
یہ زنانہ لفافہ فیکٹری کا آئیڈیا پروفیسر صاحب کا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں کے فارغ بیٹھنے سے بہتر تھا کہ انہیں کام میں لگا کر دھیان بٹایا جائے۔
جویریہ کو یہاں ویمن سینٹر میں پناہ لینے والی عورتوں کی کیٹیگری میں شامل نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ نہ تو وہ ان عورتوں کے طبقے سے تعلق رکھتی تھی، نہ ہی اس کے جسم پر صبح شام کھائی جانے والی مار کے نشان تھے۔ پھر بھی پروفیسر صاحب کو لگتا تھا جیسے اس کی روح گھائل ہو چکی ہے۔ وہ کسی ایسے لمحے میں مقید ہو گئی ہے جس نے حقیقت کی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع کر دیا ہے۔ اسے اس لمحے کی قید سے کیسے آزاد کرایا جائے، یہ پروفیسر صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
فی الحال جویریہ کی حالت کے پیش نظر اسے چھانٹی کا آسان ترین کام سونپا گیا تھا۔ جویریہ کے پاس ہاتھ میں قینچی لیے بیٹھی بسنت بی بی چھانٹی کیے گئے کاغذات میں سے غیر مناسب سائز اور کترے کناروں والے کاغذات کو کاٹ کر انہیں مناسب حالت میں لے کر آ رہی تھی۔
"چھیتی کر کڑیے! (جلدی کرو لڑکی)" بسنت بی بی نے جویریہ سے کہا۔
جویریہ نے کاغذوں کا اگلا پلندہ اٹھایا۔ یہ کسی اخبار کے ساتھ چھٹی والے دن نکلنے والا چند صفحوں پر مشتمل میگزین تھا، جس کے صفحات پر شہر کے امراء کی سوشل سرگرمیوں کی تصاویر تھیں۔ میگزین سال سے زیادہ پرانا تھا۔
جویریہ نے میگزین درمیان سے کھول کر پہلا صفحہ پنوں کی گرفت سے آزاد کرایا جس پر کسی مشہور بوتیک کے افتتاح پر آنے والی میک اپ سے لپٹی عورتوں کی تصویریں تھیں۔
دوسرا صفحہ بھی پن سے جدا ہوا، جس پر کسی کے گھر منعقد کی گئی غزل نائٹ پر آنے والی مشہور ماڈل جگمگا رہی تھی۔
تیسرا صفحہ، اسی دعوت کے مزید مہمان، گروپ کی شکل میں کھڑی ہو کر فوٹو کھنچوانے والی چند عمر رسیدہ عورتیں تھیں اور ان سے اگلی تصویر میں ایک مانوس چہرے والا نوجوان جو ہاتھ میں کولڈ ڈرنک تھامے کیمرے کی آنکھ میں مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔
جویریہ کے عرصے سے ماؤف ذہن میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔ ایک روشنی پھیلی جس نے اندھیروں میں ڈوبی ہر بات، ہر چہرہ، ہر یاد کو پھر سے روشن کر دیا۔ لیکن یہ عجیب روشنی تھی جو سکون و عافیت کی جگہ درد کا اتنا شدید احساس اپنے ساتھ لے کر آئی کہ جویریہ کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دماغ کی رگیں جکڑی گئیں جسم چیخ کر ٹوٹنے لگا۔ درد نا قابل برداشت ہو گیا۔
جویریہ کی کمرے کے در و دیوار سے ٹکرا کر آتی فلک شگاف چیخوں کو سن کر لفافے بناتی عورتوں کے ہاتھوں سے کاغذ چھوٹ کر زمین پر بکھر گئے۔ انہوں نے ہڑبڑا کر اس طرف دیکھا جہاں جویریہ، حذیفہ کی تصویر والے میگزین کے بچے کھچے کاغذوں کو ہاتھ میں جکڑے ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ رات جویریہ کے لیے قیامت کی رات تھی۔ ساری رات وہ ہوش اور بے ہوشی کی ملی جلی کیفیات کے درمیان جھولتی رہی۔
اپنے ہوش کے مختصر وقفوں کے دوران وہ اپنا سر تکیے پر پٹخ پٹخ کر ساتھ بیٹھی عورتوں کی پریشانی میں اور بھی اضافہ کر دیتی۔ اس کے جلتے جسم کی حدت کو کم کرنے کے لیے ماتھے پر رکھی گیلی پٹیاں پھسل پھسل جاتیں۔
جانے کیسی تڑپ بیدار ہو گئی تھی اس میں جو اسے کسی طور چین نہ لینے دے رہی تھی۔
"آپ لوگوں میں عقل نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اس کی حالت اتنی خراب تھی اور آپ لوگ اسے بجائے ہسپتال لے جانے کے اپنے ٹوٹکے آزماتے رہے۔" پروفیسر صاحب نے گرج کر کہا۔
"باقی سب تو ان پڑھ اور گنوار عورتیں ہیں۔ کم از کم آپ ہی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا بندوبست کر لیتیں یا پھر مجھے فون کر کے مطلع کر دیتیں۔" پروفیسر صاحب نے سینٹر کی مستقل رہائش پذیر نرس سے طنزیہ کہا جو سر جھکائے شرمندہ کھڑی تھی۔
"اب یہاں کھڑی مت رہیے۔ جا کر فوراً گاڑی نکلوائیے۔ اسے ابھی اسی وقت اسپتال لے کر جانا ہے۔" پروفیسر صاحب نے حکم دیا۔
"وہ جی! اسپتال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ملکانی جی کو فون کر دیا ہے۔ وہ ڈاکٹر کو لے کر آ رہی ہیں۔" یہ نرس کے برابر میں کھڑی ہوئی مسز ملک کی ملازمہ تھی جس نے اپنی زبان کھولی تھی۔
پروفیسر صاحب نے اس مداخلت پر اس عورت کو پر جلال انداز میں گھور کر دیکھا تو وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔
"مسز ملک خدا جانے کب یہاں پہنچیں گی۔ اب اور وقت ضائع مت کیجیے۔ جا کر گاڑی نکلوائیے میں خود ساتھ جاؤں گا۔"
"بی بی آ گئیں۔" مسز ملک کی خادمہ نے پروفیسر صاحب کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے جوش کے عالم میں گیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں سے سلیٹی رنگ کی ایک گاڑی اندر آ رہی تھی۔
پروفیسر صاحب نے مڑ کر دیکھا تو گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر مسز ملک واقعی ایک سفید اوور آل والی ڈاکٹر کو لیے اتر رہی تھیں۔
اندر کمرے میں جویریہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ غنودگی میں بھی کئی پریشان آوازیں اسے اپنے ارد گرد سنائی دے رہی تھیں۔
کمرے میں اور بھی لوگ موجود تھے جو اس کی بگڑتی حالت سے خوفزدہ ہو چکے تھے اور اسے بچانے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی تھی۔
تب ہی ایک آواز اس کے نیم خوابیدہ ذہن کے پردے کو چیرتی ہوئی سماعت سے ٹکرائی۔
ایک ایسی جادوئی آواز جس نے جویریہ کے موت کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے قدموں کو ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کر دیا۔
جویریہ نے آنکھیں کھول کر اٹھنے کی کوشش کی مگر اعصاب شکن رات نے جسم و جاں میں اتنی طاقت نہیں چھوڑی تھی جو اسے اس کوشش میں کامیاب ہونے دیتی۔ آس پاس بے شمار ابھرتی آوازوں کے شور میں جویریہ نے ایک بار پھر اس طلسماتی آواز کو تلاشنا چاہا جو حیات بن کر اس کی روح میں اتری تھی، مگر بہت ساری دوسری آوازوں کے شور میں وہ کہیں گم سی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اپنے ہی غموں سے نڈھال جویریہ ایک بار پھر ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی۔
(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

امتُ العزیز شہزاد

فریب

تجھ کو مانگوں تجھی سے کہ سب ہی مل جائے
سو سوالوں سے یہی اک سوال اچھا ہے

آج صبح ہی سے نائلہ کی طبیعت کچھ بوجھل سی تھی۔ کسل مندی کا یہ عالم تھا کہ آنکھ کھل جانے کے باوجود بھی یوں ہی بستر میں پڑے پڑے دن کے گیارہ بجا دیے تب ہی اس کے موبائل پر عاشر کی طرف سے یہ میسج موصول ہوا۔

وہ پڑھ کر مسکرا دی پھر جواب ٹائپ کرنے لگی۔

"سوال تو واقعی لاجواب ہے۔"

"سوال لاجواب نہیں۔ اس کا جواب تمہارے پاس موجود ہے۔" جھٹ سے جواب آیا۔

"خیر چھوڑو! آج اتنی دیر سے کیوں میسج کیا؟" نائلہ نے استفسار کیا۔

"جان! مصروف تھا مگر تمہاری یاد سے غافل نہیں۔ وہ شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

نائلہ نے اک گونہ سرشاری اپنے رگ وپے میں اترتی محسوس کی۔ وہ کمبل ہٹا کر بیڈ سے اتر آئی۔ منہ ہاتھ دھویا اور کچن میں آکر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

"جواب دو! کہاں ہو بھئی؟" جتنی دیر میں چائے بنی عاشر کے کھٹا کھٹ چار پانچ میسجز موصول ہو گئے۔ اس نے مسکرا کر مختصراً "لکھا۔

"ویٹ۔" اور اطمینان سے چائے کپ میں انڈیل کر کیبنٹ سے بسکٹ نکالنے لگی۔ بسکٹ اور چائے لے کر وہ لاؤنج میں چلی آئی۔ ٹی وی ہلکی آواز میں کھولا اور ریموٹ لے کر صوفے پر براجمان ہو گئی۔ تب ہی اک اور میسج موصول ہوا۔

یہ تمہاری کج ادائیاں کوئی سہ کر تو دکھائے ذرا
یہ جو ہم میں تم میں نباہ ہے میرے حوصلے کا کمال ہے

"جانتی ہوں۔" اس نے مختصراً "لکھا۔ جواب آیا۔

جان کی پرواہ پھر کس کو ہو جب قاتل ہو یاروں سا
باتیں ہو دلداروں جیسی لہجہ ہو غم خواروں سا

"تم نے کیا شاعری سنانے میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے؟" اس نے چائے کی چسکی لے کر میسج ٹائپ کیا۔

"ایسی بات نہیں ہے مگر نجانے کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ میں تم سے بات بھی کروں تو خوشبو کے لہجے میں۔"

"ہوں ہوں... خوشبو کا لہجہ بہت برا ہے۔ کبھی دیکھنا! اسے بولتے ہوئے۔" نائلہ نے ہنستے ہوئے لکھا۔

"ہاہاہا... ویسے تمہاری اردو بے حد بری ہے۔ کسی کو بولتے ہوئے سنا جاتا ہے' دیکھا نہیں۔ خیر! کوئی مسئلہ نہیں' میں بعد میں سدھار دوں گا۔" اس کے اس میسج پر نائلہ کے روم روم میں اک عجیب سی سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ کا تصور ہی نہایت خوش کن اور اچھوتا سا تھا۔

"اک تو تم بہت لیٹ جواب دیتی ہو۔" میسج آیا۔

"ہاں نا... تو میرا یہ وقت مصروفیت کا جو ہوتا ہے۔" اس نے صوفے پر لیٹ کر جواب دیا۔

"اچھا! کیا کر رہی ہو اس وقت؟" دلچسپی سے پوچھا گیا۔

"صفائی کرنے جا رہی ہوں۔" اس نے بے دلی سے کہا اور واقعی اٹھ گئی کہ ساڑھے بارہ ہو گئے تھے۔

"ویری سیڈ۔ تمہارے گھر والے ماسی کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

"رکھی ہوئی ہے۔ پر آج کل چھٹی پر ہے۔" اس نے جواب بھیجا اور کمر کے گرد دوپٹا کس کر پہلے گھر سمیٹا' پھر جھاڑو اٹھائی تب ہی میسج ٹون دوبارہ بجی۔

"جانو! تم کام سے فارغ ہو جاؤ' جب تک میں بھی لنچ کر لیتا ہوں۔"

"اوکے۔" وہ پھر سے اپنے کام میں جت گئی۔

☼ ☼ ☼

تقریباً" تین ماہ قبل نائلہ کو عاشر نے غلطی سے کال کی تھی۔ رانگ نمبر تھا۔ نائلہ نے شائستگی سے کہہ کر فون کاٹ دیا تھا' مگر عاشر نے اسے پھر معذرتی میسج بھیجا۔ نائلہ نے معذرت قبول کر لی۔ پھر عاشر نے اس کے خوبصورت وشائستہ لہجے کی تعریف کی اور اسے بتایا کہ اسے بہت کم لڑکیوں کی آواز متاثر کرتی ہے اور یہ بھی کہ وہ نائلہ کی آواز سے ہی اندازہ لگا چکا ہے کہ وہ یقیناً" بہت خوبصورت ہو گی۔

ادھر نائلہ بھی اس کی آواز کی گھمبیرتا' لہجے کی متانت اور دلکش الفاظ سے آراستہ وپیراستہ گفتگو کی اسیر ہو چلی تھی۔ اسے اب ہمہ وقت عاشر کے میسجز کا' اس کے فون کا انتظار رہتا۔ زندگی یکا یک ہی خوبصورت ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہاں تو جانم...! ختم ہو گئے تمہارے کام؟" وہ اسی وقت سب کام سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی تنہائی دھوئی نکھری نکھری سی۔

"ہاں۔" اسے مختصراً" بتایا۔ جانتی تھی وہ فوراً" کال کرے گا... یہی ہوا۔ اس نے فوراً" فون کیا۔

"ہیلو!" وہ بولی۔ اس سے بات کرتے وقت اس کا دل یونہی اتھل پتھل ہو جایا کرتا تھا۔

"وعلیکم ہیلو ڈیر! کیسی ہو؟" جذبوں کی گرمی سے پُر' اپنے مجسم ہونے کا احساس دلاتی آواز۔

"ٹھیک ہوں' تم کیسے ہو؟"

برسوں بعد فراز کو دیکھا اس کا حال احوال نہ پوچھ
شعر وہی دل والوں جیسے شغل وہی بنجاروں سا

"عاشر...! تم اتنے شعر کیسے یاد رکھ لیتے ہو؟" وہ ہنسی۔

"کچھ مشکل نہیں' شاعری سے مجھے والہانہ لگاؤ ہے۔ تم بتاؤ! کیسی ہو؟"

"بس ٹھیک ہی ہوں۔ عاشر! کبھی کبھی یہ زندگی قید لگنے لگتی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"ہاں! لگنے تو لگتی ہے۔ قید میں سانس لینے کے لیے کوئی روزن کھلا رہنا چاہیے۔"

"عاشر! ایک بات پوچھوں؟" اس نے کچھ اس انداز سے اجازت مانگی کہ عاشر تڑپ ہی اٹھا۔

"تمہیں جاناں! تمہیں اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟" اس نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

تیرے جیسی آنکھوں والے جب ساحل پر آتے ہیں
لہریں بھی شور مچاتی ہیں لو! آج سمندر ڈوب چلا

یہ جواب آیا تھا۔

اس کا دل کانوں میں دھڑکنے لگا۔

"مگر عاشر! میں اتنی خوبصورت تو نہیں ہوں۔" وہ اترائی۔

"حسن کی یہ ادا بھی قاتل ہے۔"

"بتاؤ نا عاشر! میں واقعی اتنی خوبصورت نہیں ہوں تو تمہیں کیوں لگتی ہوں؟"

عاشر اور وہ ویب چیٹ بھی کیا کرتے تھے کبھی کبھار۔

"تمہیں دیکھنے کے لیے میری آنکھوں کا ہونا ضروری ہے۔"

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

"عاشر! کبھی کبھی میں سوچتی ہوں' کہیں یہ سب کوئی خواب تو نہیں۔" اس نے کسی قدر ڈر کے کہا۔

"نہیں جانم! یہ حقیقت ہے۔ تم اور میں۔۔۔ اور ہماری محبت۔"

"اور اس محبت کا انجام کیا ہے؟" وہ قدرے گھبرا کر بولی۔

"محبت انجام سے بے خبر ہوتی ہے جانم!" وہ فوریہ جذبات سے بولا تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"مگر محبت ڈیمانڈنگ تو ہوتی ہے نا؟ کچھ وعدے' قسمیں' ملاقاتیں۔۔۔"

ہم نے کب تم سے ملاقات کا وعدہ چاہا
دور رہ کر ہم نے تمہیں اور بھی زیادہ چاہا

وہ بولا تھا۔

"عاشر! دل کرتا ہے میں ہر وقت تم سے باتیں کرتی رہوں۔ تم کتنا خوبصورت بولتے ہو۔"

"اور تم کتنی خوبصورتی سے سنتی ہو۔"

"ویسے عاشر! تم نے کبھی سوچا ہے کہ اگر ہم اور تم نہ ملے ہوتے تو یہ زندگی کیونکر گزرتی؟" وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔

تیرے بنا جو عمر گزاری
اس عمر کا باقی حصہ تیرے نام۔

"عاشر! تم آج ابھی تک آفس سے گھر نہیں گئے؟"

اس کی نظر یکدم ہی وال کلاک کی جانب اٹھی تو پوچھ بیٹھی۔ پونے پانچ ہو رہے تھے۔

"ہاں بس نکل ہی رہا ہوں۔ تم سے بات ختم کرنے کا انتظار ہے۔۔۔ اچھا سنو جانم! میں فون رکھتا ہوں۔ شاکرہ کی کال آ رہی ہے۔" وہ یکدم ہی تیزی سے بولا۔

"اچھا! اللہ حافظ۔ اپنا بہت خیال رکھنا' کھانا ٹھیک سے کھانا میں اب کل صبح ہی تم سے بات کر سکوں گی۔" وہ بددلی سے بولی۔

"ہاں ہاں' اوکے!" عاشر نے جلدی سے فون بند کیا اور دوبارہ کوئی اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"کہاں مرے ہوئے ہو؟ کس سے فون پر باتیں کر رہے تھے؟ یہاں تمہارے ان سنپولوں نے رو رو کر گھر آسمان پر اٹھا رکھا ہے۔ جلدی گھر پہنچو اور ہاں آتے وقت چھوٹے کے پیمپرز اور دو کلو دودھ لیتے آنا اور ذرا جلدی آؤ! چھوٹی کو بخار آ رہا ہے' اسے دوائی دلانے بھی چلنا ہے۔"

شاکرہ یعنی "مسز عاشر" نے کہہ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ عاشر نے جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹیں۔ اک الوداعی بوسہ نائلہ کے میسج کو کر کے اسے ڈیلیٹ کر دیا اور آفس سے باہر چلا آیا۔ نائلہ فون پکڑے گم صم سی بیٹھی تھی۔ تب ہی کال بیل بجی۔

اس نے اطمینان سے دروازہ کھولا۔

تیوریاں چڑھائے' شکن آلود لباس' گھورتی آنکھوں اور انگارے برساتی زبان والا اس کا "شوہر" منیر احمد کھڑا تھا۔

"جاہل عورت! راستہ دے' کیا دیدے پھاڑ کر مجھے دیکھ رہی ہے؟"

اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے اپنا بریف کیس صوفے پر پھینکا۔ جہاں نائلہ کا موبائل پڑا ہوا تھا۔ حسب معمول عاشر کے تمام میسجز نائلہ پہلے ہی ڈیلیٹ کر چکی تھی۔ اس لیے اسے کوئی فکر نہ تھی۔

اس نے اطمینان سے فلیٹ کا دروازہ بند کیا اور اپنے شوہر کو چائے دینے کچن میں چل دی۔

اب اسے شدت سے کل صبح کا انتظار تھا۔۔۔

☆

صوفیہ امجد

سنہری دھوپ

ناولٹ

زیبا کالج سے بہت تپی ہوئی واپس آئی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بیگ پٹخا اور فریج سے بوتل نکال کر منہ سے لگالی۔

"ایک تو بس کا سفر، دوسرے کڑی دھوپ اور تیسرے ان لچوں لفنگوں کی نظریں اور جملے بازی، دل چاہتا ہے گولی مار دوں سب کو۔" اس کی بڑبڑاہٹ خاصی بلند تھی۔ جہاں آرا نے کچن سے نکل کر اس کی طرف دیکھا۔

"السلام علیکم اماں!" اس نے گڑبڑا کر سلام داغا اور جلدی سے بوتل ٹیبل پر رکھ دی۔ اسے معلوم تھا اب بوتل سے منہ لگا کر پانی پینے پر اسے اماں کی جھڑکیاں سننی پڑیں گی لیکن انہوں نے اسے ٹوکنے سے گریز کیا۔

"کپڑے بدل لو تو کھانا نکال دیتی ہوں۔" وہ کچن میں واپس چلی گئی تھیں۔

"کھانے میں کیا پکا ہے آج بھنڈے اور بینگن پکنے کا سندیسہ نہ دینا اماں! ویسے ہی میرا میٹر گھوما ہوا ہے۔" وہ

ان کے پیچھے چلی آئی تھی۔

"چنے کی دال اور لوکی بنائی ہے آج تو' کل کے دو کباب بچے ہوئے ہیں وہ تل دوں گی ہم فارغ ہو کر تو آؤ۔" وہ اس پر ایک نظر ڈال کر کچن میں چلی گئیں۔

"حیرت انگیز۔" اماں نے نصیحت کرنے کا ایک موقع اور ضائع کردیا۔ کھانوں پر اعتراض ان کو سخت ناپسند تھا۔ ہر چیز "صبروشکر" سے کھانے کی ہدایت تھی۔

"لگتا ہے طبیعت صحیح نہیں ہے' ویسے بھی کچھ خاموش خاموش سی بھی لگ رہی ہیں' کوئی مسئلہ تو نہیں؟" اس نے کمرے تک جاتے جاتے کئی باتیں سوچ لیں۔

وہ یونیفارم بدل کر اور صرف فرض پڑھ کر باہر آئی تو اماں کو بھی نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ ندیم اور مجیب صحن میں بیٹھے کسی بات پر الجھ رہے تھے۔ دونوں میں دو سال کا فرق تھا لیکن برابر کے ہی لگتے تھے اور ہر وقت جڑواں بھائیوں کی طرح ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے۔

"ارے! تم دونوں کہاں غائب تھے؟" اس نے ان دونوں کے سروں پر چپت رسید کی۔

"بجو! میں اپنے دوست کو میتھس کی بک واپس کرنے گیا تھا۔" ندیم نے بتایا۔

"تو لی کیوں تھی؟ تمہارے پاس بک نہیں ہے کیا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہے تو سہی' لیکن جس چیپٹر کے سوال مجھے کرنے تھے اس کے صفحے باجی شمیم آرا کے بیٹے نے پھاڑ دیے تھے۔"

"تو کیا میتھس کی بک کھلونا سمجھ کر تم نے اس کے ہاتھ میں تھمادی تھی؟"

"میں کیوں تھماتا' میں تو ہوم ورک کر رہا تھا۔ شمیم باجی نے پانی لانے کے لیے بھیج دیا۔ اس دوران وہ خود تو امی سے باتیں کرتی رہیں اور ان کے سپوت نے میری کتاب کا تیاپانچا کردیا۔" ندیم نے جل کر جواب دیا۔

"ارے! اسی بات پر یاد آیا۔ باجی آئی تھیں کیا آج؟" اس نے مجیب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پتا نہیں' میرے سامنے تو نہیں آئیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"اماں کی خاموشی سے تو یہی لگتا ہے کہ ہماری باجی شمیم آرا ہی آئی ہوں گی اپنا کوئی دکھڑا رونے' جب بھی آتی ہیں اپنا جی "ہلکا" اور اماں کا "بھاری" کرکے چلی جاتی ہیں۔" اسے غصہ آنا شروع ہوگیا تھا۔

"کھانا کھالیا تم لوگوں نے؟"

"ہاں! ہم نے تو اسکول سے آتے ہی کھالیا تھا۔"

"چلو! پھر تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں جاکر لیٹو۔ ٹیوشن پڑھنے بھی جانا ہے اور خبردار! جو دھوپ میں جاکر پتنگ بازی کرنے کی کوشش کی۔" زیبا نے مجیب کے ہاتھ میں پتنگ کی ڈور دیکھ لی تھی۔ دونوں کو کمرے میں ہنکا کر وہ کچن میں آئی تو اماں وہاں پہلے سے موجود تھیں اور کھانا نکال رہی تھیں۔

"آپ نے بھی نہیں کھایا ہوگا؟" اس نے کچن کے باہر رکھی ہوئی چھوٹی سی ٹیبل پر پلیٹیں اور گلاس رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" ان کا جواب مختصر تھا۔

"اماں! کتنی مرتبہ کہا ہے میرا انتظار نہ کیا کریں مجھے دیر سویر ہوجاتی ہے' آپ ان شیطانوں کے ساتھ ہی کھالیا کریں۔"

"اب تم مجھے بتاؤ گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں؟" ان کے لہجے میں ناراضی تھی۔ انہوں نے پلیٹ میں کھانا نکال کر خاموشی سے کھانا شروع کردیا۔

"واہ! آپ نے تو چاول بھی بنائے ہوئے ہیں۔" زیبا نے پلیٹ میں دال چاول نکالے اور اس پر اچار ڈال کر کھانے لگی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو زیبا کو گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

"اماں! کیا بات ہے' خفا ہیں مجھ سے یا کوئی پریشانی ہے؟ سچی بتارہی ہوں' یہ خاموشی اور سنجیدگی بالکل سوٹ نہیں کرتی آپ پہ۔"

جہاں آرا خوش مزاج اور باتونی قسم کی خاتون تھیں۔ صبح سے کون آیا' کون گیا' سبزی والے سے کیا مناظرہ ہوا' دھوبی سے کیا مباحثہ ہوا' ندیم اور مجیب کی شرارتیں اور شکایتیں' زیبا کو ان سب کی رپورٹ کھانے کے دوران ہی مل جاتی تھی۔ دوبارہ یہ "خبرنامہ" فیاض صاحب کے گھر آنے پر نشر ہوتا۔ ان کا ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور تھا' واپسی رات کو ہی ہوتی تھی وہ باہر کامن روم میں ہی براجمان ہوجاتے اور چائے کی پیالی کے ساتھ تازہ بہ تازہ خبریں نوش فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ زیبا کو ان کی خاموشی کھل رہی تھی۔

"اماں! شمیم باجی کے یہاں تو سب خیریت ہے ناں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ کہیں کوئی بری خبر ہی نہ سننے کو مل جائے۔

"ہاں! سب خیر ہے۔ میں نے صبح ہی فون کیا تھا اسے۔"

"چلو! شکر ہے۔" اس نے اچار کی پھانک منہ میں ڈالی "ان کا تو وہی حساب ہے۔ "نو نیوز از گڈ نیوز" جب تک نہیں آرہیں' سمجھو سب خیر ہے اور جب آگئیں تو جان لو کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔

"ساس کا مزاج آج کل بہت برہم ہے۔"

"نند ہڈحرام ہے' کام کاج میں ہاتھ نہیں بٹاتی۔"

"رضا بھائی آج کل دیر سے آرہے ہیں' ان کو ٹائم نہیں دیتے۔"

"حذیفہ دانت نکال رہا ہے' چڑچڑا ہو رہا ہے۔ تنگ کرکے رکھا ہوا ہے۔" اسی قسم کے "بڑے بڑے" مسائل ہوتے ہیں ناں ان کے' جنہیں سن کر آپ پریشان ہوجاتی ہیں اماں!"

"بری بات ہے' بہن کے متعلق ایسا سوچتی ہو؟ جانتی تو ہو تم' وہ شروع سے ایسی ہی ہے زود رنج اور نرم دل' یاد نہیں' معمولی معمولی باتوں پر رونے بیٹھ جاتی تھی۔"

"مجیب نے کھیلتے ہوئے چوٹ لگادی تو نیر بہا رہی ہے۔"

"امتحان میں نمبر کم آئے تو ندیاں بہہ رہی ہیں۔"

"کسی ڈرامے کا ہیرو مرگیا تو اس کے آنسو نہیں تھم رہے ہیں۔"

زندگی ایسے تھوڑا ہی گزرتی ہے۔ اسے گزارنے کے لیے تو بڑی ہمت' حوصلے اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر بات بات پر ہمت ہار دیں تو کیسے گزارا ہو۔ یہی بات میں شمیم کو سمجھاتی ہوں' تھوڑی ہمت بندھاتی ہوں' تھوڑا حوصلہ بڑھاتی ہوں۔ اگر کچھ کہہ سن کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے اور میرے تسلی کے دو بول اور ایک پیار کی تھپکی سے وہ ایک نئی توانائی حاصل کرکے زندگی کی دوڑ میں خوش دلی سے شامل ہونے کو تیار ہوجاتی ہے تو کیا میں برا کرتی ہوں' یا وہ کچھ غلط کرتی ہے؟"

اماں کی چپ ٹوٹ چکی تھی۔ نصیحتوں کی پٹاری کھل چکی تھی اور اس میں سے زریں خیالات نکل نکل کر باہر آرہے تھے' جنہیں وہ لپک لپک کر اپنے دوپٹے کے پلوؤں میں باندھ رہی تھی کیونکہ اماں کی یہی ہدایت تھی۔ بقول ان کے' یہ ساری باتیں آئندہ زندگی میں بہت کام آنے والی تھیں۔

"ماں باپ تو اولاد کے لیے ایک سایہ دار شجر کی مانند

ہوتے ہیں' جب بچے زندگی کی "دوڑ دھوپ" سے تھک جاتے ہیں تو کچھ دیر سستانے کے لیے ان کے سائے میں لیٹ جاتے ہیں اور وہ ان کی ساری تھکن اور کڑواہٹ اپنے اندر سمو کر ان کو تازہ دم کر دیتے ہیں جیسے درخت فضا کی کثافت جذب کر کے ہمیں آکسیجن کا تحفہ دیتے ہیں۔"

"اماں!" میں حیرت سے چلائی۔ "پہلے فلسفہ بول رہی تھیں پھر سائنس پر اتر آئیں۔ اب شاعری نہ شروع کر دیجیے گا۔"

"کیا فلسفہ' کیا سائنس اور کیا شاعری' زندگی کے نشیب و فراز بہت کچھ سکھا دیتے ہیں بہت کچھ سمجھا دیتے ہیں۔ جنہیں جاننے اور سمجھنے کے لیے شاید موٹی موٹی کتابیں پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔"

اماں برتن سمیٹ کر اور مجھے حیران و پریشان چھوڑ کر کچن میں جا چکی تھیں اور میں ان کی باتوں کے پیچ و خم میں ابھی الجھی رہ گئی تھی۔ جماعتیں تو اماں نے دس ہی پڑھی تھیں' لیکن باتیں کسی دانا حکیم کی طرح کرتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

زیبا' ندیم کے لیے مہنگائی پر مضمون لکھ رہی تھی۔ لکھتے لکھتے اچانک اس نے سر اٹھا کر اماں کی طرف دیکھا' وہ ابا کے پاس بیٹھی دھیرے دھیرے کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بھی اخبار تہہ کر کے توجہ سے ان کی بات سن رہے تھے۔

سارے دن کی روداد تو اماں گھر آتے ہی ابا کو سنا دیتی ہیں' پھر اب کون سی الف لیلیٰ کی داستان ان کے گوش گزار ہو رہی ہے۔ اس کے اندر تجسس نے سر ابھارا۔ وہ سب کامن روم میں موجود تھے۔ ندیم اور مجیب ابا کی وجہ سے ٹی وی کی آواز بند کر کے کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے۔ امتیاز صاحب حسب معمول اخبار لے کر سامنے رکھے تخت پر لیٹ گئے تھے لیکن اماں خلاف معمول وہاں بیٹھی کیا باتیں کر رہی تھیں' وہ وقفے وقفے سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد جہاں آرا خود ہی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"میں چاہ رہی تھی تم کل کالج سے چھٹی کر لو۔ گھر میں کام ہوگا۔ کل شام کچھ مہمان آ رہے ہیں۔" انہوں نے ندیم کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا' جو ان کے بیٹھتے ہی گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

"پھر مہمان؟" زیبا نے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

"کیا مصیبت ہے ہر مہینے دو مہینے بعد یہی ڈراما ہوتا ہے۔ اماں! آپ نے فیصلہ کر لیا ہے' آپ مجھے سکون سے نہیں پڑھنے دیں گی۔" اس نے بمشکل آواز دبا کر کہا۔ ابا سامنے ہی تو بیٹھے ہوئے تھے۔

"پڑھنے سے کون روک رہا ہے تمہیں؟ تم اپنا کام کرو ہمیں اپنا کرنے دو۔ ویسے بھی تمہاری پڑھائی کا آخری سال چل رہا ہے۔ سلسلہ بنتے بنتے ہی بنتا ہے اچانک سب کچھ نہیں ہو جاتا۔" انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

زیبا کا پارہ ہائی ہو چکا تھا۔ وہ کاپی پٹخ کر تنتناتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے تکیوں کو اٹھا اٹھا کر بستر پر پٹخا اور پاس پڑے ہوئے موڑھے کو لات رسید کر کے اپنا غصہ اتارنے کی کوشش کی لیکن پیر بیڈ سے ٹکرا گیا۔ اب وہ سر کے بجائے پیر پکڑے بیٹھی تھی۔

"بجو! میرا مضمون۔" ندیم شاید فوراً" ہی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا مضمون۔" وہ غصے سے دھاڑی تو ندیم فوراً" ہی منظر سے غائب ہو گیا۔

"بجو! پانی پی لو۔" وہ دوبارہ آ گیا تھا پانی کا گلاس لے کر۔

"ہماری مس بتا رہی تھیں پانی پینے سے غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر غصہ آئے تو کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ' بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ۔" اس نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔

"ایک تو سارے مبلغ ہمارے گھر ہی پیدا ہو گئے ہیں۔" اس نے غٹا غٹ پانی چڑھا کر گلاس اسے تھمایا اور ساتھ ہی جانے کا اشارہ بھی کر دیا۔

"اب کیا کروں۔" وہ خود سے مخاطب تھی۔ "پہلے سمیعہ کو فون کر کے بتاؤں کہ میں کل کالج نہیں آؤں گی۔ ایسا نہ ہو وہ بس اسٹاپ پر میرا انتظار کرتی رہے۔"

سمیعہ اس کی کلاس فیلو تھی۔ دو گلیاں چھوڑ کر ہی اس کا گھر تھا دونوں ساتھ کالج آتی جاتی تھیں۔

"فون کروں گی تو دس سوال کرے گی۔ صرف میسج ہی کرنا صحیح رہے گا۔ خواہ مخواہ بال کی کھال اتارنے کی عادت ہے اس کی۔" زیبا پر بیزاری طاری تھی' شاید پچھلی مرتبہ کے تلخ تجربے نے اس کے اندر کڑواہٹ بھر دی تھی۔

"انہوں نے ہر بات پر ہی نکتہ اعتراض اٹھایا تھا۔ ہمارا قدیم طرز کا گھر' ہمارا سادہ طرز زندگی۔ اماں کی عاجزی و انکساری اور میرا سادہ سراپا۔ ہم لوگ آؤٹ آف ڈیٹڈ قرار پائے تھے۔ پھر ان کے ساتھ آنے والی لڑکی کا تبصرہ' مجھے سلگا کر رکھ گیا تھا۔

"مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ میں کسی پرانی فلم کے کرداروں سے مل رہی ہوں۔" اس نے اپنے برابر والی خاتون کے کانوں میں با آواز بلند سرگوشی کی تھی۔

ان کے جانے کے بعد رشتہ لانے والی خالہ بتول نے دھیمے سروں میں اماں کو جو راگ سنایا تھا' اس کا لب لباب جو بھی تھا' زیبا نے تو اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ "سادگی و بردباری' عاجزی و انکساری" ان پرانے سکوں کی طرح ہیں' جو اب بند ہو چکے ہیں۔ اب تو ظاہری نمود و نمائش' اور بے باکی و ہشیاری کے نئے نوٹ چھپ کر آ چکے ہیں اور بازار میں یہی گردش کر رہے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ کتنے ہی لوگوں کی زندگی ان کی وجہ سے گردش میں آ چکی ہے۔

ویسے ایک بات ہے' ہمارے ناموں کو سن کر لوگوں کو یقیناً" پرانی فلموں کے کردار یاد آ جاتے ہوں گے اور یہ سب ہماری اماں جان کی وجہ سے ہے جو ساٹھ ستر کی دہائی میں ہی پھنسی ہوئی ہیں۔ اسی دور کی فلمیں' اسی دور کی موسیقی اور اسی دور کا رہن سہن اور پھر آج بھی ان کے اندر زندہ ہے۔ نہ آج کل کے طور طریقے ان کو بھاتے ہیں۔ نہ موسیقی ان کا دل لبھاتی ہے اور نہ فلمیں پسند آتی ہیں حالانکہ اپنی جوانی میں فلموں کی رسیا تھیں۔ اب یہی دیکھ لو! اپنے اداکاروں سے ان کی محبت گھر میں جا بجا چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ شمیم آرا' زیبا اور ندیم کی صورت میں' اور یہ مجیب یہ دراصل مجیب عالم صاحب ہیں ان کے فیورٹ سنگر' اگر ریڈیو یا ٹی وی پر ان کا گانا چل رہا ہو تو چینل بدلنا جرم بن جاتا ہے۔

"میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں' میرا دل بھی گا رہا ہے"

"وہ نقاب رخ الٹ کر ابھی سامنے نہ آئیں
کوئی جا کر ان سے کہہ دے ہمیں یوں نہ آزمائیں" اور

"میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا۔"

بار بار کے سنے ہوئے کتنے ہی گانے اس کے کانوں میں گونجنے لگے تھے اس کی ذہنی رو بھٹک کر کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی۔

"بہرحال ہمارا معیار زندگی جو بھی ہے' ہم اس پر شرمندہ ہرگز نہیں ہیں اور یہ بات تو طے ہے کہ اماں کی "زیبا" کے لیے جو بھی "محمد علی" امیدوار ہوگا' اسے یہ سب "جو ہے اور جیسا ہے" کی بنیاد پر قبول کرنا ہوگا۔ بس سوچ لیا ہے' میں نے بھی "وہ اپنی ادا نہ بدلیں تو ہم اپنی خو کیوں بدلیں۔"

اس نے قنوطیت کا چولا اتار پھینکا تھا اور ہلکی پھلکی ہو کر کل کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆
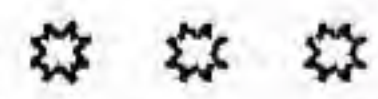
اگلی صبح وہ کافی دیر سے سو کر اٹھی تھی۔ جہاں آرا رشماں کے ساتھ مل کر صفائی کروا رہی تھیں۔ اسے ان کی کڑی تنقید کا سامنا تھا۔ انہیں مشکل ہی سے کسی کا کام پسند آتا تھا۔

"چھوٹی باجی! تسی آج گھر پر ہی ہو؟" وہ زیبا کو دیکھ کر اس کے قریب چلی آئی تھی۔

"بڑے ہی دن بعد دیکھا جی آپ کو۔" وہ اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں بول رہی تھی۔

"قمیص تو بڑی سوہنی بنی ہے آپ نے۔ لال تے کالے پھولوں والی بڑی چنگی لگ رہی ہے جی آپ پر۔ ویسے جب آپ کا دل اٹھ جائے اس پر سے تو مجھے دے دینا۔" اس نے لگے ہاتھوں اپنی فرمائش بھی نوٹ کرادی تھی۔

"ریشماں! کہاں باتیں بنانے بیٹھ گئی ہو اتنا کام پڑا ہے۔" اماں کی آواز پر وہ ان کی طرف لپک گئی۔

"آپ چائے پئیں گی؟ میں اپنے لیے بنانے جارہی ہوں۔" وہ اماں کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور نارمل موڈ میں دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

"ہاں! بنادو۔ یہیں پی لوں گی۔" انہوں نے دیوار کے ساتھ رکھے گملوں میں پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

"اب بتائیں آپ کے "لاڈلے مہمانوں" کے لیے کیا کرنا ہے۔" اس نے چائے کے کپ لاکر ٹیبل پر رکھے اور سلائس پر مکھن لگانے لگی۔

"ڈرائنگ روم کی صفائی میں نے کروادی ہے' پھر بھی ایک نظر دیکھ لینا اگر ترتیب بدلنا چاہو تو ریشماں کو ساتھ لگالینا پھر تو یہ چلی جائے گی۔"

"ترتیب وہی ٹھیک ہے اب یہ بتائیں' چائے کے ساتھ کون سے لوازمات رکھنے کا ارادہ ہے۔ شامی کباب ہرگز نہیں بنیں گے' یہ میں آپ کو پہلے ہی بتائے دے رہی ہوں۔ پچھلی مرتبہ بھی قیمہ پیس پیس کر میرے بازو شل ہوگئے تھے۔ مشین کا پیسا ہوا تو آپ کو پسند آتا نہیں ہے۔ بس بیکری سے سامان منگوائیں اور کھلاپلا کر رخصت کریں۔ زیادہ جھنجھٹ میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ارے یہ میں نے تو وہی بڑوں کے لیے بیسن بھی گھول کر رکھ دیا ہے۔"

"شاباش اماں! قابل داد ہے آپ کی اعلیٰ شنسی۔"

"بیکری کا سامان تو تمہارے ابا نے کہا ہے' کسی کے ہاتھ بھیج دیں گے' میں چاہ رہی تھی تم وہ بنالو کیا نام ہے اس کا؟" انہوں نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"وہی جو مجیب اور ندیم بہت شوق سے کھاتے ہیں ہاں' پاستا! آج کل لوگ ایسی ہی بے تکی چیزیں پسند کرنے لگے ہیں۔"

"کوئی نہیں بن رہا پاستا واستا' بس آپ نے جتنا بندوبست کرلیا ہے' وہی کافی ہے۔ آپ یہ بتائیں شام کو کیا پہن رہی ہیں؟ ایسا کریں وہ لائٹ گرین سوٹ پہن لیں۔ کانوں میں گولڈن ٹاپس صحیح رہیں گے اور ہاں ڈھیلا ڈھالا سا جوڑا بنادوں گی آپ کا۔" اس کے چہرے پر شرارت تھی۔

"ارے! بالکل باؤلی ہوگئی ہو کیا؟ وہ مجھے دیکھنے آرہے ہیں یا تمہیں؟ جو میں تیار ہوجاؤں' حد ہوگئی۔" ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔

"میری بھولی اماں! آج کل کے زمانے میں لوگ خالی خولی لڑکی کو نہیں دیکھتے بلکہ اور بھی بہت کچھ دیکھتے ہیں جس میں لڑکی کی اماں بھی شامل ہوتی ہے۔ سنا نہیں تھا' پچھلی مرتبہ کیا نصیحتیں کرکے گئی تھیں بتول خالہ' اتنی جلدی بھول گئیں؟"

"پچھلی باتوں پر مٹی ڈالو' یہ دیکھو آگے کیا کرنا ہے۔" انہوں نے ناراضی سے منہ پھلالیا۔

"اماں! میں تو مذاق کررہی تھی۔ مجھے تو اپنی اماں اس موٹی چوٹی اور سادہ انداز میں ہی پسند ہیں۔" اس نے پیار سے ان کے گرد اپنے بازو حمائل کردیے تھے۔

"پرے ہٹو' مجھے یہ چونچلے پسند نہیں ہیں۔" ان کا موڈ آف ہوچکا تھا۔

"شمیم باجی کو فون کیا؟ آپ ان کو بلانے کا سوچ رہی تھیں۔" زیبا نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"ہاں! کیا تھا لیکن وہ نہیں آسکتی۔ اس کی ساس باتھ روم میں پھسل گئیں' پیر میں موچ آگئی ہے ان کے اس کا آنا مشکل ہے' مجھے فراغت ہوجائے تو سوچ رہی ہوں کل جاکر اس کی ساس کو دیکھ آؤں۔"

"اماں! یہ شمیم باجی بھی ہمیں کسی موقعے پر دستیاب نہیں ہوتیں۔ ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا ان کے پاس' شادی کے بعد تو وہ ہمارے کسی کام کی نہیں رہیں۔"

"ہاں! میں نے سوچا تھا' آجائے گی تو مجھے بھی سہارا ہوجائے گا اور تمہیں بھی دو گھڑی مسکراہٹ میسر آجائے گی لیکن خیر لڑکیاں تو شادی کے بعد ویسے بھی پرائی ہوجاتی ہیں۔ ان کے لیے اپنا گھر اور سسرال ہی اہم ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔"

"پھر بھی آپ نے نصیحت نہیں پکڑی اور مجھے پرایا کرنے کے چکر میں گھن چکر بنی ہوئی ہیں۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے چائے کے برتن سمیٹے اور کچن کا رخ کیا۔

☆ ☆ ☆

مہمان رخصت ہوچکے تھے۔ سب کام بخیروخوبی انجام پاگیا تھا۔ زیبا' مجیب اور ندیم چائے کے بچے ہوئے لوازمات پر حملہ کرنے کی تیاری کررہے تھے۔ جہاں آرا کچھ خوش' کچھ مطمئن اور بڑی حد تک پرامید نظر آرہی تھیں۔ آنے والی خواتین خوش ہوکر گئی تھیں اور دوبارہ آنے کا عندیہ بھی دے گئی تھیں۔

"لوگ تو اچھے طریقے کے لگ رہے تھے۔ اب اللہ کرے کہ بات بن جائے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں گویا تھیں اور بسکٹ اور نمکو تھیلیوں میں بھر کر واپس رکھ رہی تھیں۔

مجیب چکن رول کیچپ میں ڈبو کر کھا رہا تھا۔ ندیم نے جلیبیوں کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا تھا۔ زیبا نے اپنے لیے پہلے سے ہی بڑے نکالے ہی تھی کہ دروازے پر بجنے والی بیل پر ہاتھ روکنا پڑا۔

"چلو مجیب! ندیم!" اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

"بجو! دیکھو میرے تو ہاتھ چکنے ہورہے ہیں۔" مجیب نے دوسرا رول اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اور میرے تو چکنے کے ساتھ میٹھے بھی ہورہے ہیں۔" ندیم کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

"مرو تم دونوں' نکمے!" وہ پیر پٹختے ہوئے دروازہ کھولنے گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے غرا کر پوچھا۔ باہر سمیعہ کا چھوٹا بھائی طلحہ کھڑا تھا۔

"وہ' وہ' سمیعہ باجی خواتین ڈائجسٹ منگا رہی ہیں۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"تمہاری بہن کو بھی چین نہیں ہے' ایک دن صبر نہیں کرسکتی تھی' کہا بھی تھا کالج لے کر آجاؤں گی۔" وہ اسے ڈپٹ کر اندر ڈائجسٹ لینے آگئی۔

"یہ لو اور اس سے کہنا کبھی خود بھی پیسے خرچ کرکے خرید لیا کرے۔ کنجوس مکھی چوس۔"

"وہ باجی نے دوسرے ڈائجسٹ کے لیے بھی کہا تھا' کیا نام بتایا تھا..." وہ باقاعدہ ہکلانے لگا تھا۔

"شعاع کہا ہوگا۔ کہہ دینا ابھی پڑھا نہیں ہے میں نے' اب چلو بھاگو یہاں سے۔"

دروازہ بند کرتے ہوئے اس کی نظر سامنے بائیک پر بیٹھے ہوئے بندے پر پڑی۔ وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ زیبا کے دیکھنے پر اس نے دوسری طرف نظر پھیرلی۔ طلحہ ڈائجسٹ لے کر اس کے پیچھے جا بیٹھا تھا۔

"ہیں! یہ کون تھا بھلا اور کہیں اس نے میری شیریں بیانی تو نہیں سن لی؟ فاصلہ تو اتنا زیادہ نہیں کہ میری آواز اس تک نہ پہنچی ہو۔ خیر! مجھے کیا۔"

اس نے شرمندگی کے احساس کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا اور اندر جاکر دعوت عام میں شامل ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

زیبا کالج سے آئی تو گھر میں بڑی رونق کا احساس ہوا۔

"السلام علیکم! اوہو' آج تو ہماری باجی شمیم آرا نے قدم رنجہ فرمایا ہوا ہے۔" اس نے چھوٹے حذیفہ کو بازوؤں میں بھر کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ بچے نے رونا شروع کردیا تھا۔

"یہ دیکھو! اتنے دن بعد آتی ہو کہ بچے ہماری

شکلیں بھول جاتے ہیں۔ ہمیں اپنا رشتے دار ماننے سے ہی انکار کردیتے ہیں۔ دیکھو! اپنے سپوت کو کیسے منہ بنا بنا کر رو رہا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کی طبیعت تھوڑی گڑبڑ ہے' اس لیے چڑچڑا ہو رہا ہے۔" شمیم آرا نے اس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"اور وہ کہاں ہیں بڑے نواب محترم وجاہت مرزا؟ کہیں دادی کے پاس تو نہیں چھوڑ آئیں؟" اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"لائی ہوں' شاید مجیب اور ندیم اسے کمرے میں لے گئے ہیں۔"

"خوشبو بتا رہی ہے کہ بریانی پکی ہے۔ کیوں اماں!" زیبا نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں! جلدی سے فارغ ہو کر آؤ۔ تمہارے انتظار میں ہم نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ بڑی شدت سے بھوک لگی ہے۔" شمیم آرا نے حذیفہ کے منہ سے فیڈر لگاتے ہوئے کہا۔

"او کے میم! میں یوں گئی اور یوں آئی۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"زیبا کے لیے جو پروپوزل آیا تھا' اس کا کیا بنا اماں؟ میں آج خاص طور پر اسی لیے وقت نکال کر آئی ہوں۔ دو دن سے دل میں کھدبد ہو رہی تھی۔ اب فون پر تو اتنی تفصیلی بات نہیں ہو سکتی۔ کیسے لوگ تھے؟ انہیں ہماری زیبا پسند آئی یا نہیں؟ ویسے میری بہن تو ایسی ہے کہ کوئی عقل کا اندھا ہی اسے ناپسند کر سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں بہن کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے' لوگوں کے معیار بدل گئے ہیں۔ جن روایتوں کو ہم گلے سے لگائے بیٹھے ہیں اور اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں اب وہ بہت سوں کے لیے پسندیدہ نہیں رہیں۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"خیر! وہ لوگ بظاہر تو مجھے اچھے لگے۔ محبت اور اخلاق سے ملنے اور قدر کرنے والے۔ ان کے انداز سے بھی پسندیدگی ظاہر ہو رہی تھی۔ دوبارہ آنے کا کہہ گئے ہیں اور ہمیں بھی اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی ہے۔ میں سوچ رہی ہوں اگر وہ ایک بار اور چکر لگالیں تو ہم بھی گھر بار اور لڑکا دیکھ آئیں۔ کوئی دن طے کر کے تمہیں بتا دوں گی' تمہاری اور رضا کی موجودگی بھی بہت ضروری ہو گی اور دیکھو! پہلے ہی جتائے دے رہی ہوں کہ رضا کو بڑے بھائی کا کردار ادا کرنا ہو گا' کبھی پھر کوئی مصروفیت آڑے آجائے۔"

"ان شاء اللہ جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی ہو گا۔ اماں! آپ بالکل فکر نہ کریں۔" شمیم آرا نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"اماں! دسترخوان بچھا دوں کیا؟" زیبا نے کچن سے ہانک لگائی۔

"ہاں! سب نیچے بیٹھ کر آرام سے کھالیں گے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"رضا کو آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے' تمہارے ابا بھی پوچھ رہے تھے' سب خیریت ہے ناں؟"

"ہاں! وہ خود بھی بہت شرمندہ ہو رہے تھے کہ اماں ابا کو سلام کرنے نہیں جاسکے' اتنے عرصے سے' لیکن کیا کریں مشکل ہی ایسی آپڑی ہے کہ گھن چکر بن کر رہ گئے ہیں۔"

"ارے! ایسا کیا ہو گیا۔" جہاں آرا کے لہجے میں تشویش تھی۔

"رضا نے اپنی فیکٹری کے برابر والی زمین خریدی تھی دو سال پہلے اپنی فیکٹری کو توسیع دینے کے لیے۔"

"ہاں ہاں پھر؟" ان کے لہجے میں بے تابی تھی۔

"اس پر کسی مافیا گروپ نے قبضہ کر لیا ہے۔ جعلی کاغذات بھی بنوالیے ہیں۔ رضا نے ان پر کیس کر دیا ہے۔ کچھ "بااختیار" لوگوں سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بس آج کل سارا وقت اسی دوڑ دھوپ میں گزر جاتا ہے۔ فیکٹری کا کام بھی متاثر ہو رہا ہے' دعا کریں! سب ٹھیک ہو جائے۔ ہم سب بہت پریشان ہیں آج کل۔"

"اتنی بڑی بات ہو گئی اور تم نے ذکر تک نہیں کیا؟" جہاں آرا حیران تھیں۔ "چھوٹی چھوٹی باتوں پر

نا ہو کر دوڑی چلی آتی ہو۔"

"رضا نے منع کر دیا تھا کہ بلاوجہ سب پریشان ہوں گے۔ اس وقت بھی صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ دعا کریں ہمارے لیے۔ پتا نہیں کیوں' میرے دل کو یقین ہے کہ آپ کی دعائیں ہی میری مشکلوں کو آسان کریں گی۔" اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

زیبا دسترخوان پر کھانا چن رہی تھی۔ اس کی وجہ سے دونوں نے اپنی آواز دھیمی کرلی تھی۔

"نفع نقصان تو کاروبار کا حصہ ہے اور اس سے ہم نمٹتے رہتے ہیں لیکن قبضہ مافیا اور اس کے ہتھکنڈوں سے ڈر لگتا ہے۔ کیا کچھ نہیں ہو رہا آج کل۔ جب تک رضا گھر واپس نہیں آجاتے' جان سولی پر ہی لٹکی رہتی ہے۔" وہ ایک دم ہی پژمردہ نظر آنے لگی تھی۔

"اللہ پر بھروسا رکھو بیٹا! اسی پر توکل کرو۔ وہ یقیناً تمہیں اس مشکل سے نکال لے گا۔ روزانہ نماز حاجت پڑھ کر دعا کرو۔ وہ حقدار کو اس کا حق ضرور دیتا ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں۔" وہ دھیرے دھیرے اس کی کمر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

"چلیے خواتین! کھانا تناول فرمالیجیے۔" زیبا نے نعرہ بلند کیا تو وہ دونوں بھی دسترخوان پر آبیٹھیں۔ ندیم اور مجیب کو کھانے کے لیے آوازیں لگائی جارہی تھیں' جو ابھی تک کمرے سے برآمد نہیں ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆
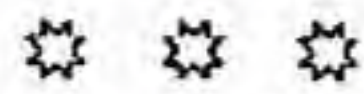
زیبا بخار کے سبب کئی دن سے کالج نہیں جارہی تھی۔ آج سمیعہ اس کی خیر خبر لینے آپہنچی۔ اب دونوں کافی دیر سے سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر گزارا مشکل تھا' جب تک وہ اپنی تمام چھوٹی بڑی باتیں ایک دوسرے کے ساتھ شیئر نہیں کرلیتی تھیں' ان کو چین نہیں آتا تھا۔ اس میں کپڑوں کی ڈیزائننگ سے لے کر ڈراموں کی کہانیوں تک اور پڑھائی سے لے کر کھانوں کی ترکیبوں تک سارے معاملات شامل ہوتے تھے۔

"تین دن سے کالج میں پاگلوں کی طرح گھوم رہی ہوں اور یہاں مہارانی بستر پر آرام فرما رہی ہیں۔" سمیعہ کا منہ پھولا ہوا تھا۔

"اچھا ہے! تمہیں بھی تو کچھ میری قدر محسوس ہو۔ میری اہمیت کا احساس تمہارے دل میں بھی جاگے۔" زیبا نے اسے چھیڑا۔

"زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل شرافت سے کالج آجانا ورنہ۔۔۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"ارے ڈرامے سے مجھے یاد آیا "ہم سفر" کی پچھلی قسط دیکھی تھی تم نے؟"

"کہاں دیکھی' ہماری اماں جان اور ابا حضور عین ڈرامے کے وقت ٹی وی کے سامنے جا بیٹھے تھے۔ اماں نے شاید "یومیہ" رپورٹ کے ساتھ کوئی "نیا بل" بھی ابا کے سامنے پیش کر دیا تھا شاید' اس پر ایک گھنٹے تک بحث ہوتی رہی۔ اب نہ جانے بل پاس ہوا کہ نہیں لیکن اس چکر میں میری پوری قسط نکل گئی۔" زیبا نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"لاکھ اماں کو اشارے کیے کہ کمرے میں جا کر مذاکرات کرلیں' لیکن نہیں بھئی' الٹا آوازیں دینے لگیں کہ ٹی وی دیکھنا ہے تو کھول لو۔ اب تم ہی بتاؤ' اماں کے ہم سفر کے ساتھ بیٹھ کر میں "ڈراما ہم سفر" کیسے دیکھتی۔"

"ہائے ہائے! کیا مس کر دیا ہے تم نے۔" سمیعہ نے اسے مزید تاؤ دلایا۔

"اسٹوری میں زبردست ٹوئسٹ آچکا ہے۔ حرم سرجری کے لیے اسپتال ایڈمٹ ہو رہی ہے۔ اشعر حسین کے دل میں "خرد" کے لیے سوفٹ کارنر پیدا ہو رہا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "خضر" واپس آرہا ہے۔"

"اچھا! زبردست بھئی' ایسا کرو تم شروع سے سناؤ کیا کیا ہوا؟" زیبا نے بے تابی دکھائی لیکن اسی وقت بریک کا ٹائم ہو گیا۔

"بیٹا! یہ حمیدہ کہاں ہوتی ہے آج کل؟ کتنے دن

ہوگئے شکل نہیں دکھائی۔" جہاں آرا چائے کی ٹرے لیے کھڑی تھیں۔

"خالہ! بھائی آئے ہوئے ہیں مسقط سے۔ بس ان ہی کی خاطرداریوں میں لگی رہتی ہیں۔"

"اچھا اچھا! خیر سے شرجیل آیا ہوا ہے۔ کتنا عرصہ ہوگیا ہے اسے دیکھے ہوئے' اس سے کہنا خالہ کو بھی سلام کرلے کسی دن آکر' اور ہاں گاجر کا اچار ڈالا ہے میں نے۔ جب جاؤ تو لے کر جانا حمیدہ کو بہت پسند ہے میرے ہاتھ کا اچار۔"

اماں کے جاتے ہی زیبا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"دیکھا تم نے؟ ڈرامے میں تو وقفے آتے ہی ہیں۔ اب صرف اس کی اسٹوری سن رہی ہوں تو اس میں بھی اشتہارات آنے شروع ہوگئے چائے اور اچار کے۔ یہ ہوتا ہے میرے ساتھ۔"

☼ ☼ ☼

زیبا بے فکری سے پاؤں پسارے تخت پر بیٹھی مٹر چھیل رہی تھی۔ چہرے پر ملتانی مٹی کا ماسک لگایا ہوا تھا اور اپنے موبائل فون پر راحت فتح علی کے گانے "تیری میری پریم کہانی" پر سر دھن رہی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب بیل بجی اور اماں دروازہ کھولنے جا پہنچیں۔ ہوش تو اس وقت آیا جب انہوں نے کسی اجنبی لڑکے کے ساتھ اندر کا رخ کیا۔ ان کے ہاتھ میں خوان پوش سے ڈھکی ہوئی ٹرے تھی۔

"آجاؤ بیٹا! آجاؤ۔ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ میں تو کئی دن سے تمہیں یاد کررہی تھی۔" وہ کسی کو پیار دلار سے اندر لارہی تھیں۔

اس نے ہونقوں کی طرح دونوں کی طرف دیکھا۔ آنے والا اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا تھا۔

"اماں...! یہ کیا حرکت ہے۔" زیبا کا دل چاہا زور سے چلائے لیکن تقریباً "سوکھ جانے والے ماسک کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا۔ اس نے عجلت میں قریب پڑا ہوا دوپٹا گلے میں ڈالا اور غڑاپ سے کمرے میں گھس گئی۔ اس کا پیر لگنے سے چھلے ہوئے مٹر کی جالی نیچے جاپڑی تھی اور سارے مٹر آنے والے کے قدموں میں بکھر گئے تھے۔ وہ اس استقبال پر حیران و پریشان کھڑا تھا۔

"یہ تو وہی لڑکا ہے' طلحہ جس کے ساتھ ڈائجسٹ لینے آیا تھا۔" اس نے منہ دھوتے ہوئے سوچا۔

"اچھا تو یہ سمیعہ کا بھائی ہے' جو مسقط سے آیا ہوا ہے۔" اسی لیے اماں اپنا پیار لنڈھا رہی ہیں۔

"زیبا! کہاں جاکر بیٹھ گئی ہو؟ یہ مٹر تو سمیٹ لو۔" اماں نے اسے آواز دی۔

"اور ہاں! ایک گلاس ٹھنڈا تو بنا دو۔ بچہ اتنی دور سے آیا ہے۔"

"ہاں! مسقط سے پیدل ہی چل کر آیا ہے ہمارے ہاں۔" اس نے جل کر سوچا۔

"زیبا! ذرا یہ برتن تو خالی کردو۔" اماں کی آوازیں وقفے وقفے سے آرہی تھیں۔

"جی اماں!" جلدی سے تولیے سے منہ رگڑ کر اور قرینے سے دوپٹا اوڑھ کر وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

اب نہ جانے تولیے کی رگڑ سے یا غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا وہ اماں کی طرف ناراضی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آنے والے کی طرف ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ اسے لگا شاید وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے ہی اس نے "روح افزا" کا گلاس منہ سے لگالیا تھا۔

"بدتمیز۔" زیبا منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"اتنی دیر سے آوازیں دے رہی تھی۔" اماں نے اسے دیکھ کر کہا۔

"حمیدہ نے نیاز کا زردہ بھیجا ہے' ذرا برتن خالی کرکے بھائی کو دے دو۔"

اماں کی بات سن کر اسے اچھو لگ گیا تھا۔ شاید لفظ "بھائی" اس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔

"نہیں' نہیں خالہ! برتن بعد میں آجائیں گے۔ اب میں چلتا ہوں۔"

اتنی دیر میں شاید وہ پہلی مرتبہ ہی بولا تھا۔ زیبا نے زردے کی ٹرے اٹھاتے ہوئے اس کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا تو غصیلے انداز میں اس کی طرف

دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ شاید ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

زیبا نے زردے کی ٹرے لاکر کچن میں پٹخ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ذرا مجھے بتول کا نمبر تو ملا کر دینا' دو ہفتے ہوگئے' کوئی خیر خبر ہی نہیں دی اس نے۔" جہاں آرا نے فون ڈائری اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"اماں! آپ خود ملالیں نا' نمبر ملانا آتا تو ہے آپ کو۔" زیبا کی نظریں ٹی وی پر مرکوز تھیں۔

"فون بند پڑا ہے کل سے' اس لیے تمہیں زحمت دے رہی ہوں۔ اپنے موبائل پر ملادو۔" ان کے لہجے میں جھنجلاہٹ بڑی واضح تھی۔

زیبا نے ٹھنڈی سانس بھری اور ڈائری سے نمبر تلاش کرکے فون ملانے لگی۔

"یہ لیں' ملا دیا نمبر' بیل جارہی ہے۔" اس نے سیل فون انہیں پکڑا دیا جسے لے کر وہ کمرے میں چلی گئیں۔

"اللہ کرے ان لوگوں نے انکار ہی کردیا ہو۔" اس نے جل کر دعا کی۔

"لیکن اس سے بھی کیا ہوگا' تھوڑے دن بعد کوئی نیا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ پھر ان تمام مرحلوں سے دوبارہ گزرنا ہوگا۔ وہی نمائش' وہی خاطرداری' وہی امید و بیم کی کیفیت یعنی ڈراما ریپیٹ ٹیلی کاسٹ ہوتا رہے گا ہوتا رہے گا۔"

"یہ لو! بتول تو گھر پر نہیں ہے۔ اس کے بیٹے سے کہہ دیا ہے کہ وہ آجائے تو میرے پاس بھیج دے۔" جہاں آرا نے اس کو فون واپس کرتے ہوئے اطلاع فراہم کی۔ زیبا نے ان کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔

"اللہ جانے ان کو کس بات کی جلدی ہے۔" اس نے چڑ کر سوچا۔

کوئی گھنٹے بھر بعد ہی بتول خالہ ہانپتی کانپتی ان کے گھر آپہنچیں۔

"شاباش ہے تمہیں بھی بتول! اتنے دن ہوگئے نہ کوئی اطلاع نہ فون نہ خبر۔ تم نے تو مجھے آس و نراس کی کیفیت میں مبتلا کرکے رکھ دیا ہے۔" جہاں آرا نے ان پر آتے ہی چڑھائی کردی تھی۔

"دو گھڑی دم تو لینے دو۔ ابھی بتاتی ہوں ساری بات۔ ادھر میرے پاس آکر بیٹھو۔" انہوں نے اپنے قریب جگہ بناتے ہوئے کہا۔

"فون تو چار دن بعد ہی آگیا تھا ان لوگوں کا لیکن مجھے بتانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ عجیب سی شرمندگی محسوس ہورہی تھی مجھے۔"

"آخر ایسی کیا بات ہوگئی؛ صاف صاف بتاؤ' پہیلیاں نہ بجھواؤ بتول!"

"دراصل جس لڑکے کا رشتہ لے کر وہ خواتین آئی تھیں۔ اس نے پہلے ہی کوئی لڑکی پسند کر رکھی تھی اپنے آفس کی۔ ماں بہنوں کو علم نہیں تھا وہ اپنے طور پر لڑکیاں دیکھتی پھر رہی تھیں لیکن جب بات کھلی تو لڑکے نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ تو اسی لڑکی سے شادی کرے گا' ادھر ادھر جاکر وقت ضائع نہ کیا جائے۔ اس کی ماں سخت شرمندہ تھی۔ بار بار معذرت کررہی تھی ورنہ انہیں تو ہماری زیبا بہت پسند آئی تھی اور تمہارے اخلاق کی بھی بہت تعریف کررہی تھیں وہ۔" انہوں نے بات ختم کرکے جہاں آرا کی طرف دیکھا' ان کا چہرہ پھیکا پڑگیا تھا۔

"تم بالکل دل چھوٹا نہ کرو۔ رشتے بہتیرے ہیں ہماری بچی کے لیے۔ اللہ کوئی نہ کوئی اور سبب پیدا کردے گا۔" انہوں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

زیبا چائے لے کر آئی تو آخری جملے اس کے کانوں میں پڑے۔ "لگتا ہے معاملہ پٹا نہیں۔ چلو! چھٹی ہوئی۔ اب کچھ دن تو سکون سے گزر ہی جائیں گے۔" اس نے طمانیت بھری سانس لی تھی۔

"کچھ کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ کیا خیال ہے کچھ میٹھا ہوجائے؟" زیبا نے ندیم کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا' جو ہوم ورک میں مصروف تھا۔ بتول خالہ کے جانے

کے بعد اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہوگیا تھا۔

"ایسا کرو، پیسٹری لا دو چاکلیٹ کریم والی اور واپسی پر نکڑ پر جو ٹھیلے والا ہوتا ہے اس سے مونگ پھلیاں بھی لے لینا، سب مل کر کھائیں گے۔ چلو ٹریٹ میری طرف سے۔" اس نے لالچ دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو معاف کریں۔ یہ پوری ایکسرسائز مکمل کرنی ہے مجھے۔ اتنے سارے سوال باقی ہیں ابھی پھر پاکستان اور انگلینڈ کے میچ کی ہائی لائٹس شروع ہوجائیں گی۔" ندیم نے تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی بات سن کر زیبا کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔

"بچو! شرافت سے لا دو ورنہ بھول جاؤ میچ ویچ کو۔"

"کیا مطلب؟" ندیم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"شہناز خالہ کی بیٹی ثمینہ کا میسج آیا تھا اماں کے لیے۔ پاکستانی مووی چینل سے وحید مراد اور رانی کی "بہارو پھول برساؤ" آنے والی ہے تھوڑی دیر بعد۔

"تو پھر؟" ندیم نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"پھر یہ کہ ایسا نہ ہو "سعید اجمل" کی باؤلنگ کی جگہ تمہیں رانی کے ڈانس دیکھنے پڑ جائیں۔

"چندا رے چندا! کچھ تو ہی بتا میرا افسانہ
بیتاب ہے کیوں دل دیوانہ۔"

اس نے لہک لہک کر اسی فلم کا گانا سنایا۔

"کیا مصیبت ہے۔ سارا میچ تو اسکول اور ٹیوشن کے چکر میں نکل جاتا ہے۔ اب ہائی لائٹس بھی نہ دیکھیں۔ ایک تو پتا نہیں اماں کو کیا دلچسپی ہے پرانی فلموں سے۔ دیکھی دکھائی فلمیں بار بار ایسے دیکھتی ہیں جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔" ندیم سراپا احتجاج بنا ہوا تھا۔

"یہ گھر میرا گلشن ہے
گلشن کا خدا حافظ۔"

اب وہ اسے فلم کا دوسرا گانا اپنا دوپٹا لہرا لہرا کر سنا رہی تھی۔

"بجو! زیادہ بلیک میل نہ کیا کرو، لاؤ پیسے دو اور دیکھو! اماں کو فلم کے بارے میں پتا نہیں چلنا چاہیے۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"یہ ہوئی نا بات۔" وہ ہنستے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"ہائے! میں مر گئی۔" حمیدہ خاتون لنگڑاتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ سمیعہ نے ایک طرف سے ان کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"کیا ہوگیا اماں؟" شرجیل جلدی سے اٹھا اور سہارا دے کر انہیں صوفے پر بٹھایا۔

"ہائے ہائے! میرا پیر۔" انہوں نے پیر کی طرف اشارہ کیا۔

"طلحہ! ذرا آئی اوڈیکس تو لانا۔" سمیعہ نے آواز لگائی۔

"ہوا کیا ہے؟" شرجیل نے سوالیہ نظروں سے سمیعہ کی طرف دیکھا۔

"ہونا کیا تھا، ٹیکسی سے اترتے ہوئے پیر مڑ گیا، موچ آگئی شاید، کتنا منع کر رہی تھی میں "اماں! ہیل نہ پہنو۔ وہ بیچاری اتنا وزن برداشت نہیں کر سکے گی" لیکن نہیں مانی میری بات۔ اب دیکھ لیا کیا انجام ہوا۔ وہ تو شکر ہے، جاتے ہوئے ان کی سینڈل نے جواب نہیں دیا، ہاں واپسی پر اس بے چاری کی "ہمت" ٹوٹ گئی۔"

"ارے! بکو اس ہی کیے جائے گی یا کچھ لگائے گی بھی اس پر۔ اتنا درد ہو رہا ہے ہائے۔"

"یہ طلحہ معلوم نہیں کہاں رہ گیا ہے، میں لے کر آتی ہوں۔" وہ تیزی سے اندر چلی گئی تھی۔

شرجیل نے آئی اوڈیکس لگا کر ماں کے پیر میں پٹی باندھ دی تھی۔ اب وہ قدرے سکون سے بیٹھی ہوئی تھیں۔

"سمیعہ! ذرا ڈھنگ کی چائے تو پلا دے مجھے، توبہ توبہ! ایسی بدمزہ چائے تھی، حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ سموسے تھے تو وہ بھی ٹھنڈے اور مجھے تو بسکٹ بھی باسی لگ رہے تھے۔"

"اماں! خدا کو مانیں، سردی کا موسم ہے۔ ویسے ہی ہر چیز جلدی ٹھنڈی ہوجاتی ہے۔" سمیعہ نے چڑ کر کہا اور چائے بنانے چلی گئی۔

"میں نے سوچا تھا اس دفعہ تمہاری منگنی کر دیتی ہوں پھر اگلے برس آؤ گے تو شادی کا دیکھ لیں گے، لیکن لگتا ہے خدا کو کچھ اور ہی منظور ہے۔ اب تمہاری چھٹیاں ختم ہوجائیں گی۔ تم چلے جاؤ گے تو معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ بغیر دیکھے بھالے کون اپنی لڑکی کا رشتہ دیتا ہے۔" وہ شرجیل سے مخاطب تھیں۔

"بھائی! جھوٹ نہیں بولوں گی۔ پندرہ دن میں یہ تیسری کوشش تھی ہماری، جو ناکام ہوگئی۔" سمیعہ نے چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ایسے آرام سے یہ کام نہیں ہوتے۔ اللہ بخشے، تمہاری دادی کہتی تھیں کہ جوتیاں گھس جاتی ہیں تب کہیں جا کر لڑکی کا رشتہ ملتا ہے۔" حمیدہ خاتون نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"اماں! وہ پرانا محاورہ تھا اب تو ہیلیں ٹوٹ جاتی ہیں، تب بھی کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ اچھا یہ جھمکے تو اتار دیں اب، ایمان سے گھبراہٹ ہو رہی ہے ان کو دیکھ دیکھ کر۔ کتنا کہا تھا وہ چھوٹے والے ٹاپس پہن لیں۔ ہم کوئی ولیمہ میں نہیں جا رہے، لیکن ہماری اماں کسی کی بات سنیں تب نا۔"

"ارے! ایسے ہی پہن اوڑھ کر جاتے ہیں رشتہ لینے، تمہیں کیا خبر، اگلے بندے کو بھی پتا چلے کہ ہم کھاتے پیتے گھرانے سے ہیں۔" انہوں نے فخریہ انداز میں کہا۔

"اماں! میرے بس کی بات نہیں یہ۔ صاف بتا رہی ہوں۔ ویسے بھی مجھے اچھا نہیں لگتا، کسی کے گھر جاؤ، کھا پی کر لڑکی کو ریجیکٹ کرکے آجاؤ۔ مجھے تو شرمندگی سی ہوتی ہے۔"

"اچھا تو مجھے بھی نہیں لگتا لیکن اب اپنے جوڑ کا بھی ملے جب ہی تو بات بنے۔ گھربار ڈھنگ کا ہو، خاندان اچھا ہو اور لڑکی ایسی تو ہو جو میرے شرجیل کے ساتھ جچے۔ سلیقہ مند ہونا بھی بہت ضروری ہے تاکہ گھر گرہستی سنبھال سکے اور عادت اخلاق کی بھی اچھی ہونی چاہیے تاکہ رشتے نبھا سکے۔"

"بس! اتنی ساری خوبیاں ایک لڑکی میں تو ملنے سے رہیں۔ مجھے تو لگتا ہے بھائی کو چار شادیاں کرنا پڑیں گی آپ کو مطمئن کرنے کے لیے۔"

"توبہ کر سمیعہ! جو منہ میں آتا ہے، بکے چلی جاتی ہے۔ کبھی سوچ سمجھ کر بھی بول لیا کر۔" انہیں غصہ آگیا تھا۔

شرجیل ان کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔

"بھائی! مزے لے رہے ہیں بیٹھ کر، آپ سے یہ نہیں ہوتا خود ہی کوئی لڑکی پسند کرکے ہمیں بتا دیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

"پسند تو کی ہے ایک بھتنی۔" شرجیل کی آنکھوں میں کسی کا سراپا لہرایا تو وہ بے اختیار ہی مسکرا دیا۔

"بھتنی ہو یا چڑیل پیری۔ آپ ہمیں ایڈریس بتا دیں بس، گزارہ تو آپ کو ہی کرنا ہے اس کے ساتھ۔" اس نے شرجیل کی بات کو مذاق میں لیتے ہوئے کہا۔

"اپنے ارد گرد دیکھو تو کچھ نظر آئے نا۔ پچھلے ایک ہفتے سے یہی سمجھا رہا ہوں کہ تمہاری قریب کی نظر کمزور ہوگئی ہے، میرے ساتھ چل کر چشمہ بنوا لو لیکن تم سنتی ہی نہیں ہو۔"

"اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے بھائی؟" سمیعہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں کہاں ماری ماری پھر رہی ہو۔ اپنی خالہ جہاں آرا کا گھر نظر نہیں آتا تمہیں؟" شرجیل نے اس کے سر پر ایک چپت رسید کی۔

سمیعہ کے چہرے پر پہلے پریشانی، پھر حیرانی اور آخر میں خوشی کے تاثرات ابھرنا شروع ہوگئے۔

"بھائی! کیا آپ کی بات کا وہی مطلب ہے، جو میں سمجھ پائی ہوں؟"

"مجھے کیا معلوم تم کیا سمجھیں اور کیا نہیں، عقل سے پیدل!"

حمیدہ بیگم ان دونوں کو حیرت سے تک رہی تھیں ان کی مبہم باتیں ان کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔

"یا ہو! ارے میرا بھائی محمد علی۔" وہ خوشی سے بھائی سے لپٹ گئی تھی۔

"یہ بات پہلے میری عقل میں کیوں نہ آئی؟" وہ حیران تھی۔

"تم اپنی عقل جو گھاس چرنے کہیں چھوڑ آئی ہو۔" شرجیل نے اسی کے انداز میں جواب دیا اور ٹیبل پر سے بائیک کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

"اماں! مبارک ہو' مسئلہ ہی حل ہو گیا۔" اس نے حمیدہ بیگم کو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"ارے! کیا باؤلی ہو گئی ہے پرے ہٹ' میری ٹانگ میں جھٹکے لگ رہے ہیں۔" انہوں نے اسے پیچھے دھکیلا۔

"اماں! ایک بات تو بتائیں! آپ خالہ جہاں آرا کو کب سے جانتی ہیں؟"

"کوئی آج کا قصہ نہیں ہے' برسوں پرانا بہناپا ہے ہمارا۔"

"اور زیبا کیسی لگتی ہے آپ کو؟" اسے اپنی خوشی چھپانا محال ہو رہا تھا۔

"بہت پیاری بچی ہے۔ ہمیشہ بہت محبت سے ملتی ہے اور سچی بات ہے مجھے تو بڑی اپنی اپنی سی لگتی ہے۔"

"اماں! جب اس میں اتنی خوبیاں ہیں تو اسے اپنی بہو کیوں نہیں بنا لیتیں؟" بالآخر سمیعہ نے اپنا مدعا بیان کر ہی دیا۔

حمیدہ بیگم کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ چند لمحوں بعد ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اب وہ باقاعدہ ہنس رہی تھیں۔

"اے لو! اسے کہتے ہیں بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ کبھی میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں' ورنہ میں کاہے کو اتنی خوار ہوتی پھرتی۔" انہوں نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"اللہ اماں! کتنا مزا آئے گا۔ زیبا اور میری بھابھی۔ مجھے تو سوچ سوچ کر ہی کچھ ہو رہا ہے۔ چلیں! ابھی چلتے ہیں خالہ کے گھر۔" سمیعہ کی خوشی دیدنی تھی۔

"زیادہ اتاؤلی نہ ہو۔ یہ معاملات ایسے طے نہیں ہوتے۔ تمہارے ابا آئیں تو مشورہ کرتی ہوں ان سے پھر طریقے سے رشتہ لے کر جائیں گے۔ ہاں! یاد آیا' کچھ دن پہلے جہاں آرا ذکر کر رہی تھی کسی رشتے کا۔ کہہ رہی تھی لوگ معقول اور زیبا کو بھی پسند کر گئے تھے شاید۔۔۔"

"ہیں۔۔۔! اس نے تو مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ بہت میسنی ہے' مل جائے اچھی طرح پوچھوں گی۔" اسے تاؤ آنے لگا تھا۔

"واہ مولا! کیا شان ہے تیری' کیسے بندوں کے بگڑے کام بناتا ہے' کیسے مشکلوں کو آسان کرتا ہے۔ شکر ہے تیرا۔" حمیدہ خاتون وہیں صوفے پر پھیل کر لیٹ گئی تھیں۔ سر سے جانو کوئی بوجھ اتر گیا تھا۔

"اماں آرام سے لیٹ گئیں؟ آپ کو نہیں لگتا کہ ہمیں جلدی کرنی چاہیے؟ کہیں دیر نہ ہو جائے۔" سمیعہ کو تو بے چینی سی لگ گئی تھی۔ "پتا نہیں ابا کہاں رہ گئے' کب گھر آئیں گے۔"

اس نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ حمیدہ بیگم اس کی بے صبری پر مسکرا دی تھیں۔

☆ ☆ ☆

زیبا نے لحاف سے سر نکال کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ "اوہو! عصر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔" وہ لحاف پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سردیوں میں بستر چھوڑنا کتنا مشکل لگتا ہے لیکن نماز چھوڑ دو تو عجیب سی شرمندگی کا احساس طاری رہتا ہے دل پر۔" وہ سوچتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی۔

نماز پڑھ کر اس نے کچن میں قدم رکھا تو چائے کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ ایک اور مہک بھی اسے کچن کی فضا میں رچی ہوئی محسوس ہوئی۔

"اماں! بڑی خوشبو آ رہی ہے' کیا پکا ڈالا رات کے لیے۔" اس نے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"چکن بنایا ہے تمہاری پسند کا' شملہ مرچ ڈال کر' دہی سا کی ترکیب "زبیدہ آپا" بتا رہی تھیں پرسوں ٹی وی پہ۔"

"اچھا! چکن جل فریزی۔" اس نے پتیلی کا ڈھکن کھول کر لمبا سانس کھینچا۔

"ویسے اماں! یہ ہفتے میں دوسری بار چکن کیسے پکا لی آپ نے؟ ہفتے وار ٹائم ٹیبل میں تو آپ نے ایک ہی دن مقرر کیا ہوا ہے چکن کا' اسکول میں ڈرائنگ کے پیریڈ کی طرح۔"

"میری بچی کو پسند ہے اس لیے بنائی ہے۔" انہوں نے اسے پیار سے لپٹاتے ہوئے کہا۔ ان کا چہرہ نامعلوم خوشی سے چمک رہا تھا۔

"اماں! کیا بات ہے' آج بڑی خوش نظر آ رہی ہیں؟" اس نے جار میں سے اپنے لیے نمکو نکالتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! میں تو ہر حال میں خوش رہتی ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔"

"ہوں' مگر کوئی بات تو ہے' کچھ تو ہے جو ہماری اماں گلابی ہوئی جا رہی ہیں۔ اماں! آپ کو پتا ہے آپ کا چہرہ ایک کھلی کتاب کی طرح ہے جس پر پریشانی' ناراضی اور خوشی ہر تحریر با آسانی پڑھی جا سکتی ہے۔"

"چلو' چلو! زیادہ باتیں نہ بناؤ' چائے پی لو تو تھوڑے سے چاول چن دینا۔ سوچ رہی ہوں تمہارے ابا کے آنے سے پہلے مٹر پلاؤ دم دے لوں' پھر وقت ملے نہ ملے۔" انہوں نے کچن سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"بلے بھئی بلے! آج تو دعوت ہو رہی ہے ہماری۔" وہ بھی اپنا چائے کا کپ لے کر باہر نکل آئی۔

☆ ☆ ☆

جہاں آرا اور امتیاز صاحب میں کافی دیر سے مذاکرات جاری تھے۔ جہاں آرا کے چہرے سے خوشی ہویدا تھی اور تو اور امتیاز صاحب بھی مسکرا رہے تھے۔

زیبا کا سارا دھیان اسی طرف لگا ہوا تھا۔ یہ مناظر کھلے ہوئے دروازے سے صاف نظر آ رہے تھے لیکن فاصلہ ہونے کی وجہ سے وہ آوازیں سننے سے قاصر تھی۔

"ویسے تو ساری رام کہانیاں ٹی وی کے سرہانے بیٹھ کر ہی بیان کی جاتی تھیں کہ ڈراما دیکھنا محال ہو جاتا ہے اور آج نہ جانے کون سا خفیہ اجلاس ہے۔ جو بند کمرے میں نہیں' بلکہ کھلے دروازے کے ساتھ جاری ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے' یہ تو اندازہ ہو گیا لیکن ان مسکراہٹوں کے پیچھے راز کیا ہے آخر؟" وہ مارے تجسس کے مری جا رہی تھی۔

"مجیب! آج کوئی آیا تھا گھر میں؟" اس نے نونہال منہ سے لگائے مجیب کا شانہ ہلایا۔

"پتا نہیں! میرے سامنے تو کوئی نہیں آیا۔" وہ پھر کہانی میں گم ہو گیا تھا۔

"پھر اماں کہیں گئی تھیں کیا؟" زیبا نے دوبارہ اسے متوجہ کیا۔

"کیا مشکل ہے بجو! مجھے نہیں معلوم' ندیم سے پوچھ لو۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

زیبا نے ندیم کی طرف دیکھا جو اس کے موبائل پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف تھا۔

"ندیم! ادھر آؤ ذرا' اماں کے کمرے میں ایک چکر تو لگا کر آؤ۔ دیکھو لو وہ دونوں کس موضوع پر بات کر رہے ہیں۔" اس نے ندیم کے ہاتھ سے اپنا موبائل جھپٹ لیا تھا۔

"توبہ توبہ بجو! بہت بری بات ہے۔ اماں کہتی ہیں' اچھی بات نہیں ہوتی وہ لینا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" اس نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"کن سوئیاں۔" مجیب نے لقمہ دیا۔ کہانیاں پڑھ پڑھ کر اس کا ذخیرہ الفاظ خاصا وسیع ہو گیا تھا۔

"تو میں کب کہہ رہی ہوں' کن سوئیاں لینے کو' بس یوں جاؤ اور یوں آ جاؤ۔" زیبا نے شرمندہ ہو جانے کے باوجود ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

"ابا ڈانٹیں گے۔ پوچھیں گے کیا کام ہے۔" ندیم متردد تھا۔

"کہہ دینا! ایک ڈھونڈ رہا ہوں' کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں۔" زیبا نے راستہ سمجھایا۔

ندیم بے دلی سے اٹھا اور کمرے کا چکر لگا کر تیزی

سے باہر نکل آیا۔ دونوں نے اپنی باتوں میں اس پر دھیان نہیں دیا تھا شاید۔

"مہنگائی۔" ندیم نے واپس آکر لٹھ مارا اور زیبا کے ہاتھ سے موبائل لے کر دوبارہ گیم میں مصروف ہو گیا۔

"کیا مہنگائی؟" زیبا نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"موضوع ہی تو پوچھا تھا تم نے۔ مہنگائی پر بات ہو رہی تھی ابا کہہ رہے تھے۔ مہنگائی کا زمانہ ہے ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا ہو گا۔"

"اف! ان کے چہروں سے چھلکتی خوشی کا سرا مہنگائی کے ساتھ جا کر کیسے مل سکتا ہے؟" اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"اور بھی تو کچھ کہہ رہے ہوں گے اور کچھ نہیں سنا تم نے۔" وہ پھر ندیم سے مخاطب تھی۔ ندیم نے زچ ہو کر اس کی طرف دیکھا پھر اچانک اس کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔

"ہاں ایک جملہ اور بھی سنا تھا میں نے۔" اس نے موبائل آف کر کے زیبا کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

"تو پھوٹتے کیوں نہیں ہو منہ سے!" زیبا کا پارہ ہائی ہونے لگا تھا۔

"پھوٹنے کے بیس روپے ہوں گے۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"وہ۔ ایسا ہے کہ میرا چٹپٹے کرکرے کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"لیکن وہ تو دس روپے کا پیکٹ ہے۔" زیبا نے حیرانی سے کہا۔

"کیوں میرا بھائی نہیں کھائے گا کیا؟ کیوں پارٹنر!" اس نے مجیب سے تائید چاہی۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" وہ تو جیسے تیار بیٹھا تھا۔

"او میرے خدا! کتنے تیز ہو گئے ہو تم دونوں۔ سودے بازی کر رہے ہو بڑی بہن کے ساتھ کہاں سے سیکھی ہیں یہ حرکتیں؟"

"جس میڈم! اپنی بڑی بہن سے ہی سیکھی ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔" اس نے نہایت انکساری سے جواب دیا تھا جبکہ مسکراہٹ ہونٹوں کے گوشوں سے نکلنے کو بے تاب تھی۔

"دیکھ لوں گی تم کو بھی۔" اس نے پاس رکھے ہوئے کالج بیگ سے بیس روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے۔ ندیم نوٹ مٹھی میں دبا کر دروازے کی طرف لپکا۔

"ارے مسٹر! وہ بات تو بتاؤ۔" زیبا نے اسے جاتے جاتے پکارا۔

"ہاں۔ وہ ابا سے کہہ رہی تھیں کہ ساٹھ روپے کلو گاجریں دی ہیں سبزی والے نے اگر منڈی سے گاجریں آجائیں تو ندیم کے لیے حلوہ بنا دوں گی۔" اس نے بمشکل ہنسی کو ضبط کر کے جواب دیا۔ آج وہ بھی پرانے حساب بے باق کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"ٹھہر تیری تو!" اس نے کھینچ کر مارنے کے لیے ادھر ادھر کوئی چیز تلاش کی مگر سوائے موبائل اور ٹی وی ریموٹ کے کوئی چیز دستیاب نہ تھی۔ مجیب رسالہ منہ پر رکھے ہنس رہا تھا۔

"تم نے کیا کمی کمی لگا رکھی ہے شیطان کے چیلے! ادھر دو رسالہ اور ہوم ورک لے کر بیٹھو۔" اس نے اپنا غصہ مجیب پر اتارنا شروع کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن ہفتہ تھا۔ ندیم اور مجیب کی چھٹی تھی۔ زیبا نے بھی کالج سے چھٹی کر لی تھی۔ دیر سے اٹھ کر ٹھاٹھ سے ناشتہ کیا اور اب کسل مندی سے صحن بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی۔ جہاں آرا بھی سبزی لے کر اس کے پاس آبیٹھی تھیں۔

گھنٹی کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا تو مجیب کے دروازہ کھولنے پر باجی شمیم آرا ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ اٹھائے کھلکھلاتے ہوئے اندر داخل ہو رہی تھیں۔

"مبارک ہو اماں! مجھے تو خوشی کے مارے سار رات نیند نہیں آئی، دیکھ لیں! صبح ہی صبح نازل ہو گئی ہوں۔" وہ آکر اماں سے لپٹ گئی۔

"اب تم بھی پیا دیس سدھارنے کی تیاری لڑکی!" اس نے زیبا کو گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا

نقوں کی طرح ان دونوں کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"کل ہی حمیدہ کا فون آیا تھا۔ اس کی بات سن کر خوشی سے میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میں نے تو ما طرح کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ بڑا پیارا اور سعادت مند ہے شرجیل! اور گھرانہ تو دیکھا بھالا ہے ہی چھان کی ضرورت نہ کسی اور بات کی فکر۔ ماں باپ کو اس ۔علاوہ اور کیا چاہیے۔ تمہارے ابا کی بھی رضا ہے ت خوش ہیں وہ بھی۔" بالآخر اماں کا قفل ٹوٹ گیا لہ ساری کہانی اب زیبا کی سمجھ میں آنا شروع ہو گئی

"حمیدہ کہہ رہی تھی، کل وہ ظہور بھائی اور اپنے جیٹھ ںی کے ساتھ باقاعدہ رشتہ لے کر آئے گی اور اس بڑے مان سے کہا ہے کہ وہ انکار نہیں سنے ۔" جہاں آرا بیٹی کو تفصیل سے آگاہ کر رہی تھیں۔

"میں نے کہا شرجیل کو بھی لے آنا گھر کا بچہ ہے، ا تو دیکھا بھالا ہے لیکن رضا بھی مل لے گا تو اچھا ے گا۔"

"ہاں اماں! میں اور رضا کل صبح ہی آجائیں گے، سنبھال لیں گے، آپ فکر نہ کریں۔ آج بچوں کو ز کر دوڑی دوڑی آگئی ہوں۔ بس سن کر رہا ہی نہیں اور پھر مجھے آپ کو ایک خوشخبری بھی سنانی" اس نے اماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"اماں! اللہ کے کرم اور آپ کی دعا سے وہ زمین کا بھی حل ہو گیا ہے۔ کیس کا فیصلہ ہمارے حق میں ا ہے اور اس دوسری پارٹی کے خلاف قانونی ائی بھی شروع ہو گئی ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے تو نے ہماری مشکلوں کو آسان کیا ہم پر اپنی رحمت کے دروازے کھول ۔" جہاں آرا کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"ی ہمیں بھی بتائے گا کہ کیا ہونے جا رہا ہے اس ا؟" مجیب نے بڑے بوڑھوں کے انداز میں ہا۔

"ارے بقراط کے نانا! اپنی زیبا کا رشتہ طے ہو رہا ہے ..ہ کے بیٹے شرجیل کے ساتھ۔ اور تمہارے

رضا بھائی کا بھی ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے خدا کے فضل سے۔" شمیم آرا نے خوشی سے بتایا۔
"تو اس موقعے پر مٹھائی کھانا تو بنتا ہے نا ہمارا؟" ندیم کی نظریں مسلسل مٹھائی کے ڈبے پر ہی تھیں۔
"اوہ! میں تو بھول ہی گئی اسی لیے تو لائی تھی۔" شمیم آرا نے مٹھائی کا ڈبہ کھول کر سب سے پہلے اماں کا منہ میٹھا کرایا پھر پورا گلاب جامن زیبا کے منہ میں ٹھونس دیا۔ ندیم اور مجیب نے خود ہی ڈبے پر حملہ کر دیا تھا۔
اماں کی خوشی اور مسکراہٹ کا راز فاش ہو چکا تھا۔ زیبا نے اپنے اردگرد ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھا اور وہ مسکراتی شرارت سے بھرپور آنکھیں اس کے تصور میں ابھریں تو اس کا دل بھی ایک خوش گوار احساس سے معمور ہونے لگا۔
موبائل فون کی مسلسل بجتی ہوئی بیل پر زیبا نے فون کان سے لگایا تو دوسری طرف سمیعہ تھی۔ خوشی سے چیختی چلاتی اور حسب معمول اسے بے بھاؤ کی سناتی وہ نہ جانے اس سے کیا کچھ کہہ رہی تھی لیکن جب آخر میں اس نے کہا کہ کل بھائی بھی ہمارے ساتھ آرہے ہیں اور انہوں نے ایک میسج تم تک پہنچانے کو کہا ہے تو زیبا کی تمام حسیات جاگ گئیں۔
"وہ کہہ رہے تھے آنکھیں بچھانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن "دسترخوان" بچھانے کی نہیں ہو رہی ہے۔ بھلا اس کا کیا مطلب ہوا؟ اس میں تو رومانس کا کوئی پہلو ہی نہیں نکلتا۔" وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔
"شٹ اپ!" زیبا نے فون بند کر دیا تھا لیکن اس خاص منظر کو یاد کرکے اس کے چہرے کی مسکراہٹ کا رنگ اور تیز ہو گیا تھا۔
"ویسے ایک بات ہے بجو! یہ کسی ڈرامے کی آخری قسط نہیں لگ رہی جس کے آخر میں ایک دم ہی سب کچھ اچھا ہو جاتا ہے؟" مجیب نے قلاقند پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔
"تو پھر ہو جائے اسی بات پر ایک تصویر۔" ندیم نے مجیب کو اماں اور دونوں بہنوں کے پاس کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔
"اسمائل۔" اس نے نعرہ لگایا اور فرضی کیمرے کی مدد سے اس منظر کی تصویر کھینچ لی۔
اس لمحے کو کسی کیمرے کی آنکھ نے تو قید نہیں کیا لیکن یہ لمحہ یہ منظر ایک خوب صورت "یاد" بن کر اس گھر کے مکینوں کے ذہنوں میں محفوظ ضرور ہو گیا تھا۔
زیبا نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ سب کے خوشی سے چمکتے دمکتے چہرے دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کافی دن کے سرد اور ابر آلود موسم کے بعد سورج نے اچانک ہی بادلوں سے سر نکال کر جھانکا ہو اور اس کی "سنہری دھوپ" نے ان سب کے وجود کو ایک حرارت بخش اور مسرت آگیں احساس سے دوچار کر دیا ہو۔

☼ ☼ ☼
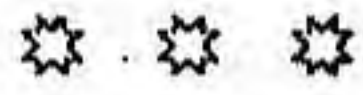
تو جناب! یہ تھی میری یعنی زیبا اور اس کے گھر کی کہانی۔ اس کہانی میں میرا کردار بس یہیں تک تھا، امید ہے آپ کو پسند آیا ہوگا۔ "پرومو" سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میرے "کردار" اور "پرفارمنس" سے متاثر ہو کر مجھے اگلی سیریل کے لیے کاسٹ کر لیا گیا ہے۔ اس میں میرا کردار ایک "بیوی" اور "بہو" کا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں اس نئے کردار میں بھی آپ کی توقعات پر پورا اتروں گی اور پھر آپ کی دعا میں بھی تو میرے شامل حال ہوں گی۔ ہیں ناں؟
یہاں تک میرا ساتھ دینے، میری کہانی پڑھنے اور اپنا قیمتی فارغ وقت میرے نام کرنے کا شکریہ۔

نمرہ احمد

مکمل ناول

جنت کے پتے

سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں' حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کو یورپی یونین نے اسکالرشپ کے لیے منتخب کیا۔ اب وہ پانچ ماہ کے لیے ترکی جارہی ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سبین پھپھو کے آٹھ سالہ بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہوچکا ہے۔ سبین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ مہینے میں ایک آدھ بار فون پر رابطہ کرلیتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں' مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

تایا فرقان کے بیٹے داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر ڈال دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے۔ وہاں میجر احمد سے میٹنگ ہوتی ہے۔ وہ حیا کے بارے میں ہربات جانتا ہے۔ حیا کے شکایت کرنے پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔

تایا فرقان اپنی بیٹی ارم کو سر پر دوپٹہ اوڑھنے کی سختی سے تاکید کرتے ہیں' جبکہ سلیمان صاحب قدرے آزاد خیال ہیں۔ سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ داور کی شادی والے دن حیا سے بے ہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی اس کی عزت بچاتا ہے۔ یہ خواجہ سرا حیا کو اکثر اہم مواقع پر نظر آتا رہتا ہے۔

حیا کے ساتھ اس کی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے ترکی جارہی ہے۔ وہ دونوں بہت جدوجہد کرکے پاسپورٹ اور ویزا بنواتی ہیں۔ دونوں کی دوستی ہوجاتی ہے۔

دوسری قسط
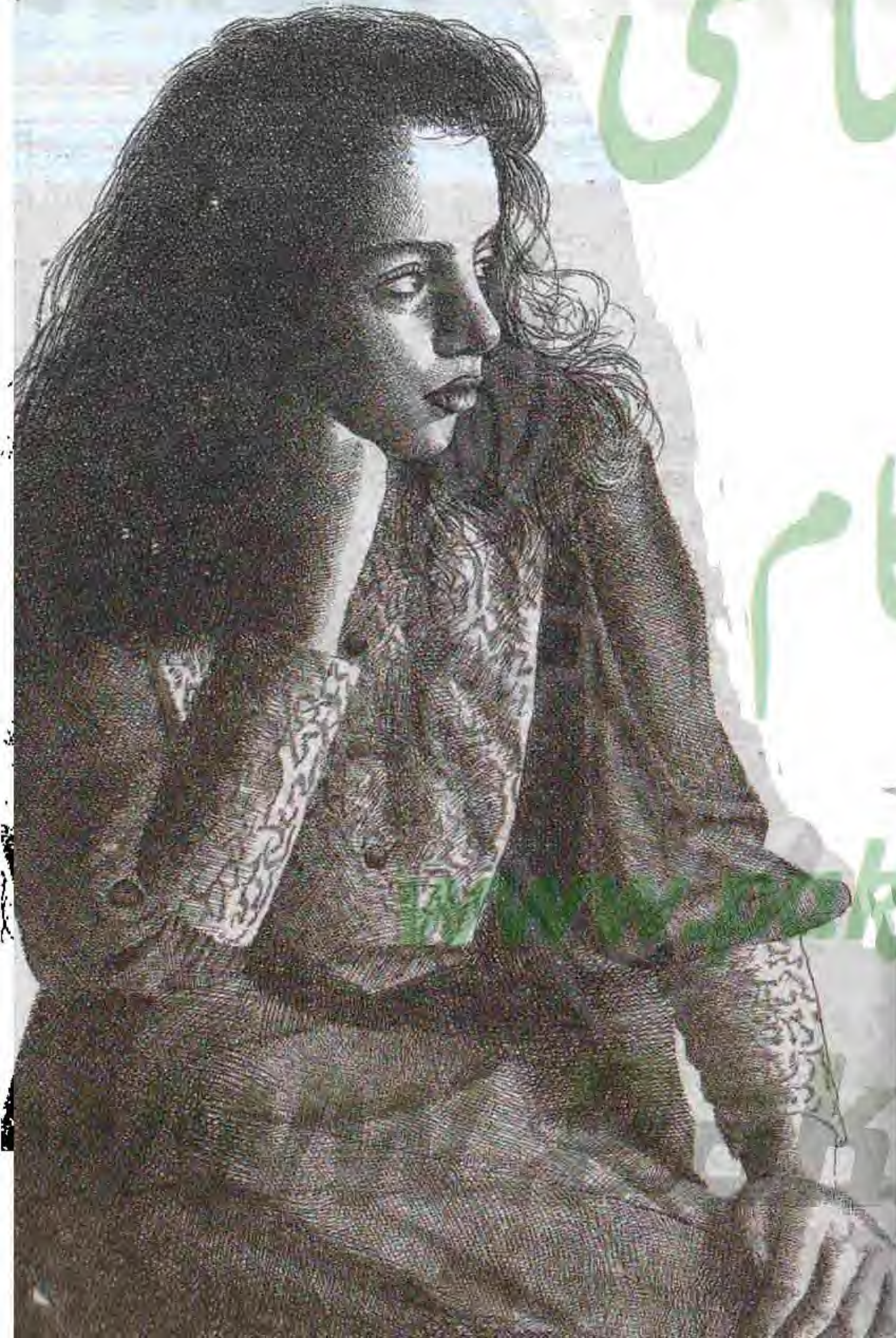
"حیا! آپ نے اسے خواجہ سرا بنے دیکھا تھا نا؟ تو ہو سکتا ہے وہ بس صرف ایڈونچر کے لیے خواجہ سرا بنا ہو۔"

"چلو گھر چلتے ہیں۔" وہ بے دلی سے ڈی جے سے مخاطب ہوئی۔ ایک دم ہی اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اٹھائیس جنوری کو اسے اتحاد ایرلائنز کا ٹکٹ ای میل کر دیا گیا جس کا اس کو پرنٹ آؤٹ نکلوانا تھا' پھر اسی ٹکٹ پر اسے پانچ فروری کی صبح استنبول کے لیے روانہ ہونا تھا۔

شام میں وہ ارم سے اس کا لیپ ٹاپ مانگنے تایا فرقان کے گھر آئی تھی۔ اس کا نیٹ کام نہیں کر رہا تھا' اور ابا ابھی آفس سے نہیں آئے تھے ورنہ ان کا استعمال کر لیتی۔ خدیجہ کا پیغام آیا تھا کہ سبانجی یونیورسٹی نے ہاسٹل کا الیکٹرک فارم پر کرنے کے لیے بھیجا ہے' سو وہ میل چیک کر لے۔

تایا فرقان لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر مسکرائے۔

"آگئی تایا کی یاد؟" انہوں نے صفحہ پلٹتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

"جی!" وہ بظاہر مسکراتے ہوئے ان کے پاس چلی آئی۔ ورنہ اس روز کی صائمہ تائی کی باتیں ابھی تک نشتر کی طرح چبھتی تھیں۔

"فلائٹ کب ہے؟" وہ اخبار پہ نگاہیں مرکوز کیے پوچھ رہے تھے۔

"پانچ فروری کو۔"

"ہوں' اپنا خیال رکھنا۔ ویسے بیٹیوں کو تنہا اتنا دور بھیجنا نہیں چاہیے۔ سلیمان کا حوصلہ ہے بھئی! خیر تم ترکی میں اپنے لباس اور اقدار کا خیال رکھنا' سر سے دوپٹہ نہ اتارنا' جیسے ارم نہیں اتارتی۔" آخری فقرہ کہتے ہوئے ان کے لہجے میں فخر در آیا تھا۔ حیا کے حلق تک کڑواہٹ گھل گئی۔

"جی بہتر! میں ذرا ارم سے مل لوں۔" وہ جان چھڑا کر اندر آگئی۔

کاش کہ وہ تایا فرقان کو بتا سکتی کہ مغربی لباس جو وہ یہاں ان کی وجہ سے نہیں پہنتی' وہاں ضرور پہنے گی۔ اس نے بہت سے ٹاپس اور جینز خرید کر اپنے سامان میں رکھ لیے تھے' اور رہی سر ڈھکنے کی بات تو وہ خیر سے سبانجی میں سختی سے "حرام" تھا۔ شکر!

ارم کمرے میں نہیں تھی۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا اور اندر سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ بے دلی سے اس کے بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ ارم شاور لینے میں بہت دیر لگاتی تھی' سو مجبوراً اسے انتظار کرنا تھا۔

دفعتاً سیل فون کی گھنٹی بجی۔ حیا چونکی۔

ارم کا سیل فون اس کے ساتھ ہی تکیے پہ رکھا تھا۔ اس نے گردن جھکا کر دیکھا۔ سیل فون کی روشن اسکرین پہ "ایک نیا پیغام" جگمگا رہا تھا۔ ساتھ ہی بھیجنے والے کا نام لکھا آ رہا تھا۔ "حیا سلیمان"

وہ بے یقینی سے فون کی اسکرین کو دیکھے گئی۔ کیا کسی نے ارم کو اس کے نمبر سے پیغام بھیجا تھا یا ارم نے کسی کا نمبر اس کے نام کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا؟

حیا نے محتاط نگاہوں سے باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھا' اور پھر فون پہ ایک دو بٹن دبائے۔ پیغام لمحے بھر بعد ہی کھل گیا۔

"میں کال کر لوں؟ صبح سے بات نہیں ہوئی' اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ یہ دل اتنا مضبوط نہیں ہے جان! ریلائی!"

اس نے جلدی سے پیغام مٹایا اور سیل فون واپس تکیے پہ رکھا۔ ایک لمحے میں اسے سب سمجھ میں آگیا تھا۔

ارم۔۔۔ تایا فرقان کی اسکارف والی' سر ڈھکنے والی بیٹی۔ ایک عدد بوائے فرینڈ کی مالک تھی جسے لوگوں سے چھپانے کے لیے اس نے "حیا" کا نام دے رکھا تھا۔ تب ہی وہ اس رشتے پہ خوش نہیں تھی' حیا کو یاد آیا۔

وہ مزید بیٹھے بنا وہاں سے نکل آئی۔ لیپ ٹاپ اس نے تایا فرقان سے مانگ لیا' مگر جاتے جاتے ایک طنز و استہزا بھری مسکراہٹ کے ساتھ ان کو ضرور دیکھا تھا۔ کاش! وہ ارم کے حجاب کا پول کھول سکتی تو تایا کی شکل دیکھنے والی ہوتی۔ حجاب اوڑھنا یا نقاب کرنا کردار کی پختگی کی علامت نہیں ہوتی' اس نے بے اختیار سوچا تھا۔

سبانجی نے اسے اس کے ہاسٹل کے متعلق ترجیحات جاننے کے لیے ایک سوال نامہ بھیجا تھا۔ لیپ ٹاپ گود میں رکھے' وہ بیڈ پہ نیم دراز دلچسپی سے سوالات پڑھتی' صرف اپنا موڈ بہتر کرنے کے لیے مضحکہ خیز جواب بھیجنے لگی۔

"کیا آپ اپنی کسی ہم وطن ایکسچینج اسٹوڈنٹ کے ساتھ کمرا شیئر کرنا چاہیں گی؟"

"بالکل بھی نہیں!" اس کی انگلیاں تیزی سے لیپ ٹاپ کی کنجیوں پہ حرکت کر رہی تھیں۔

"کیا آپ اسموکنگ کرتی ہیں؟"

"بالکل کرتی ہوں۔"

"ڈرنک کرتی ہیں؟"

"وہ بھی کرتی ہوں۔"

"آپ کس قسم کی طبیعت کی مالک ہیں؟"

"سخت' جھگڑالو اور خونخوار۔"

وہ مسکراہٹ دبائے جواب لکھ رہی تھی۔ جب صفحہ ختم ہوا تو اس نے "نیکسٹ" کو دبایا۔ سوچ رہی تھی کہ اگلے صفحے کے جوابات دے کر اس فارم کو منسوخ کر دے گی۔ اس فارم کو جمع کرانے کا اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا' مگر جب نیکسٹ دبانے پہ اگلے صفحے کے بجائے

"فارم فل کرنے کا شکریہ۔ ہم آپ کا ڈورم الاٹ کرتے وقت آپ کی دی گئی ترجیحات کا خیال رکھیں گے۔"

لکھا آیا تو اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"لعنت ہو تم سب پر!" وہ جھنجلا کر اٹھی اور لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا' فارم سبانجی کو جا چکا تھا اور اس کا پہلا ہی تاثر کتنا برا ہو گا' وہ جانتی تھی۔

اس کی پیکنگ ابھی نامکمل تھی۔ اس نے ایک نگاہ کھلے سوٹ کیسز اور بکھری اشیا پہ ڈالی' پھر کچھ سوچ کر باہر آئی۔

لاؤنج خالی تھا۔ حیا نے ٹیلی فون اسٹینڈ پہ رکھی ڈائریکٹری اٹھائی اور صفحے پلٹنے لگی۔ "ایس" کے صفحے پہ چار سطور میں سبین پھپھو کے گھر کا پتا اور فون نمبر لکھا تھا۔ اس نے وہ صفحہ پھاڑا اور تہہ کر کے مٹھی میں دبا لیا۔

ایک دفعہ جہان سکندر اسے مل جائے' پھر وہ ان بیتے ماہ و سال کا حساب ضرور لے گی۔ بیڈ پہ آکر بیٹھی اور اپنے سامنے کھلے پڑے میل باکس کو دیکھا۔ وہاں اب ایک نئی ای میل کا نشان جگمگا رہا تھا۔

"نیشنل رسپانس سینٹر فار سائبر کرائم۔"

اس نے قدرے الجھ کر اس میل کو دیکھا اور کھولا۔ بھلا اب سائبر کرائم سیل والے اس سے کیوں رابطہ کر رہے تھے؟

صفحہ کھل گیا اور وہ جیسے جیسے پڑھتی گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔

یہ ای میل سائبر کرائم سیل سے اس کی اس میل کے جواب میں آئی تھی جو چند روز قبل اس نے بطور شکایت بھیجی تھی اور جس میں اس نے ویڈیو کا ذکر کیا تھا۔ اب اس کے جواب میں ہیلپ ڈیسک آفیسر نے اس کو ایک باقاعدہ کمپلینٹ فارم بھیجا تھا' جس کو بھرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنا فون نمبر' گھر کا پتا' شناختی کارڈ نمبر وغیرہ لکھ کر بھیجنے تھے۔ یہ فارم ایف آئی آر کے مترادف تھا' سو تمام تفصیلات ضروری تھیں۔

وہ یک ٹک اس فارم کو دیکھے گئی۔ اگر سائبر کرائم سیل نے اسے جواب اب دیا تھا تو وہ پرائیویٹ نمبر سے آنے والی کال' وہ میجر احمد کا آفس' وہ سب کیا تھا؟ کیا اسے بے وقوف بنایا گیا تھا؟ کیا واقعی وہ اصلی میجر تھا یا۔۔۔؟ مگر پھر اس کے پاس اس ویڈیو کو مکمل طور پر انٹرنیٹ سے ہٹوانے کی طاقت اور اثر و رسوخ کیسے

آیا؟

وہ الجھتے ذہن کے ساتھ جلدی جلدی جواب ٹائپ کرنے لگی۔ اسے سائبر کرائم سیل کو مختصر الفاظ میں یہ یقین دہانی کروانی تھی کہ وہ ڈیوا ب ہٹ چکی ہے اور وہ اپنی شکایت واپس لے رہی ہے۔ اسے اب فوری طور پہ ان خفیہ والوں سے پیچھا چھڑانا تھا۔

میل لکھ کر اس نے "سینڈ" کو دبایا اور پر سوچ نگاہوں سے اسکرین دیکھے گئی۔

میجر احمد کا تعلق سائبر کرائم سیل سے نہیں تھا' اس بات کا اس کو یقین ہو چلا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایئر پورٹ پہ ڈی جے بری طرح رو رہی تھی۔ اس کے والدین اس کے ساتھ کھڑے اسے تسلی دے رہے تھے۔ حیا کچھ دیر تو اسے چپ کروانے کی کوشش کرتی رہی' پھر عاجز سی ہو کر قدرے فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی اور جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑے سکون سے ڈی جے کو روتے دیکھتی رہی۔

اس نے شلوار قمیص پہ سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی اور دوپٹہ مفلر کی طرح گردن سے لپٹا تھا۔ بس آج آخری روز تھا۔ پھر ترکی میں وہ اپنی مرضی کا لباس پہنے گی اور اپنی مرضی سے اکیلی ہر جگہ گھومے گی' بنا روک ٹوک' بنا تایا فرقان یا ابا کی ڈانٹ کے خوف کے۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور ان کی فلائٹ اگلی صبح (پانچ فروری کی صبح) چار بجے کی تھی۔

"کتنا روتی ہے یہ۔ تم خیال رکھنا اس کا!"

سلیمان صاحب کو ڈی جے کے مسلسل رونے پہ کوفت ہونے لگی تھی۔ جب تک وہ واپس ہوئے' ڈی جے روئے جا رہی تھی۔ اس کے آنسو تب جا کر تھمے جب اتحاد ایر لائنز کی وہ پاکستانی نژاد آفیسران کے پاس آئی اور بہت شائستگی سے ان کو مخاطب کیا۔

"میڈم! آپ لوگ پلیز اپنے ڈاکومنٹس اور لیپ ٹاپس سوٹ کیس سے نکال کر ہینڈ کیری میں رکھ لیں۔ تاکہ اگر آپ کا سامان گم بھی ہو جائے تو کم از کم ڈاکومنٹس محفوظ رہیں۔"

"ایویں ہی سامان گم ہو جائے؟" ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کر کے ڈی جے نے غصے سے کہا۔ وہ سارا رونا بھول گئی تھی۔ "ہم نے ہینڈ کیری میں اتنا بوجھ نہیں اٹھانا۔"

"میم! یہی بہتر ہے' کیونکہ بعض اوقات سامان گم بھی ہو جایا کرتے ہیں' کہیں یہ نہ ہو کہ بعد ازاں آپ کسی مسئلے سے دوچار ہوں۔"

وہ اس ترک ایر لائن میں کام کرنے والی ایک پاکستانی لڑکی تھی اور ان کے پہلی دفعہ بین الاقوامی فلائٹ لینے کے پیش نظر کہہ رہی تھی اور حیا مان بھی جاتی' مگر ڈی جے اڑ گئی۔

"ہرگز نہیں' ہم نے اتنا بھاری ہینڈ کیری نہیں اٹھانا۔"

"پلین میں آپ کو نہیں اٹھانا پڑے گا۔" آفیسر کی شائستگی برہمی میں بدلنے لگی۔

"پلین میں جانے تک تو اٹھانا ہی پڑے گا۔"

"پھر تو ترکی میں آپ پر اللہ ہی رحم کرے!" وہ پیر پٹختی چلی گئی تو ڈی جے نے اپنی متورم آنکھوں اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ حیا کو دیکھا اور انگلی سے عینک پیچھے کی۔

"انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی' جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے!"

حیا بے اختیار ہنس دی۔ اسے ڈی جے اچھی لگی تھی۔

فلائٹ میں ان دونوں کو نشستیں ایک ہی قطار میں ملیں۔ درمیانی راستے کے دائیں طرف جڑی تین نشستوں میں سے کھڑکی کے ساتھ والی حیا کو ملی اور راستے والی نشست ڈی جے کو' درمیانی نشست خالی تھی۔

"کیا ہی مزا آجائے حیا! اگر اس سیٹ پہ کوئی ہینڈسم اور چارمنگ سا لڑکا آ کر..." ڈی جے کے الفاظ ادھورے رہ گئے۔

ایک بھاری بھرکم سے پاکستانی صاحب جو اپنے

ٹوپیس میں بے حد پھنسے پھنسے سے لگ رہے تھے' اطمینان سے چلتے ہوئے آئے اور دھپ سے ان دونوں کے درمیان بیٹھ گئے۔

حیا ذرا غیر آرام دہ محسوس کر کے مزید کھڑکی کی طرف کھسک گئی اور خدیجہ مخالف سمت۔

"مجھے عثمان شبیر کہتے ہیں' شیخ عثمان شبیر۔" اپنی بھاری آواز میں وہ خوش دلی سے گویا ہوئے۔

"نائس!" حیا بظاہر اپنے چھوٹے سے گولڈن کلچ کو کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ یہ وہی کلچ تھا جو دادر بھائی کی مہندی پہ اس نے گولڈن لہنگے کے ساتھ لیا تھا۔

"گڈ!" ڈی جے نے میگزین اٹھا کر چہرے کے سامنے پھیلا لیا۔

"میں ترکی سے آیا ہوں' دراصل وہیں رہائش پذیر ہوں' میری بیوی اور بیٹا بھی وہیں رہتے ہیں۔"

حیا مزید اپنے پرس پہ جھک گئی اور ڈی جے نے میگزین چہرے کے اتنا قریب کر لیا کہ اس کی ناک صفحات کو چھونے لگی۔

"مگر وہ میرا بیٹا نہیں ہے' جانتی ہو وہ کس کا بیٹا ہے؟"

مزید نظر انداز کرنا بے کار تھا۔ حیا نے رخ عثمان شبیر کی جانب موڑا اور ڈی جے نے بیزاری سے میگزین نیچے کر لیا۔

"آپ بتائیں' کس کا بیٹا ہے وہ؟"

عثمان شبیر کو شاید صدیوں سے کسی سامع کی تلاش تھی۔ وہ اپنی داستان حیات فوراً ہی شروع کر بیٹھے۔ ڈی جے مسلسل جمائیاں روک رہی تھی اور حیا شدید متلی محسوس کر رہی تھی۔ وہ پچھلی صبح کی جاگی ہوئی تھی اور اب اس صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اوپر سے جہاز کا سفر' اس نے ڈی جے کے سامنے ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ پہلی بار جہاز میں بیٹھ رہی ہے' آخر ڈی جے کیا سوچتی کہ کیسی لڑکی ہے' کبھی ہوائی کا سفر ہی نہیں کیا۔ اب کیا بتاتی کہ کبھی کوئی ایسی صورت ہی نہیں بن لی۔

اس سب پہ مستزاد ان صاحب کی الم ناک داستان' جو مختصراً کچھ ایسے تھی کہ وہ اور ان کی بیگم عرصہ تیس برس سے ترکی میں رہائش پذیر تھے۔ چونکہ اولاد نہیں تھی اس لیے انہوں نے عثمان صاحب کے ایک کزن کا بیٹا گود لے لیا تھا۔ وہ بیٹا بے جا لاڈ پیار سے خاصا بگڑ چکا تھا' سو اس صورت حال کو سنوارنے کے لیے انہوں نے اپنی بھانجی سے اس کا رشتہ طے کر دیا تھا' جس پہ آٹھویں فیل بھانجی صاحبہ بہت خوش اور بیٹا بہت ناراض تھا اور اس سے پیشتر کہ وہ اپنی پاکستان آمد کی وجہ بیان کرتے' مینو کارڈز آ گئے۔

وہ دونوں پھر سے تازہ دم ہو گئیں۔ مینو پہ کچھ نام جانے پہچانے اور کچھ اردو سے ملتے جلتے تھے۔

"جیرو آلو ود سبز کٹلٹس' پنیر جل فریزی' سادہ پراٹھا' تیکھی بریانی' Sayadiat Samak وغیرہ۔"

حیا نے ڈی جے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ درمیان موجود بھاری بھرکم دیوار کے باعث وہ آگے ہو کر بیٹھی۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا منگوائیں۔"

"ٹرکش فوڈ بہت زبردست ہوتا ہے اور ترک کھانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں' میں بتاتا ہوں کہ کیا منگواؤ۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر متذبذب سی حیا نے ہتھیار ڈال دیے۔

"بہت بہتر' بتائیے۔" وہ گہری سانس لے کر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

"پہلے تو Sayadiat Samak منگواتے ہیں۔ یہ روایتی ترک چاول ہیں' سفید مچھلی' فرائیڈ پیاز اور کاجو کے ساتھ۔"

"چاولوں میں کاجو؟" حیا کو سوچ کر ہی متلی ہونے لگی۔

"مشروم اینڈ چیز آملیٹ' جیرو آلو..." وہ بہت اعتماد سے لکھواتے گئے۔ مگر جب کھانا آیا تو حیا کا دل خراب ہونے لگا۔ کھانے کی خوشبو سونگھ کر ہی اس کا جی متلانے لگا تھا۔

عثمان شبیر بڑے بڑے لقمے لیتے مزے سے کھا رہے تھے۔ ڈی جے بمشکل ایک چمچہ لے کر ہی دوہری ہوئی۔ حیا بھی بدمزا ہوگئی تھی۔ اتنا بدمزا کھانا اس نے آج تک نہیں کھایا تھا۔

بمشکل چکھ کر انہوں نے برتن پرے کردیے۔ عثمان شبیر ابھی تک پوری دل جمعی سے کھا رہے تھے۔ عجیب سی خوشبوئیں اس کے نتھنوں میں گھس رہی تھیں۔ اگر یہی ترک فوڈ تھا تو اسے لگا' ترکی میں پانچ ماہ وہ بھوکی رہے گی۔

ایسا ہی تو اس کا ڈائیوو بس میں بھی نہیں متلاتا تھا' جیسے ادھر ہو رہا تھا۔ وہ منہ پہ دوپٹا رکھ کر سو گئی۔

☼ ☼ ☼

اسلام آباد سے پورے ڈھائی گھنٹے بعد انہیں ابوظہبی ایرپورٹ پہ اترنا تھا۔ وہاں کچھ دیر کا قیام تھا اور پھر۔ استنبول!

ابوظہبی اترنے سے قبل کھڑکی کے پار زمین کا گولائی میں کشادہ دکھائی دینے لگا تھا۔ زمین کا وہ کرہ اتنا حسین تھا کہ اس کی ساری بیزاری اور نیند بھاگ گئی۔ وہ محو سی یک ٹک وہ منظر دیکھے گئی۔

ابوظہبی ایرپورٹ پہ انہوں نے ٹرمنل تھری پہ لینڈ کیا تھا۔ استنبول کی فلائٹ انہوں نے ٹرمنل ون سے پکڑنی۔ مگر پہلے.... گھر فون کیا!

وہ دونوں آگے پیچھے تیز تیز چلتے ہوئے کالنگ کارڈ خریدنے گئیں۔ پانچ یوروز کا اتصلات کا کارڈ خریدا اور فون بوتھ کی طرف بھاگیں۔

قطار میں فون بوتھ لگے تھے۔ حیا نے ایک ایک کرکے پہلے تینوں پہ کارڈ لگانے کی کوشش کی' مگر کارڈ تھا کہ ڈلنے کا نام ہی نہ لے۔ اسے ایرپورٹ پہ فون بوتھ استعمال کرنے کا پہلا تجربہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

"حیا اس بندے کو دیکھو جیسے یہ ڈال رہا ہے' ویسے ہی ڈالو۔" ڈی جے نے اسے کہنی ماری تو حیا نے پلٹ کر دیکھا۔

چوتھے بوتھ پہ ایک شخص ان کی طرف پشت کیے' اپنا کارڈ ڈال رہا تھا۔ حیا کو دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کون سا طریقہ استعمال کر رہا ہے۔ سو وہ ڈی جے کا ہاتھ تھامے اس کے سر پہ جا پہنچی۔

وہ ریسیور کان سے لگائے نمبر ملا رہا تھا۔

"پلیز! ہمیں یہ کارڈ ڈال دیں۔ میں اسے ڈال نہیں پا رہی۔" حیا نے کارڈ اس کی طرف بڑھایا' وہ چونک کر پلٹا۔

وہ سیاہ رنگت' گھنگریالے بالوں اور اونچے قد کا نسلاً" حبشی تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کارڈ لیتے ہوئے ان دونوں لڑکیوں پہ نگاہ ڈالی۔ ایک سیاہ لمبے بالوں اور بڑی آنکھوں والی خوب صورت سی لڑکی جو جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔ دوسری بڑے چشمے اور ڈھیلی پونی والی لڑکی جس نے سوئیٹر تہ کرکے بازو پہ ڈال رکھا تھا۔ دونوں منتظر سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اچھا میں ذرا بات کرلوں' پھر۔!" اسے شاید کان سے لگے ریسیور میں آواز آئی تھی' تب ہی رخ موڑ گیا۔

وہ دونوں اسی طرح کھڑی اسے دیکھتی رہیں۔ ان سے وہ انگریزی میں مخاطب ہوا تھا' مگر اب فون پہ عربی میں بات کر رہا تھا۔ ڈی جے تو بور ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی' مگر شریعہ اینڈ لاء کے پانچ برسوں نے حیا کو عربی اچھی طرح سے سکھا دی تھی۔ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں اپنے ایل ایل بی کے پہلے برس ان کو عربی ہی سکھائی جاتی تھی' اور ان کی کلاسز میں الجیرین اور مصری اساتذہ انہیں عربی میں ہی لیکچرز دیا کرتے تھے۔

"میں استنبول آرہا ہوں۔" وہ اب رخ پھیرے قدرے پریشانی سے کہہ رہا تھا۔ "ہاں شام تک گھر پہنچ جاؤں گا۔ تم نے حارث کو ڈاکٹر کو دکھایا؟ اچھا؟ کیا کہتا ہے ڈاکٹر؟

کروں گا پیسوں کا انتظام' کہا جو ہے' بار بار ایک ہی بات مت دہرایا کرو' جاہل عورت!" طیش سے اس کی دبی دبی سی آواز بلند ہوئی۔ "ہاں' میری پاشا سے بات ہوگئی تھی' اسی کے کام کے لیے خوار ہو رہا ہوں' مگر پاشا زیادہ رقم نہیں دے گا۔ ایک جگہ اور بھی بات کی ہے۔"

اس نے رک کر کچھ سنا اور پھر مزید جھنجلاہٹ سے بولا۔

"اچھا فون رکھ رہا ہوں' مرحبا!" اس نے کھٹاک سے فون رکھا اور ان کی طرف پلٹا۔

"سوری گرلز!" بمشکل چہرے پہ بشاشت لاتے ہوئے وہ اب ان کا کارڈ لگانے لگا۔ پہلی ہی کوشش کامیاب ہوگئی۔ وہ شاید کارڈ کو الٹا پکڑ رہی تھی۔

"لیجیے!" سیاہ فام نے ریسیور اس کی طرف بڑھایا۔ پھر ان سے ہٹ کر دور چلا گیا۔

"بس ایک ایک منٹ کی کال کریں گے۔" حیا نے ملاتے ہوئے ڈی جے کو تنبیہہ کی۔

سلیمان صاحب نے پہلی ہی گھنٹی پہ فون اٹھالیا۔

"وہ چپ ہوئی کہ نہیں؟ توبہ کتنا روتی ہے۔"

"جی جی ابا! وہ چپ ہوگئی ہے۔" اور پھر جلدی جلدی اپنی خیریت بتا کر فون بند کیا۔ ڈی جے نے بھی بمشکل ایک ہی منٹ گھر بات کی۔ بعد میں بقیہ رقم دیکھی تو بمشکل ایک یورو استعمال ہوا تھا۔ باقی چار یورو کا بیلنس ابھی موجود تھا۔ دونوں اپنی عجلت و کنجوسی پہ خوب پچھتائیں کہ اب ابوظہبی سے نکل کر تو وہ کارڈ کسی کام کا نہیں تھا۔ حیا نے اسے اپنے گولڈن پاؤچ میں ڈال دیا۔

اب انہیں اپنا سامان لینا تھا۔ وہاں بہت سے ٹائرز چل رہے تھے۔ ہر ٹائر پہ بیگز اور سوٹ کیس قطار میں رکھے چلے آرہے تھے۔ انہیں قطعاً" علم نہیں تھا کہ اپنے بیگز کو کہاں تلاشیں؟

وہ دونوں بدحواس سی ایک ٹائر سے دوسرے کی طرف بھاگنے لگیں۔ ڈی جے کو تھوڑی دیر میں ہی ٹھنڈے پسینے آنے لگے اور اس کا سانس پھول گیا۔ کبھی حیا کو ایک جگہ اپنے سیاہ سوٹ کیس کا گمان گزرتا تو وہ ڈی جے کا ہاتھ کھینچ کر اُدھر بھاگتی' مگر قریب سے دیکھنے پہ وہ کسی اور کا بیگ نکلتا' تو کبھی ڈی جے اپنے بھورے تھیلے کو پہچان کر چلاتے ہوئے ایک طرف دوڑتی' مگر اس پہ کسی اور کا نام درج ہوتا۔

"حیا بتاؤ! اب بیگز کہاں سے ڈھونڈیں؟" ڈی جے نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ حیا نے بمشکل تھوک نگلا اور چہرے پہ آتے بال کانوں کے پیچھے اڑسے۔ اب سچ بولنے کا وقت تھا۔

"ڈی جے! میں آج زندگی میں پہلی دفعہ جہاز میں بیٹھی ہوں۔"

ڈی جے نے چند لمحے اس کا چہرہ دیکھا' پھر اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی۔

"ہاتھ مارو! میں بھی آج پہلی دفعہ جہاز میں بیٹھی ہوں۔"

حیا نے زور سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا اور دونوں ہنس پڑیں۔ کافی دیر بعد ان کو ٹائرز کی لسٹ نظر آئی' جس پہ ہر فلائٹ کے مخصوص ٹائر کا نمبر درج تھا۔ فہرست دیکھ کر دو منٹ میں ہی اپنا مطلوبہ ٹائر مل گیا۔

سامان لے کر حیا اتنی تھک چکی تھی کہ جب ڈی جے نے وہیں ایک جگہ چمکتے فرش پہ بیٹھنے کو کہا تو وہ اپنا سارا نخرہ اور غرور بالائے طاق رکھ کر وہیں زمین پہ بیٹھ گئی۔

اپنے بیگز کے ساتھ وہ دونوں اب مزے سے فرش پہ بیٹھیں ہر آتے جاتے کو دیکھ رہی تھیں اور اردگرد مہذب' نفیس لوگ حیرت سے ان کو دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ٹرمنل ون سے جو پرواز ان کو ملی' اس میں بھی عثمان شبیر ساتھ ہی تھے۔ اپنی داستان حیات فراموش کرکے وہ اب ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا انٹرویو کرنے لگے۔

"کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ کیوں آئی ہو؟ ترکی میں کدھر جانا ہے؟ کیوں جانا ہے؟"

"سبانجی! سبانجی یونیورسٹی؟" انہوں نے اتنی بلند

آواز میں دہرایا کہ اگلی نشست پہ بیٹھی ترک خاتون نے گردن موڑ کر قدرے اونچے ہو کر ان کو دیکھا۔

"مسابجی!" اس سے آگے خاتون نے قدرے ستائش سے چند الفاظ ترک میں کہے' جو حیا کو سمجھ نہ آئے۔ جواباً" عثمان شبیر صاحب نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کچھ کہا تو وہ خاتون قدرے گڑبڑا کر واپس رخ پھیر گئیں۔

"آپ نے ان کو کیا کہا؟" حیا نے کڑی نگاہوں سے انہیں گھورا۔

"کچھ نہیں' تم بتاؤ' یہ پاکستان میں والدین اتنے آزاد خیال کب سے ہو گئے کہ جوان بچیوں کو اکیلے ترکی بھیج دیں؟"

"اکیلے نہیں ہیں ہم' پورا گروپ ہے' ہم دو اسٹوڈنٹس ہیں اور باقی فیکلٹی ممبران ہیں' جو دو روز قبل روانہ ہو چکے ہیں۔"

"خیر اب اکیلی جا رہی ہو تو خیال رکھنا کہ۔۔۔" اور پھر ان کا وعظ شروع ہو گیا۔ نماز پڑھا کرو' قرآن پڑھا کرو' پردہ کیا کرو' سچ بولا کرو' اللہ سے ڈرو' غرض ہر وہ بات جو بیٹے کی تربیت کے وقت انہیں بھول گئی تھی' اب اچانک یاد آ گئی۔ حیا نے قدرے جھنجلا کر رخ پھیر لیا۔

دوپہر دو بجے کھڑکی کے اس پار۔۔۔ نیچے۔۔۔ بہت نیچے۔۔۔ وہ پرفسوں منظر پھیلنے لگا۔

مرمرا کا سمندر' اوپر بادل اور برف۔۔۔ یوں جیسے نیلی چادر پہ سفید روئی کے گالے تیر رہے ہوں' وہ اس منظر کے سحر میں کھوتی چلی گئی۔

جہان سکندر کا ترکی اس کے قدموں تلے تھا۔

"یہ رکھ لو۔" اعلان ہونے لگا تو نہایت زبردستی عثمان شبیر نے اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ تھمایا۔ اس پہ میرے گھر' سیل اور آفس کے نمبرز لکھے ہیں۔ کبھی کبھار میں گھر پہ نہیں ہوتا اور کبھی کبھار میرا سیل بھی آف ہوتا ہے' مگر آفس کے نمبر پہ میں ہمیشہ ملتا ہوں۔ میری سیکریٹری کی فضولیات سے بچنے کے لیے ڈائریکٹ میری پرائیوٹ ایکسٹینشن ڈائل کرنا۔ وہ ہے 14 یعنی چودہ' کیونکہ میری اور پاکستان کی تاریخ پیدائش چودہ اگست ہے۔ رکھ لو' ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

عثمان شبیر سے بمشکل جان چھوٹ رہی تھی۔ ان کو کبھی کال کرنا یا دوبارہ ملاقات کا تصور ہی حیا کے لیے سوہان روح تھا' پھر بھی ان کے بہت اصرار پہ اس نے اپنے سنہری پاؤچ میں وہ کارڈ بغیر دیکھے رکھ لیا۔

اتاترک انٹرنیشنل ایئرپورٹ استنبول کی یورپی طرف واقع تھا۔ یہ اسے بعد میں علم ہوا تھا' البتہ جو بات ہمیشہ سے معلوم تھی' وہ یہ تھی کہ استنبول دنیا کا وہ واحد شہر ہے' جو دو خطوں کو ملاتا ہے یورپ اور ایشیا۔

استنبول کے دو حصے تھے۔ ایک یورپی طرف کہلاتا تھا اور دوسرا ایشیائی طرف (یا اناطولین طرف)۔ وہ دونوں جب اپنے سامان کی ٹرالیاں دھکیلتے آگے آئیں تو رومی فورم کے ارکان ان کو مل گئے' جو انہیں لینے آئے تھے۔ رومی فورم ایک ترک این جی او تھی جو بالخصوص ایکسچینج اسٹوڈنٹس کا بہت خیال رکھتی تھی۔

وہ دو لڑکے تھے' احمت اور چغتائی۔

"چغتائی نام تو ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے' مسعود عبدالرحمٰن چغتائی۔" حیا نے بے اختیار سوچا۔

"السلام علیکم!" وہ بہت گرمجوشی اور احترام سے ان سے ملے۔ چغتائی نے ان سے بیگز لے لیے۔

"آیئے' باہر گاڑی انتظار کر رہی ہے۔"

"چغتائی برادر! پلیز پانی پلا دیں۔ بہت پیاس لگی ہے۔" حیا کی طرح ڈی جے بھی پیاس سے بے حال تھی۔ چغتائی نے سر اثبات میں ہلایا اور احمت کے ساتھ سامان اٹھانے لگا۔ پھر وہ دونوں ان کے آگے چلتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گئے۔

بے حد مہمان نواز قوم کے اس سپوت نے ان کو پانی کیوں نہیں پلوایا' یہ معما وہ ساری زندگی حل نہیں کر سکی۔ قوی امکان یہ تھا کہ چغتائی کی انگریزی کمزور تھی' جس کے باعث وہ ان کا مدعا سمجھ نہیں پایا تھا۔

باہر نکلنے سے قبل انہوں نے اپنی رقم ترک لیرا اور یوروز میں تبدیل کروالی تھی۔ ایک لیرا پاکستانی پچپن روپے کا تھا اور ایک یورو ایک سو پچیس روپے کا۔

"ففٹی فائیو۔۔۔ ون ٹوئنٹی فائیو۔۔۔ ففٹی فائیو۔۔۔ ون ٹوئنٹی فائیو۔۔۔" ڈی جے زیر لب کرنسی کی مالیت کا حساب لگاتی اور ان کی قیمت یاد کرتی باہر آئی تھی۔

ایئرپورٹ کا دروازہ کھلتے ہی سردی کی ایسی یخ بستہ' ہڈیوں میں گھستی' خون کو منجمد کرتی لہر نے ان کا استقبال کیا کہ چند لمحوں میں حیا کے ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔ یہاں مری اور ایوبیہ کی سرد ترین ہوا سے بھی کئی گنا سرد ہوا چل رہی تھی۔ حیا نے بے اختیار بازو سینے پہ لپیٹ لیے' وہ ٹھٹھرنے لگی تھی۔

ان کا سامان خاصا وزنی اور بے تحاشا تھا۔ دونوں لڑکے سرمئی رنگ کی ہائی ایس میں بیگز رکھتے رکھتے ہانپ گئے تھے۔ تب احمت نے بتایا۔

"ہماری روایت ہے کہ جو بھی اتاترک ایئرپورٹ سے استنبول آتا ہے' ہم اسے سب سے پہلے سلطان ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار پہ لے کر جاتے ہیں۔ اس سے اس کا ترکی میں قیام اچھا گزرتا ہے۔" احمت کہہ کر بیگ گاڑی میں رکھنے لگا تو ڈی جے نے سرگوشی کی۔

"مگر حیا! یہ تو توہم پرستی اور شرک۔۔۔"

اس نے زور سے کہنی مار کر ڈی جے کو خاموش کرایا' پھر اندر بیٹھتے ہوئے دبی آواز میں گھرکا۔

"میزبانوں سے اس سردی میں بحث کی تو وہ تمہیں یہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے پاگل! صبح تک منجمد ہو کر پڑی ہو گی اور آئندہ ترکی آنے والے سب سے پہلے تمہارے منجمد مجسمے کی زیارت کیا کریں گے۔"

احمت کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی آتی تھی' سو وہ سارا راستہ گردوپیش کے متعلق بتاتا رہا۔ حیا کو اس سفر نامے سے دلچسپی نہ تھی سو رخ پھیرے کھڑکی سے باہر دیکھے گئی۔

وہ جو امریکی فلموں والی بلند و بالا عمارتوں کی آس لگائے بیٹھی تھی' قدرے مایوس ہوئی' کیونکہ استنبول شروع میں تو یوں لگا جیسے اسلام آباد ہو۔

آہستہ آہستہ غور کرنے پہ محسوس ہوا کہ نہیں۔۔۔ وہ واقعی یورپ تھا۔ دکانوں کے چمکتے شیشے' صاف سڑکیں' مغربی لباس میں پھرتے لوگ' دکانوں کی چھتوں اور درختوں کے اوپر پڑی برف اور سڑک کے کنارے بچھی برف کی تہیں گویا سفید گھاس ہو۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس کہر اور سردی میں بھی ترک لڑکیاں بڑے مزے سے منی اسکرٹس میں گھوم رہی تھیں۔

"خدا کرے' رات برف نہ پڑے۔" چغتائی نے موڑ کاٹتے ہوئے ایک پرتشویش نگاہ باہر پھیلے برف زار پہ ڈالی۔

"ہاں! خدا کرے رات واقعی برف نہ پڑے۔" احمت نے تائید کی۔

حیا اور ڈی جے نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ڈی جے آہستہ سے اردو میں بڑبڑائی۔ "او یں نہ پڑے' خود تو برف باری دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہیں' ہمیں تو دیکھنے دیں۔ اللہ کرے' رات برف ضرور پڑے' آمین ثم آمین۔" اور حیا نے دل میں اس کی تائید کی۔

ونڈ اسکرین کے اس پار یورپین شہر کا اختتام دکھائی دے رہا تھا۔ آگے نیلا سمندر بہہ رہا تھا اور اس کے دوسری طرف استنبول کا ایشیائی حصہ آباد تھا۔ دونوں حصوں کو ایک عظیم الشان پل نے جوڑ رکھا تھا۔

دو خطوں کا ملاپ' دو تہذیبوں کا سنگم۔

"مرمرا کے سمندر کا جو حصہ استنبول کے درمیان سے گزرتا ہے' اسے بوسفورس کا سمندر کہا جاتا ہے۔ اس پل کا نام بھی بوسفورس برج ہے۔" احمت بتانے لگا۔

"مگر ہم تو مزار پہ جا رہے تھے جو کہ یورپین حصے ہی میں ہے' پھر پل عبور کرنے کا مقصد؟" قریب آتے پل کو دیکھ کر حیا نے حیرت سے پوچھا' کیونکہ پل کے اس طرف اناطولین شہر تھا۔

"ہم نے پل عبور نہیں کرنا' اس کے قریب سے کسی کو اٹھانا ہے' ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے' آگے مزار تک آپ کو اسی نے لے کر جانا ہے۔"

چغتائی نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ احمت

اب لاک کھول کر باہر نکل رہا تھا۔

حیا نے اس خوب صورت اونچے پل کو دیکھا اور سوچا کہ وہ کتنے برس اسی پل پر سے گزرا ہوگا۔ کتنی ہی دفعہ اس نے بوسفورس کے نیلے پانیوں پہ چاند کی پریوں کا رقص دیکھا ہوگا۔ جب وہ اس سے ملے گی تو کیا اس کی آنکھوں میں استنبول کی سفید گھاس کی برف جمی ہوگی یا مرمرا کے پانیوں کا جوش ہوگا؟ اور کیا وہ کبھی اس سے مل پائے گی؟ اس خیال پہ اس کا دل جیسے مرمرا کے سمندر میں ڈوب کر کسی لٹی پٹی کشتی کی طرح ہولے سے ابھرا۔

کھڑکی کے اس پار سے ایک دراز قد لڑکی کار کی طرف چلی آرہی تھی۔ چہرے کے گرد اسکارف لپیٹے' بلیو جینز کے اوپر گھٹنوں تک آتا سفید کوٹ پہنے' وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے چلتی آرہی تھی۔ اس کی رنگت استنبول کے سورج کی طرح سنہری اور آنکھیں بوجھل بادلوں کی مانند سرمئی تھیں۔

وہ لڑکی ان دونوں ترک لڑکوں کے پاس پہنچی اور مسکراتے ہوئے چغتائی کے ہاتھ سے چابی لی۔ رحمت پیچھے کھڑی ہائی ایس کی جانب اشارہ کرکے کچھ کہنے لگا۔ وہ لڑکی اپنی نرم مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلاتی سنتی گئی۔

پھر وہ دونوں چلے گئے اور وہ لڑکی کار کی طرف آئی۔ دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ کر گردن پیچھے گھمائی۔

"اسلام علیکم۔ اور ترکی میں خوش آمدید۔" اس کی انگریزی شستہ اور انداز بے حد نرم تھا۔ حیا نے محسوس کیا کہ ترک السلام کے بجائے سلام علیکم کہتے تھے

"وعلیکم السلام۔" حیا نے اس کا بڑھا ہاتھ تھاما تو اسے لگا' اس نے اتنا نرم ہاتھ کبھی نہیں چھوا۔ وہ ہاتھ نہیں گویا مکھن کا ٹکڑا تھا۔

"میرا نام ہالے نور ہے' میرا تعلق رومی قوم سے ہے۔ میں سبانچی سے منرل سائنس اینڈ انجینئرنگ میں ایم ایس کر رہی ہوں۔ ایئرپورٹ پر آپ کو لینے کے لیے بھی مجھے ہی آنا تھا' مگر میں کہیں پھنس گئی تھی' اس لیے نہیں آسکی' بہت معذرت۔" اس نے کار واپس موڑ دی تھی۔

"حیا سلیمان۔"

"خدیجہ رانا۔"

ان کے تعارف کو ہالے نور نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ سنا اور سر اثبات میں ہلایا۔ وہ واقعی نور کا ہالہ تھی۔ ڈھلی ہوئی چاندنی۔

"اب ہم انصاری محلہ جارہے ہیں۔" وہ اسٹیرنگ وہیل گھماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"محلہ؟ اردو والا محلہ' حیا!" ڈی جے نے دھیرے سے سرگوشی کی۔

"شاید۔ تب ہی تو کہتے ہیں کہ اردو ترک سے نکلی ہے' تم نے میٹرک میں اردو زبان کے مضمون میں اس فقرے کا رٹا نہیں لگایا تھا کہ لفظ اردو ترک زبان سے نکلا ہے' جس کے معنی۔۔۔"

"لشکر کے ہیں!" ڈی جے نے چہک کر فقرہ مکمل کیا۔

"ایوب سلطان جامعہ" کے بیرونی بازار کا نام انصاری محلہ تھا۔ بے حد رش' بہت سے لوگ اور ہر سو اڑتے' چگتے کبوتر' وہ تینوں لوگوں کے درمیان بمشکل راستہ بنائیں' مسجد کے احاطے تک پہنچی تھیں۔

نماز سے فارغ ہو کر حیا نے دیکھا' وہاں جامعہ کا نام Eyup Sultan Camii لکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ جامعہ میں J کی جگہ C لکھا ہے' جو کہ غلط لگ رہا تھا۔

"ہماری زبان میں C کو J کی آواز سے پڑھا جاتا ہے۔" انصاری محلے کے رش سے گزرتے ہوئے اس کی حیرت پہ ہالے نے بتایا۔ وہ مسکراتی ہوئی بڑے اعتماد سے اپنے سفید کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چل رہی تھی۔ اس کی بات پہ حیا بے اختیار چونکی۔

"حیران کیوں ہو؟" ہالے نے رک کر شاپر سے اپنے جوتے نکالتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہاں مسجد میں داخلے کے وقت جوتے باہر رکھنے کے بجائے شاپر میں رکھنے اور ساتھ شاپر ہمہ وقت اٹھائے رکھنے کا رواج تھا۔

"یعنی اگر کسی کا نام جہان ہو تو وہ ترک ہجوں میں اسے کیسے لکھے گا؟" بلا ارادہ اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر فوراً" گڑبڑا کر ڈی جے کو دیکھا۔ وہ ذرا فاصلے پہ کبوتروں کی تصاویر کھینچ رہی تھی۔ اس نے نہیں سنا تھا۔

ہالے شاپر ڈسٹ بن میں پھینک کر سیدھی ہوئی اور مسکرا کر ہجے کرکے بتایا۔ (CIHAN)

"اوہ!" اس نے خفیف سا سر جھٹکا۔ تب ہی وہ اسے فیس بک پہ نہیں ملا تھا۔ وہ اس کو Jihan لکھ کر ڈھونڈتی رہی' مگر وہ تو اپنے نام کو Cihan لکھتا ہوگا۔

گلی صاف ستھری اور کشادہ تھی۔ دونوں اطراف میں دکانوں کے دروازے کھلے تھے۔ آگے کرسیاں میزیں بچھی تھیں۔ ارد گرد بہت سے اسٹال لگے تھے۔ سڑک کے کناروں پہ کھلے عام کتے ٹہل رہے تھے۔ مگر وہ بھونکتے نہیں تھے۔

حیا کو بھوک لگ رہی تھی اور وہ اب اس سفرنامے سے بور ہونے لگی تھی۔ بمشکل وہ تینوں اس رش بھرے محلے سے نکلیں۔

"ایکسچینج اسٹوڈنٹس کو ان کا پہلا کھانا ایک ترک میزبان خاندان دیا کرتا ہے اور ابھی ہم اسی میزبان خاندان کے گھر جارہے ہیں۔"

جب وہ کار میں بوسفورس کے پل پر سے گزر رہی تھیں تو ہالے نے بتایا۔ کھانے کا سن کر اس پہ چھائی بیزاریت ذرا کم ہوئی۔

میزبان خاندان کا گھر استنبول کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ کشادہ سڑک' خوب صورت بنگلوں کی قطار' اور بنگلوں کے سامنے سبزے پہ جمی برف۔

ان کے اسکالر شپ کو آرڈی نیٹر نے چند باتیں انہیں ذہن نشین کروادی تھیں کہ ترکی میں جوتے گھر سے باہر اتارنے ہیں' گھاس پہ نہیں چلنا اور ملاقات کے وقت ترک خاندان کے بڑے کا ہاتھ چومنا ہے۔

"اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس تکلف کو رہنے دو۔" ان دونوں نے گھر کے داخلی دروازے کے باہر بچھے میٹ پہ جوتے اتارے تو اندر سے آتی وہ مشفق اور معمر خاتون پیار بھری خفگی سے بولی تھیں۔ پہلے دن کوئی اصول نہیں ہوتے' اسلام علیکم اور ترکی میں خوش آمدید۔"

"آپ کے اصولوں کی پاسداری میں ہمارے لیے فخر ہے۔" حیا نے مسکراتے ہوئے ان کا ہاتھ تھاما اور سر جھکا کر ان کے ہاتھ کی پشت کو لبوں سے لگایا۔

معمر خاتون' مسز عبداللہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

"اندر آجاؤ۔" وہ راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹیں۔ ان کی سرخ بالوں والی بیٹی آگے بڑھی اور کارپٹ شوز حیا اور ڈی جے کے قدموں میں رکھے۔ وہ ریشمی کپڑے سے بنے کوٹ شوز کی شکل کے جوتے تھے۔ دونوں نے جھک کر وہ جوتے پہنے اور اندر داخل ہوئیں۔

اس ترک گھر کا فرش لکڑی کا بنا تھا۔ لونگ روم کے فرش پہ بہت خوب صورت قالین بچھے تھے۔ وہ باتھ روم ہاتھ دھونے آئی تو دیکھا' وہاں بیسن اور ٹونٹی وغیرہ نہیں تھے بلکہ ایک طرف قطار میں نل لگے تھے' البتہ باتھ روم کے فرش پر بھی رگز (پائیدان) اور کاؤچ بچھے تھے' حیرت انگیز!

وہ واپس آئی تو ڈائننگ ہال میں کھانا لگایا جارہا تھا۔ ڈی جے جھک کر پیار سے مسز عبداللہ کی چھ سالہ نواسی عروہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ تین خواتین سے مشتمل چھوٹا سا کنبہ تھا اور چونکہ وہ دونوں لڑکیاں تھیں' سو ہالے نے ایسے ترک خاندان کا چناؤ کیا تھا' جس میں کوئی مرد نہ ہو۔ اسی پل مسز عبداللہ سوپ کا بڑا سا پیالا اٹھائے آئیں۔ ہالے ان کی مستعدی سے مدد کروا رہی تھی۔

"تم کیا کہہ رہی تھی' تمہارا یہاں کوئی رشتہ دار بھی ہے؟" انہوں نے سوپ کا ڈونگا میز پہ رکھا۔ حیا نے ایک نظر اس ملغوبے کو دیکھا۔

"جی۔۔۔ میری پھپھو ہیں ادھر۔" وہ سوپ کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کدھر رہتی ہیں؟"

"ادھر!" اس نے پرس سے وہ مڑا تڑا کاغذ نکال کر ہالے کو تھمایا۔ ہالے نے ایک نظر اس کاغذ کو دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کل میں ملوا دوں گی تمہیں ان سے 'کھانا شروع کرو۔" اس نے کاغذ واپس حیا کی جانب بڑھا دیا۔

"ڈی جے! ہم واقعی ترکی میں بھوکوں مریں گے۔ اس ملغوبے کی شکل تو دیکھو' مجھے تو پھر سے متلی ہو رہی ہے۔" "حیا جرا" مسکراتے ہوئے ہولے سے اردو میں بولی۔ مسز عبداللہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"یہ کہہ رہی ہے کہ ان خواتین کا خلوص اسے شرمندہ کر رہا ہے۔" ڈی جے نے جلدی سے ترجمانی کرتے ہوئے میز کے نیچے سے اس کا پیر زور سے کچلا۔

"اوہ شکریہ۔" مسز عبداللہ مسکرا کر کھانا پیش کرنے لگیں۔

سوپ دراصل سرخ مسور کی دال کا شوربہ تھا اور اردو جیسی ترک میں اسے چوربہ کہتے تھے۔ وہ ذائقے میں شکل سے بڑھ کر بدمزا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی دونوں پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی برداشت جواب دینے لگی۔

"حیا! مجھے الٹی آنے والی ہے۔"

"اور میں مرنے کے قریب ہوں۔"

وہ بدقت مسکراہٹ چہروں پہ سجائے چمچہ بھر رہی تھیں۔ ترک خواتین بہت مرعوبیت سے سوپ پی رہی تھیں۔

چوربہ ختم ہوا تو کھانا آگیا۔ وہ اس سے بھی بڑھ کر بدمزا۔ ایک چاولوں کا پلاؤ تھا۔ پاکستان میں پلاؤ کو "پ" کے اوپر پیش کے ساتھ بولا جاتا ہے' مگر یہاں اسے "پ" تلے زیر کے ساتھ بولا جاتا تھا۔ پلاؤ شکل میں ابلے چاولوں سے مختلف نہ تھا۔ ساتھ چنے کا سالن اور مرغی کی گریوی' منچورین کی طرح تھی۔

وہ ڈیڑھ دن کی بھوکی تھیں اور اوپر سے یہ بدمزا کھانے مزید حالت خراب کر رہے تھے۔

"خدیجہ! تمہاری دوست مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہے' خیریت؟" مسز عبداللہ نے پوچھ ہی لیا۔ پلاؤ کا پیالا بھی ختم ہو چکا تھا اور ہم پاکستانی میزبانوں کے برعکس وہ اسے دوبارہ بھرنے کے لیے دوڑی نہیں تھیں۔ وجہ ان کی خلوص کی کمی نہ تھی' بلکہ شاید یہی ان کا طریقہ تھا۔

ڈی جے نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔ سب کھانے سے ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

حیا نے میز تلے آہستہ سے اپنا پاؤں ڈی جے کے پاؤں پہ رکھا۔

"فیملی فرنٹ کی ہما کوئی معقول وجہ بتاؤ ان کو۔"

"نہیں۔ وہ۔ دراصل۔ حیا۔ حیا بہت ڈرپوک ہے۔ اسے اسٹریٹ کرائم سے بہت ڈر لگتا ہے اور یہ پہلی دفعہ اکیلی یورپ آئی ہے' تو یہ پوچھ رہی ہے کہ کہیں استنبول میں ہمارا آرگنائزڈ کرمنلز سے تو واسطہ نہیں پڑے گا؟"

حیا خفت سے سر جھکائے لب کاٹتی رہی۔ وہ خالی ہاتھ ان کے گھر آئی تھیں اور انہوں نے میز بھر دی تھی' پھر بھی اس کے نخرے ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ اسے بے حد پچھتاوا ہوا۔ وہ بات سنبھالنے پہ ڈی جے کی بے حد ممنون تھی۔

"قطعاً" نہیں' استنبول بہت محفوظ شہر ہے۔" سرخ بالوں والی لڑکی رسان سے بولی۔ "یہاں کی پولیس ایسے لوگوں کو کھلے عام نہیں پھرنے دیتی۔"

"بالکل۔ استنبول میں قانون کی بہت پاسداری کی جاتی ہے۔" ہالے نے تائید کی۔ مسز عبداللہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ ان کے چہرے پہ کچھ ایسا تھا کہ حیا انہیں دیکھے گئی۔

جب ہالے نور استنبول کی شان میں ایک قصیدہ پڑھ کر فارغ ہوئی تو مسز عبداللہ نے گہری سانس لی۔

"خدا کرے تمہارا واسطہ کبھی عبدالرحمان پاشا سے نہ پڑے۔"

حیا نے دھیرے سے کانٹا واپس پلیٹ میں رکھا۔ ایک دم پورے ہال میں اتنا سناٹا چھا گیا تھا کہ کانٹے کی کانچ سے ٹکرانے کی آواز سب نے سنی۔

"کون پاشا؟" ڈی جے نے الجھ کر مسز عبداللہ کو دیکھا۔

"وہ ممبئی کا ایک اسمگلر ہے' یورپ سے ایشیا اسلحہ اسمگل کرتا ہے۔ استنبول میں اگر چڑیا کا بچہ بھی لاپتا ہو جائے تو اس میں پاشا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بوسفورس کے سمندر میں ایک جزیرہ ہے' بیوک ادا۔ اس جزیرے پہ اس مافیا کا راج ہے۔"

"اور میری ماں کو خواب بہت آتے ہیں۔" ان کی بیٹی نے خفگی سے ان کو دیکھا۔

"یہ لڑکیاں سمجھتی ہیں' میری عقل میرا ساتھ چھوڑنے لگی ہے۔"

"بالکل ٹھیک سمجھتی ہیں اور ایکسچینج اسٹوڈنٹس! کان کھول کر سن لو۔" ہالے نے قدرے تلملا کر مداخلت کی۔ "استنبول میں ایسا کوئی کرائم سین نہیں ہے' یہ سب گھریلو عورتوں کے افسانے ہیں۔ یہاں کوئی بھارتی اسمگلر نہیں ہے۔"

دونوں ترک لڑکیاں اپنے تئیں بات ختم کر کے اب سوئٹ ڈش کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ خدیجہ بھی ان کی باتوں پہ مطمئن ہو کر شکرپارے کھانے لگی تھی' مگر حیا کے حلق میں وہ شکرپارے کہیں اٹک سے گئے تھے۔

ابوظہبی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پہ اس نے اس حبشی کے منہ سے پاشا کا نام سنا تھا۔ وہ نہایت مضمحل سا اپنی بیوی سے عربی میں بات کر رہا تھا۔ اپنے بیٹے کے علاج کا ذکر۔ پاشا کے کسی کام کا ذکر' پیسے کم ملنے کا ذکر' مگر شاید وہ کسی اور کا ذکر کر رہا ہو اور واقعی ترک گھریلو عورتوں کے افسانوں کے مرکزی پاشا کا کوئی وجود نہ ہو۔

الوداعی لمحات میں جب باقی سب آگے نکل چکے تو مسز عبداللہ نے دھیرے سے حیا کے قریب سرگوشی کی۔

"یہ لڑکیاں اپنے استنبول کی برائی نہیں سن سکتیں۔ تمہیں اس لیے بتایا کہ تم کرائم سے ڈرتی ہو اور خوب صورت بھی ہو' خوب صورت لڑکیوں پہ عموماً" ایسے لوگ نظر رکھتے ہیں۔"

حیا نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ان کے جھریوں زدہ چہرے پہ سچائی بکھری تھی۔

"وہ واقعی اپنا وجود رکھتا ہے۔" وہ بالکل سن سی ہوئی انہیں دیکھے گئی۔

کیا افواہوں کا خوف مجسم صورت میں ان کے سامنے آگیا تھا' یا ان کی عقل واقعی ان کا ساتھ چھوڑ رہی تھی؟

☼ ☼ ☼

شام کے سائے گہرے پڑ رہے تھے' جب وہ سبانجی یونیورسٹی پہنچیں۔ سبانجی امرا کی جامعہ تھی۔ وہاں چار ماہ کے ایک سمسٹر کی فیس بھی دس ہزار ڈالرز سے کم نہ تھی۔ شہر سے دور' مضافات میں واقع وہ قدرے گولائی میں تعمیر کردہ عمارت بہت پرسکون سی دکھتی تھی۔ چونکہ وہ جگہ استنبول شہر سے قریباً" پینتالیس منٹ کے فاصلے پہ تھی' اس لیے سبانجی میں ڈے اسکالرز نہیں ہوتے تھے۔ ان کے تمام طلبہ و طالبات بشمول ہالے نور جیسے لوگوں کے' جن کے گھر استنبول میں ہی تھے' ہاسٹل میں رہائش پذیر تھے۔

یونیورسٹی کی عمارت سے دور برف سے ڈھکے میدانوں میں ایک جگہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ وہ ان کے رہائشی بلاکس تھے۔ انگریزی حرف ایل کی صورت کھڑی تین تین منزلہ عمارتیں' جن کے کمروں کے آگے بالکونی بنی تھیں۔ چھ کمرے ایل کی ایک لکیر پہ تھے اور چھ دوسری لکیر پہ تھے۔

"تمہارا کمرا دوسری منزل پہ ہے۔" ہالے نے اس کا سامان گاڑی سے نکالتے ہوئے بتایا۔ حیا اور ڈی جے دوسرا بیگ گھسیٹ کر لا رہی تھیں۔

ایل کی شکل کا بلاک جس کو ہالے بی ون کہہ رہی تھی' کے باہر گولائی میں چکر کھاتی سیڑھیاں کھلے آسمان تلے بنی تھیں' جو اوپر تک لے جاتی تھیں۔ لوہے کی ان سیڑھیوں کے ہر دو زینوں کے درمیان خلا تھا اور زینوں پہ برف کی موٹی تہ تھی۔ ذرا سا پاؤں پھسلے اور آپ کی ٹانگ اس گیپ میں سے نیچے پھسل جائے۔

وہ تینوں گرتی پڑتی بمشکل حیا کا سامان اوپر لائیں۔

"کمرا تو اچھا ہے' ہم یہاں رہیں گے؟" حیا نے ہالے کی تھمائی چابی سے دروازہ کھول کر دھکیلا تو بے اختیار لبوں سے نکلا۔

"ہم نہیں' صرف تم' کیونکہ خدیجہ کا بلاک بی ٹو ہے۔ وہ جو سامنے ہے۔" اس نے انگلی سے دور برفیلے میدان میں بنی عمارت کی جانب اشارہ کیا۔

"کیا مطلب' میں ادھر اکیلی؟" وہ دنگ رہ گئی۔

"بعد میں تم بدلوا سکتی ہو آفیسر سے کہہ کر۔ ابھی تم آرام کرو' ہر کمرے میں چار اسٹوڈنٹس ہوتے ہیں۔ ہر اسٹوڈنٹ کی ٹیلی فون ایکسٹینشن اس کی میز پہ ہوتی ہے۔ آج کل چھٹیاں ہیں' اکثر طالب علم اپنے گھر گئے ہوئے ہیں۔ تمہارا کمرا خالی ہے' مگر تم جا کر اپنے بیڈ پر ہی سونا' ترک لڑکیوں کے بستر پہ کوئی سو جائے تو وہ بہت برا مانتی ہیں۔ کوئی مسئلہ ہو تو میرا بی فور میں ہے' اوکے؟" مسکرا کر وہ بولی تو حیا نے سر ہلا دیا۔

ڈی جے نے بے چارگی سے اسے دیکھا اور ہالے کے ہمراہ سیڑھیاں اترنے لگی۔ "ہالے! سنو' اس عمارت کے پیچھے کیا ہے؟" کسی خیال کے تحت اس نے پکارا۔ ہالے مسکرا کر پلٹی اور بولی "جنگل!" پھر وہ دونوں زینے اتر گئیں۔

حیا نے اندر کمرے میں قدم رکھا۔

کمرا خوب صورتی سے آراستہ تھا۔ ہر دیوار کے ساتھ ایک ایک ڈبل اسٹوری بینک رکھا تھا۔ عموماً" ایسے بینکس میں نیچے ایک بیڈ اور اوپر بھی ایک بیڈ ہوتا ہے' مگر اس میں نیچے بڑی سی رائٹنگ ٹیبل بنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لکڑی کی سیڑھی اوپر جاتی' جہاں ایک آرام دہ بیڈ تھا۔ میز پہ ایک ٹیلی فون رکھا تھا۔ وہ چاروں بینکس کو دیکھتی اپنے نام کی میز کی کرسی کھینچ کر نڈھال سی بیٹھ گئی۔

وہ ایک تھکا دینے والا دن ثابت ہوا تھا' مگر ابھی وہ تھکن کے بجائے عجیب سی اداسی میں گھری تھی۔

غیر ملک' غیر خطہ' غیر جگہ اور تنہا کمرا۔ جس کے پیچھے جنگل تھا۔ اسے جانے کیوں بے چینی ہونے لگی۔

وہ فریش ہونے کے لیے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی' تاکہ باہر کہیں باتھ روم ڈھونڈے' ابھی اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ دو کمرے چھوڑ کر ایک کمرے کا دروازہ کھلا' اس میں سے ایک لڑکا بیگ اٹھائے نکل رہا تھا۔

اس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور پھر مقفل کر دیا۔

گرلز ہاسٹل میں لڑکا؟ اگر پاکستان میں ہوتی تو یقیناً" یہی سوچتی' مگر یہ بات تو سباجنجی کے پراسپکٹس میں پڑھ چکی تھی کہ وہ مخلوط ہاسٹل تھا۔ البتہ ایک کمرے کے اندر صرف ایک صنف والے افراد ہی رہ سکتے تھے۔

وہ بددل سی ہو کر واپس کرسی پہ آبیٹھی۔

سامنے والی دیوار پہ ایک سفید اور سیاہ تصویر آویزاں تھی' پنسل سے بنایا گیا وہ خاکہ ایک کلہاڑے کا تھا' جس کے پھل سے خون کی بوندیں گر رہی تھیں۔ خاکہ بے رنگ تھا' مگر خون کے قطروں کو بے حد شوخ سرخ رنگ سے بنایا گیا تھا۔

اس نے جھرجھری لے کر دوسری دیوار کو دیکھا۔

وہاں ایک لڑکی کے چہرے کا بے رنگ پنسل سے بنا خاکہ ٹنگا ہوا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے آنکھیں میچے ہوئے تھی' اس کی گردن پہ چھری چل رہی تھی اور ادھر سے بھڑکیلے سرخ خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

وہ مضطرب سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان تصاویر والی دیوار کے ساتھ لگے بینک کی میز پہ بہت سے چاقو اور چھریاں قطار میں رکھے تھے۔ ہر سائز' ہر قسم اور ہر دھار کا چاقو جن کے لوہے کے پھل مدھم روشنی میں بھی چمک رہے تھے۔

وہ ایک دم بہت خوف زدہ ہو کر باہر نکلی۔

کوریڈور میں اندھیرا تھا۔ دور نیچے برف سے ڈھکے میدان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی' جیسے ہی اس نے پہلے زینے پہ قدم رکھا اوپر چھت پہ لگا بلب ایک دم جل اٹھا۔

وہ ٹھٹک کر رکی اور گردن گھمائی۔ کوریڈور خالی تھا'

وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر بلب کس نے جلایا؟

اس کی گردن کی پشت کے بال کھڑے ہونے لگے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ پلٹی اور زینے اترنے لگی۔ تب ہی ایک دم ٹھاہ کی آواز کے ساتھ اوپر کوئی دروازہ بند ہوا۔ اس نے پتھر بن جانے کے خوف سے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی چلی گئی۔

آخری زینے سے اتر کر اس نے جیسے ہی برف زار پہ رکھا' اوپر بالکونی میں جلتا بلب بجھ گیا۔

باہر زور و شور سے برف گر رہی تھی۔ تازہ پڑی برف سے اس کے قدم پھسلنے لگے تھے۔ سفید سفید گالے اس کے بالوں اور جیکٹ پہ آٹھہرے تھے۔ وہ گرتے پڑتے ڈی جے کے بلاک بی ٹو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے پہلی دفعہ اپنی مانگی گئی کسی دعا پہ پچھتاوا ہوا تھا' "کاش! آج یہ برف نہ پڑتی۔"

بی ٹو کی دوسری منزل کی بالکونی میں وہ دم لینے کو رکی۔ اسے منزل یاد تھی' مگر کمرے کا نمبر بھول چکا تھا۔ اس نے ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کا پیالا بنا کر زور سے آواز دی۔

"ڈی جے۔۔۔ تم کہاں ہو؟"

"ڈی جے۔۔۔"

ایک دروازہ جھٹ سے کھلا اور کسی نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اندر کھینچا۔

"اگر تم دو منٹ مزید تاخیر کرتیں تو میں مر چکی ہوتی حیا!" ڈی جے بھی اس کی طرح تنہا اور خوف زدہ لگ رہی تھی۔ مگر اب اس کمرے میں آ کر حیا کا سارا خوف اڑن چھو ہو چکا تھا۔

"ڈرو مت' تمہارے لیے ہی تو آئی ہوں۔ مجھے پتا تھا' تم اکیلی ڈر رہی ہو گی' ورنہ میرا کیا ہے' میں تو کہیں بھی رہ لیتی ہوں۔" وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر بولی' پھر بے اختیار جمائی روکی۔

"مگر ڈی جے! میں سوؤں گی کدھر؟"

"ان تین خالی بیڈز پہ کانٹے بچھے ہوئے ہیں کیا؟"

"مگر ہالے نے کہا تھا کہ ترک لڑکیاں۔۔۔"

"فی الحال یہاں نہ ہالے ہے' نہ ہی ترک لڑکیاں۔۔۔"

"مگر اللہ تو دیکھ رہا ہے!" غیر ملک میں اس کا سویا ہوا خوفِ خدا جاگ اٹھا تھا۔

"اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہالے کو پتا نہیں لگنے دے گا۔ اب بستر میں گھسو اور سو جاؤ۔ خدا جانے مجھے کس پاگل کتے نے کاٹا تھا' جو ترکی آ گئی۔ آگے جھیل' پیچھے جنگل' اتنی وحشت۔۔۔"

ڈی جے کمبل میں لیٹے بڑبڑائے جا رہی تھی۔ نیند سے تو وہ بھی بے حال ہونے لگی تھی' سو ڈی جے کے قریبی بینک کی سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر کمبل میں لیٹ گئی۔

"حیا۔۔۔" وہ کچی نیند میں تھی' جب ڈی جے نے اسے پکارا۔

"ہوں؟" اس کی پلکیں اتنی بوجھل تھیں کہ وہ انہیں کھول نہیں پا رہی تھی۔ "سامنے والے کمرے میں بڑے ہینڈسم سے لڑکے رہتے ہیں' میں نے انہیں کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔"

"اچھا۔۔۔" اس کا ذہن غنودگی میں ڈوب رہا تھا۔

"اور سنو' وہ پلاؤ اتنا برا بھی نہیں تھا' ہمیں صرف سفر کی تھکاوٹ کے باعث برا لگا' اور سنو۔۔۔"

مگر ڈی جے کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ سو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

دروازے پہ مدھم سی دستک ہوئی تو وہ سرعت سے کرسی سے اٹھی۔ ایک نظر سوئی ڈی جے پہ ڈالی' دوسری اپنے زیر استعمال بینک پہ' جو دوبارہ سے بنا سلوٹ اور شکن کے بنایا جا چکا تھا اور جس پہ ترک لڑکیوں کے اعتماد کے خون کیے جانے کی کوئی نشانی باقی نہ تھی۔۔۔ اور دروازہ کھول دیا۔

"سلام علیکم ایکسچینج اسٹوڈنٹس!" ہالے نور ہشاش بشاش سی مسکراتی کھڑی تھی۔ وہ یوں تھی گویا دھلی ہوئی چاندنی۔ سیاہ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹے' ہلکی سبز

لمبی جیکٹ تلے سفید جینز پہنے 'شانے پہ بیگ اور ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑے وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔

"وعلیکم السلام' آؤ ہالے!" وہ مسکراتی ہوئی ایک طرف کو ہوئی۔

"تمہارے کمرے میں گئی تھی 'مگر تم ادھر نہیں تھیں میں نے اندازہ کیا کہ تم یہیں ہوگی۔" ہالے نے اپنا بیگ میز پہ رکھا اور کرسی کھینچ کر نفاست سے بیٹھی۔

"ہاں' میں علی الصبح ہی ادھر آگئی تھی۔ ڈی جے کی یاد آرہی تھی۔"

"خدیجہ سو رہی ہے؟" ہالے نے گردن اونچی کرکے اوپر دیکھا' جہاں ڈی جے دو موٹے کمبل گھٹڑی کی صورت خود پہ ڈالے سو رہی تھی۔

"ہاں اور شاید دیر تک سوتی رہے۔"

"اوہ۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہارے فون رجسٹرڈ کروانے چلیں آج۔ ترکی میں غیر ملکی فون پہ ترک سم کارڈ ایک ہفتے کے بعد بلاک ہو جاتا ہے۔"

"ہاں بالکل' تم لوگ جاؤ اور میرا فون بھی لے جاؤ' میں ابھی دو گھنٹے مزید سوؤں گی۔"

کمبلوں کے اندر سے آواز آئی تو ہالے مسکرا دی' مسکراتے ہوئے اس کی چمکتی سرمئی آنکھیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔

"چلو حیا! ہم دونوں چلتے ہیں۔"

وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑی ہو گئی تھیں۔ حیا صبح اپنے کمرے میں جاکر فریش ہو آئی تھی۔ ابھی وہ سیاہ چوڑی دار پاجامے اور ٹخنوں تک آتی سیاہ لمبی قمیص میں ملبوس تھی۔ شیفون کا دوپٹہ گردن کے گرد مفلر کی طرح لپیٹے' اور اوپر لمبا سیاہ سویٹر پہنے ہوئے تھی۔

"کچھ دن میرے خوش قسمت دن ہوتے ہیں' جب میرے پاس کار ہوتی ہے' اور کچھ دن بد قسمت دن جب میرے پاس کار نہیں ہوتی اور آج میرا خوش قسمت دن ہے۔" ہالے نے اٹھتے ہوئے بتایا۔

"ابھی ہم قریبی دکانوں میں جائیں گے' اگر وہاں سے فون رجسٹرڈ نہ ہوئے تو جواہر چلیں گے' اس کے بعد وہاں سے جہانگیر۔"

"جواہر؟" حیا نے ابرو اٹھائی' جہانگیر کو اس نے کسی ترک کا نام سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

"جواہر شاپنگ مال ہے۔ یورپ کا سب سے بڑا اور دنیا کا چھٹا بڑا شاپنگ مال!"

"وہ اچھا جیسے پاک ٹاورز۔۔" اوپر کمبلوں سے آواز آئی۔

"پاک ٹاور؟" ہالے نے گردن اٹھا کر خدیجہ کے کمبلوں کو دیکھا۔

"ہمارا پاک ٹاورز ایشیا کے سب سے بڑے شاپنگ مال شمار ہوتا ہے۔" وہ غنودہ آواز میں بولی۔

"نائس!" ہالے ستائش سے مسکرا کر باہر نکل گئی۔

حیا نے اس کے جانے کی تسلی کرلی' پھر لپک کر پیچھے آئی اور سیڑھی پہ چڑھ کر ڈی جے کا کمبل کھینچا۔

"یہ پاک ٹاورز ایشیا کا سب سے بڑا مال کب سے ہو گیا؟"

"اس نے کون سا جا کر چیک کر لینا ہے۔ تھوڑا شو مارنے میں کیا حرج ہے؟"

ڈی جے غڑاپ سے پھر کمبل میں گھس گئی۔

☼ ☼ ☼

ہالے ڈرائیو کرتے ہوئے متاسف سی بار بار معذرت کر رہی تھی۔ فون رجسٹر نہیں ہو سکے تھے۔ "ڈی آ" پورٹ کی دکان پہلے تو ملی نہیں' دوسری موبائل کمپنیوں کی دکانیں ہی ہر جگہ تھیں۔ یوں جیسے آپ کو زونگ کی دکان کی تلاش ہو اور ہر طرف یوفون کی دکانیں ہوں۔ بمشکل ایک دکان ملی تو اس کا منیجر شاپ بند کر کے جا رہا تھا۔ لاکھ منتوں پر بھی اس نے دکان نہیں کھولی اور چلا گیا۔ اب ہالے مسلسل شرمندگی کا اظہار کر رہی تھی۔

"بس کرو ہالے! بعد میں ہو جائے گا یہ کام' اب مجھے شرمندہ مت کرو۔"

"خیر' تمہارا دوسرا کام تو کروں' جہانگیر چلتے ہیں۔" ہالے نے گہری سانس اندر کھینچی۔ گاڑی سڑک پہ رواں دواں تھی اور کھڑکی کے باہر ہر سو برف دکھائی دے رہی تھی۔

"تم ایڈریس دکھاؤ' ہم پہنچنے والے ہیں۔"

"کدھر؟" حیا نے ناسمجھی سے ڈرائیو کرتی ہالے کو دیکھا۔

"جہانگیر اور کدھر؟"

"وہاں کیا ہے؟"

"تمہاری آنٹی کا گھر' کل کہا جو تھا کہ تمہیں لے جاؤں گی' صبح بتایا بھی تھا' بھول گئیں؟"

"تم۔۔ تم مجھے ادھر لے کر جا رہی ہو؟" وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"ہاں نا۔۔ اب ایڈریس بتاؤ' اسٹریٹ نمبر تو مجھے یاد رہ گیا تھا' آگے بتاؤ۔"

"وہ ہالے!" اس نے ہڑبڑا کر پرس سے وہ مڑا تڑا سا کاغذ نکالا۔۔ اس نے کاغذ پہ دیکھا' اس علاقے کا نام Cihangir لکھا تھا' وہ اسے سہانگیر پڑھتی رہی تھی' اب یاد آیا کہ ترکوں کا سی' جیم کی آواز سے پڑھا جاتا تھا۔ اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ ادھر جانا ہے وہ تحائف ہی اٹھا لیتی جو اماں نے بھیجے تھے۔ ذرا اچھے کپڑے ہی پہن لیتی' تھوڑا سا میک اپ ہی کر لیتی۔

"لو' یہ تو سامنے ہی تھا۔ اب تم جاؤ' مجھے ادھر تھوڑا کام ہے' میرا نمبر تم نے فون میں فیڈ کر لیا ہے نا؟ جب فارغ ہونا تو مجھے کال کر لینا۔ میں آجاؤں گی' گھنٹہ تو مجھے بھی لگ ہی جائے گا' پھر کھانا ساتھ کھائیں گے۔"

گاڑی رک چکی تھی۔ حیا نے بے توجہی سے اس کی ہدایات سنیں اور دروازہ کھول کر نیچے اتری۔

اس کے دروازہ بند کرتے ہی ہالے گاڑی زن سے آگے لے گئی۔

وہ ایک خوب صورت چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ بیرونی چار دیواری کی جگہ سفید رنگ کی لکڑی کی باڑ لگی تھی۔ گیٹ بھی لکڑی کی باڑ کا بنا تھا۔ گیٹ کے پیچھے چھوٹا سا صحن تھا اور اس کے آگے وہ بنگلہ۔

بنگلے کی گلابی چھت مخروطی تھی۔ داخلی سفید دروازہ اونچا تھا۔ اس تک چڑھنے کے لیے دو اسٹیپس بنے تھے۔ اسٹیپس کے دونوں اطراف شوخ رنگ پھولوں والے گملے رکھے تھے۔ تو یہ تھی وہ چھوٹی سی جنت' جس میں وہ رہتا تھا' اور جس سے باہر نکلنے کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

وہ گیٹ کو دھکیل کر' پتھروں کی روش پہ چلتی ان اسٹیپس تک آئی' اونچے سفید دروازے پہ سنہری رنگ کی تختی لگی تھی۔

"سکندر شاہ۔"

وہ ترک ہجوں میں لکھا نام اس کے پھوپھا کا ہی تھا۔ گھنٹی کی تلاش میں اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اس گھر میں بہت سی لکڑی کی کھڑکیاں بنی تھیں اور شاید کوئی کھڑکی کھلی تھی' جس سے مسلسل ایک ٹھک' ٹھک کی آواز آرہی تھی۔ جیسے کوئی ہتھوڑے یا کلہاڑے کو لکڑی پہ زور سے مار رہا ہو۔

اس نے اپنی کپکپاتی انگلی گھنٹی پہ رکھی اور سنہری ڈور ناب کے چمکتے دھات میں اپنا عکس دیکھا۔

کاجل سے لبریز بڑی بڑی سیاہ آنکھیں' دونوں شانوں پر سے پھسل کر نیچے گرتے لمبے بال اور سردی سے سرخ پڑتی ناک۔ وہ سیاہ لباس میں چینی کی مورت لگ رہی تھی' گھبرائی ہوئی پریشان سی مورت۔

اس نے گھنٹی سے انگلی ہٹائی تو ٹھک ٹھک کی آواز بند ہو گئی۔ چند لمحے بعد لکڑی کے فرش پہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی انجانی زبان میں بڑبڑاتا دروازہ کھولنے آرہا تھا۔

وہ لب کاٹتے ہوئے کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی' جب دروازہ کھلا۔ چوکھٹ پہ بچھے ڈور میٹ پہ اسے دروازہ کھولنے والے کے ننگے پاؤں دکھائی دیے۔ اس کی نگاہیں دھیرے سے اوپر اٹھتی گئیں۔

بلیو جینز اور اوپر گرے سویٹر میں ملبوس' وہ ایک ہاتھ میں ہتھوڑی پکڑے کھڑا تھا۔ سویٹر کی آستینیں اس نے کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں اور اس کے کسرتی بازو جھلک رہے تھے۔

حیا نے دھیرے سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا سانس لمحے بھر کو ساکت ہوا تھا۔

وہ ویسا ہی تھا جیسے اپنے بچپن کی تصاویر میں لگا کرتا تھا۔ وہی بھورے مائل بال، جو بہت اسٹائلش انداز میں ماتھے پہ گرتے تھے۔ پرکشش آنکھیں، اٹھی ہوئی مغرور ناک، سنہری رنگت کے تیکھے نقوش۔ وہ ماتھے پہ تیوری لیے آنکھیں سکیڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت ہینڈسم تھا۔

"سن کمسن؟" اس نے ترک میں کچھ پوچھا تو وہ چونکی۔

"سس۔۔۔ سبین سکندر۔۔۔ سبین سکندر کا گھر یہی ہے؟"

"جی یہی ہے۔" وہ انگریزی میں بتا کر سوالیہ جانچتی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

اسے لگا وہ بوسفورس کے پل پہ ہتھیلیاں پھیلائے کھڑی ہے، اور نیلے پانیوں کو چھو کر آتی ہوا اس کے بال پیچھے کو اڑا رہی ہے۔ وہ کسی گہرے خواب کے زیر اثر تھی۔ حسین خواب کے۔۔۔

"میں ان کی مہمان ہوں۔ پاکستان سے آئی ہوں۔" وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔

"کیسی مہمان؟" اس کا انداز اکھڑا اکھڑا سا تھا، جیسے وہ کسی ضروری کام میں مصروف تھا جس میں حیا مخل ہوئی تھی۔

"میں حیا ہوں۔۔۔ حیا سلیمان۔" اس نے پرامید نگاہوں سے جہان سکندر کا چہرہ دیکھا کہ ابھی اس کا نام سن کر اس کی پرکشش آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق۔۔۔

"کون حیا سلیمان؟"

اس کے قدموں تلے بوسفورس کا پل شق ہوا تھا۔ وہ بے دم سی نیچے گہرے نیلے پانیوں میں جا گری تھی۔

"کون حیا سلیمان؟" بے آواز دہراتے ہوئے وہ سن سی ہوتی، اسے تک رہی تھی۔ اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس شخص کے چہرے پہ زمانوں کی اجنبیت اور بیزاری تھی، پہچاننے یا نہ پہچاننے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ جہان سکندر تو اس سے واقف ہی نہ تھا۔

"کون، مادام؟" اس نے قدرے اکتا کر دہرایا۔

حیا نے خفیف سا سر جھٹکا، پھر لب بھینچ لیے۔

"میں سبین پھوپھو سے ملنے آئی ہوں۔ ان کے بھائی سلیمان کی بیٹی ہوں۔ وہ جانتی ہیں مجھے۔"

"او کے، اندر آجاؤ۔" وہ شانے اچکا کر واپس پلٹ گیا۔

وہ جھجک کر اوپر زینے پہ چڑھی، پائیدان کو دیکھ کر کچھ یاد آیا تو "فوراً" پیر جوتوں سے نکالے اور لکڑی کے فرش پہ قدم رکھا۔

فرش بے حد سرد تھا۔ دور راہداری کے اس پار جہاں اس نے جہان کو جاتے دیکھا تھا۔ وہاں سے ہتھوڑی کی ٹھک ٹھک پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

وہ راہداری عبور کر کے کچن کے کھلے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

امریکی طرز کا کچن نفاست سے آراستہ تھا۔ وسط میں گول میز کے گرد چار کرسیوں کا پھول بنا تھا ایک جانب کاؤنٹر کے ساتھ وہ حیا کی طرف پشت کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھوڑی تھی جس سے اوپر کیبنٹ کے کھلے دروازے کے جوڑ پہ زور زور ضربیں لگا رہا تھا۔

وہ چند لمحے کے شش و پنج کے بعد ڈھیٹ بن آگے آئی اور قدرے آواز کے ساتھ کرسی کھینچی بے اختیار چونک کر پلٹا۔

"ڈرائنگ روم میں۔۔۔ خیر!" وہ ناگواری سے بھینچ کر واپس کیبنٹ کی طرف مڑ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کیبنٹ کے دروازے کے جوڑ پہ کسی شے کو پکڑ رکھا تھا اور دوسرے سے ہتھوڑی مار رہا تھا۔

حیا سلیمان نے زندگی میں کبھی اتنی تذلیل محسوس نہیں کی تھی۔

"نام۔۔۔ نام۔۔۔" چند لمحے گزرے تو وہ اسی طرح کام کی طرف متوجہ، چہرے پہ ڈھیروں سنجیدگی پکارنے لگا۔

وہ انگلیاں مروڑتی، ٹانگ پہ ٹانگ رکھے سر جھکا بیٹھی تھی۔ دفعتاً چوکھٹ پہ آہٹ ہوئی تو سر اٹھایا۔ راہداری سے برتن ہاتھ میں لیے سبین پھپھو

پن میں داخل ہوئی تھیں۔ کندھوں تک آتے پ کٹ بال اور کھلے لمبے اسکرٹ کے اوپر سرمئی سٹر پہنے وہ کچھ بولتی آرہی تھیں۔ اسے بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر رکیں۔

"حیا۔ میرا بچہ۔۔۔ تم کب آئیں؟" برتن کاؤنٹر پہ پٹخ کر وہ والہانہ انداز میں اس کی طرف لپکیں۔ وہ جہان کے سرد مہر رویے پہ بددل سی بیٹھی تھی، مگر بڑبڑا اٹھی۔ بہت گرم جوشی سے اسے گلے لگا کر انہوں نے اس کی پیشانی چومی، پھر بے حد محبت و اپنائیت بھری آنکھوں سے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"فاطمہ نے بتایا تھا کہ تم کچھ روز تک آؤ گی ملنے۔ سوچ رہی تھی کہ تم تھکن اتار لو تو میں خود ہی تم سے ملنے آؤں گی۔ کیسی ہو تم؟ کتنی پیاری ہو گئی ہو۔"

وہ اب اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی محبت سے کا ہاتھ تھامے کہہ رہی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں پھپھو! آپ کیسی ہیں؟" وہ بدقت اپنی انہی کی طرح انگریزی میں گفتگو کر رہی تھی۔

"تم کتنی بڑی ہو گئی ہو۔ آنکھیں تو بالکل سلیمان ای جیسی ہیں۔"

"لوگ کہتے ہیں، میری آنکھیں میری اماں سے ہیں پھپھو!" وہ ہلکا سا جتا گئی۔

"بھئی مجھے تو تم میرے بھائی کا ہی عکس لگتی ہو۔ اور کیسے ہیں؟" وہ ایک ایک کا حال پوچھنے لگیں۔ وہ کی خیریت بتا کر کہنے لگی۔

"آپ داور بھائی کی شادی میں نہیں آئیں۔"

"داور بھی کتنا بڑا ہو گیا ہے کہ ماشاءاللہ شادی بھی ہ۔ کیسی رہی شادی؟ میں نے ویڈیو دیکھی تھی ری۔"

اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"کون سی ویڈیو؟" اس کا سانس رکنے لگا۔ ایک دم کمرے میں بہت گھٹن ہو گئی تھی۔

"وہ جو داور کے ولیمہ پہ اسٹیج پہ بنائی گئی تھی۔ تم نے فراک پہن رکھی تھی۔ میں نے روحیل کے فیس پہ دیکھی تھی۔"

"روحیل سے کانٹیکٹ ہے آپ کا؟" اس کی رکی سانس ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ بحال ہوئی۔ "اور آپ فیس بک یوز کرتی ہیں؟"

وہ ان دونوں کی جانب پشت کیے کیبنٹ کے دروازے پہ اسی طرح ضربیں لگا رہا تھا۔

"ہاں بس روحیل کی البمز دیکھنے کے لیے کرتی ہوں۔ تم استعمال کرتی ہو فیس بک؟"

"نہیں، پہلے کرتی تھی، پھر چھوڑ دیا۔ مجھے یہ سوشل نیٹ ورکس پسند نہیں ہیں، ہر شخص آپ کی زندگی میں جھانک رہا ہوتا ہے، انسان کی کوئی پرائیویسی ہی نہیں رہتی۔"

"ہوں، وہ حیا! تم جہان سے ملیں؟" ایک دم خیال آنے پہ انہوں نے گردن پھیر کر اپنے بیٹے کو دیکھا، جو چہرے پہ ڈھیروں سختی لیے اپنے کام کی جانب متوجہ تھا۔

"جہان! تم حیا سے ملے ہو؟ یہ سلیمان بھائی کی بیٹی اور روحیل کی بہن ہے۔ تمہاری فرسٹ کزن۔"

"ہوں۔ مل چکا ہوں۔" وہ اب جھک کر دراز سے کیل نکال رہا تھا۔

"یہ رشتہ داریاں یاد رکھنے کے معاملے میں بہت پور ہے۔ ویسے کوشش تو کرتا ہے اور اسے رشتے یاد بھی رہتے ہیں۔"

"دراصل پھپھو! انسان کو رشتے تب یاد رہتے ہیں جب اس کے ماں باپ اسے رشتے یاد دلائیں۔ بچوں کا کیا قصور؟ سارا قصور تو والدین کا ہوتا ہے۔ اگر والدین ہی اولاد کو کبھی رشتہ داروں سے نہ ملوائیں تو الزام کس کے سر پہ رکھا جائے؟"

سبین پھپھو کا جوش و خروش سے دمکتا چہرہ پھیکا پڑ گیا مگر وہ اسی طرح تلخی سے کہتی جا رہی تھی۔ جہان اب بھی کام میں مصروف تھا۔

"مثلاً" اب آپ لوگ ہیں۔ آپ کئی دہائیوں سے ادھر مقیم ہیں اور شاید آپ کا واپس آنے اور اپنے خونی رشتوں سے ملنے کا دل ہی نہیں چاہتا تو ہے ناں یہ ان فیئر نہیں؟"

پھپھو کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ لٹھے کی مانند سفید اور

پھیکا۔ پھر وہ بدقت ذرا سا مسکرائیں اور ہولے سے سر جھٹکا۔

"ٹھیک۔ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بس کبھی آہی نہیں سکے۔"

وہ اب مطمئن تھی۔ اپنے لہجے پہ اسے قطعی افسوس نہیں ہوا تھا۔ یہ ان لوگوں کی بے رخی تھی جس کے باعث اس کا ان سے تعلق ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔ وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق تھی۔ کسی کی منکوحہ ہو کر بھی خاندان کے لڑکے اس سے امید لگانے لگے تھے۔ اس کڑوی دوائی کا ذرا سا ذائقہ یہ ذمہ داران بھی تو چکھیں، جنہیں اپنے بیٹے کو یہ بتانا یاد رہا تھا کہ وہ اس کی کزن ہے اور بس۔

دفعتاً اس کی نگاہ فریج کے اوپر رکھے فوٹو فریم پہ پڑی۔ اس میں ایک خوش شکل درمیانی عمر کے صاحب مسکرا رہے تھے۔ سر پہ آرمی کیپ اور خاکی وردی کے کندھوں پہ سجے تمغے و پھول ستارے۔

"یہ پھوپھا ہیں؟" وہ گردن اٹھا کر حیرت سے تصویر دیکھنے لگی۔ سبین پھپھو نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور دھیرے سے سر ہلا دیا۔

"انسان کو رشتے تب یاد رہتے ہیں، جب اس کے ماں باپ اس کو رشتے یاد دلائیں۔" وہ پلٹے بنا خاصا جتا کر بولا تو حیا چونکی۔

وہ تو اسے اتنا لاتعلق سمجھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا، جہان نے اس کی تلخ باتوں پہ دھیان نہیں دیا، مگر نہیں، وہ بظاہر نظر انداز کیے سب سن رہا تھا۔ وہ ذرا محتاط ہو، سیدھی ہوئی۔

"میرا مطلب ہے، پھوپھا آرمی میں تھے؟ پاکستان آرمی میں؟"

"نہیں!" جہان ہتھوڑی سلیب پہ رکھ کر آگے بڑھا اور فریج پہ رکھا فریم ہاتھ سے گرا دیا۔ تصویر والی طرف فریج کی چھت پہ سجدہ ریز ہو گئی۔

"حیا! تم نے کھانا تو نہیں کھایا نا؟ میں بس لگا رہی ہوں۔" پھپھو اب سنبھل کر دوبارہ سے ہشاش بشاش سی ہو گئی تھیں۔

حیا جواب دیے بنا تحیر سے فریج کے اوپر اوندھے منہ گرے فریم کو دیکھے گئی۔ اس کے ایک سوال کے جواب میں جس بدمزاجی سے جہان نے فریم گرایا تھا، وہ ابھی تک اس پہ گنگ تھی۔

"ممی! آپ کا کیبنٹ ریڈی ہے۔" وہ اب کیبنٹ کا دروازہ کھول بند کر کے چیک کر رہا تھا۔

"تھینک یو جہان! اور باتھ روم کا نل بھی؟" پھپھو نے گول میز پہ پلاؤ کا بڑا سا پیالا رکھتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

"اے ہے۔ پھر وہی بدمزا پلاؤ؟" وہ خفیف سا سر جھٹک کر رہ گئی۔

"رہنے دیں پھپھو! میں۔۔۔"

"کوئی اگر مگر نہیں۔ میں تمہارے لیے کچھ خاص نہیں بنا سکی۔ سو مجھے اب انکار کر کے شرمندہ نہ کرنا۔"

جہان اب دراز سے ایک ڈبہ نکال کر اندر رکھی چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا، دفعتاً ڈور بیل بجی۔ جہان نے رک کر راہداری کی سمت دیکھا، پھر ڈبہ وہیں چھوڑا اور باہر نکل گیا۔

"شروع کرو حیا!" پھپھو نے مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے، پلیٹ اسے تھمائی۔ اس نے شکریہ کہہ کر چاول اور تھوڑا سا لوبیا کا مسالہ نکالا۔

راہداری کے اس پار جہان کسی مرد کے ساتھ ترک میں کچھ بول رہا تھا۔ دونوں کی مدھم سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

دوسرے ہی چمچے میں اسے وہ پلاؤ مزے دار لگنے لگا۔ ڈی جے صحیح کہہ رہی تھی، ان کو کھانا صرف سفر کی تھکن کے باعث بدمزا لگا تھا۔

"پھپھو! آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ۔۔۔"

"حیا۔۔۔"

اس کا چمچہ پکڑے منہ تک جاتا ہاتھ اور بات، دونوں رک گئے۔ بے حد بےیقینی سے اس نے گردن موڑی۔ جہان راہداری سے اسے پکارتا آرہا تھا۔ کیا اس مغرور اور بددماغ آدمی کو اس کا نام یاد رہ گیا تھا؟

"جی؟" وہ بمشکل بول پائی۔

وہ کچن کے کھلے دروازے سے اندر آیا تو حیا نے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں ایک ادھ کھلے گلابوں کا بوکے اور ایک سفید کارڈ تھا۔

"کیا تم یہاں رہنے آئی ہو؟" وہ اس کے سامنے کھڑا سختی سے پوچھنے لگا۔

"نن۔ نہیں۔" وہ سانس روکے ان سفید گلاب کے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

"تو پھر اپنے ویلنٹائن کو میرے گھر کا پتا دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

اس نے زیر لب ترکی میں کسی غیر مہذب لفظ سے اس نامعلوم شخص کو نوازا اور گلدستہ و کارڈ اس کے سامنے میز پہ تقریباً "پھینکنے" کے انداز میں رکھا۔

"نہیں۔ میں نے نہیں!" وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے پھولوں کے اوپر گرے سفید کارڈ کو دیکھے گئی جس پہ لکھے حروف نمایاں تھے۔

"فار مائی لو۔ حیا سلیمان فرام یور ویلنٹائن۔"

اور ویلنٹائن ڈے میں ہفتہ سے زیادہ دن باقی تھے۔ اسے یاد تھا۔

"یہ یہاں بھی پہنچ گیا؟" وہ ابھی تک بے یقین تھی۔

جہان اپنا ٹول بکس کھولے کھڑا چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ کچن میں ایک شرمندہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دفعتاً میز پہ رکھا حیا کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ گھر سے کال آرہی تھی۔ اس نے کال کاٹی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"حیا۔ بیٹھو بچے۔"

"میری۔ میری فرینڈ کال کر رہی ہے۔" وہ باہر آگئی ہے شاید، چلتی ہوں۔ اللہ حافظ۔"

حالانکہ پھپھو کی شکل سے ظاہر تھا کہ وہ جانتی ہیں کہ فون اس کی دوست کا نہیں تھا، مگر انہوں نے سر ہلا دیا۔ کہنے کو جیسے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ کرسی دھکیل کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

میز پہ سفید گلاب پڑے رہ گئے۔

ڈور میٹ پہ اس کے جوتے پونی ہی ... ان نے ان میں پاؤں ڈالے تو دیکھا، ایک کاغذ ان پہ گرا ہوا تھا۔ حیا جھکی اور وہ کاغذ اٹھا لیا۔ وہ کسی کوریئر سروس کی رسید تھی غالباً، جو شاید جہان نے دستخط کر کے وہیں پھینک دی تھی۔

وہ رسید الٹ پلٹ کر دیکھتی تیز قدموں سے گیٹ عبور کر گئی۔

وہ پھول آج ہی کی تاریخ میں کسی "اے آر" نے بک کروائے تھے۔ اے احمد اور آر سے۔۔۔؟

وہ دھیرے دھیرے سڑک کے کنارے چلنے لگی۔ رسید ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

وہ گھنٹہ بھر پہلے تک خود اس بات سے ناواقف تھی کہ وہ جہانگیر آرہی ہے، پھر اس "اے آر" کو کیسے علم ہوا؟ کیا وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا؟ کیا اس کا تعاقب کیا جارہا تھا؟ لیکن ایک پاکستانی آفیسر کے ایک غیر ملک میں اتنے ذرائع کیسے ہو سکتے تھے؟ صرف اسے تنگ کرنے کے لیے اتنی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کون کرے گا؟

وہ کالونی کے سرے پہ نصب بینچ پہ بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں برف سے ڈھکی گھاس پہ جمی تھیں۔ اسے ہالے کے آنے تک یہیں بیٹھنا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے اگلے روز ہی ڈورم آفیسر حقان سے بات کر کے اپنا کمرا بدلوا لیا تھا۔ اب وہ ڈی جے کے کمرے میں منتقل ہو چکی تھی۔ کمرے میں تیسری لڑکی ایک چینی نژاد "ہنگ لنگ" تھی۔ اس کا پورا نام اتنا لمبا اور پیچیدہ تھا کہ اس نے یورپ کے لیے اپنا نام "چیری" رکھ لیا تھا۔ وہ ایکسچینج اسٹوڈنٹ تھی اور پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔

چوتھی لڑکی ایک اسرائیلی یہودی "تالی" تھی۔ واقعتاً "تالی" کے درخت کی طرح لمبی چوڑی اور گھنگھریالے بالوں والی۔ وہ بھی ایکسچینج اسٹوڈنٹ تھی اور اس کے ساتھ والے کمرے کے فلسطینی ایکسچینج اسٹوڈنٹس (وہ ہینڈسم لڑکے جن کا ذکر ڈی جے نے پہلے

روز کیا تھا) سے گاڑی چھٹتی تھی۔ وہ فلسطینی لڑکے اور وہ اسرائیلی لڑکی ہر جگہ ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔ کیمپس کی سیڑھیاں ہوں یا ہاسٹل کا کامن روم۔ وہ چاروں ساتھ ہی ہوتے۔

"ان کے پاسپورٹ چیک کرواؤ یا تو یہ اسرائیلی نہیں ہے' یا وہ فلسطینی نہیں ہیں۔ اتنا اتحاد اور دوستی؟ توبہ ہے بھئی!" ڈی جے جب بھی ان کو ساتھ دیکھ کر آتی' یونہی کڑھتی رہتی۔ حیا نے ابھی ان لڑکوں کو نہیں دیکھا تھا' نہ ہی اسے شوق تھا۔

تمام ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس پیر تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں کسی کو کسی ایکسچینج اسٹوڈنٹ کا نام معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بس یہ فلسطینی ہیں' یہ چائنیز ہے' یہ نارویجن ہے' یہ ڈچ ہے اور یہ دونوں پاکستانی ہیں۔

ان کو ایک سے چار مضامین لینے کا اختیار تھا۔ ڈی جے نے دو لیے جبکہ حیا نے چار لیے۔ پانچ ماہ کے اختتام پہ امتحان دینے کی پابندی تھی' اور یہ پانچ ماہ لازماً ترکی میں گزارنے کی پابندی تھی' باقی چاہے کلاس اٹینڈ کرو' چاہے نہ کرو' چاہے ساری رات باہر گزارو' کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ خوب مزے تھے۔

سبانجی میں کلاس کے اندر لڑکیوں کے اسکارف پہ پابندی تھی۔

"تو یہ ہالے نور کیا کرتی ہوگی؟" حیا نے ڈی جے سے تب پوچھا' جب وہ دونوں نماز کے بہانے کلاس میں دکھائی جانے والی ترکی کی تعارفی پریزنٹیشن سے کھسک کر آئی تھیں اور اب پریئر ہال میں بیٹھی چپس کھا رہی تھیں۔

"وہ کیپ لے لیتی ہے' اور گردن میں مفلر یا کبھی کبھی وگ بھی لگا لیتی ہے مگر سر ڈھک کر جاتی ہے۔"

ڈی جے چپس کترتے ہوئے بتا رہی تھی۔ وہ دونوں چوکڑی مار کر کارپٹ پہ بیٹھی تھیں۔ ایک طرف الماری میں قرآن و اسلامی کتب کے نسخے سجے تھے۔ دوسری طرف بہت سے اسکارف اور اسکرٹس ٹنگے ہوئے تھے' جینز والی ترک لڑکیاں اسکرٹ پہن کر نماز پڑھ لیتیں اور پھر بعد میں وہ اسکرٹ وہاں لٹکا کر چلی جاتیں۔ استنبول کے ہر زنانہ پریئر ہال میں ایسے اسکارف اور اسکرٹس لٹکے ہوتے تھے۔

"مزے کی ہے یہ ہالے نور بھی۔" وہ انگلی سے بال پیچھے کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس نے بھی بلیو جینز کے اوپر گلابی سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ پاکستان میں تایا فرقان کی ڈانٹ کے ڈر سے وہ جینز نہیں پہن سکتی تھی' لیکن شکر کہ یہاں وہ لوگ نہیں تھے اور وہ زندگی کو اپنی مرضی سے لطف اندوز ہو کر گزار رہی تھی۔

"پرسوں تم اپنی پھپھو کے گھر گئی تھیں۔ کیسا ٹرپ رہا؟"

"اچھا رہا' پھپھو نے پلاؤ بنایا تھا' وہ واقعی اتنا بدمزا پکوان نہیں ہے' جتنا ہم سمجھے تھے۔"

"میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی۔"

جب پریئر ہال میں بھی خوب بور ہو گئیں تو باہر نکل آئیں۔

سرد نم ہوا دھیمی لے میں بہہ رہی تھی۔ ہری بھری گھاس پہ سبانجی کی گول سی عمارت پورے وقار کے ساتھ کھڑی تھی' جیسے ایک گولائی کی شکل میں بنے گھر کو ہیٹ پہنا دی جائے۔ شیشے کے اونچے داخلی دروازوں کے سامنے سیڑھیاں بنی تھیں۔ سیڑھیوں کے دونوں اطراف سبزہ پھیلا تھا۔

وہ دونوں فائلیں تھامے زینے اتر رہی تھیں' جب ڈی جے نے اس کا شانہ ہلایا۔

"یہ جو آخری زینے پہ تین لڑکے کھڑے ہیں' یہ وہی فلسطینی لڑکے ہیں۔ دیکھو! ٹالی بھی ان کے ساتھ ہے۔"

اس نے ہوا سے چہرے پہ آتے بال پیچھے ہٹائے اور دیکھا۔ وہ ہینڈسم اور خوش شکل سے لڑکے سیڑھیوں کے کنارے کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔

"آؤ ان سے ملتے ہیں۔"

"مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ تم جاؤ' مجھے ذرا کام ہے۔"

وہ کھٹ کھٹ زینہ اترتی آگے بڑھ گئی۔ ڈی جے نے اسے نہیں پکارا' وہ ان فلسطینیوں کی جانب چلی گئی تھی۔ اور وہ یہی چاہتی تھی' ڈی جے سے دوستی اپنی جگہ' مگر فی الحال وہ خوب آزادی سے استنبول کو کھوجنا چاہتی تھی۔ اکیلی اور تنہا۔

قریباً" گھنٹے بھر بعد وہ اپنے کمرے سے خوب تیار ہو کر نکلی اور پتھریلی سڑک پہ چلنے لگی۔

اس نے بلیو جینز کے اوپر ایک تنگ اسٹائلش سا سرخ کوٹ پہن رکھا تھا۔ شدید سردی کے باوجود ننگے پاؤں میں پانچ انچ اونچی سرخ پنسل ہیل پہنی تھی۔ ریشمی بال ہوا سے شانوں پہ اڑ رہے تھے اور گہرے کاجل کے ساتھ رس بھری کی طرح سرخ لپ اسٹک۔ اسے سرخ لپ اسٹک ہمیشہ بہت پرکشش لگتی تھی اور آج اسے معلوم تھا کہ وہ بہت حسین لگ رہی ہے۔

بس اسٹاپ آ چکا تھا' جب بادل زور سے گرجے۔ یہ بس اسٹاپ یونیورسٹی کے اندر ہی تھا۔ سبانجی کی ہیروئن "گورسل" تھی۔ گورسل بس سروس۔ وہ سبانجی کے طلبا کے لیے ہی چلتی تھی اور انہیں استنبول شہر تک لے جاتی تھی۔ ہالے نے اسے گورسل کا شیڈول رٹوا دیا تھا۔

"جس دن تمہاری گورسل چھوٹی' تمہیں ہالے نور بہت یاد آئے گی۔" اس نے سختی سے تاکید کرتے ہوئے کہا تھا۔ گورسل اپنے مقررہ وقت سے ایک لمحہ تاخیر نہیں کرتی تھی' اور اگر آپ چند سیکنڈ بھی دیر سے آئے تو گورسل گئی۔ اب دو گھنٹے بیٹھ کر اگلی گورسل کا انتظار کریں۔

جب وہ گورسل میں بیٹھی تو آسمان پہ سیاہ بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ جب گورسل نے باسفورس کا عظیم الشان پل پار کیا تو موٹی موٹی بوندیں پانی میں گر رہی تھیں اور جب وہ تاقسم اسکوائر پہ اتری تو استنبول بھیگ رہا تھا۔

تاقسم اسکوائر استنبول کا ایک مرکزی چوک تھا۔ وہاں عین وسط میں اتاترک سمیت تاریخی شخصیات کے مجسمے نصب تھے۔ "مجسمہ آزادی"' ایک طرف ہرا بھرا سا پارک تھا' اور دوسری طرف میٹرو ٹرین کا زیر زمین اسٹیشن۔

وہ بس سے اتری تو بارش تڑا تڑ برس رہی تھی۔ موٹے موٹے قطرے اس پہ گر رہے تھے۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے تیز تیز سڑک پار کرنے لگی۔ گیلی سڑک پہ اونچی ہیل سے چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ پوری طرح بھیگ چکی تھی۔

زیر زمین میٹرو اسٹیشن تک جاتی وہ چوڑی سیڑھیاں سامنے ہی تھیں۔ وہ تقریباً" دوڑ کر سیڑھیوں کے دہانے تک پہنچی ہی تھی کہ چیخ کی آواز آئی۔ وہ لڑکھڑائی اور گرتے گرتے بچی۔ اس کی دائیں سینڈل کی ہیل درمیان سے آدھی ٹوٹ گئی تھی۔ ٹوٹا ہوا دو انچ کا ٹکڑا بس اٹکا ہوا ساتھ لٹک رہا تھا۔

اس نے خفت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لوگ مصروف سے انداز میں چھتریاں تانے گزر رہے تھے۔ شکر کہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

بارش اسی طرح برس رہی تھی۔ اس کے بال موٹی گیلی لٹوں کی صورت چہرے کے اطراف میں چپک گئے تھے۔ اس نے کوفت سے ٹوٹے جوتے کے ساتھ زینہ اترنا چاہا' مگر یہ ناممکن تھا۔ جھنجلا کر وہ جھکی' دونوں جوتوں کے اسٹریپس کھولے' پاؤں ان میں سے نکالے اور جوتے اسٹریپس سے پکڑ کر سیدھی ہوئی۔

نیچے ٹرین کے پہنچنے کا شور مچ گیا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے زینہ اترنے لگی۔ اس کے پہلو میں گرے ہاتھ سے لٹکے دونوں جوتے اِدھر اُدھر جھول رہے تھے۔

میٹرو کا ٹکٹ ڈیڑھ لیرا کا تھا' چاہے جس اسٹیشن پر بھی اترو۔ وہ ٹکٹ لے کر جلدی سے ٹرین میں داخل ہوئی تاکہ کسی کے محسوس کرنے سے قبل ہی معتبر بن کر جوتے پہن کر بیٹھ جائے۔

میٹرو میں نشستیں دونوں دیواروں کے ساتھ سیدھی قطار میں تھیں۔ کھڑے ہونے والوں کے لیے اوپر راڈ سے ہینڈل لٹک رہے تھے۔ وہ ایک ہینڈل کو پکڑے بھیڑ میں سے راستہ بنانے لگی۔ اس کی نظر کونے کی ایک خالی نشست پہ تھی مگر آگے چلتے شخص نے گویا راستہ روک رکھا تھا۔ جب تک وہ کونے والی نشست پہ بیٹھا نہیں' وہ آگے نہیں بڑھ سکی' پھر اس کے بیٹھتے ہی دھم سے اس کے برابر کی جگہ پہ آ بیٹھی۔

وہ سیاہ سوٹ میں ملبوس شخص شناسا سا لگا۔ لمحے بھر کو اس کا سانس رک سا گیا۔

وہ جہان سکندر تھا۔

بہت قیمتی اور نفیس سیاہ سوٹ میں ملبوس جیل سے بال پیچھے کیے وہ چہرے پہ ڈھیروں سنجیدگی لیے اخبار کھول رہا تھا۔ بریف کیس اس نے قدموں میں رکھ دیا تھا۔

وہ متحیر سی بیٹھی، سامنے دیکھے گئی۔ کن اکھیوں سے اسے وہ چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے نظر آرہا تھا۔ سامنے والی قطار اور ان کی قطار کے درمیان جگہ اوپر لگے ہینڈل پکڑ کر کھڑے لوگوں سے بھرنے لگی تھی۔

وہ اس عجیب اتفاق پہ اتنی ششدر بیٹھی تھی کہ ہاتھ سے لٹکتے جوتے بھول ہی گئے۔ یاد رہا تو بس یہی کہ وہ کتنا قریب ہے۔۔۔ مگر کتنا دور تھا۔ وہ اسے کیسے مخاطب کرے؟ اور اگر وہ اسے دیکھے بنا ٹرین سے اتر گیا تو۔۔۔؟ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

مگر وہ تو شاید اسے پہچانتے بھی نہ۔ اس سرد مہر، کم گو شخص سے اسے یہی توقع تھی۔

چند پل سرکے تھے کہ جہان نے صفحہ پلٹنے کی غرض سے اخبار نیچے کیا اور انگوٹھے سے اگلے صفحے کا کنارہ موڑتے ہوئے ایک سرسری نگاہ پہلو میں بیٹھی لڑکی پہ ڈالی، پھر صفحہ پلٹ کر اخبار کی جانب متوجہ ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ جیسے رکا اور گردن موڑ کر دوبارہ اسے دیکھا۔

اس کی بھیگی موٹی لٹیں رخساروں سے چپک گئی تھیں۔ پانی کے قطرے ٹھوڑی سے نیچے گردن پہ گر رہے تھے، وہ اس کے متوجہ ہونے پہ بھی سانس روکے سامنے دیکھے گئی۔

"وہ۔۔۔ حیا!" وہ حیرت بھری آواز جیسے کہیں دور سے آئی تھی۔ حیا نے دھیرے سے پلکیں اس کی جانب اٹھائیں۔ کاجل کی لکیر مٹ کر نیچے بہہ گئی تھی، تب بھی ان اداس آنکھوں میں عجب سحر دکھتا تھا۔

"جہان سکندر!" وہ بدقت رسماً مسکرائی۔

"حیا! کیسی ہو؟ اکیلی ہو؟" کہنے کے ساتھ جہان نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ وہاں کوئی مسافر حیا کا ہم سفر نہیں لگ رہا تھا۔

"جی اکیلی ہوں۔"

"میں نے یہ بھی پوچھا ہے کہ کیسی ہو؟" مسکراتے ہوئے اپنائیت سے کہتے ہوئے وہ اخبار تہہ کرنے لگا۔ وہ جو اس کے لیے ہتھوڑی اور میخیں نہیں رکھ سکتا تھا اب اخبار رکھ رہا تھا؟ یا خدا! یہ وہی جہان سکندر تھا؟

"ممی تمہیں یاد کر رہی تھیں۔ تم پھر کب آؤ گی گھر؟" اخبار ایک طرف رکھ کر اب وہ پوری طرح حیا کی جانب متوجہ تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

"بس۔۔۔ شاید کچھ دن۔۔۔" کچھ کہنے کی سعی میں اسے محسوس ہوا، جہان کی نگاہیں اس کے ہاتھ پہ پھسلی تھیں اور پیشتر اس کے کہ وہ چھپا پاتی، وہ دیکھ چکا تھا۔

"جوتے کو کیا ہوا ہے؟ اتنی سردی میں ننگے پاؤں بیٹھی ہو۔ لاؤ دکھاؤ جوتا۔" وہ خفا ہوا تھا یا فکر مند، اسے سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ جہان جوتا لینے کے لیے جھکا تو اس نے بے بسی سے ٹوٹی ہیل والی سینڈل سامنے کی۔

"یہ تو الگ ہونے والا ہے۔" اس کے ہاتھ سے جوتا لے کر اب وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ حیا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"جہان! رہنے دو۔"

"ٹھہرو، شاید یہ جڑ جائے۔" وہ جھک کر دوسرے ہاتھ سے بریف کیس میں سے کچھ نکالنے لگا۔

"جہان! لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ پکڑو ذرا۔" وہ سیدھا ہوا اور جوتا حیا کو تھمایا، پھر ہاتھ میں پکڑا ٹیپ کھولا۔ کافی لمبا سا اسٹرپ کھول کر دانت سے کاٹا۔ حیا نے جوتا سامنے کیا۔ اس نے احتیاط سے ہیل کے نچلے لٹکتے حصے کو اوپر کے ساتھ جوڑا اور اس کے گرد چکروں میں ٹیپ لگاتا گیا۔

"اب پہنو۔" مرہم شدہ سینڈل کو اس نے جھک کر حیا کے قدموں میں رکھا۔ حیا نے اس میں پاؤں ڈالا اور اسٹرپ بند کرنے جھکی ہی تھی کہ زور پڑنے سے دوبارہ

والا ہیل کا ٹوٹا حصہ سرے سے ہی الگ ہو گیا۔

"اوہ!" وہ متاسف ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔" حیا کو شرمندگی نے آن گھیرا۔ یہ وہ سرد مہر اور تلخ جہان نہیں، بلکہ کوئی اپنا اپنا سا شخص تھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے جھک گیا تھا۔ حیا نے گردن ترچھی کر کے دیکھا۔ وہ اپنے بوٹ کا تسمہ کھول رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے روک پاتی، جہان اپنے بوٹ اتار چکا تھا۔

"پہن لو۔ باہر ٹھنڈ ہے، سردی لگ جائے گی۔" اب وہ جرابیں اتار کر اپنے بریف کیس میں رکھ رہا تھا۔ اس کا انداز عام سا تھا، جیسے وہ روز ہی میٹرو میں کسی نہ کسی کو اپنے جوتے دے دیتا ہو۔

"نہیں، رہنے دو۔ میں ابھی مارکیٹ سے نیا لے لوں گی۔"

"پہن لو حیا!"

"مگر تم کیا کرو گے؟ تم تو آفس جا رہے ہو نا؟"

جہان نے ذرا سا مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ "آفس کے کام سے شسلی جا رہا ہوں۔"

"پھر میں تمہیں جوتے واپس کیسے کروں گی؟ پتا نہیں کب تمہارے گھر آؤں اور۔۔۔"

"تم ابھی اکیلی کہیں نہیں جا رہیں۔ اگلا اسٹیشن شسلی ہے۔ ادھر ہم ساتھ مال سے جوتا خریدیں گے، میں اپنے بوٹ واپس لے لوں گا۔"

"مگر تمہارے آفس کا کام۔۔۔"

"میں ننگے پاؤں کام پہ جا کر کیا کروں گا؟" وہ دھیرے سے مسکرایا۔ وہ پہلی بار حیا کے لیے مسکرایا تھا۔ وہ یک ٹک کاجل کی مٹی مٹی سیاہی والی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ اس کے چہرے سے چپکی موٹی گیلی لٹیں اب سوکھنے لگی تھیں اور ٹھوڑی سے گرتے پانی کے قطرے خشک ہو چکے تھے۔

"جوتے پہن لو۔ لوگ اب بھی دیکھ رہے ہیں۔" وہ چونکی پھر خفیف سا سر جھٹکا اور دوہری ہو کر بوٹ پہننے لگی۔ وہ جب بھی سمجھتی کہ جہان لاتعلقی سے بیٹھا اس کی بات نہیں سن رہا، وہ اس کو وہی فقرہ لوٹا دیا کرتا تھا۔ وہ سیدھی ہوئی تو جہان اخبار کھول چکا تھا۔ عجیب دھوپ چھاؤں جیسا شخص تھا۔

شسلی کے اسٹاپ پہ میٹرو سے اترتے وقت حیا نے دیکھا، جہان بہت آرام سے اس کے آگے ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی خفت، کوئی جھجک نہ تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ چند زینے بعد ہی اوپر سیڑھیوں کے اختتام پہ سڑک اور کھلا آسمان دکھائی دینے لگا۔ وہ جہان کے دائیں طرف تھی۔ آخری سیڑھی چڑھتے ہوئے اس نے دیکھا زمین پہ ایک کیل نکلی پڑی تھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ مطلع کر پاتی، جہان کا پاؤں اس کیل کے نوکدار حصے پہ آیا۔ جب اس نے دوبارہ پاؤں اٹھایا تو اس کی ایڑھی سے خون کی ننھی سی بوند نکل گئی تھی۔ اس نے بے اختیار جہان کے چہرے کو دیکھا۔ وہ سکون سے سیدھ میں دیکھتا تیز تیز چل رہا تھا۔

"جہان۔۔۔ تمہارا پاؤں۔۔۔ تمہیں زخم آیا ہے۔" وہ اس کے ساتھ چلنے کی کوشش میں تیزی سے چلنے لگی تھی۔

"خیر ہے۔" وہ رکا نہیں۔

"مگر تمہارا خون نکلا ہے۔" وہ واقعتاً پریشان تھی۔

"بچوں والی بات کرتی ہو تم بھی۔ اتنے ذرا سے خون سے میں زخمی تو نہیں ہو گیا۔ بہت ٹف زندگی گزاری ہے میں نے۔ وہ دیکھو، جواہر مال۔"

اس سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہ چپ ہو کر اس کے ساتھ مال کے قریب آ رکی۔

وہ ایک بلند و بالا خوب صورت، نیلے سرمئی شیشوں سے ڈھکی عمارت تھی۔ اس کے اوپر بڑا سا ستارہ اور اطراف میں چھوٹے ستارے بنے تھے۔ بڑے ستارے کے اوپر "Cevahir Mall" لکھا تھا اور جہان ترکوں کی طرح "سی" کو "جے" پڑھ رہا تھا۔

"یہ جواہر مال ہے۔ یورپ کا سب سے بڑا اور دنیا کا چھٹا بڑا شاپنگ مال۔" وہ فخر سے بولا تھا۔

جواہر اندر سے بھی اتنا ہی عالیشان تھا۔ سفید ٹائلوں سے چمکتے فرش' اوپر تک نظر آتی پانچوں منزلوں کے برآمدے' اور ہر مال کی طرح وہ درمیان سے کھوکھلا تھا۔ عین وسط میں ایک اونچا کھجور کے درخت کی طرح کا ٹاور لگا تھا' اور یہ روشنیوں و قمقموں سے مزین ٹاور پانچویں منزل کی چھت تک جاتا تھا۔

وہ مسحور سی گردن اٹھائے اوپر پانچوں منزلوں کی بالکونیاں دیکھ رہی تھی' جہاں انسانوں کا ایک بے فکر' ہنستا مسکراتا ہجوم ہر سو بکھرا تھا۔ رنگ' خوشبو' امارت' چمک... آہ... وہ یورپ تھا۔

جوتے خرید کر وہ دونوں اوپر چلے آئے۔ حیا نے جوتوں کا بل بنواتے ہی جلدی سے ادائیگی کردی تھی تاکہ جہان کو موقع ہی نہ مل سکے۔ وہ اس پہ خاصا خفا ہوا' مگر حیا پر سکون تھی۔ بالے نور سمیت وہ کسی بھی ترک سے کچھ بھی لینے میں عار نہیں سمجھتی تھی مگر جہان سکندر کا احسان... کبھی نہیں!

چوتھی منزل کی دکانوں کے آگے بنی چمکتی بالکونی میں وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لوگوں کے رش میں رستہ بناتی حیا کو جہان کی رفتار سے ملنے کے لیے تقریباً" بھاگنا پڑ رہا تھا' پھر بھی وہ پیچھے رہ جاتی' اور وہ آگے نکل جاتا۔ وہ اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں اب تھکنے لگی تھی۔

شاید یہی ان کی زندگی کی کہانی تھی۔

جہان نے ایک شیشے کا دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر راستہ دیا۔ "تھینک یو۔" وہ سرخ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی' وہ اس کے پیچھے آیا۔

وہ ریسٹورنٹ تھا۔ نرم گرم ماحول' ہیٹر اور باہر کے سرما کی ملی جلی خنکی' مدھم روشنیاں' پیچھے بجتا دھیما میوزک۔

"آرڈر کرو۔" وہ ایک کونے والی میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھ گئے تو جہان نے کہا۔ اپنا کوٹ اتار کر اس نے کرسی کی پشت پہ رکھ دیا تھا اور اب وہ کف کھول کر آستین موڑ رہا تھا۔

"مگر یہ دعوت کس خوشی میں ہے؟" حیا دونوں کہنیاں میز پہ ٹکائے دائیں ہتھیلی ٹھوڑی تلے ٹکائے دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ چہرے کے دونوں اطراف میں گرتے بال اب خاصے سوکھ گئے تھے۔

"تمہارے اس خوب صورت کوٹ کی خوشی میں اور یہ دعوت میری طرف سے ہے' اب آرڈر کرو۔"

حیا نے گردن جھکا کر ایک سرسری نگاہ اپنے کوٹ پہ ڈالی۔

"مگر دعوت تمہاری طرف سے ہے تو آرڈر تمہیں ہی کرنا چاہیے۔" اس نے جہان کی بات نظر انداز کردی کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہے۔

"ٹھیک ہے۔" جہان نے مینو کارڈ اٹھایا اور صفحے پلٹنے لگا۔ وہ محو سی اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھے گئی۔ کیا وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے؟ اتنی بڑی بات وہ نہ جانتا ہو' کیا یہ ممکن تھا؟

"اس روز تم نے بہت غلط بات کی تھی جہان! مجھے تم پہ بہت غصہ آیا تھا۔" جب وہ آرڈر کرچکا تھا وہ یوں ہی بند مٹھی ٹھوڑی تلے ٹکائے اسے تکتے ہوئے بولی۔

"میں نے کیا کیا تھا؟" وہ حیران ہوا۔

"پتا نہیں کس نے میرے نام وہ پھول بھیجے اور ز نے کہا کہ میرا ویلنٹائن... میں ایسی لڑکی نہیں ہوں جہان! نہ ہی میں جانتی ہوں کہ وہ پھول کس نے بھیجے تھے۔"

"اوکے!" جہان نے سمجھنے والے انداز میں اثبا میں سر کو جنبش دی' مگر وہ جانتی تھی' اسے یقین نہ آیا۔

ریسٹورنٹ میں گہما گہمی تھی۔ ارد گرد ویٹرز میزوں کے درمیان راستہ بناتے ٹرے اٹھائے تیزی سے آ جا رہے تھے۔ پس منظر میں بجتی موسیقی کے سر بدل رہے تھے۔ اب ایک ترک گلوکار دھیمی لے والا گیت گا رہا تھا۔

"ویسے تم صبح صبح کہاں جا رہی تھیں؟"

"میں یہیں استقلال ہی آرہی تھی' شاپنگ کرنے۔"

ویٹر کافی لے آیا تھا اور اب ان دونوں کے درمیان ہ کار ٹرے سے دوسرا کپ اٹھا کر میز پہ رکھ رہا تھا۔

"بہادر لڑکی ہو' اکیلی گھوم پھر لیتی ہو۔" جہان نے مسکرا کر کہتے ہوئے اپنی کافی میں شکر ڈالی۔

"استنبول میں یہ بہادری مہنگی تو نہیں پڑے گی؟"

"مطلب؟" کافی کا بھاپ اڑاتا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے جہان کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔ اس نے ایک گھونٹ بھر کر کپ نیچے رکھا۔

"مطلب ڈرگ مافیا' آرگنائزڈ کرائم اور اسٹیٹ سیکرٹ آرگنائزیشن جیسی ترکیبات سے واسطہ تو نہیں پڑے گا؟" وہ کہنیاں میز پہ رکھے آگے ہوئی اور چہرے پہ سادگی سجائے آہستہ سے بولی۔ "کیونکہ سنا ہے یہاں ان سب سے پالا پڑ سکتا ہے۔"

"کس سے سن لیں تم نے ایسی خوف ناک باتیں؟" جہان نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

"تم بتاؤ' یہ پاشا کون ہے؟"

"پاشا کو نہیں جانتیں تو ترکی کیوں آئی ہو؟ مصطفیٰ کمال پاشا... یا کمال اتاترک... وہ ترکوں کا باپ تھا۔"

"وہ نہیں' میں استنبول کے پاشا کی بات کر رہی ہوں' عبدالرحمان پاشا کی۔"

کافی کا کپ لبوں تک لے جاتے ہوئے جہان نے ... کرنا سمجھی سے دیکھا۔

"کون؟" کافی سے اڑتی بھاپ لمحے بھر کے لیے اس کے چہرے کو ڈھانپ گئی۔

"ایک بھارتی اسمگلر جو یورپ سے ایشیا اسلحہ اسمگل کرتا ہے۔"

"کم آن!" اس نے کپ رکھ کر سنجیدگی سے حیا کو دیکھا۔ "استنبول میں ایسا کوئی مافیا راج نہیں ہے۔ یہ کس نے تمہیں کہانیاں سنا دی ہیں؟ یوں ہی مشہور ہونے کے لیے کسی نے اپنے بارے میں کوئی افواہ اڑائی ہوگی۔ تم استنبول کو کیا سمجھ رہی ہو؟"

... کی طرح وہ ایک خالص ترک تھا۔ اپنے ... کے لیے جی جان سے تیار تیار۔

ویٹر جہان کے اشارے پہ بل لے آیا تھا اور اب جہان اپنے بٹوے سے کارڈ نکال کر اس کی فائل میں رکھ رہا تھا۔

"رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے نا۔"

"حیا! یہ پاکستان نہیں ہے۔" جہان نے ذرا تفاخر سے جتا کر کہا تو اس کے لب بھینچ گئے۔ کارڈ رکھ کر جہان نے فائل بند کرکے ایک طرف رکھی۔

"پاکستان میں بھی یہ سب نہیں ہوتا اور بل میں دوں گی۔" حیا نے تیزی سے فائل اٹھائی اور کھولی۔

"جیسے میں جانتا ہی نہیں۔" جہان کی اگلی بات لبوں میں رہ گئی۔

ان کے دائیں طرف سے ایک ویٹر ٹرے اٹھائے چلا آرہا تھا۔ اچانک ایک دوسرا ویٹر تیزی سے اس کے پیچھے سے آیا اور پہلے ویٹر سے آگے نکلنے کی کوشش کی۔ پہلے ویٹر کو ٹھوکر لگی' وہ توازن برقرار نہ رکھ پایا اور نتیجتاً" اس کی دائیں ہتھیلی پہ سیدھی رکھی لکڑی کی ٹرے شڑ شڑ کرکے بھاپ اڑاتے بیف چلی سمیت الٹ گئی۔ میز پہ رکھے حیا کے ہاتھ پہ ٹرے اور گرم بیف اکٹھے آکر لگے۔ وہ بلبلا کر کھڑی ہوئی۔ فائل اور بل نیچے جا گرے۔

"آئی ایم سوری... آئی ایم سوری..." دونوں ویٹر بیک وقت چیزیں ٹھیک کرنے لگے۔ ٹرے سے کافی کا کپ بھی الٹ گیا تھا اور ساری کافی اب فرش پر گری پڑی تھی۔

جہان ناگواری سے ترک میں انہیں ڈانٹنے لگا۔ چند منٹ معذرتوں اور میز صاف کرنے میں لگ گئے۔ وہ واپس بیٹھا تو حیا اپنی کلائی سہلا رہی تھی۔

"تمہیں چوٹ آئی ہے۔ دکھاؤ' زیادہ جل تو نہیں گیا۔" اس نے ہاتھ بڑھایا' مگر حیا نے کلائی پیچھے کرلی۔

"ذرا سی چوٹ سے میں زخمی تو نہیں ہوگئی۔ بہت ٹف زندگی گزاری ہے میں نے۔" بظاہر مسکرا کر وہ درد کو دبا گئی۔ ہتھیلی سرخ پڑ چکی تھی اور شدید جل رہی تھی۔

"میری بات اور ہے' ہاتھ دکھاؤ!"

مگر اس نے ہاتھ گود میں رکھ لیا۔

"ٹھیک ہے' اِٹس لو کے' کافی کا شکریہ' اب ہمیں چلنا چاہیے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بل والی بات اسے بھول گئی تھی۔
"مگر کافی تو ختم کرلو۔" وہ قدرے پریشانی سے کھڑا ہوا۔
"رہنے دو' انتہائی بدتہذیب ویٹرز ہیں یہاں کے' چلو۔" واپسی پہ وہ اسے میٹرو اسٹیشن تک چھوڑنے آیا تھا۔ زیر زمین جاتی سیڑھیوں کے دہانے پہ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔
"تم واپس ٹاقسم نہیں آؤ گے؟"
"نہیں' وہ دفتر یہاں قریب ہی ہے' جس سے کام کے سلسلے میں ملنے آیا تھا' اس طرف۔" جہان نے بازو اٹھا کر دور ایک طرف اشارہ کیا۔ اس نے سفید شرٹ کی آستین یوں ہی کہنیوں تک موڑ رکھی تھی اور کوٹ بازو پہ ڈال رکھا تھا۔ ٹائی کی ناٹ اب تک ڈھیلی ہوچکی تھی۔ وہ یقیناً" اس کا ایک ورکنگ ڈے خراب کرچکی تھی۔
"ویسے تم کیا کرتے ہو؟" وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی گردن اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔
"میں ایک غریب سا ریسٹورنٹ اونر ہوں' استقلال اسٹریٹ پہ جو پہلا برگر کنگ ہے' وہ میرا ہے۔ استقلال اسٹریٹ ٹاقسم کے بالکل ساتھ ہے۔ دیکھی ہے تم نے؟"
"اوں ہوں۔" اس نے گردن دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلائی۔
"تم اس ویک اینڈ پہ گھر کیوں نہیں آجاتیں؟ ممی خوش ہوں گی۔"
"اور تم؟" بے ساختہ لبوں سے پھسلا۔
"میں تو ویک اینڈ پر بھی ریسٹورنٹ میں ہوتا ہوں۔"
"پھر فائدہ؟" اس نے سوچا۔
"کوشش کروں گی۔" وہ مسکرادی' اس نے دایاں ہاتھ جیب سے نکال کر بال پیچھے ہٹائے۔
"تمہارا ہاتھ ابھی تک سرخ ہے' اگر کسی دوست نے پوچھ لیا تو کیا کہو گی؟"
"کہہ دوں گی کہ گیلی برف کے ساتھ کیچڑ تھی گھاس پہ' وہیں پھسل گئی۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ "اب کزن کے ساتھ کافی پینے کا قصہ سنانے سے تو رہی۔"
"پھسل گئی تو ہتھیلی رگڑی گئی؟"
"ہاں!"
"اور گھٹنے؟" جہان نے مسکرا کر اس کی جینز کی طرف دیکھا۔
"مطلب؟" حیا نے ابرو اٹھائے۔
"لڑکی! کور اسٹوری پوری بنایا کرو۔ اگر تم ہتھیلیوں کے بل کیچڑ میں گرو تو اصولاً" تمہارے گھٹنوں پر بھی رگڑ آنی چاہیے۔" پھر وہ چند قدم چل کر گھاس کے قطعے کی طرف گیا' جھک کر تین انگلیوں سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور واپس آکر اس کے سامنے کی۔
"اسے اپنی جینز پہ لگادو' ورنہ تمہاری فرینڈز یقین نہیں کریں گی۔"
"اتنا بھی کوئی شکی مزاج نہیں ہوتا جہان سکندر!" اس نے ہنس کر اپنے پوروں پہ ذرا سی گیلی مٹی لی اور جھک کر گھٹنوں کے اوپر جینز پہ مل دی' پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے سیدھی ہوئی۔
"میں کوشش کروں گا کہ ہفتے کی صبح سارا کام کرکے گھر آجاؤں' تم ہفتے کی شام میں ضرور آنا۔"
پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کم گو' سنجیدہ طبیعت کا' لیے دیے رہنے والا شخص ضرور ہے' مغرور بھی ہے اور جلدی گھلتا ملتا بھی نہیں' مگر اندر سے وہ بہت خیال رکھنے والا بھی ہے اور باریک بین بھی' جو معمولی باتیں وہ نظرانداز کردیتی تھی' وہ جہان کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہیں رہتی تھیں۔
وہ جب ہاسٹل میں واپس آئی تو ڈی جے اور ہالے ایک رسالہ کھولے کسی طویل بحث میں مگن تھیں۔ ڈی جے کی نگاہ سب سے پہلے اس کے سرخ ہاتھ پر پڑی۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"ایک جگہ گیلی برف کے ساتھ کیچڑ تھی' وہیں پھسل گئی۔" پھر بات بدلنے کی غرض سے بولی۔ "ہالے! یہ بالکونی بتی کون جلاتا ہے؟ جیسے ہی اس کے نیچے جاؤ تو وہ جل اٹھتی ہے۔"
ہالے غور سے اس کے کوٹ کو دیکھ رہی تھی' اس کے سوال پہ نگاہیں اٹھا کر اس کو دیکھا۔
"ان میں آٹومیٹک سینسرز لگے ہیں' وہ اپنی رو میں کسی انسان کی موجودگی پر یا پھر تیز ہوا' آندھی وغیرہ میں خود بخود جل اٹھتی ہیں۔"
"اور دروازہ بہت دیر سے بند ہوا' خود بخود۔"
"ان دروازوں کے کیچر سلو ہیں۔ یہ چوکھٹ پہ دیر سے آکر لگتے ہیں' تاکہ ہر وقت کی ٹھاٹھا سے طلبا کی پڑھائی ڈسٹرب نہ ہو۔"
"آہاں۔" ڈی جے نے سمجھ کر سر ہلایا۔ "ہمارے ہاں بھی ہاسٹلز میں ایسی لائٹس اور دروازے۔۔۔"
"نہیں ہوتے۔" حیا نے ڈی جے کی بات تیزی سے کاٹی۔ "اور پاک ٹاور ایشیا کا دوسرا بڑا مال نہیں ہے' ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی۔"
وہ جواہر دیکھ آئی تھی اور اسے اس بڑھک پہ خفت ہوئی تھی۔
"حیا!" ڈی جے نے احتجاجاً" گھورا۔ ہالے ابھی تک حیا کا کوٹ دیکھ رہی تھی۔ حیا الماری کی طرف چلی گئی تو ہالے گہری سانس لے کر بولی۔
"پھر حیا! تمہیں کسی ہینڈسم لڑکے نے کافی پلائی؟" وہ جو ٹوٹی جوتی والا شاپر الماری میں رکھ رہی تھی' بری طرح چونک کر پلٹی۔
"نہیں۔۔۔ کیوں؟" وہ تیزی سے بولی۔
"کافی' چائے' لنچ۔۔۔ کچھ بھی نہیں؟"
"نہیں' مگر کیوں؟"
"تم عقل مند' جو سرخ کوٹ پہن کر گئی تھیں' شہر کی سیر پہ استنبول میں' اگر اتنا زیادہ سرخ رنگ پہن کر اور بڑی میک اپ کرکے باہر نکلا جائے تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ۔۔۔" ہالے نے مسکراہٹ دبائی کہ "یو آر لکنگ فار اے ڈیٹ' یا پھر ون نائٹ اسٹینڈ! یہاں تو لوگ ویلنٹائن ڈے پہ بھی سرخ پہن کر نہیں نکلتے۔"
"اچھا؟ پتا نہیں۔" وہ دانستہ ان کی طرف سے رخ موڑ کر الماری میں سے چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔
"یہ دعوت کس خوشی میں ہے؟"
"تمہارے اس خوب صورت کوٹ کی خوشی میں۔"
مارے تضحیک کے اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ وہ جہان کی مسکراہٹیں' وہ شائستگی' وہ ریسٹورنٹ لے جانا' وہ سب کسی اپنائیت کے جذبے کے تحت نہیں تھا' بلکہ۔۔۔ بلکہ وہ اسے کوئی بکاؤ مال سمجھ رہا تھا؟ خود کو پلیٹ میں رکھ کر پیش کرنے والی لڑکی؟ کوئی پیشہ ور۔۔۔؟
اس کے دل پہ بہت سے آنسو گر رہے تھے۔ جہان سکندر ہمیشہ اسی طرح اسے بے عزت کردیا کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

آہستہ آہستہ وہ جہان سکندر کے استنبول میں ایڈجسٹ ہوتی جارہی تھی۔
ڈی جے کی نیند اور نسیان البتہ اسے عاجز کردیتے تھے۔ ڈی جے کو ذرا کہیں ٹیک مل جاتی' وہ آنکھیں بند کرکے سونے کے لیے تیار ہوجاتی اور پھر اس کا بھلکڑپن۔۔۔ حیا جب بھی کچھ فوٹو کاپی کروانے جاتی' اسے وہاں لاوارث پڑے کسی رجسٹر' کسی نوٹس کے جتھے' کسی کتاب پہ ہمیشہ شناسائی کا گمان گزرتا۔ وہ اسے اٹھا کر دیکھتی تو بڑا بڑا "ڈی جے" لکھا ہوتا تھا۔ وہ ہر چیز واپس لا کر ڈی جے کے سر پہ مارا کرتی تھی۔ اور ڈی جے "یہ ادھر کیسے پہنچ گیا؟" کہہ کر ہنسنے لگ جاتی۔
سبانجی میں ان کا ایک مخصوص آئی ڈی کارڈ بنا تھا۔ اس پہ تصویر کھنچوانے کی شرط سر اور گردن کھلی رکھنا تھی۔ وہ موبائل کے پری پیڈ کارڈ کی طرح تھا۔ کورسل کا ٹکٹ' فوٹو کاپیز کی رقم اور دوپہر کے کھانے کا بل اسی کارڈ پہ ادا ہوتا تھا۔ اس میں موبائل کے ایزی لوڈ کی طرح بیلنس ڈلوایا جاتا تھا۔ انہیں ان پانچ ماہ میں ہر مہینے

ایک ہزار یوروز کا اسکالر شپ ملنا تھا، مگر چند تیکنیکی مسائل کے باعث کسی بھی اسکالر شپ ایکسچینج اسٹوڈنٹ کے فروری کے ایک ہزار یوروز نہیں آئے تھے۔ امید تھی کہ مارچ میں اکٹھے دو ہزار مل جائیں گے اور پھر آگے ہر مہینے باقاعدگی سے ملا کریں گے۔ تب تک پاکستان سے آئی رقم سے گزارا کرنا تھا۔ سو آج کل سب ایکسچینج اسٹوڈنٹس کا ہاتھ تنگ تھا۔

دوپہر کا کھانا وہ سبانجی کے ڈائننگ ہال میں کھاتی تھیں۔ رات کا کھانا اپنے کمرے میں خود بنانا ہوتا۔ ہر بلاک میں ایک کچن تھا، جہاں پر اسٹوڈنٹ اپنا ناشتا اور رات کا کھانا تیار کرتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہاں طلبا کے لیے خصوصی ڈیزائن کردہ چولہے تھے، اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں کوئی پڑھائی میں مگن چولہے پہ کچھ رکھ کر بھول جائے یا گیس کھلی چھوڑ دے اور نقصان نہ ہو، وہ چولہے آٹومیٹک تھے۔ ہر پندرہ منٹ بعد جب چولہا خوب گرم ہو جاتا تو خود بخود بند ہو جاتا۔ پھر پانچ منٹ بعد دوبارہ جل اٹھتا۔ ان کو بند ہونے سے روکنے کا کوئی طریقہ نہ تھا اور ایسے بے کار چولہوں پہ دیسی کھانے پکانا ناممکن تھا۔

ہاسٹل کے بلاکس کے قریب ہی ایک بہت بڑا لگژری سپر اسٹور "دیاسا" تھا۔ "دیا" اس کا نام تھا اور "سا" ترک میں اسٹور کو کہتے تھے۔ وہ دونوں دیا اسٹور سے راشن لاتیں اور بل آدھا آدھا تقسیم کر لیتیں۔ ایک رات حیا کھانا بناتی اور وہ بہت اچھا سادہ سی کھانا ہوتا۔ دوسری رات ڈی جے کی باری ہوتی اور جو وہ بناتی، وہ کچھ بھی ہوتا، مگر کھانا نہ ہوتا۔

"ڈی جے! میں یہ تمہارے سر پہ الٹ دوں گی۔" وہ جب بغیر بھنی ابلی ہوئی سبزی کا سالن دیکھتی یا پھر ابلے چاولوں پہ آملیٹ کے ٹکڑے تو ڈی جے پہ خوب چلایا کرتی تھی۔

اور پھر ترکی کے مسالے... وہ اتنے پھیکے ہوتے کہ حیا چار، چار چمچے بھر کے سرخ مرچ ڈالتی تو بھی ذرا سا ذائقہ آتا۔ کھانے اس کے بھی پھیکے ہوتے، مگر ڈی جے سے بہتر تھے۔ البتہ اپنے کمرے میں روز جب صبح ہوتی تو ڈی جے بینک کی سیڑھیاں پھلانگ کر اترتی اور اسی طرح نہار منہ کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی، پھر پٹ کھول کر باہر چہرہ نکال کر زور سے آواز لگاتی۔

"گڈ ما آآ آرننگ ڈی جے۔" اور جواب میں دور کسی بلاک سے ایک لڑکا زور سے پکارتا۔ "ٹی ٹی ٹی بے۔" "غالباً" وہ ڈی جے کے الفاظ ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ڈی جے روز صبح صبح یہی عمل دہراتی۔ اس کے ٹی بے کہنے کے بعد وہ پکارتی "ڈا... لیل..." اور وہ لڑکا جواباً" چلاتا۔

"ڈا... دی..." اس کے بعد حیا کمبل سے منہ نکال کر کشن اٹھاتی اور ڈی جے کو زور سے دے مارتی۔ یوں اس کی اور اس ان دیکھے لڑکے کی گفتگو اختتام پذیر ہوتی۔

گھر روز ہی بات ہو جاتی تھی۔ البتہ موبائل کی رجسٹریشن میں مسئلہ ہوا تھا۔ ڈی جے کا تو رجسٹر ہو گیا مگر حیا کے ساتھ ہوا یوں کہ اس کے پاسپورٹ پہ جہاں انٹری کی تاریخ پانچ فروری لکھی تھی، وہاں اوپر آفیسر کے دستخط کے باعث پانچ کا ہندسہ بظاہر چھ لگ رہا تھا۔ تاریخ کا ذرا سا فرق مشکل پیدا کرنے لگا اور اس کا فون رجسٹر نہ ہو سکا۔ وہ ترک سم اس پہ استعمال نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ ہفتے کے بعد غیر رجسٹر فون پہ ترک سم بلاک ہو جاتی تو ہالے نے اسے اپنا ایک پرانا موبائل سیٹ لا دیا، اور وہ اس بدصورت، موٹے، بھدے فون کو برداشت کرنے پہ مجبور ہو گئی۔ اپنے موبائل پہ اس نے پاکستانی سم لگا دی تھی اور وہ رومنگ پہ ٹھیک چل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا کہاں کا پلان ہے؟" حیا نے چاولوں کی پلیٹ میں سے چمچہ بھرتے ڈی جے سے پوچھا۔ یہ پلاؤ اب اس کا اور ڈی جے کا مرغوب ترین کھانا بن چکا تھا۔ اور ساتھ ترک کوفتے اور پھلوں کا سلاد۔ وہ دونوں آمنے سامنے ڈائننگ ہال میں بیٹھی جلدی جلدی کھا رہی تھیں۔

"میں سسلی جانا چاہتی ہوں، شاپنگ وغیرہ کے لیے اور تم تو اپنی پھپھو کے گھر جاؤ گی نا؟" ڈی جے کوفتے کے سالن میں سے تیل نکال کر دوسرے پیالے میں ڈال رہی تھی۔ وہ یوں ہی ہر سالن میں سے تیل نکالا کرتی تھی۔ تلی ہوئی چیزوں کو اخبار میں لپیٹ کر دباتی اور پھر کھاتی۔

"ہاں اور تم ہڈیوں کا ڈھانچہ اسی لیے ہو۔" حیا نے رک کر ناگواری سے اس کے عمل کو دیکھا۔ وہ بنا اثر لیے اوپر آیا تیل دوسرے پیالے میں انڈیلتی رہی۔

ڈائننگ ہال بے حد وسیع و عریض تھا۔ ہر سو زرد روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہاں دو لمبی سی قطاروں میں مستطیل میزیں لگی تھیں اور دونوں قطاروں کے چاروں طرف کرسیوں کی سرحد بنی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی، رش اور شور سا تھا۔

دفعتاً" پلیٹ کے ساتھ رکھا حیا کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے چمچہ پلیٹ میں رکھا اور نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے چمکتی اسکرین کو دیکھا۔

تایا فرقان ہوم کالنگ...

"ہیلو؟" اس نے فون اٹھا لیا۔

"حیا! ارم بول رہی ہوں۔"

"ہوں... کیسی ہو ارم؟" نوالہ منہ میں تھا، اس لیے اس کی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"ٹھیک... تم سناؤ۔" ارم کی آواز میں ذرا بے چینی تھی۔

"سب خیریت ہے، تم بتاؤ، کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

"نہیں... ہاں... سنو، ایک بات تھی۔" ارم کی آواز دھیمی سرگوشی میں بدل گئی۔

"کہو، میں سن رہی ہوں۔" حیا نے آہستہ سے چمچہ رکھا اور نیپکن سے لبوں کو دبایا۔ اس کے ذہن کے پردے پہ وہ ویڈیو ابھری تھی۔

"وہ... یار عجیب سی بات ہے، مگر تم ابا وغیرہ کو نہ بتانا۔ اصل میں کل شام جب میں یونیورسٹی سے واپس آئی تو گیٹ کے قریب ایک... ایک خواجہ سرا تھا... اس نے مجھے روکا۔"

حیا بالکل دم سادھے سنے گئی۔ پل بھر کو اسے ڈائننگ ہال کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ اس کی سماعت میں صرف ارم کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"پہلے تو میں ڈر گئی، مگر اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تو مجھے تسلی ہوئی۔ وہ مجھ سے تمہارا پوچھ رہا تھا کہ حیا باجی کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟ امریکہ پہنچ گئیں، خیریت سے؟ میں نے بتایا کہ وہ امریکہ نہیں، ترکی گئی ہے۔ پھر وہ کہنے لگا کہ میں تمہیں اس کا سلام اور..." وہ جھجکی۔ "اور دعا دے دوں۔"

"اور کچھ؟"

"نہیں، مگر تم ابا وغیرہ کو مت بتانا کہ میں نے ایک خواجہ سرا سے بات کی ہے۔"

"یہ بات تمہیں اس سے مخاطب ہونے سے قبل سوچنی چاہیے تھی۔ بہرحال میں نہیں جانتی، وہ کون ہے۔ کیا نام بتایا اس نے اپنا؟"

"ڈولی۔"

"پتا نہیں کون ہے۔ آئندہ ملے تو بات نہ کرنا، بلکہ نظرانداز کر کے گزر جانا۔" مزید چند باتیں کر کے اس نے فون رکھ دیا اور دوبارہ پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ویسے تمہاری پھوپھو کا کوئی ہینڈسم بیٹا وغیرہ ہے؟" ڈی جے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے مگن سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیوں؟"

"تمہاری چمک دمک دیکھ کر یہ خیال آیا۔" ڈی جے نے مسکراہٹ دباتے اپنی عینک انگلی سے پیچھے کی۔

حیا نے یوں ہی چمچہ پکڑے گردن جھکا کر خود کو دیکھا۔ وہ پاؤں کو چھوتے زرد فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھی۔ فراک کی زرد شیفون کی تنگ چوڑی دار آستینیں کلائی تک آتی تھیں۔ شیفون کا دوپٹا اس نے گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ بال حسب عادت سمیٹ کر دائیں کندھے پہ آگے کو

ڈال رکھے تھے۔

"ہاں' ہے ایک بیٹا' مگر شادی شدہ ہے۔" وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر پلیٹ میں پڑا کوفتہ کانٹے سے توڑنے لگی۔

"اونہوں۔۔۔ سارا مزا ہی کر کرا کر دیا۔"

"اوئے ڈی جے! یہ کیا؟" وہ ڈی جے کے پیچھے کچھ دیکھ کر رکی تھی۔

"کوفتہ ہے اور کیا۔" ڈی جے نے کانٹے میں پھنسے کوفتے کو دیکھ کر کہا۔

"افوہ! اپنے پیچھے دیکھو۔" اس نے جھنجلا کر کہا تو ڈی جے نے گردن موڑی۔ وہاں ایک قدرے فربہی مائل لڑکی چلی آرہی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس تھی۔

"مسا بجی میں ہم وطن؟" ڈی جے نے بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ اگلے ہی پل وہ دونوں اپنے اپنے کوٹ اٹھا کر کھانا چھوڑ کر اس طرف لپکی تھیں۔

وہ لڑکی اپنی کتابیں سنبھالتی چلی آرہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ وہ ڈی جے کی شلوار قمیص اور حیا کا فراک پاجامہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھی اور وہ دونوں اس کی شلوار قمیص۔

"آپ پاکستانی ہیں؟" حیا پر جوش سی اس کے پاس گئی۔ ڈی جے اس سے ذرا پیچھے تھی۔

"نہیں' میں انڈین ہوں۔"

ڈی جے ڈھیلی پڑ گئی۔ "رہنے دو حیا! مجھے ابھی ورلڈ کپ کا غم نہیں بھولا۔"

اس نے سرگوشی کی۔ حیا نے زور سے اپنا پاؤں ڈی جے کے جوتے پہ رکھ کر دبایا۔

"ہم پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس ہیں۔ حیا سلیمان اور یہ خدیجہ رانا۔ آپ؟"

"میں انجم ہوں۔ میں اور میرے ہزبینڈ پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اور ہم دونوں یہاں پڑھاتے بھی ہیں۔ ادھر فیکلٹی میں ہمارا اپارٹمنٹ ہے' وہیں رہتے ہیں ہم' کبھی آؤنا ادھر۔" انجم ان دونوں سے زیادہ پر جوش ہو گئی تھیں۔

"شیور۔۔۔ انجم باجی۔" ڈی جے ان کا مسلمان ہونا سن کر پھر سے خوش ہو گئی تھی۔ وہ تینوں کافی دیر وہاں کھڑی باتیں کرتی رہیں اور جب ڈی جے کو یاد آیا کہ گورسل نکلنے میں پانچ منٹ ہیں تو انجم باجی کو جلدی سے خدا حافظ بول کر وہ اپنا کوٹ ہاتھوں میں پکڑے باہر بھاگیں۔

☆ ☆ ☆

وہ تاقسم کے پارک میں سنگی بینچ پہ بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا لمبا سفید اونی کوٹ اب زرد فراک پہ پہن لیا تھا اور سر جھکائے ہاتھ میں پکڑی شکن زدہ چیٹ پر سے سبین پھپھو کا نمبر موبائل پہ ملا رہی تھی۔ کال کا بٹن دبا کر اس نے وہ بھدا اترک فون کان سے لگایا۔

وہاں دور تک سبزہ پھیلا تھا۔ خوش نما پھول اور رنگوں' تتلیوں کی بہتات' ہوا اس کے لمبے بال اڑا رہی تھی۔ وہ موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے فون پہ جاتی گھنٹی سننے لگی۔

"ہیلو۔" بہت دیر بعد جہان نے فون اٹھایا۔

"جہان۔۔۔ میں حیا۔۔۔" اس کے انداز میں خفت در آئی۔ اس سے کہہ رکھا تھا اسی لیے آج جا رہی تھی' ورنہ اس سرخ کوٹ نے تو اسے خوب بے وقعت کیا تھا۔

"ہاں حیا بولو؟" وہ مصروف سا لگ رہا تھا۔

"وہ میں تاقسم پہ ہوں' تم مجھے یہاں سے پک کر کے گھر لے جا سکتے ہو؟ آج ویک اینڈ تھا تو۔۔۔"

"سوری حیا! میں شہر سے باہر ہوں' تم گھر ممی کو فون کر لو نا۔"

"یہ تمہارے گھر کا نمبر نہیں ہے؟" اس نے حیرت سے چیٹ کو دیکھا۔

"نہیں' یہ تو میرا موبائل نمبر ہے۔"

تو کیا اس نے داور بھائی کی مہندی والے روز جہان کے موبائل پہ فون ملا دیا تھا؟

"اوہ۔۔۔ مجھے پھپھو کا نمبر لکھوا دو۔" جہان نے فوراً نمبر لکھوا دیا۔

"اچھا میں ڈرائیو کر رہا ہوں' پھر بات ہوتی ہے۔" مزید کچھ سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔

وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ عجیب اجنبی سا اپنا تھا۔

پھوپھو اسے کیب پہ لینے آئی تھیں۔ وہ جو چند لیراز کی بچت کے چکر میں کیب کر کے نہیں گئی تھی' خوب شرمندہ ہوئی۔

"گاڑی نہیں تھی تو بتاتیں' میں تو ایسے ہی۔۔۔"

"کوئی بات نہیں' گاڑی تو جہان کے پاس ہی ہوتی ہے۔" اور وہ مزید شرمندہ ہوئی۔ پھر گردن موڑ کر کھڑکی کے باہر دوڑتے درخت دیکھنے لگی۔

اسے پھپھو کچن میں ہی لے آئیں۔ حسب عادت وہ کام میں مصروف ہو گئیں۔

"یہ میرے لیے اتنا بکھیڑا پالنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ ارد گرد پھیلی اشیا دیکھ کر خفا ہوئی۔

"کوئی بات نہیں' تم میری بیٹی ہو' میرا ہاتھ بٹا دو گی' اسی لیے میں نے یہ سب شروع کر لیا۔" دونوں کے درمیان پچھلی ملاقات کے ناخوشگوار اختتام کا کوئی تذکرہ نہ ہوا' جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"چلیں! پھر آج پلاؤ تو میں ہی بناتی ہوں' مجھے ریسیپی سمجھاتی جائیں' ویسے بھی ترکوں کی میز اس پلاؤ کے بغیر ادھوری لگتی ہے۔" وہ کورٹ اسٹینڈ پہ لٹکا کر آستین کلائی سے ذرا پیچھے کرتی واپس آئی۔ دوپٹا اس نے اتار کر کرسی پہ رکھ دیا تھا۔

"پہلے تم چکن کی بوٹیاں کاٹ دو۔" انہوں نے ٹوکری میں رکھے مسلم مرغ کی طرف اشارہ کیا اور خود چولہے پہ چڑھی دیگچی میں چمچہ ہلانے لگیں۔

"چھری تو یہ پڑی ہے' کٹنگ بورڈ کدھر ہے؟" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"کٹنگ بورڈ۔۔۔ اوہو۔۔۔ وہ تو صبح سے نہیں مل رہا۔ جہان بھی پتا نہیں چیزیں اٹھا کر کدھر رکھ دیتا ہے۔ ٹھہرو! میں ایک پرانا بورڈ لے آؤں اوپر اٹیک سے۔"

"آپ رہنے دیں' میں آتی ہوں' اٹیک اوپر کس طرف ہے؟"

"سیڑھیوں سے اوپر راہداری کے آخری سرے پہ' مگر تمہیں تکلیف ہو گی' میں خود۔۔۔"

"آپ گوشت بھونیں' جل نہ جائے' میں بس ابھی آئی۔" وہ ننگے پاؤں چلتی باہر لونگ روم میں آئی۔

سیڑھیوں کے ساتھ لگے قد آور آئینے میں اسے اپنا عکس دکھائی دیا تو ذرا سی مسکرا دی۔ فرش کو چھوتے زرد فراک میں وہ کھلتے پھول کی طرح لگ رہی تھی۔ گلے کا گھاٹ کھلا تھا اور اس کے دہانے پہ چھوٹے چھوٹے سورج مکھی کے پھولوں کی لیس نیم دائرے میں لگی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کی خوب صورت لمبی گردن میں سورج مکھی کے پھولوں کا ڈھیلا سا ہار لٹک رہا ہو۔ اس نے انگلیوں سے فراک پہلوؤں سے ذرا اٹھایا اور ننگے پاؤں لکڑی کے زینوں پہ چڑھنے لگی۔

اوپر راہداری کے آغاز میں ایک کمرے کا دروازہ بند تھا' شاید وہ جہان کا کمرا تھا۔ ابھی گھر میں داخل ہوتے ہوئے پھپھو نے کچھ ایسا بتایا تھا۔

وہ ایک نظر بند دروازے پہ ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ فراک اب اس نے پہلوؤں سے چھوڑ دیا تھا۔

اٹیک میں آگے پیچھے بہت سے صندوق اور دوسرا کاٹھ کباڑ رکھا تھا۔ وہ متذبذب سی اندر آئی۔ بتی نہ جانے کدھر تھی۔ اس نے دروازہ کھلا رہنے دیا' باہر سے آتی روشنی کافی تھی۔

وہاں ہر سو سامان رکھا تھا' کٹنگ بورڈ نہ جانے کدھر تھا۔ وہ اندازاً" آگے بڑھی اور ایک کونے والے صندوق کا کنڈا کھول کر ڈھکن اوپر اٹھایا۔

نیچے لونگ روم سے بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ ساتھ میں جہان اور پھپھو کی ملی جلی آوازیں۔ وہ مسکرا کر صندوق پہ جھکی۔

اس میں الیکٹرک کا کوئی ٹوٹا پھوٹا سامان رکھا تھا۔ کٹنگ بورڈ کہیں نہ تھا۔ حیا نے ڈھکن بند کیا اور نسبتاً" زیادہ کونے میں رکھے صندوق کی طرف آئی۔

اپنے عقب میں اسے راہداری سے کسی دروازے کے ہولے سے کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی تھی۔ جہان اتنی جلدی اوپر پہنچ گیا؟ مگر وہ پلٹی نہیں اور صندوق کو کھولنے لگی' جس کے ڈھکن کے اوپر گرد اور مکڑی

کے جالوں کی تہہ تھی۔

اس نے چند چیزیں الٹ پلٹ کیں تو بے اختیار گرد نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اسے ذرا سی کھانسی آئی۔ پورا اٹیک بے حد صاف تھا۔ ماسوائے ان کونے میں رکھے دو تین صندوقوں کے جیسے انہیں زمانوں سے نہ کھولا گیا ہو۔

اس کی پشت پہ اٹیک کا ادھ کھلا دروازہ ہولے سے کھلا۔ کوئی چوکھٹ میں آن کھڑا ہوا تھا' یوں کہ راہداری سے آتی روشنی کا راستہ رک گیا۔ پل بھر میں اٹیک۔۔۔ نیم تاریک ہو گیا۔

وہ پلٹنے ہی لگی تھی کہ صندوق میں کسی خاکی شے کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اسے اوپر نکالا۔ وہ لکڑی کا تختہ نہیں تھا' بلکہ ایک اکڑا ہوا کپڑا تھا۔

حیا نے کپڑا کھول کر سیدھا کیا۔ ایک پرانی گرد آلود خاکی شرٹ۔۔۔ اوپر سجے ستارے' تمغے اور ایک نام کی تختی۔

چوکھٹ میں کھڑا شخص چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا' اس کی طرف بڑھنے لگا۔

حیا نے نیم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ تختی پڑھی۔

"سکندر شاہ!" اس نے بے اختیار رینک دیکھا۔ وہ کرنل کی نشان دہی کر رہا تھا۔

وہ شرٹ ہاتھ میں پکڑے کسی الجھن میں گرفتار پلٹی اور ایک دم جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔

اس کے عقب میں جہان نہیں تھا۔ وہ کوئی اور تھا۔ دراز قد' کنپٹیوں اور پیشانی سے جھلکتے سفید بال' سخت نقوش' نائٹ گاؤن میں ملبوس' وہ کڑی نگاہوں سے اسے دیکھتے قریب آ رہے تھے۔

وہ سانس روکے انہیں دیکھے گئی۔

وہ عین اس کے سر پہ آئے' اور ایک جھٹکے سے اس کی گردن دبوچی۔

"میری جاسوسی کرنے آئی ہو؟"

اس کے گلے کو دبوچے وہ غرائے تھے۔

بے اختیار اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔ شرٹ اس کے ہاتھ سے پھسل گئی۔ اس نے اپنی انگلیوں سے گردن کے گرد جکڑے ان کے ہاتھ کو پکڑ کر ہٹانے کی کوشش کی' مگر بے سود۔

"پاکستانیوں نے بھیجا ہے تمہیں؟ اپنے مالکوں سے بولو' تمہیں بلیو پرنٹس کبھی نہیں ملیں گے۔"

"چھوڑیں مجھے۔" وہ زور سے کھانسی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ اس کا گلا دبا رہے تھے۔

"کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا' کبھی نہیں' ہر چیز آگے دے دی گئی ہے' ہر چیز۔" انہوں نے اسے گردن سے دبوچے اس کا سر کھلے صندوق پہ جھکایا۔ وہ تڑپنے' چلانے لگی۔

"چھوڑیں مجھے۔" وہ اپنے ناخن ان کے ہاتھ میں چبھا کر ان کو ہٹانے کی ناکام سعی کر رہی تھی۔

"تمہیں واپس نہیں جانے دوں گا۔ وہ بلیو پرنٹس تمہیں کبھی نہیں ملیں گے۔"

حیا کا سانس رکنے لگا۔ وہ اس کا سر صندوق میں دے کر اوپر سے ڈھکنا بند کر رہے تھے' اسے لگا وہ مرنے والی ہے۔

"امی۔۔۔ امی۔۔۔" وہ دہشت سے چلانے لگی۔ وہ اس کو گردن سے دبوچے' اس کا سر منہ کے بل اندر دے رہے تھے۔ گرد سے اٹے صندوق میں اس کا سانس اکھڑنے لگا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ذرا سنبھل کے

فاطمہ عسکری

صبح کا وقت ویسے ہی پر لگا کر اڑتا ہے' اس پر اگر کوئی مہمان آجائے تو میرے لیے کیسی مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ بہت آسانی سے کوئی بھی ایسی عورت سمجھ سکتی ہے جس کے چار چھوٹے بڑے بچے ہوں۔ چاروں کی پسند علیحدہ علیحدہ ہو اور لنچ پر سب کی پسند کی اشیاء ضرور موجود ہوں۔

اس دن بھی میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ صبح سوا آٹھ بجے میاں جی کو رخصت کر کے میں نے جلدی سے ککر میں گوشت چڑھایا اور کچن کی صفائی میں لگ گئی۔ رات کو چونکہ پورا کچن سمیٹ کر سوتی ہوں' اس لیے زیادہ پھیلاوا نہیں ہوتا۔ دس منٹ بعد سلیبوں پر کپڑا مار کر میں نے چائنیز کی سبزیاں پھیلالیں۔ تیز تیز ہاتھ چلاتے ہوئے مسلسل دماغ سب سے چھوٹی صبا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ آج اس کے اسکول میں پیرنٹس ٹیچرز میٹنگ تھی اور مجھے ٹیچرز سے کیا کیا باتیں کرنا ہیں۔

ککر کی سیٹی بجنا شروع ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر ککر بند کر کے میں نے یونہی چولہے پر رکھا رہنے دیا اور فرائنگ پین میں سبزیاں فرائی کرنا شروع کر دیں۔ شکر ہے چکن بوائل ہی رکھا تھا' اسے بھی ریشے ریشے کر کے فرائنگ پین میں ڈالا اور ساسز وغیرہ ڈال کر اسے فائنل کر کے ڈھک کر رکھ دیا۔

ٹی وی لاؤنج سے بچوں کے کپڑے اٹھا کر لانڈری میں ڈالے اور خود چینج کر کے الٹے سیدھے بال بنائے' ہلکی سی لپ اسٹک لگا کر دوپٹہ سر پر جمایا اور گھر کو لاک کرتی ہوئی باہر آئی۔ ڈیڑھ گھنٹے باہر رہنے کے بعد جب اسپگھٹی اور کیچپ لے کر میں گھر کے سامنے پہنچی' رقیہ باجی کو اپنے فلیٹ کی بیل بجاتے ہوئے پایا۔

انہیں اپنے گھر کے سامنے دیکھ کر مجھے کسی حد تک کوفت ہوئی۔ یہ نہیں ہے کہ میں مہمانوں سے گھبراتی ہوں یا میں کھلانے پلانے میں کنجوس ہوں' بلکہ میں تو ہر وقت ایک' دو چیزیں گھر میں ایسی ضرور رکھتی ہوں جن سے مہمانوں کی فوری تواضع کی جاسکے۔ اور ان سے بات چیت کا موقع بھی مل سکے۔ رقیہ باجی عجیب فطرت کی عورت ہیں۔ اگر آپ ان کی صحبت میں آدھا گھنٹہ بھی بیٹھیں تو نہ چاہنے کے باوجود آپ کسی نہ کسی کی غیبت کوئی کا شکار ہو جاتے ہیں اور مزے دار بات یہ ہے کہ وہ آپ ہی کا کہا ہوا کوئی جملہ پکڑ کر بات کو اتنا گھماتی ہیں اور اسے آگے ایسے نشر کرتی ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورا بیان آپ کا ہی تھا اور وہ بے چاری تو بے قصور تھیں۔

بہرحال اب جب وہ گھر کے سامنے کھڑی تھیں تو اخلاقاً" مجھے سلام کرنا پڑا۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"اوہ! بچوں اور میاں کو بھیج کر تم سیر سپاٹے کو نکل گئیں۔ ہاں بھئی سسرال سے علیحدہ رہنے کے یہ ہی تو فائدے ہیں۔ بندہ کسی کو بھی جواب دہ نہیں ہوتا' اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ ویسے کہاں گئی تھیں؟ میکے؟"

انہوں نے اپنا تجزیہ پیش کر کے سوال داغ دیا۔

میں نے بھی ان کی تصحیح کرنا ضروری نہیں سمجھی اور مسکرا کر لاک کھولنے لگی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے اندر آگئیں۔ میں نے کچن کاؤنٹر پر سامان رکھا' دوپٹہ سامنے صوفے پر ڈال دیا اور پنکھا چلا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"بڑے دن ہوئے تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی' سوچا چلو' تمہارے ساتھ ایک کپ چائے ہی پی لی جائے۔" انہوں نے بے تکلفی سے چائے کی فرمائش کر ڈالی۔ چائے پینے کا تو میرا بھی دل چاہ رہا تھا۔

"آپ بیٹھیں آرام سے' بس دس منٹ میں چائے بنتی ہے۔"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا جو پونے بارہ بجا رہی تھی۔ میرے چاروں بچوں کی وین سوا ایک بجے گھر پہنچا دیتی تھی' سو مجھے اسی حساب سے کام کرنا تھا۔ میں نے ایک طرف چولہے پر چائے کا پانی رکھا اور دوسرے چولہے پر اسپگھٹی کے لیے پانی رکھا۔ فریزر سے دو کباب نکال کر تلے۔ اتنی دیر میں چائے بھی تیار ہو گئی۔ چائے پیالیوں میں نکال کر میں نے ٹرے میں رکھی اور کبابوں کی پلیٹ ایک سائیڈ پر رکھ کر رقیہ باجی کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی اور خود صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں پھیلنے لگی۔

"کل میں حیدری مارکیٹ گئی تھی۔" انہوں نے کباب کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "گرمیاں آگئی ہیں میں نے کہا لان کے پرنٹ ہی دیکھ لوں۔"

"اچھا' پھر کچھ پسند آیا؟" میں نے سرسری سا دریافت کیا۔

"ارے بی بی کہاں' پوری مارکیٹ کو آگ لگی ہوئی ہے۔ عام سی گھٹیا لان کے سوٹ آٹھ سو اور جہاں کوئی نام والی لان کا پرنٹ پسند کرو تو قیمت دو ہزار اور بائیس سو سے نیچے ہی نہیں آتی۔" انہوں نے ابرو چڑھا کر جواب دیا۔

"ہاں یہ تو صحیح کہہ رہی ہیں' مہنگائی تو واقعی بہت ہو گئی ہے۔" میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"پھر بھی لوگوں کو دیکھو' ٹوٹے پڑ رہے ہیں بازاروں میں۔"

"یہ بھی آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔" میں نے پھر ان

سے اتفاق کیا۔
"اب تم اپنی نند کو ہی دیکھ لو، جو ہر ہفتے تمہارے یہاں آتی ہے، کیا نام ہے اس کا؟" انہوں نے دریافت کیا۔
"کون فرحت؟" میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔
"سے آپ نے کہاں دیکھ لیا؟"
"کل ہی تو ملی تھی مارکیٹ میں، مجھے پہچانی تو نہیں، میں نے بھی تعارف کروانا ضروری نہیں سمجھا، دھڑا دھڑ سوٹ خرید رہی تھی، ایک سے ایک رنگ، ایک سے ایک ڈیزائن مہنگے مہنگے، اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو اس نے تیس جوڑے خریدے ہوں گے۔" انہوں نے اپنی دانست میں دھماکہ کیا۔
"دراصل فرحت بھرے سسرال میں رہتی ہے اور ہے بھی سب سے بڑی بہو۔ اپنی نندوں کو، دیورانیوں کو عید تہوار پر جوڑے دیتی ہے اور وہ سب رمضان سے پہلے ہی خرید لیتی ہے، پھر گھر میں کچھ پرانے نوکر بھی ہیں، ان کے جوڑے بھی لیے ہوں گے۔" میں نے پھر اطمینان سے جواب دیا۔
"لو بتاؤ بھلا اس مہنگائی میں اپنا گزارہ مشکل ہے۔ سسرال والوں اور حتیٰ کہ نوکرانیوں کے جوڑے، سراسر فضول خرچی ہے۔" وہ عجیب حسد بھرے انداز میں بولیں۔
"یہ تو اچھی بات ہے رقیہ باجی! اگر خدا نے ہمیں نعمتوں سے نوازا ہے تو اس میں غرباء اور اقرباء سب کا حق نکال دیں، برکت رہتی ہے۔" میں نے رسان سے سمجھایا۔
"ارے بی بی! یہ سب بھرے پیٹ کے چونچلے ہیں۔ ویسے کرتا کیا ہے تمہارا نندوئی؟" انہوں نے تجسس سے پوچھا۔
"الیکٹرونک گڈز کا کاروبار ہے ان سب بھائیوں کا۔" میں نے بتایا۔
"تو سب بھائیوں کی بیویاں ایسے ہی شاہ خرچیاں کرتی ہیں؟" وہ پھر متجسس ہوئیں۔
"سب کا تو خیر مجھے نہیں پتا، لیکن ناظم بھائی بڑے ہونے کی وجہ سے سب اندر باہر کے کرتا دھرتا ہیں اور اسی لیے فرحت بھی اپنی ذمہ داری زیادہ محسوس کرتی ہے۔" میں نے کہا۔
"ہاں بھئی۔" انہوں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔
"اللہ بھی کیسے کیسوں کو دیتا ہے۔" انہوں نے عجیب سے انداز میں کہا جیسے فرحت کوئی بہت بری یا بدصورت عورت ہو، مجھے بہت برا لگا، لیکن پھر مجھے حضرت علیؓ کا ایک قول یاد آیا۔
"ہر چیز کا ایک صدقہ ہے اور عقل کا صدقہ یہ ہے کہ جاہل کی بات کو برداشت کرو کیونکہ تم اسے سمجھانے سے قاصر ہو۔"
"اچھا بھئی، چائے کا شکریہ تو میں کہوں گی نہیں کیونکہ بہت دن بعد تمہیں زحمت دی ہے۔ اب میں چلوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں اور میں نے بھی دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ جلدی اٹھ گئیں۔
بچوں کے آنے میں صرف چالیس منٹ باقی تھے اور مجھے بہت سے کام نپٹانے تھے۔ ان کے جلدی اٹھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں ان کے مطلب کی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆
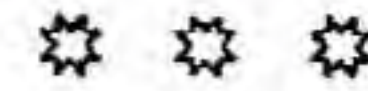
فرحت کا بڑا بیٹا میٹرک میں پاس ہوا تو اس نے اپنے گھر میں تقریب کا اہتمام کیا۔ اس کی سسرال اچھی خاصی تھی، چار نندیں اور دو دیور، پھر ناظم بھائی کے چچا اور ماموں وغیرہ جبکہ میکے کے نام پر دو ہی گھر تھے، ایک ہمارا اور ایک بڑی راحت باجی کا۔ اچھے خاصے لوگ جمع ہو گئے تھے۔
فرحت اور اس کی دیورانیوں نے مل کر کھانے کا اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ بازار سے صرف چکن بریانی کی ایک دیگ آئی تھی، باقی سارا کھانا انہوں نے گھر میں تیار کیا تھا۔ بکرے کے گوشت کی کڑاہی، کوفتے کا سالن، فیرنی، چکن مائیکرونی اور بچوں کا دل

خوش کرنے کے لیے زنگر برگر اور فرنچ فرائز بھی تھے۔ فرحت کی ایک دیورانی نے کچھ کانٹی نینٹل کورسز کر رکھے تھے، لہٰذا دو، تین قسم کے سلاد بھی دسترخوان کی رونق بڑھا رہے تھے۔ فرحت کی دونوں دیورانیاں ثانیہ اور نمو ذمہ دار میزبانوں کی طرح سب کو پوچھ رہی تھیں۔ فرحت کی بڑی دیورانی ثانیہ مجھے بہت پسند ہے۔ گوری رنگت گول چہرہ، چائنیز آنکھیں، جو ہر وقت کسی شرارت پر آمادہ محسوس ہوتی تھیں۔ دو بچے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی، اسی کی طرح چائنیز آنکھوں والے۔
میں نے اپنی من پسند اشیاء سے پلیٹ سجائی اور ٹی وی لاؤنج میں بڑی کرسیوں کی جانب آ گئی۔ بچے دوسرے بچوں کے ساتھ مگن تھے۔ خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا جا رہا تھا۔
"السلام علیکم۔" ثانیہ نے مجھے زوردار سلام کیا۔
"تم نے اب مجھے دیکھا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا۔
"دیکھ تو پہلے ہی لیا تھا، لیکن اب آپ سے ذرا دو، دو ہاتھ کرنے ہیں۔" وہ اپنی شرارتی آنکھیں مٹکاتی ہوئی بولی۔
"اللہ رحم کرے، مجھ غریب سے کیا غلطی ہو گئی۔" میں نے ڈرنے کی اداکاری کی۔
"یہ بتائیے، یہ آپ ہماری اتنی پیاری جٹھانی کے خلاف بیان بازیاں کیوں کر رہی ہیں؟" اس کے چہرے اور آنکھوں کی مسکراہٹ اس کے لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔
"کیا کریں بھئی، بھاوج ہیں، کہیں تو جلاپا دکھائیں گے نا۔" میں نے مذاق کیا۔
"اچھا یہ بتائیں، یہ رقیہ آپ کے فلیٹ میں رہتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں گراؤنڈ فلور پر رہتی ہیں۔" اب میرا ماتھا ٹھنکا۔ "تم انہیں کیسے جانتی ہو؟" میں نے پوچھا۔
"وہ دراصل میری چھوٹی بہن مازیہ کے رشتے کے سلسلے میں امی کے گھر آئی تھیں۔" اس نے بتایا۔
"لیکن ان کے تو دونوں بیٹوں کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک الگ کہیں رہتا ہے اور دوسرا ساتھ میں ہی ہے۔" میں نے کہا۔
"ہاں بتا رہی تھیں، اصل میں وہ اپنی چھوٹی بہن کے بیٹے کے سلسلے میں اپنی بہن کے ساتھ مازیہ کو دیکھنے آئی تھیں۔ باتیں نکلیں تو میں نے ان سے ان کی رہائش پوچھی۔ انہوں نے آپ کے فلیٹ کا نام لیا۔ میں نے آپ کا تذکرہ کیا تو فوراً پہچان گئیں۔ میں نے جتایا میں آپ کی نند کی دیورانی ہوں۔ پہلے تو پوچھا کون سی نند، جب میں نے فرحت بھابھی کا نام لیا تو ایکا ایکی ان کی ساری ہمدردیاں میرے ساتھ ہو گئیں۔ کہنے لگیں "عمیرہ مجھے سب بتاتی ہے، اس کی نند بہت چالاک ہے۔ دیوروں کو مٹھی میں کیا ہوا ہے، دیورانیاں گھر کی نوکرانیاں بنی ہیں، سارے بزنس پر فرحت کے شوہر کا قبضہ ہے، بھائی، بھاوج سب فرحت کے دست نگر رہتے ہیں۔
میں ان کی باتیں سن کر حیران رہ گئی کہ آپ کی اور فرحت بھابھی کی دوستی تو مثالی ہے۔ آپ ان کے خلاف ایسی بے سروپا باتیں کیوں کریں گی۔ میری امی بھی حیران ہو گئیں کیونکہ سب ہی جانتے ہیں ناظم بھائی نے دونوں چھوٹے بھائیوں کو بیٹوں کی طرح پالا ہے۔ ایک دکان سے تین دکانیں ہو گئیں ماشاء اللہ سے۔ تینوں بھائیوں کے کاروبار علیحدہ علیحدہ جم گئے، یہ سب ناظم بھائی اور فرحت بھابھی کے ایثار کی وجہ سے ہی ممکن ہوا اور یہ فرحت بھابھی کا رویہ ہی تھا جو سب وسائل ہونے کے باوجود ہم نے گھر علیحدہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اسی گھر میں اوپر کاظم اور قاسم نے اپنے اپنے پورشنز بنوا لیے۔ میں ان سے مل کے بہت حیران ہوئی اور گھر آ کر بھی پریشان رہی کہ آپ کی طرف سے یہ غلط فہمی کیسے دور ہو۔ فرحت بھابھی نے میری کیفیت کو بھانپ لیا۔ وہ سمجھیں کہ رشتے میں کوئی مسئلہ ہے۔ ایک دن کمرے میں بلا کر کہنے لگیں "تم جب سے امی کے گھر سے آئی ہو چپ چپ ہو، کیا مازیہ کے رشتے کے سلسلے میں کوئی مسئلہ ہے؟" میں

نے بھی کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر میں نے فرحت بھابھی کو سب کچھ بتادیا۔" اس نے شرارت سے میری جانب دیکھا۔

"پھر؟" میرا رواں رواں سماعت بن گیا۔ فرحت بے حد سمجھ دار اور رکھ رکھاؤ والی تھی مگر اپنی برائی وہ بھی جھوٹی برائی کون برداشت کرتا ہے اور میرا اور اس کا تو رشتہ بھی نازک ہی تھا۔

"فرحت بھابھی کو بتایا تو وہ ہنستی چلی گئیں۔ پھر انہوں نے مجھے رقیہ بیگم کا حلیہ بتایا۔ کہنے لگیں میں جانتی ہوں' بھائی کے فلیٹ میں نیچے ایک آدھ بار اس عورت کو دیکھا ہے' ہر آنے جانے والے کو جاسوسوں کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ ایک بار حیدری مارکیٹ میں بھی نظر آئی تھی۔ میری خریداری کو نظر لگا رہی تھی۔ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے۔ کچھ لوگ دوسروں کی زندگی کے بارے میں بہت متجسس ہوتے ہیں۔ اپنے دماغ کے حساب سے سوچتے ہیں اور اسی کو درست سمجھتے ہیں۔ یہ رقیہ بھی ان ہی عورتوں میں سے لگتی ہے مجھے' اور رہی بات میری بھابھی عمیرہ کی تو انہیں میں اچھی طرح جانتی ہوں' انہوں نے بات کسی اور انداز میں کی ہوگی اور رقیہ نے اسے کسی اور انداز میں پیش کیا ہے۔ تم رقیہ کے بارے میں مت سوچو' لڑکا دیکھو کیسا ہے۔ فرحت بھابھی نے میرا دل ہلکا پھلکا کردیا۔" (اور میرا بھی)

"جناب لوگ ایسے ہی میرے اور فرحت کے ذہنی میلان کی داد نہیں دیتے۔" میں نے دل ہی دل میں فرحت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خوش گواری سے کہا۔

"ہاں بھئی' یہ بات تو ہے۔" ثانیہ نے گردن ہلائی۔

"پھر لڑکا دیکھا' پسند آیا؟" میں نے استفسار کیا۔

"یہ بھی ایک کہانی ہے۔" وہ پراسرار سا مسکرائی۔

"کیا مطلب' کیسی کہانی؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہم رقیہ بیگم کا بھانجا دیکھنے گئے۔ لڑکا واقعی بہت اچھا ہے۔ 28 سال عمر' بینک میں نوکری' اگرچہ ابھی نئی ہے لیکن ترقی کے بہت چانسز ہیں۔ ماں بھی رقیہ بیگم سے مختلف ہیں' سمجھ دار اور وضع دار۔ لڑکا سب سے بڑا ہے' ایک چھوٹی بہن شادی شدہ ہے' ایک بہن اور ایک بھائی کنوارے ہیں۔ باپ کسی کمپنی میں سپروائزر ہیں۔ سب ہی فیملی اچھی ہے۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

"ہاں۔ جب ہم ان کے گھر گئے تو آنٹی نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھادیا۔ کچھ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ ان کے والد صاحب ہمارے پاس آکر بیٹھ گئے' دونوں بہنیں بھی آگئیں۔ ہم سمجھے کہ آنٹی کچن وغیرہ میں مصروف ہیں لیکن میں نے محسوس کرلیا کہ سب ہی کچھ بے چین سے ہیں۔ اچانک ہی باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ رقیہ بیگم چلا رہی تھیں۔ "ہاں' ہاں تو میں نے کیا جھوٹ کہا تھا۔ عمیرہ نے ہی مجھے بتایا تو میں نے کہہ دیا۔ پتا نہیں تم کو اس چینی خاندان میں کیا نظر آگیا ہے۔ نقطی دانوں جیسی تو آنکھیں ہیں لڑکی کی' ارے صفیہ! تم ہمیشہ سے نادان ہو' بیٹوں کی ماؤں کو ذرا اور طرح کا ہونا چاہیے۔ یہ کیا پچھلے ہفتے لڑکی دیکھ کر آئیں اور اس ہفتے اپنے گھر بلالیا۔ ذرا لڑکی والوں کو دو' چار فون کرنے دیتیں۔ تمہیں دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے اپنے مونس میں کوئی عیب ہے جو پہلا رشتہ دیکھا اور تیار ہوگئیں۔" رقیہ بیگم نان اسٹاپ بول رہی تھیں اور صفیہ بیگم سر تھامے سامنے تخت پر بیٹھی تھیں۔ میری امی اور کاظم کی وہ حالت تھی کہ کیا بتاؤں۔ رقیہ بیگم ہم سب کے باہر آجانے اور سب کچھ سن لینے پر بھی شرمندہ نہیں تھیں۔ بڑی تن فن کرتی وہ گیٹ کی طرف بڑھیں' میں راستے میں کھڑی تھی' مجھے دیکھ کر ہاتھ جھٹک کر بولیں۔ "سامنے سے ہٹ چیں چیں چاں چاں۔" انہوں نے جس طرح کہا' میری ہنسی چھوٹ گئی اور آپ کو پتا ہے مجھے تو ویسے ہی بہت ہنسی آتی ہے۔ رقیہ بیگم تو نکل کر چلی گئیں' لیکن میرے مستقل ہنسنے پر امی اور کاظم مسکرانے لگے۔ پھر مونس کی دونوں بہنوں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ مونس کے والد میرے نزدیک آئے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے "خوش رہو' ہمیں امید ہے ہماری ہونے والی بہو بھی اسی طرح ہنس مکھ ہوگی۔" انہوں نے پیار سے کہا۔

"اور چیں چیں چاں چاں بھی۔" مونس سے چھوٹا انس بے ساختہ بولا اور سب ہی ہنس پڑے ماحول کا بوجھل پن دور ہوگیا' لیکن صفیہ آنٹی مسلسل شرمندہ ہوتی رہیں۔"

"وہ ایسی کیوں ہیں؟" جب صفیہ آنٹی تھوڑی ریلیکس ہوئیں تو امی نے ان سے پوچھا۔

"اصل میں رقیہ باجی کے دونوں بیٹوں نے پسند کی شادی کی ہے۔ باجی کو لڑکیاں دیکھنے اور ناشتے کرنے کا ارمان ہی رہ گیا۔ بڑے والے نے اپنی کسی آفس کولیگ سے شادی کی ہے۔ اسے تو باجی نے اتنا ستایا کہ بیٹا شادی کے دوسرے ہفتے ہی الگ ہوگیا۔ دوسری بہو ہماری بھتیجی ہے۔ وہ بھی بیٹے کی پسند ہے۔ اس نے کہہ دیا' ماموں کے گھر رشتہ لے جائیں' بہت اچھی لڑکی ہے۔ اسے بھی رقیہ باجی بہت سناتی ہیں کہ میرے بیٹے پر ڈورے ڈالے ہیں لیکن وہ ہنستی رہتی ہے' ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی ہے۔ کھانا' پانی' دوا دارو ہر چیز کا خیال رکھتی ہے' پھر بھی بری ہے' مجھ سے کہتی ہے۔ کیا کریں' پھوپھی ہیں ہماری' بڑی بھابھی کی طرح چھوڑا بھی نہیں جاسکتا۔ میں تو کہتی ہوں بہن! لوگ ایسے ہی نئی نسل کو برا بھلا کہتے ہیں' ساری بات تربیت کی ہے۔" صفیہ آنٹی نے کہا۔

"جی بالکل' آپ درست کہہ رہی ہیں۔" امی نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"اصل میں آپ کے گھر انہیں لانے کی بھی یہی وجہ تھی۔" صفیہ آنٹی نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا۔ "پھر میں نے مونس کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا ارادہ کیا اور یہ میرے سر ہوگئیں' تم جہاں جہاں لڑکی دیکھنے جاؤ' میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اپنے لڑکوں میں تو میرا ارمان پورا نہیں ہوا' بھانجے پر ہی کرلوں۔ مجھے ثانیہ ایک نظر میں پسند آگئی۔ سچی بات ہے آپ کا گھر لڑکی دیکھنے کے لیے میرا پہلا گھر تھا۔ جب پہلے ہی گھر میں گوہر مراد مل گیا تو در' در پھرنے کا فائدہ؟ بس یہی بات رقیہ باجی کو پسند نہیں آرہی ہے کہ لوگوں سے ملنے اور ان کے بارے میں باتیں بنانے کا موقع اتنی جلدی ختم ہوگیا۔ وہ مصر تھیں کہ ابھی آپ کو انوائیٹ کرنے کے بجائے میں دو' چار لڑکیاں اور دیکھوں' لیکن میں نے انکار کردیا۔ اب ناراض ہوگئی ہیں۔ یہ تھی پوری کہانی۔" ثانیہ نے لمبی سانس لے کر بات ختم کی۔

"یا خدا! کیا چیز ہیں یہ رقیہ باجی' لفظوں کے ہیر پھیر سے لوگوں کے درمیان فساد پیدا کرنا' کتنا عظیم گناہ ہے۔ میں نے کیا کہا تھا اور انہوں نے کیا بنادیا۔" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ارے! میں نے آپ کا کھانا ٹھنڈا کردیا' لائیں میں گرم لاکر دیتی ہوں۔" ثانیہ میری پلیٹ کی جانب دیکھ کر بولی' جس میں ہر چیز جوں کی توں رکھی تھی۔

"ارے نہیں' ٹھیک ہے میں کھالوں گی۔" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں' یہ پلیٹ میں اوون میں گرم کرکے کھالوں گی' آپ کو اور لادیتی ہوں۔" وہ زبردستی میری ... لے کر چلی گئی اور تھوڑی دیر میں تازہ پلیٹ بنا کر لے آئی۔

"میں تو اللہ کا شکر ادا کررہی ہوں کہ فرحت نے ان کی بے سروپا باتوں کا اعتبار نہیں کیا' ورنہ دلوں میں بال آنے میں کیا دیر لگتی ہے۔"

"فرحت بھابھی واقعی سمجھ دار ہیں' ورنہ میرے دل میں تو واقعی آپ کی جانب سے بدگمانی پیدا ہوگئی تھی لیکن فرحت بھابھی نے بڑی اچھی بات کی کہ اگر تم کسی سے کسی تیسرے شخص کے متعلق بات کررہی ہو اور اسے جانتی بھی ہو تو اس کی شخصیت کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے سامنے والے کی بات میں پلس مائنس کرتے جاؤ تاکہ بدگمانی زیادہ دیر دل میں نہ رہے ورنہ رشتوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ بس آپ سے اتنا کہوں گی کہ ایسے لوگوں سے بات کرتے ہوئے ذرا خیال رکھیں' کیا پلس کرنا ہے اور کیا مائنس' بس ذرا سنبھل کے۔" ثانیہ نے کہا اور ہنستے ہوئے اٹھ گئی۔

☼

آمنہ ریاض

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے' جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے' جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینیا کی مریض ہے' جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت دقت لگتا ہے۔ وہ فیملی کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی' ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

سبیہہ العباس طبیعتاً" سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے' جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ

پھپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہہ 'تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ 'تنوی کا منگیتر ہے' وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

شبیہہ العباس 'ثروت دانیال کی اولاد ہے' جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور غصیلا بنا دیا۔ وہ انیبا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیبا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال 'ثمینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں تو ثمینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد 'زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً" ہادی کا ٹکراؤ شبیہہ سے ہوتا ہے جس سے ہادی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجلاہٹ میں شبیہہ ہادی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ہادی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ہادی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں 'لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً" ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ 'ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ہادی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں' جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ہادی 'ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ 'ہادی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر 'نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے' وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد 'بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو' رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے 'لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔ دین محمد 'جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت' دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آ کر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن 'ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ 'ہادی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس 'ہادی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ہادی کے باپ 'رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ 'ہادی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ہادی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی معذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ہادی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایمبیسی حرکت میں آ جائے گی۔

ثمینہ نے ہادی سے کہا' وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہو گا تاکہ حویلی جا سکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ہادی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کر سکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہادی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔

٢١
اکیسویں قسط

"یہ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے؟" شبیہہ العباس نے کسی قدر حیران ہوتے ہوئے جیسے خود کلامی کے انداز میں کہا تھا۔

"تم اسے جانتے ہو؟" مستقیم بھٹی نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"زیادہ تو نہیں لیکن ...... خادم! یہ لڑکی کون ہے اور حویلی میں کیا کر رہی ہے؟" شبیہہ نے الجھن بھرے انداز میں کہتے ہوئے ملازم سے پوچھا۔

"چھوٹے چوہدری! یہ دوپہر سے آئی بیٹھی ہے۔ بڑی چوہدرائن سے ملنا چاہتی ہے۔ ہم نے بتایا کہ وہ حویلی میں موجود نہیں ہیں تو حویلی کے باقی مالکوں سے ملنے پر اصرار کرنے لگی۔ مجبوراً" ہمیں اسے اندر بٹھانا پڑا 'پھر تنوی بی بی نے بولا کہ اسے گیسٹ روم میں ٹھہرا دو۔" خادم نے اپنی بھاری 'مودب آواز میں جواب دیا تھا۔

"ہوں ...... نام کیا بتاتی ہے؟" مستقیم بھٹی نے دور متذبذب سی کھڑی ہادی کو دیکھتے ہوئے پر سوچ انداز میں کہا۔

"جی! ہادی رجب علی۔"

مستقیم بھٹی نے ایک اور پر سوچ ہنکارہ بھرا۔ مانوس نین نقش 'بولتی ہوئی سی' کسی کی یاد دلاتی ہوئی سی پیشانی' وہی ذہانت کی چمک لیے ہوئے آنکھیں۔ شک و شبہہ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ جو بھی تھا سامنے کی بات تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ ایسا تھا جو انہیں کشمکش میں ڈال رہا تھا۔

"مہمان کو مہمان خانے میں لے چلو خادم!" انہوں نے ملازم سے کہا۔

"لیکن بابا ......" شبیہہ نے کچھ کہنا چاہا۔ مستقیم بھٹی نے ہاتھ کے خفیف سے اشارے سے اسے بولنے سے

روک دیا۔

"مجھے اس سے بات کرنے دو شبیہہ!"

شبیہہ کچھ کہنا چاہتا تھا' لیکن خاموش رہا اور مستقیم بھٹی کے پیچھے چل دیا۔

☆ ☆ ☆

"ابا جان کی وفات کے بعد ممی مجھے دبئی لے گئی تھیں' بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ فیاض ماما ہم دونوں کو اپنے ساتھ دبئی لے گئے تھے۔ کچھ عرصے دبئی میں رہے' پھر وہاں سے قطر اور اب آئرلینڈ..... لیکن اس دوران میں اپنے دل سے پاکستان آنے کا خواب نکال نہیں سکی۔ مجھے بے حد شوق تھا کہ اس ملک' اس علاقے کو دیکھوں جہاں بابا جان پیدا ہوئے تھے اور پلے بڑھے تھے۔ مجھے وہ انسٹی ٹیوٹ دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا' جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔"

ہادی بہت ٹھہر ٹھہر کر اور تحمل سے بول رہی تھی اور مستقیم بھٹی کی زیرک نگاہیں بغور اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"ممی کے واپس آئرلینڈ جانے سے پہلے ہی میں نے یہاں ایڈمیشن لے لیا تھا' لیکن جیسے ہی ممی نے جانے کا ارادہ کیا' میں نے اسی روز حویلی آنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس ملک میں آؤں اور انسٹی ٹیوٹ کو دیکھے بغیر چلی جاؤں' گاؤں نہ دیکھوں' جہاں سے میرے بابا جان کی یادیں وابستہ ہیں اور اس مکان کو نہ دیکھوں جہاں میرے بابا بڑے ہوئے تھے۔" اس نے چند لمحوں کا توقف کیا اور جانچتی نظروں سے مستقیم بھٹی کا جائزہ لیا۔

"آپ سے صرف اتنی ریکویسٹ ہے کہ مجھے چند روز یہاں رہ لینے دیں۔ بابا جان کی حویلی کو دیکھ لوں' ان سے وابستہ افراد سے مل لوں' اس کے بعد میں واپس چلی جاؤں گی۔"

اس نے بہت سوچ سمجھ کر اسکرپٹ تیار کیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس اسکرپٹ کی حیثیت تاش کے پتوں کے قلعے کی سی تھی۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ قلعہ قائم رہتا ہے یا انکار کی ایک پھونک سے ڈھے جاتا ہے۔

"آپ کو ریکویسٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹے! اس حویلی پر آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اس حویلی میں رہنے والے باقی افراد کا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اس حویلی پر آپ کا ہم سب سے زیادہ حق ہے رجب بھائی صاحب کی وجہ سے تو یہ بھی غلط نہیں ہوگا۔"

مستقیم بھٹی کا نرم مگر مہربان لہجہ ہادی کو اس کے تمام تر اعتماد کے باوجود ہونق بنا گیا تھا۔

"جی..... میں کچھ سمجھی نہیں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ مستقیم بھٹی آہستگی سے ہنس دیے جیسے کسی بچے کی بات پر ہنسا جاتا ہے۔

"اس میں نہ سمجھنے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے بیٹے! سیدھی سی بات ہے' یہ حویلی جتنی ہماری ہے' اتنی ہی آپ کی بھی ہے۔ لہٰذا آپ کو یہاں قیام کے لیے کسی کی اجازت کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ آپ جب تک چاہیں' یہاں رہ سکتی ہیں۔"

"او' تھینک یو سو مچ مستقیم صاحب!"

"ارے! یہ تو بہت ہی غیریت والا طرز تخاطب ہے۔ آپ کے اور میرے درمیان ایک بہت ہی خوب صورت اور قابل احترام رشتہ ہے۔ چچا' باپ کے برابر ہی تو ہوتا ہے۔ مجھے اچھا لگے گا' اگر آپ مجھے اسی رشتے کے حوالے سے پکاریں۔"

"جی ضرور....." ہادی اس بار بھی اپنے ہونق پن پر پوری طرح قابو نہیں پاسکی تھی۔ لیکن چونکہ مستقیم بھٹی کسی اور ہی دھن میں تھے' لہٰذا انہوں نے ہادی کے تاثرات کا کچھ خاص نوٹس نہ لیا۔

"رجب بھائی صاحب کے ساتھ اگرچہ ہمیں زیادہ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا لیکن ان کے حوالے سے کچھ بہت اچھی یادیں بہرحال میرے حافظے میں موجود ہیں۔ آپ کو بھی یوں اچانک سامنے دیکھ کر میں بہت خوش ہوں۔ بھائی صاحب کے حوالے سے آپ ہمیں عزیز بھی بہت ہوئیں۔ مجھے امید ہے اماں بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔" ہادی ان کے پرخلوص لہجے پر محض مسکرا ہی سکتی تھی۔

"میں ملازمہ سے کہہ کر آپ کا سامان گیسٹ روم سے اندرونی کمرے میں بھجوا دیتا ہوں۔ رات کے کھانے پر باقی سب سے بھی آپ کی ملاقات ہوجائے گی۔ اس وقت آپ آرام کرنا چاہو تو بصد شوق....."

مستقیم بھٹی نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ہادی بھی دل ہی دل میں متعجب ہوتے ہوئے احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک بات اور....." مستقیم بھٹی دروازے کی طرف جاتے ہوئے پلٹے۔

"یہ حویلی آپ کی ہے۔ اس حویلی میں رہنے والے افراد بھی آپ کے اپنے ہیں' لہٰذا آپ کو..... کسی بھی قسم کی جھجک محسوس کرنے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔ جیسی اس حویلی کی باقی بچیاں ہیں' ویسی ہی آپ بھی ہیں۔"

اپنائیت کا بھرپور احساس دلاتا مشفق لہجہ تھا۔ ہادی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

"میں ملازمہ کو بھجواتا ہوں' وہ کمرے تک آپ کی رہنمائی کردے گی۔" مستقیم بھٹی باوقار چال چلتے ہوئے مہمان خانے سے باہر نکل گئے۔

ہادی چند لمحے خالی الذہنی کی کیفیت میں دروازے کی طرف دیکھتی رہی پھر گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ مستقیم بھٹی کا رویہ اس کی توقعات کے بالکل ہی برعکس تھا۔ وہ ان کی طرف سے غرور' اکتاہٹ اور بیزاری جیسے رویوں کی توقع کررہی تھی' جبکہ انہوں نے اس سے بہت اپنائیت کا رویہ اختیار کیا تھا' بلکہ بہت کھلے دل سے اسے خوش آمدید بھی کہا تھا۔ بہرحال ہادی مطمئن بھی اور کسی قدر خوش بھی۔ اسے حویلی میں قیام کی اجازت مل گئی تھی اور فی الحال یہی بہت تھا۔ اب دیکھنا صرف یہ تھا کہ حویلی کے باقی مکین اس کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور وہ یہ دیکھنے کے لیے بے چین تھی۔

☆ ☆ ☆

حرم' تنوی اور رشنا اطمینان سے بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ درمیان میں سلے ان سلے چمکیلے کپڑوں کا ڈھیر اور لڑکیوں کے چہروں پر اشتیاق کی کرنیں۔

"حرم آپا! یہ بائل گرین کلر آپ کو بہت سوٹ کرے گا۔" تنوی نے گرین کلر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دبے دبے سے جوش کے ساتھ کہا۔

"میں تو کہتی ہوں مہندی کے لیے اس کی لانگ شرٹ بنوالیں۔ ساتھ میں پیلا چوڑی دار پاجامہ..... سچ! آپ بہت پیاری لگیں گی۔"

"چوڑی دار پاجامہ پہننے کون دے گا۔" حرم نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ رشنا اور تنوی نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رشنا کا ہاتھ تیزی سے اپنی گود میں سوتے ہوئے ڈیڑھ سال کے رافع کو تھپکنے لگا۔

"حرم صحیح کہہ رہی ہے۔ ویسے بھی ہم کتنے ہی پلانز بنالیں' فائنل چوائس تو بی جان کی ہی ہوگی۔" رشنا نے سادگی سے کہا۔

تنوی نے بددلی سے کپڑا واپس پھینک دیا۔

"اٹھالیں اس ڈھیر کو..... جب فائنل چوائس بی جان کو ہی کرنا ہے تو ہم کس لیے اپنا ٹائم ضائع کریں۔"

"تم کیوں اپنا موڈ آف کر رہی ہو؟" حرم نے پیار سے اس کے بال سہلائے۔
"تمہیں تو بی جان کبھی منع نہیں کریں گی کیونکہ تمہاری بات وہ ٹالتی ہی نہیں ہیں۔ تمہیں پسند ہے یہ کلر اور کپڑا تو تم بنالو۔"
"نہیں حرم آپا! یہ کپڑے آپ کے لیے آئے ہیں۔ میں ان میں سے کچھ نہیں لے۔۔۔" اس نے منہ بسور کر ابھی یہیں تک کہا تھا کہ دروازے پر مخصوص سی دستک ہوئی۔
"آجاؤ بھئی!" رشنا نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ دروازہ آہستگی سے کھول کر ملازمہ کلثوم اندر داخل ہوئی۔
"رشنا بھابھی! آپ کو بڑی بی بی نے اپنے کمرے میں بلوایا ہے اور حرم باجی اور تنوی باجی! بڑی بی بی کہہ رہی ہیں، آپ لوگ کھانے کے کمرے میں آجائیں۔ آج سب لوگ اکٹھے کھانا کھائیں گے۔"
وہ رٹے رٹائے طوطے کی طرح پیغام نشر کر کے رخصت ہونے لگی۔ حرم نے فوراً آواز دے کر روک دیا۔
"ارے! رکو بھئی۔ کہاں بھاگی جا رہی ہو؟ آج کیا خاص بات ہے کہ سب اکٹھے کھانا کھائیں گے؟ کوئی مہمان آیا ہے کیا؟" اس نے فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھا۔
"یہ تو پتا نہیں جی! بڑی بی بی نے اتنا ہی کہنے کو کہا تھا۔" کلثوم نے مؤدب ہو کر جواب دیا۔
"اچھا! ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔"
"رکو کلثوم! وہ لڑکی جو شام میں آئی تھی اور جسے گیسٹ روم میں ٹھہرایا تھا، وہ واپس چلی گئی؟" اب کی بار تنوی نے پوچھا تھا۔
"نہیں جی۔۔۔ بڑے چوہدری جی نے اس کا سامان ابھی آپ کے ساتھ والے کمرے میں رکھوا دیا ہے۔" کلثوم نے تو عام سے انداز میں بتایا تھا، لڑکیوں کے سر پر گویا بم پھٹا۔
"ارے! یہ کون محترمہ ہیں بھئی، جنہیں گیسٹ روم سے نکال کر اندر کمرے میں ٹھہرایا جا رہا ہے؟" رشنا نے قدرے تعجب سے کہا۔
"خدا جانے۔۔۔ لیکن ہو نہ ہو، یہ ہے کوئی خاص ہستی۔" حرم نے خیال ظاہر کیا تھا۔
"یہ ڈنر بھی اسی کے لیے ارینج ہوا ہے۔" تنوی نے بھی خیال ظاہر کیا، پھر جوش کے ساتھ بولی۔ "دیکھیے گا حرم آپا! وہ کتنی پیاری ہے۔ رشنا بھابھی! میں نے حرم آپا کو پہلے بھی بتایا تھا۔"
"رہنے دو تنوی! تمہاری بات پر اب کون بھروسا کرے۔ تمہیں آج تک کوئی برا لگا بھی ہے؟" رشنا نے مزے سے اس کا مذاق اڑایا۔
"اور نہیں تو کیا۔۔۔" حرم ہنسی۔ "یہ اور جلال۔۔۔ دونوں ہی ایک سے ہیں۔ مجال ہے، جو کبھی کسی کی تعریف سے چوک جائیں۔"
دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔ تنوی منہ بسور کر بیٹھ گئی۔
"اچھا میں امی کے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تم لوگ بھی جلدی سے آجاؤ۔ دیکھیں تو سہی، کون سا کوہرِ نایاب آیا ہے۔" رشنا افراتفری میں باہر نکل گئی۔ حرم اٹھ کر کپڑوں کا ڈھیر سمیٹنے لگی۔ ساتھ ہی گاہے بگاہے تنوی پر بھی مسکراتی نگاہیں ڈال لیتی تھی، جو مستقل منہ بنائے بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼
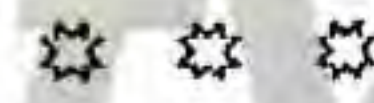
"آؤ ہادی! یہاں بیٹھو۔"

مستقیم بھٹی کی آواز نے ہادی کی رہنمائی کی تھی۔ وہ دھیمے سے انداز میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک محسوس کن خاموشی پھیل گئی تھی اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سب کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہیں۔ اتنے بہت سے لوگوں میں صرف تین چہروں سے وہ واقف تھی۔ مستقیم بھٹی کا مہربان چہرہ، تنوی کا معصوم پر اشتیاق چہرہ اور شبیہہ العباس کا خشونت بھرا چہرہ۔
"یہ ہادی ہے۔ ہمارے بڑے بھائی رجب علی کی بیٹی۔ رجب بھائی صاحب کا انتقال بہت جواں عمری میں ہو گیا تھا، تب ہادی کی والدہ کو ہادی کے ماموں اپنے ساتھ دبئی لے گئے تھے۔ اب ہادی کئی سال بعد پاکستان آئی ہے۔" مستقیم بھٹی نے بنا کسی کو مخاطب کیے اسے متعارف کرانا شروع کر دیا تھا، پھر انہوں نے ہادی کو مخاطب کیا۔
"ہادی بیٹے! چونکہ آپ یہاں کسی سے بھی واقف نہیں ہیں، اس لیے میں فرداً فرداً سب کا تعارف کرا دیتا ہوں۔ یہ منصور بھٹی ہیں، ہمارے سب سے چھوٹے بھائی اور آپ کے چھوٹے چچا۔ یہ ان کی زوجہ عالیہ ہیں۔ کمال، آفاق، ضیا اور جلال ان کے صاحبزادے ہیں۔
یہ شبیہہ العباس ہیں، ہمارے صاحبزادے۔۔۔ سب آپ کے بہن بھائی ہیں ہادی! اتنے عرصے آپس میں نہ مل پانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خون کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے امید ہے، آپ کو سب کے ساتھ گھلنے ملنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"
کھانا بے حد خاموشی کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ اگر سب کے دلوں میں ہادی کے متعلق کوئی الجھن تھی بھی تو اسے وقتی طور پر دبا دیا گیا تھا۔ صرف نمل تھی، جو حرم کے کان میں گھسے جا رہی تھی۔
"ہمارے کوئی رجب علی نام کے تایا بھی تھے؟ حرم آپا! آپ نے تو کبھی مجھے بتایا ہی نہیں۔"
"اس کے خیال میں حرم وہ معتبر ہستی تھی، جو ہر خبر رکھتی ہے۔
"تو۔۔۔ ہمیں تو خود آج پتا چل رہا ہے۔ تمہیں کہاں سے بتا دیتی۔"
"ویسے حرم آپا! میں نے بتایا تھا ناں، لڑکی بہت خوب صورت ہے۔ اب کیا کہتی ہیں؟" تنوی نے دوسری جانب سرگوشی کی تھی۔
"ہاں۔۔۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔"
ہادی ان سب کے تبصروں اور نظروں سے بے پروا ہو کر اطمینان سے سیر ہو کر کھانا کھا رہی تھی۔ جب سب لوگ کھانا کھا چکے اور مرد حضرات اٹھ کر جانے لگے، تب ہادی نے واضح طور پر دیکھا۔ شبیہہ العباس اسے کڑی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ہادی کا ڈگمگاتا اعتماد مستقیم بھٹی کے محبت و شفقت بھرے لہجے سے اچھا خاصا حوصلہ پکڑ چکا تھا۔ اس نے ادائے بے نیازی سے اسے دیکھا اور تیکھے پن سے منہ موڑ لیا۔

☼ ☼ ☼

"مستقیم۔۔۔ یہ لڑکی۔۔۔" منصور بھٹی نے عجلت میں اسٹڈی میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
"رجب بھائی صاحب کی بیٹی ہے۔" مستقیم بھٹی نے، جو ریک میں کوئی کتاب تلاش کر رہے تھے، فوراً جواب دیا تھا۔
"ہاں! لیکن۔۔۔ تمہیں اماں سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔" منصور بھٹی کی آواز میں کسی قدر تشویش تھی۔
"منصور چچا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" شبیہہ بھی ان کے پیچھے ہی اندر داخل ہوا تھا۔ "اول تو اس لڑکی کے ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ آپ کے سوتیلے بھائی کی بیٹی ہے، دوسرے بی جان سے پوچھے بغیر آپ کو اسے حویلی میں ٹھہرانے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا ابا!"

جنت بیگم کا لاڈلا ہونے کی بنا پر وہ ایسے بہت سے رازوں سے واقف تھا جن سے باقی لوگ ناواقف تھے۔

"مادی کا چہرہ سب سے بڑا ثبوت ہے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ رجب بھائی صاحب کی بیٹی ہے۔ باقی رہی اماں سے پوچھنے کی بات ۔۔۔ تو تم دونوں اچھی طرح جانتے ہو' اماں بیمار ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں جب ہر طرح کا چھوٹا بڑا فیصلہ کرنے کا اختیار میرے پاس ہے تو میں کیوں مادی کو نہ ٹھہراؤں؟" مستقیم بھٹی کو شبیہہ کا انداز ناگوار گزرا تھا۔

"آپ میری بات نہیں سمجھ رہے ابا!" شبیہہ نے تحمل سے کہا۔

"دراصل میں اس لڑکی کو پہلے سے جانتا ہوں اور یہ کبھی بھی مجھے اچھی نہیں لگی۔ عجیب بدتمیزی لڑکی ہے اور اسی لیے مجھے شک ہے کہ یہ کہیں آپ کو بے وقوف نہ بنا رہی ہو۔"

"تم اسے کس طرح جانتے ہو؟"

منصور بھٹی نے الجھ کر پوچھا۔ شبیہہ نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور پھر اپنی اور مادی کی پہلی ملاقات سے آخری ملاقات تک کا حال کہہ سنایا' لیکن نہ جانے کیوں کسی مصلحت کے تحت وہ جلال کا نام گول کر گیا تھا۔

"کسی کو ناپسند کرنے یا اس پر شک کرنے کی یہ ایسی کوئی خاص وجہ تو نہیں ہے۔" مستقیم بھٹی نے کہا تھا۔

"تمہیں وہ شاید اسی لیے بری لگی کہ کسی نے پہلی بار تمہیں یوں منہ توڑ جواب دیے ہوں گے۔ تمہیں عادت بھی تو نہیں' کسی سے کھری کھری سننے کی۔" مستقیم بھٹی وہ واحد انسان تھے' جو بنا گھبرائے اس کے مزاج پر تنقید کر لیتے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ یہی بات شبیہہ کو چبھتی بھی بہت تھی۔ حسب توقع وہ اس بار بھی چڑ گیا تھا۔

"آپ کو تو میرے علاوہ کبھی کوئی غلط لگتا ہی نہیں۔" وہ مزید کوئی لفظ بولے بنا اسٹڈی سے نکل گیا۔

"مستقیم! شبیہہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے نہیں پتا' یہ لڑکی سچ بول رہی ہے یا جھوٹ۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں' ان ماں بیٹی کو اماں نے خود حویلی سے نکالا تھا۔ ایسا نہ ہو اس کو ٹھہرا کر' ہم اماں کے غصے کو دعوت دے بیٹھیں اور تم جانتے ہو' اماں کا غصہ بہت غضب ناک ہوتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں منصور! اماں تھوڑا بہت غصہ ضرور کریں گی لیکن میرا خیال ہے' ہم عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے ہیں' جہاں اماں کو ہمارے فیصلوں کو بھی اہمیت دینا چاہیے۔" مستقیم بھٹی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"ساری زندگی بہت غلط فیصلے کیے ہیں اماں نے بھی اور ان کی تقلید میں ہم نے بھی ۔۔۔ لیکن اب اور نہیں ۔۔۔ میں اپنے غلط فیصلوں کو سدھارنا چاہتا ہوں منصور! اور جتنا اللہ موقع دے رہا ہے' اتنا تو میں ضرور کروں گا' آدھی سے زیادہ زندگی پچھتاووں کی نذر ہو گئی۔ میں نہیں چاہتا کہ قبر تک بھی یہ پچھتاوے میرے ساتھ رہیں۔"

مستقیم بھٹی کی آواز نہ صرف پچھتاوے کے احساس سے بوجھل تھی' بلکہ بے حد دھیمی بھی تھی اور ان کے چہرے پر ملال کے سائے بھی لہرا رہے تھے۔

منصور بھٹی نے بڑھ کر بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"صحیح کہہ رہے ہو تم۔ اماں کے غلط فیصلوں کا بھگتان تو سب نے ہی بھگتا ہے' لیکن میں اس فیصلے میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"مادی کا بھی اس حویلی پر اتنا ہی حق ہے جتنا ہم سب کا۔ میں اس کا حق اسے واپس کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے منصور! اللہ ہم سے ناخوش ہے۔ اماں نے ایک نہیں' دو دو یتیموں کا حق غصب کیا تھا اور یتیموں کا حق مارنے والوں سے اللہ خوش کیسے ہو سکتا ہے؟ مادی کا حق اسے دیں تو اللہ ہم سے خوش ہو گا اور یہ بے سکونی بھی ختم ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے۔"

منصور بھٹی مستقل تائید میں سر ہلا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

نماز کے بعد تسبیح پوری کرنا تنوی کے لیے دو بھر ہوا جا رہا تھا۔ فطری تجسس تھا جو دل و دماغ میں مستقل ابال لے رہا تھا۔ بس نہ چلتا تھا' ابھی اڑ کر چھوٹی امی (عالیہ) کے پاس جائے اور مادی کے متعلق دل میں ابھرتا ہر سوال ان سے پوچھ لے' لیکن نمل تھی کہ بستر سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور حرم کی فجر کی نماز کچھ زیادہ ہی طویل ہو گئی تھی۔ ایک تو تنوی آج تک یہ نہ سمجھ سکی تھی کہ اتنے لمبے لمبے سجدوں میں وہ اللہ سے مانگتی کیا ہے۔

بہرحال پچھلی رات بھی جب تک نیند پلکوں کی دہلیز سے اتر کر آنکھوں کے اندر تک نہ گھس گئی تھی وہ لوگ مادی کو موضوع بحث بنائے رہے تھیں اور ان لوگوں نے آپس میں یہی طے کیا تھا کہ صبح اٹھتے ہی چھوٹی امی کے در پر حاضری دیں گے۔

"اب اٹھ بھی جائیں حرم آپا! آپ کو پتا بھی ہے' آج کل چھوٹی امی نماز پڑھ کر سو جاتی ہیں۔ ذرا سی بھی دیر کی تو وہ جلدی دوبارہ نہیں اٹھیں گی۔" جاء نماز سے اٹھتے ہوئے اس نے ٹھنک کر کہا تھا۔

"اٹھ جاتی ہوں بھئی۔ آخر تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟" حرم نے دعا مکمل کر کے پوچھا۔ ساتھ ہی جاء نماز کا کونا موڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھے بٹھائے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ہمارے کوئی بڑے مرحوم ماموں بھی تھے اور خیر سے ان کی ایک عدد بیٹی بھی ہے۔" تنوی کے لہجے میں اشتیاق بھی تھا' تجسس بھی۔ "آپ کو یہ سب سن کر حیرانی نہیں ہوئی حرم آپا؟ میرا تو دل چاہتا ہے جلد از جلد اصل بات جان لوں کہ اگر کوئی مرحوم ماموں تھے بھی تو اب تک ان کا نام صیغۂ راز میں کیوں رکھا گیا۔ آپ مانیں یا نہ مانیں' اس کے پیچھے ضرور کوئی لمبی کہانی ہے۔"

"بھئی! لمبی کہانی ہو یا چھوٹی۔ میں کسی کہانی کے لیے اپنی نیند برباد نہیں کر سکتی۔" نمل نے بے نیازی سے کہہ کر کروٹ بدل لی۔

"کل رات تو سب سے زیادہ تم ہی بے چین تھیں کہ امی سے پوچھتے ہیں' اب نیند زیادہ پیاری ہو گئی؟" حرم نے کہا۔

"رات گئی' بات گئی۔ یہ میں نہیں کہتی' سیانے کہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس لڑکی کے بارے میں جاننے کا مجھے تجسس بہت ہے' لیکن اپنی نیند سے زیادہ پیارا مجھے کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ لوگ کہانی سن کر مجھے بھی سنا دیجیے گا۔ اچھا گڈ نائٹ۔" وہ کہہ کر نیند کی وادی میں اتر گئی۔

"اس کی جب تک نیند پوری نہیں ہو جاتی۔ اس کی نائٹ ہی رہے گی۔"

حرم اور تنوی کمرے سے باہر آ گئیں۔ چھوٹی امی کا کمرہ کون سا میلوں دور تھا۔ ہلکی سی دستک دی اور اجازت پاتے ہی اندر داخل ہو گئیں۔

"السلام علیکم چھوٹی امی!"

تنوی سب سے پہلے ان کے کمبل میں گھسی۔ اس کی پرورش بھی عالیہ کے ہاتھوں ہوئی تھی اور ان کے اپنے بچوں کے برعکس وہ ان کی لاڈلی بھی بہت تھی' بلکہ ایک طرح سے انہی کا پرتو تھی۔

"وعلیکم السلام ۔۔۔ تم دونوں آج صبح صبح کیسے؟" انہوں نے قدرے تعجب سے پوچھا۔ نماز کے انداز میں گرم شال لیے وہ قرآن مجید پڑھ رہی تھیں۔

"بس! آپ کی بہت یاد آ رہی تھی۔" تنوی نے لاڈ سے کہا۔ عالیہ ہنس دیں۔

"اب مجھے بناؤ نہیں۔ اچھی طرح جانتی ہوں اپنی بیٹی کو۔" تنوی ہنسنے لگی۔ حرم نے کہا۔

"امی! ہم ہادی کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔"

"ہیں۔۔۔؟ سب کچھ مستقیم بھائی صاحب بتا تو چکے ہیں اب مجھ سے کیا جاننا چاہ رہی ہو تم لوگ؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی کہ بیٹھے بٹھائے ہماری نئی نویلی اور اتنی بڑی کزن کہاں سے آگئی جب کہ اس کا تو کہیں دور دور تک پتا نہیں تھا۔" اب کے تنوی نے کہا تھا۔

"مجھے پتا تھا تجسس کے مارے تم لوگوں کو نیند ہی نہیں آئی ہوگی۔ نمل کیسے پیچھے رہ گئی؟" عالیہ نے قرآن پاک غلاف میں لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

"اسے اپنی نیند زیادہ پیاری ہے۔" حرم نے کہا۔

"اچھا! آپ چھوڑیں نمل کو۔۔۔ ہمیں ہادی کے بارے میں بتائیں؟" تنوی نے بے چینی سے کہا تھا۔

"بھئی تقریباً" ساری ہی بات تو تمہیں مستقیم بھائی صاحب بتا چکے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب مجھ سے تم لوگ کیا جاننا چاہتی ہو۔" عالیہ الجھ کر بولیں۔

"سب کچھ بتا چکے ہیں بڑے ابا۔ لیکن حیرانی ہمیں اس بات پر ہے کہ اگر یہ لڑکی واقعی ہماری کزن ہے تو آج تک ہم نے اس کا یا اس کے ابا کا ذکر کیوں نہیں سنا؟" تنوی نے کہا۔

"بھئی! معاملہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے سسر اور تمہارے نانا جان نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی سے دو بچے تھے ایک یہ رجب بھائی صاحب اور دوسری ایک بیٹی جو بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔۔۔ مجھے بہت زیادہ معلومات تو نہیں ہیں۔ جتنا تمہارے چھوٹے ماموں نے بتایا وہی جانتی ہوں کہ رجب بھائی صاحب اسی حویلی میں پلے بڑھے تھے پھر وہ حویلی سے چلے گئے کہاں گئے کس کے پاس رہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ اس کے بعد جب میں بیاہ کر اس حویلی میں آئی تو رجب بھائی صاحب اور ان کی بیوی ثمینہ اسی حویلی میں تھے اور رجب بھائی صاحب کسی بیماری یا حادثے کی وجہ سے اپنی ٹانگ گنوا بیٹھے تھے۔ اب اماں (جنت بیگم) کی سخت مزاجی سے تو تم سب واقف ہی ہو۔ انہیں اپنے شوہر کی پہلی بیوی کی اولاد سے پرخاش تھی۔ اسی پرخاش کے ہاتھوں انہوں نے رجب بھائی صاحب اور ثمینہ بھابھی پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔"

عالیہ بولتے بولتے اس صبح کے دوراہے پر جا پہنچیں، جب اپنی شادی کی پہلی صبح وہ اپنے کمرے سے باہر نکلیں تو عین صحن کے درمیان ان کی ساس اپنی بڑی بہو بلکہ سوتیلی بہو کو مار پیٹ رہی تھیں۔ ثمینہ کو تشدد کا نشانہ کیوں بنایا جا رہا تھا، یہ تو عالیہ کو پتا نہیں چل سکا۔ وہ صرف اتنا جان پائیں کہ ان کی ساس بہت زور آور ہیں۔ اختیارات کا جو منبع انہیں حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں مل سکتا۔ عالیہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پہلے ہی روز ساس کا کچھ ایسا رعب اور خوف ان کے دل و دماغ پر چھایا کہ عالیہ پھر ساری زندگی ان کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ساری زندگی ڈری سہمی سی گزاری تھی۔ بچوں کی پرورش بھی اسی نہج پر کی۔ یہ الگ بات ہے کہ تنوی کے علاوہ ان کے سہم کا اثر کوئی بھی قبول نہ کر سکا۔ گو کہ وہ ان کی اولاد نہیں تھی مگر حنا ان کا اثر تنوی نے قبول کیا اور کوئی نہ کر سکا۔

"کیا ہوا امی! آپ کہاں کھو گئیں؟" حرم نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو عالیہ چونک سی گئیں پھر گہری سانس بھر کر بولیں۔

"یہ تو خیر میری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ اماں کا مزاج ایسا ہے کہ سکون سے تو انہوں نے خیر کبھی بھی کسی کو نہیں رہنے دیا لیکن ثمینہ بھابھی کو تو انہوں نے بہت ہی تنگ رکھا۔ لوگ جانور پالتے ہیں تو اس سے بھی نرمی سے

ہی آجاتے ہیں۔ اماں نے ثمینہ بھابھی کو جانور کی سی نرمی بھی نہیں دی اور جب رجب بھائی صاحب کا انتقال ہوا پھر تو اماں نے ثمینہ بھابھی کو بہت ہی تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت ہادی بہت ہی چھوٹی تھی۔ ثمینہ بھابھی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہادی کو لے کر اپنے بھائی کے پاس چلی جائیں۔

تم لوگوں کے دادا کا انتقال بھی اس وقت تک ہو چکا تھا۔ ثمینہ بھابھی کے جانے سے رجب بھائی صاحب کے باب بالکل ہی بند ہو گیا۔ ایک طرح سے اماں نے پابندی ہی عائد کر رکھی تھی کہ رجب بھائی صاحب کی بیوی اور بیٹی کا ذکر تک نہیں کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تم بچوں میں سے کوئی بھی ہادی اور اس کی ماں سے واقف نہیں ہے۔۔۔ بلکہ میں تو خود حیران ہوں کہ مستقیم بھائی صاحب نے ہادی کو حویلی میں ٹھہرانے جیسا فیصلہ کیسے کر لیا جبکہ اماں کے فیصلوں سے انحراف کی ہمت تو کوئی بھی نہیں کرتا۔"

تینوں کے مابین گہری خاموشی چھا گئی۔ جیسے تینوں کے دل اپنی اپنی جگہ بوجھل ہوں۔

"اس کا مطلب ہے کچھ عرصہ پہلے تک بی جان بہت ظالم تھیں۔" چند منٹ بعد تنوی نے کسی قدر بے یقینی اور تاسف کے ساتھ کہا۔

"تھیں نہیں۔۔۔ وہ اب بھی ایسی ہی ہیں۔" عالیہ نے دل میں سوچا مگر کچھ کہا نہیں۔ اب بچیوں کے سامنے کیا کہتیں۔

☼ ☼ ☼

نئی جگہ تھی۔ اسے رات کو نیند بھی مشکل سے آئی اور صبح آنکھ بھی جلدی کھل گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ مختصر سی نیند کے بعد بھی وہ خود کو بہت تر و تازہ محسوس کر رہی تھی شاید اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ذہن سے حویلی والوں کے رویوں کے خدشات کا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

نماز سے فارغ ہو کر اس نے کچھ سوچا پھر کمرے سے باہر نکل آئی کمروں کے آگے بنی ہوئی راہداری دور تک سنسان پڑی تھی اور گہری خاموشی کا راج تھا۔ ممکن ہے ان بند دروازوں کے پیچھے کوئی جاگ رہا ہو مگر باہر سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں محض آسیب بستے ہوں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اور ارد گرد کا جائزہ لیتی باہر آگئی۔

حویلی کے وسیع و عریض لان میں صبح کی اولین کرنیں بڑی خوب صورتی سے بکھری ہوئی تھیں۔ ہلکی سی ہوا کے نرم جھونکوں سے درختوں کے پتے لرز رہے تھے اور گھاس نم سی محسوس ہوتی تھی۔

اس نے چپل وہیں برآمدے میں اتار دی اور گھاس کی نمی کو اپنے تلووں پر محسوس کرنے لگی۔ ارد گرد کئی طرح کے پودوں کی بہتات تھی۔ اسے خیال آیا انیبا اور فیضان ماما یہاں ہوتے تو بہت خوش ہوتے۔ فیضان ماما سے اسے زریں کا خیال آیا اور زریں سے تنوی یاد آگئی۔

"اے لڑکی! رکو۔۔۔"

ہادی اپنی ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی، جب اسے اپنے عقب سے آواز سنائی دی۔ اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے، ساتھ ہی اس نے گردن موڑ کر دیکھا اور بد مزا ہو گئی۔ سفید رنگ کی کرسی پر شبیہہ العباس بیٹھا اسے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔ سامنے ٹیبل پر اخبار پھیلا ہوا تھا۔

ہادی نے گردن موڑی اور پھر سے چہل قدمی کرنے لگی۔ شبیہہ العباس کو اس کا انداز اور بھی ناگوار گزرا۔

"تمہیں سنائی نہیں دیتا، رکو ابھی اور اسی وقت!" اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ بلند اور بد تمیز تھا۔

ہادی نے پلٹ کر قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔ "کیا تم نے مجھ سے کچھ کہا؟"

شبیہہ نے اخبار میز پر پٹخا اور تن فن کرتا اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"تمہیں واقعی سنائی نہیں دیتا۔ کیا تمہارے علاوہ یہاں کوئی اور ہے جس سے میں رکنے کے لیے کہوں گا؟"
"حالانکہ حرکتیں تو تمہاری ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمہیں سنائی نہیں دیتا۔ کل رات بھی تمہارے ابا تمہیں بتا چکے ہیں کہ میرا نام ہادی ہے۔ اے لڑکی نہیں۔" ہادی نے تحمل سے لیکن منہ توڑنے والے انداز میں کہا تھا۔
"اگلی بار مجھے مخاطب کرنا ہو تو میرے نام سے کرنا۔ ورنہ مخاطب کرنے کی غلطی ہی نہ کرنا۔"
شبیہہ العباس سے اس انداز میں کب کوئی بات کر سکتا تھا۔ خصوصاً" ایک لڑکی تو ہرگز نہیں۔ اس کا غصہ عود کر آیا۔
"مجھے بھی تم جیسی جاہل اور بدتمیز لڑکی کو مخاطب کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم حویلی کیوں آئی ہو؟ عزائم کیا ہیں تمہارے؟"
"یہ تو تم نے بالکل ٹھیک پہچانا میں جاہل بھی ہوں اور بدتمیز بھی۔ لیکن ابھی تو تم نے صرف ٹریلر دیکھا ہے۔ اگلی بار مجھ سے اس انداز میں بات کرنے کی کوشش کرو گے تو پوری فلم بھی دکھا دوں گی اور تم غش کھا کر گر پڑو گے۔"
اس کا انداز اور لہجہ دونوں ہی آگ لگانے والا تھا شبیہہ کو بری طرح تاؤ آیا۔
"تم ــــــ"
"یہ تو ہوئی ایک بات۔" ہادی نے اپنی بات جاری رکھی۔
"دوسری بات یہ کہ میرے عزائم بہت خطرناک ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ تفصیل سے میں تمہیں کیوں آگاہ کروں ــــــ ہو کون تم؟" مسکرا کر طنز کرنا اور آگ لگانا اسے خوب آتا تھا۔ شبیہہ کا چہرہ اشتعال سے سرخ پڑ گیا۔
"میں وہ ہوں جو تمہیں اٹھوا کر اس حویلی سے باہر پھینکوانے کا اختیار رکھتا ہوں۔ چند منٹ میں تمہارا سارا غرور خاک میں ملا کر رکھ سکتا ہوں میں۔" اس نے دانت کچکچا کر کہا۔
ہادی پھر مسکرائی۔
"غرور کو خاک میں صرف اللہ ملا سکتا ہے تم کیا چیز ہو جو اتنا بڑا دعوا کر رہے ہو۔ باقی بات رہی مجھے اس حویلی سے باہر پھینکوانے کی ــــــ تو ایسی حماقت بھول کر بھی مت کرنا کیونکہ یہ حویلی صرف تمہارے دادا کی نہیں ہے میرے دادا کی بھی ہے ــــــ ایک طرح سے اس حویلی پر میرا حق تم سے تو زیادہ ہی ہے۔ ایسا نہ ہو مجھے باہر پھینکوانے کے بجائے تمہیں خود یہاں سے جانا پڑ جائے۔ امید ہے میری بات تم سمجھ گئے ہو گے۔"
ہادی جاتے جاتے پلٹی۔
"اور ہاں ــــــ اگلی بار مجھے دھمکی دینے کی غلطی بھی مت کرنا۔ میں تمہاری حویلی کی لڑکیوں جیسی نہیں ہوں جو تمہاری دھمکیوں سے سہم جاؤں۔ بظاہر ایسی لگتی نہیں ہوں لیکن غصے میں آ جاؤں تو اچھے اچھوں کی طبیعت صاف کر کے رکھ دیتی ہوں سو بی کیئر فل اینڈ اسٹے اوے فرام می۔" (محتاط رہو اور مجھ سے دور رہو) یہ بات بھی مسکرا کر ہی کہی گئی تھی۔
"تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔" شبیہہ العباس پیر پٹخ کر پلٹ گیا۔ ہادی نے مسکرا کر کندھے اچکا دیے اور زور سے بولی۔
"ایز یو وش۔"
شبیہہ العباس کی رگوں میں تو جیسے آگ دوڑنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ محض اتفاق ہی تھا کہ جب شبیہہ العباس انگارے چباتا اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی مڈبھیڑ مستقیم سے ہو گئی۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟" انہوں نے اس کا مشتعل چہرہ دیکھ کر پوچھا۔
"میں نے آپ سے کہا تھا ناں۔ اس لڑکی کو حویلی میں نہ ٹھہرائیں۔ انتہائی بدتمیز لڑکی ہے بات کرنے کا تو رتی بھی سلیقہ نہیں ہے۔" اس نے پھر پھوڑے۔ مستقیم بھٹی الجھے۔
"ہادی کی بات کر رہے ہو؟" پھر فوراً" جیسے سمجھ گئے۔
"جی ہاں وہی آپ کی قابل احترام مہمان۔" شبیہہ العباس نے سلگ کر کہا تھا۔
"اس لڑکی کو بات کرنے کی بالکل بھی تمیز نہیں ہے۔"
"تم کل بھی یہی کہہ رہے تھے اب بھی یہی کہہ رہے ہو جب پتا چل گیا ہے اسے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تو [illegible]نے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" مستقیم بھٹی نے الٹا اسے لتاڑا۔
"اب کیا میں اپنے ہی گھر میں پابند رہوں کہ کس سے بات کرنا ہے اور کس سے نہیں؟" وہ جل کر بولا۔
"بھئی وہ تمہاری ملازمہ تو ہے نہیں کہ تمیز سے پیش آنے کی پابند رہے۔" مستقیم بھٹی نے سابقہ انداز میں کہا

"اور میں دیکھ ہی چکا ہوں وہ بچی ذرا بھی بدتمیز مزاج کی نہیں ہے۔ بہت ہی تمیز اور سلیقے سے بات کرنے کی عادی ہے البتہ تمہارے مزاج سے بھی میں واقف ہوں۔ اس لیے مجھے یقین ہے تم نے ہی کوئی غلط بات کی ہو گی۔"
شبیہہ العباس کا موڈ مزید آف ہو گیا۔
"سنو شبیہہ! وہ بچی میری مہمان ہے اور اگر مجھے پتا چلا کہ میرے مہمان کے ساتھ کسی نے بھی کوئی بدتمیزی کی خواہ وہ تم ہی کیوں نہ ہو تو یاد رکھنا! میں بہت برے طریقے سے پیش آؤں گا۔ زندگی بھر تمہارے کسی معاملے میں دخل نہ دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں اس معاملے میں بھی چپ رہوں گا۔" مستقیم بھٹی نے مضبوط لہجے میں کہا اور مستحکم چال چلتے اپنے راستے پر چل دیے۔
شبیہہ کے ماتھے پر اتنے بل پڑ چکے تھے کہ شمار کرنا مشکل تھا۔ اس نے غصے سے فرش پر ایک ٹھوکر رسید کی اور تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

لڑکیوں کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ ذرا بھی جھجک کا شکار نہیں تھی کیونکہ کل رات کھانے کے بعد اور صبح ناشتے کے وقت ان لوگوں نے آپس میں کافی باتیں کی تھیں۔ درمیان میں جو جھجک تھی وہ تقریباً" مٹ ہی چکی تھی۔ تب ہی ہادی اکیلے بیٹھی اکتا گئی تو اس طرف آ گئی۔
دروازہ کھلا ہوا تھا ہادی نے ذرا جھجکتے ہوئے اندر جھانکا۔ سب اپنی اپنی جگہ مصروف لگتے تھے۔ اس نے جھجک طاق رکھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ سب کی نظریں خود بخود دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔
"کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔
"آؤ ناں ہادی! اس میں اجازت لینے کی کیا بات ہے۔" عالیہ چچی بھی وہیں موجود تھیں خوشدلی سے بولیں۔ [illegible]وں نے بھی اس کا استقبال مسکرا کر کیا تھا۔
"یہاں تو لگتا ہے کسی فینسی ڈریس شو کی تیاری کی جا رہی ہے۔"
ہادی نے اندر آتے ہوئے کپڑوں کے اس ڈھیر کو دیکھا جو ابھی بھی لڑکیوں کے درمیان دھرا تھا۔

"فینسی ڈریس شو ہی سمجھ لو۔۔۔ کیونکہ شادی کے فنکشنز بھی تو کسی فینسی ڈریس شو سے کم نہیں ہوتے۔" نمل نے کہا۔

"کس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں بھئی؟"

"حرم آپا کی۔۔۔ اگلے مہینے کی پچیس کو مہندی ہے۔" یہ جواب بھی نمل کی جانب سے ہی آیا تھا۔ حرم کے چہرے پر البتہ دھیمی سی مسکراہٹ لہرائی تھی۔

"اوہ کانگریچولیشنز۔"

"مادی! آپ پچیس تاریخ تک یہیں ہوں گی ناں؟" تنوی نے پوچھا۔

"ہوپ سو۔۔۔" مادی مسکرا کر بولی۔

"ارے آپ رکیے گا ناں۔۔۔ بہت مزا آئے گا شادی میں۔" تنوی بہت پرجوش ہو کر کہہ رہی تھی۔

"ارے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ اس کی بہن کی شادی ہے' شرکت کیوں نہیں کرے گی۔" عالیہ چچی کا انداز بے حد مشفق تھا۔

مادی کو یکدم جنت بیگم کا خیال آیا تھا۔ اس نے فوراً" سر جھٹک دیا اور ان کے کپڑے اور شادی کی دیگر تیاریوں کے متعلق پوچھنے لگی۔

"تقریباً" سب ہی لوگ اس کی توقعات سے بڑھ کر اچھے ثابت ہوئے تھے۔ سب ہی نے اسے پرجوش طریقے سے خوش آمدید کہا تھا اور اس بات نے مادی کا حوصلہ بے حد بڑھا دیا تھا۔ باقی بچا شبیہہ العباس تو اس کی مادی کو کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ ان سب کے درمیان بیٹھی بظاہر ان سب سے باتیں کرتے ہوئے وہ مستقل انہی سب پہلوؤں پر سوچ رہی تھی۔

تب ہی اس نے ملازمہ کی آواز سنی۔

"حرم بی بی! آپ کو نمل اور تنوی باجی کو شبیہہ صاحب اپنے کمرے میں بلوا رہے ہیں۔"

"اس۔۔۔ شبیہہ کو اس وقت کیا کام پڑ گیا۔" حرم نے کہا پھر ملازمہ سے بولی۔

"اچھا تم اس سے کہو ہم تھوڑی دیر میں آتی ہیں۔"

"چلی جاؤ حرم! پہلے جا کر اس کی بات سن لو ورنہ بہت غصہ کرے گا۔" عالیہ چچی نے اس کے ممکنہ ردعمل سے آگاہ کیا۔

"چلے جاتے ہیں امی! شبیہہ ہی تو ہے۔" حرم نے چڑ کر کہا تھا۔

"تم لوگوں کو پتا ہے ناں اس کے مزاج کا۔۔۔ ذرا سا غصہ آگیا تو قیامت اٹھا دے گا۔" عالیہ چچی نے نرمی سے کہا تھا لیکن مادی نے صاف محسوس کیا' تینوں لڑکیوں کو ان کی بات کچھ خاص پسند نہیں آئی۔

"تم یہیں بیٹھو مادی! ہم ذرا شہزادہ سلیم کی بات سن کر آتے ہیں۔"

"بدتمیزی مت کرو حرم!" عالیہ چچی نے ڈپٹا۔ لڑکیاں منہ بسورتی باہر نکل گئیں۔

"آنٹی! کیا میں حرم کے دولہا کی تصویر دیکھ سکتی ہوں؟" مادی نے عالیہ سے پوچھا۔ "حرم اتنی پیاری ہے' میں دیکھنا چاہ رہی ہوں' اس کا دولہا کیسا ہے۔" اسے کوئی بات تو کرنا ہی تھی۔

"ہاں کیوں نہیں۔۔۔ لیکن میں تمہاری چچی ہوں۔ اچھا ہوگا تم مجھے آنٹی کہنے کے بجائے چچی کہو۔"

عالیہ چچی نے وہیں بیٹھے قریبی دراز سے ایک تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ مادی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بڑے اشتیاق سے تصویر پکڑی تھی مگر تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کے اشتیاق پر ٹھنڈا پانی پڑ گیا۔

معمولی شکل و صورت کا چالیس پینتالیس برس کا مرد تھا۔ حرم کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں۔

"یہ۔۔۔" مادی نے مایوسی سے تصویر عالیہ چچی کو پکڑا دی تھی۔

"مستقیم بھائی صاحب کے دوست کا بھائی ہے' اماں نے رشتہ طے کیا ہے۔"

عالیہ چچی خوشی خوشی اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگیں' لیکن مادی کے جوش پر پانی پڑ چکا تھا۔ اسے ان تفصیلات سے رتی بھر بھی دلچسپی نہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تم لوگوں کو یہی کہنے کے لیے بلایا تھا کہ اس لڑکی سے کوئی زیادہ گھلنے ملنے کی ضرورت نہیں۔ ابا چاہے کچھ بھی کہیں۔ تم لوگوں کو محتاط رہنا ہوگا۔ زیادہ دوستیاں گانٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کا لہجہ دوٹوک اور رعب دار تھا۔

"لیکن شبیہہ! اس میں آخر برائی کیا ہے؟" حرم نے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نکتہ اعتراض بھی سب سے پہلے اٹھایا تھا۔ "پھر بڑے ابا نے خود کہا ہے۔"

"تم ضرور کوئی نہ کوئی اعتراض کا پہلو نکال لیا کرو۔" شبیہہ نے حسب توقع بھڑک کر کہا۔ "ابا وہ بات نہیں سمجھ رہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ بی جان آئیں گی تو وہ بھی میری ہی بات کو درست کہیں گی اور تب تو اس لڑکی کو یہاں سے جانا ہی پڑے گا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بی جان کو تم تینوں کا اس سے گھلنا ملنا بھی اچھا نہیں لگے گا' اسی لیے تاکید کر رہا ہوں۔"

"اچھا! ٹھیک ہے۔" حرم نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا اور نمل اور تنوی کو اشارہ کرتی دروازے کی طرف چل دی۔

"اور تم۔۔۔" شبیہہ نے تنوی کی طرف اشارہ کیا' وہ سہم کر رک گئی۔

"تم تو بطور خاص اس سے دور رہنا۔ تم جیسی عقل سے پیدل لڑکی کو قابو کرنا تو اس کے لیے اور بھی آسان رہے گا۔"

تنوی سعادت مندی سے سر ہلاتی بعجلت باہر نکل گئی۔

شبیہہ سر جھٹک کر اپنے اسکیچ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی نظر کارپٹ پر پڑی نوٹ بک پر پڑ گئی جس کے اوپر بڑے حروف میں جنت بی بی لکھا ہوا تھا۔

"اس لڑکی سے اپنی کوئی چیز سنبھالی نہیں جاتی۔" اس نے جھنجلا کر نوٹ بک اٹھائی تاکہ میز پر رکھ دے نوٹ بک بیچ درمیان سے کھل گئی۔ شبیہہ کی نظریں غیرارادی طور پر تحریر پر بھٹکنے لگیں اور وہ جوں جوں پڑھتا جا رہا تھا اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال بچھ رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

ذاتوں کے بندھن

رشکِ حبیبہ

لان کے گلابی نقش و نگار سے آراستہ لباس میں آئینے کے سامنے کھڑی زینب نے چہرے کے ارد گرد بڑی بکھری ابھی گیلی لٹوں کو سنوارتے ہوئے خود پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔

شادی کے سات سال بعد دو بچوں کی ماں بننے کے باعث قدرے بے ڈول ہوتا سراپا کچھ اتنا قابل اعتراض نہیں تھا۔ جو غیر معمولی کشش و خوبصورتی کا حامل نہ سہی لیکن بدصورتی کی حد میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے کنگھی سنگھار میز پر دھری اور چہرہ آئینے کے قریب کرتے ہوئے بغور اپنے چہرے کو جانچا۔ بے اختیار اس کے سیدھے ہاتھ کی پوریں آنکھوں کے گرد پڑے سیاہ حلقوں پہ جا ٹھہریں۔ قدرے توقف سے سرسراتی انگلیوں نے آنکھوں کے کونے، رخساروں سے ذرا اوپر پڑی چھائیاں محسوس کرنے کی سعی کی۔ اسے یاد آیا شادی سے پہلے یہ جگہ کتنی شفاف ہوا کرتی تھی۔ اس نے تنقیدی انداز میں چہرے کو دائیں بائیں موڑا اور سر جھٹکتے ہوئے پیچھے ہوئی۔

"شادی سے پہلے تو میرا رنگ اتنا سانولا بھی نہیں تھا۔ میں کب اتنی موٹی تھی؟" خود کلامی کرتے ہوئے اس نے ذرا سا رخ موڑ کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ کچھ پل نہر کر کچھ سوچتے ہوئے اس نے سنگھار میز کی نچلی دراز کھول کر میک اپ کا سامان برآمد کیا۔ میک اپ کا سامان کیا تھا چند ہی چیزیں تھیں۔ فیس پاؤڈر، بلش آن کٹ جو بیک وقت آئی شیڈوز کا بھی کام دیتی تھی۔ تین لپ اسٹکس میں سے اس نے گلابی رنگ منتخب کیا۔ چھوٹی سی کاجل کی ڈبیا اور براؤن لپ لائنر نکال کر ابھی اس نے میز پر رکھا ہی تھا کہ عباس دوڑتا ہوا اندر آیا۔ پھولے پھولے گالوں اور سنہرے بالوں والا چار سالہ عباس زینب کی جان تھا۔

"امی! وہ۔" ہاتھ میں پلاسٹک کی بیٹ پکڑے پھولی ہوئی سانسوں کی پروا کیے بنا بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زینب مسکرائی اور اس کے نزدیک گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہوئے اسے بازو سے تھام کر اپنے نزدیک کرلیا۔

"ابو آگئے ہیں۔ دادی آپ کو بلا رہی ہیں۔" زینب نے ڈوپٹے کے آنچل سے عباس کی نم پیشانی خشک کی اور رخسار چومتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ عباس خبر پہنچا کر جاچکا تھا۔ زینب نے ایک بے زار اور بے نیاز نظر سنگھار میز پر رکھے سامانِ زیب و زینت پر ڈالی اور ایک سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ اسے یاد آیا شادی سے پہلے امی کہا کرتی تھیں۔

"لڑکیوں کا ضرورت سے زیادہ بننا سنورنا بے موسم برسات ہے۔ شادی کے بعد عورتوں کا سنگھار سجتا بھی ہے اور بھاتا بھی کیونکہ سراہنے والی نگاہ موجود ہوتی ہے۔"

"اب کوئی پوچھے ذرا میری جیسی سسرال میں جہاں وجود زن صرف دو ہیں (میں اور میری ساس) چار دیور، شوہر اور سسر، کسی قدر مردانہ گھر میں گھریلو مصروفیات سے فراغت مل جائے وہی غنیمت ہے کجا کہ اس کے بعد بننا سنورنا۔ یوں بھی جب فراغت میسر آتی ہے تب تھکاوٹ اتنی ہوتی ہے کہ خود پر توجہ دینے کی سکت نہیں ہوتی اور جب دل سجنے پر آمادہ ہو تو گھریلو الجھنیں دامن سے لپٹی رہتی ہیں۔"

زینب سامان واپس دراز میں رکھتے ہوئے مسلسل خود سے مخاطب تھی۔ کام ختم کر کے اس نے سر اٹھایا۔

"ہنہ! میں تو اب گھر گرہستی والی ہوں۔ مجھے جس کے دل اور گھر آنگن میں بسنا تھا بس چکی۔ مجھے یہ نو عمر لڑکیوں کی طرح چونچال پن (سنگھار) کب بھائے گا۔"

شانوں پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے اس نے سر جھٹکا اور مطمئن ہوتی باہر نکل آئی۔ پتا نہیں زینب کا یہ زعم کہ "میں تو اب گھر گرہستی والی ہوں۔" کس حد تک درست تھا؟

☼ ☼ ☼

"آج بہت کام تھا دکان پہ؟" زینب نے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں!۔ کچھ کہا تم نے؟" عمر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز غالباً" غنودگی کے جھونکوں میں مست ہو چلا تھا تبھی اس کی آواز پر چونکتے ہوئے سیدھا ہو بیٹھا۔

"میں نے کہا بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ بہت کام تھا آج؟"

زینب نے صوفہ کم بیڈ پر محو خواب عباس اور تین سالہ ندا کے ارد گرد پڑے ٹیڈی بیئرز سمٹ کر کشن درست کیا۔

"ہاں! بہت تھک گیا آج۔" عمر نے دونوں ہاتھوں کی پوروں سے آنکھوں کے پپوٹوں اور پیشانی پر دباؤ ڈالا۔

"دکان پہ بھی اچھا خاصا کام جمع تھا اور ایک نئے مکان کی وائرنگ کی بکنگ بھی ہو گئی وہاں بھی جانا پڑا۔ پھر وہاں سے مارکیٹ کا چکر۔ ادھر الگ مغز ماری۔"

وہ تکیہ سیدھا کر کے مکمل دراز ہوا۔ زینب اس کے سرہانے آبیٹھی وہ جو پلکیں موند چکا تھا۔ آہٹ پر خفیف سی آنکھیں کھول کر زینب کو دیکھا۔ وہ متذبذب سی کیفیت کے زیر اثر سر جھکائے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ سونا نہیں ہے۔" وہ تکیے سے سر اٹھائے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں۔" زینب چونک گئی۔

"کوئی پریشانی ہے۔" اب وہ اس کی طرف کروٹ لے کر اس کا ہاتھ تھام چکا تھا کلائی میں پڑی سات آٹھ بدرنگ چوڑیوں نے ۔ احتجاج بلند کیا۔

"وہ۔ اگلے مہینے نبیلہ کی شادی ہے۔ معلوم ہے نا آپ کو۔" وہ کسی قدر پریشان کن لہجے میں بول رہی تھی۔

"تو..... اس وجہ سے پریشان ہو؟" عمر بے زار ہوا۔

"نہیں... وہ۔" وہ پھر اٹکنے لگی۔ عمر اسے بغور جانچتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا۔؟ کہو بھی۔" اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالتے عمر نے اسے متوجہ کیا۔

"نبیلہ کی شادی کے تحفے کے لیے پریشان ہو۔" اپنے تئیں اس کی الجھن ڈھونڈ لایا۔

"ہوں۔" زینب نے اثبات میں سر ہلاتے چہرہ اٹھایا۔ عمر سوچ میں پڑ گیا۔

"میری حالت کا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ قرض واہوں کو بھی نبٹانا ہے پھر کمیٹی کی ادائیگی۔ دکان کے خراجات پھر گھر کا خرچ ۔۔۔ جو ہے سب تمہارے سامنے ہے۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ زینب عجیب ادھیڑ بن میں کھو گئی۔

"بہر حال فکر نہ کرو۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ بھرم تو رکھنا ہی ہے۔" وہ اب زینب کو تسلیاں دے رہا تھا۔

"کم سے کم بھی دس پندرہ ہزار روپوں کی ضرورت ہے۔ گولڈ کی قیمت تو آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ ت مشکل سہی لیکن ممکن ہے کہ پیسوں کا بندوبست ہو جائے۔ پھر تحفے تحائف کے ساتھ تم لوگوں کی بھی تیاری کرنی ہو گی۔"

عمر نے نظریں گھما کر ندا اور عباس کو دیکھا۔ زینب کی نگاہیں بھی اس کے تعاقب میں اٹھیں۔

"یہ تو ہے۔ کپڑے وغیرہ بھی ضروری ہیں۔ میرے جو ہیں ان سے ہی کام چلا لوں گی۔ بس عباس اور ندا کے دو دو اچھے ریڈی میٹ سوٹ ایک ایک۔ جوڑا ای ابو ور نبیلہ کے لیے اور ساتھ سونے کی کوئی چیز ہو جائے تو بہتر ہو۔"

پرجوش ہوتی زینب نے ناچاہتے ہوئے بھی اپنے نئے کپڑوں کے خرچ کا بوجھ کم کر دیا۔

تھی نا آخر کو ایک گرہستن جو گھر کی بنیاد میں اپنی نا تمام خواہش اور حسرتیں چن دینے کے ہنر سے باخوبی واقفیت رکھتی ہے۔ پتا نہیں یہ صنف نازک کی معصومیت ہے یا مجبوری کہ اپنے حق سے بڑی آسانی کے ساتھ دستبردار ہو کر مقابل کی زندگی سہل کرنے پر فخر محسوس کرتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ کہیں اس کے اس فعل کے باعث بے فکری کے جھولے میں جھولتے جھولتے ایک دن لاپرواہی کی عادت پر براجمان نہ ہو جائے۔

"کیوں تمہارے پاس نئے کپڑے ہیں؟" عمر اسے رہا تھا۔ الجھے بالوں اور پریشان مضمحل چہرے پر گردشوں کی گرد واضح طور پر جم چکی تھی۔

"نئے تو نہیں۔ لیکن اتنے پرانے بھی نہیں۔ گو کہ خاصے استعمال کیے ہوئے ہیں لیکن اچھی حالت میں ہیں۔ چل جائیں گے۔ آپ میری فکر مت کریں۔"

وہ اسے اپنی فکر سے آزاد کر کے مشرقی عورت ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی تھی۔

"مجھے خواہش ہی رہی کہ تم کبھی مجھ سے کچھ جتا کے مانگو۔ میں تمہاری خواہش پوری نہ کر سکوں تو تم روٹھ جاؤ۔ اور پھر میں....."

اپنے ارمان کی قربانی دے کر اس نے عمر کے منہ سے تحسین کے دو جملوں کے بجائے عجیب سی خواہش سنی اور ہولے سے ہنس پڑی۔

"کیا ہوا؟..... ہنسی کیوں آ رہی ہے؟" عمر روٹھے لہجے میں بول اٹھا۔

"ابھی تو آپ نے کہا سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ جب کہ سب کچھ میرے سامنے ہے تو پھر میں بے جا فرمائش کر کے آپ کو پریشان کیوں کروں۔"

زینب کے لبوں پر ابھی بھی مسکان ٹھہری ہوئی تھی۔

"تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" وہ خفا خفا سا لگا۔

"ہنسی مجھے اس بات پر آ رہی ہے کہ اب دو بچوں کے باپ کو چھڑے چھانٹ لڑکوں کی طرح روٹھنے منانے کی تمنا ستانے لگی ہے۔" وہ کہتے ہوئے کھل کے مسکرائی تھی۔ عمر خفگی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا کہ۔ یکایک.....

زینب کے مضمحل چہرے میں کسی کا چمکیلا چہرہ دمک اٹھا۔ نفاست سے ترشے ابرو ـــــ کٹیلے بھرے بھرے لب اور ستواں ناک میں لشکارے مارتی سونے کے مٹر جیسی لونگ۔ بس دو پل کے لیے۔ عمر ـــــ بے دھیانی میں زینب کو یک ٹک دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیا سوچ رہے ہیں۔" معاً" زینب کی جھینپی سی آواز نے اسے حال کی کرخت زمین پر لا پٹخا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ چہرے پر ہاتھ پھیر کر سوچ کا عکس

نادیدہ مٹانے کی سعی کی۔

"نہیں کچھ نہیں۔" وہ اپنی سوچ کی آوارہ ہوتی اڑان پر دم بخود تھا۔

"ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔" وہ سوچتے ہوئے کھویا کھویا سا زینب کو ہی فوکس کیے ہوئے تھے۔

"تو پھر ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" زینب کی لجائی آواز پر عمر نے سر جھٹکتے ہوئے اس کی ادائے دلربائی پر غور کیا تو احساس ہوا کہ وہ نادان تو اس کے سوچ کی آوارہ ہوتی اڑان سے قطعی بے خبر ماحول کی معنی خیزی میں کھوئی ہوئی ہے۔

"اف!... میں بھی نا؟" عمر نے بے ساختہ طمانیت سے مسکراتے ملامتی انداز میں گویا اپنے آپ کو ڈپٹا۔

"دیکھ رہا ہوں تم اتنی بھی بری نہیں ہو۔" وہ شریر ہوا۔

"اتنی نہیں گویا تھوڑی ہوں۔" وہ ٹھنکی تھی۔

"رہنے دو۔ تم خوامخواہ ناراض ہو جاؤ گی۔" چڑاتی مسکان عمر کے لبوں پر آویزاں تھی۔

"تو لے آنا تھا کسی بہت اچھی کو۔" وہ سچ مچ بھڑک گئی تھی ایسا عمر کو محسوس ہوا۔

"کیسے لے آتا۔ تمہیں پتا تو ہے اس وقت اماں نے تمہیں پسند کر لیا تھا۔" عمر کی زبان پھسلی۔

"اس وقت کا اتنا افسوس ہے۔ تو اب لے آیئے۔" زینب نے تپ کر "اس وقت" پہ زور دیا۔

"یعنی تم اجازت دے رہی ہو؟" اس کا بھبھوکا سرخ چہرہ عمر کو مزا دے گیا۔

"کیوں؟ آپ نے لڑکی ڈھونڈلی جو میری اجازت درکار کرنے کا مرحلہ آگیا۔" وہ اس پہ چڑھ دوڑی۔

"توبہ کرو یار۔ یونہی تمہیں تنگ کر رہا تھا۔" وہ اب زینب کو رام کرنے لگا تھا۔

"مجھے معلوم ہے آپ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔" وہ مان بھرے انداز میں مخاطب تھی۔

"دوسری بات آپ کو جو پسند کرے گی نا کوئی "اندھی" ہی ہوگی۔"

وہ عمر کی گہری سانولی رنگت پر چوٹ کرتی اسے چڑانے لگی تھی۔

"دعا کرو کہ کبھی وہ "اندھی" مجھ سے نہ ٹکرائے۔" زینب نے عمر کی بات پر پھر ایک خفا سی نگاہ اٹھائی۔

"چھوڑو، موڈ مت خراب کرو۔ پہلے ہی تھکن سے برا حال تھا اوپر سے تم نے دماغ کی دہی کر دی۔" عمر دانستہ خائف ہوتا دراز ہونے لگا۔ زینب بھی کمر سیدھی کر کے لیٹ گئی۔

"بات سنیں!" چند ساعتوں بعد نیم تاریک خوابناک فضا میں زینب کی آواز ابھری۔

"ہوں!" عمر نیند کی آغوش میں سرکنے لگا تھا۔

"عباس کا اسکول ایڈمیشن کروانا ہے۔ چار سال کا ہو رہا ہے۔" اسے نئی فکر دامن گیر تھی۔

"کروالیں گے۔ یار! ابھی چار سال کا ہی تو ہے۔ زندگی رہی تو سب کرنا ہے ہاں اگر زندگی نے ساتھ نہ دیا تو اور بات ہے۔" وہ نیند میں بھری لڑکھڑاتی آواز میں گویا تھا۔

"توبہ کریں۔ پتا نہیں کیا کیا فضول باتیں کرتے رہتے ہیں۔" اس کی آخری بات پر زینب دہل گئی۔ نیم تاریک کمرے میں ہلکی ہلکی عمر کے خراٹے کی آواز رقصاں تھی اس نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدلی۔ چند لمحوں میں زینب کی پلکیں بھی بوجھل ہو کر آپس میں جڑ گئیں۔

☼ ☼ ☼

شدید گرمی کا عالم جوبن پہ تھا اور آگ برساتے سورج کو غالباً "کچھ زیادہ ہی جلدی تھی کہ صبح گیارہ بجے ہی عین سروں پر آکھڑا تھا۔ موٹر بائیک پر تیزی سے راستہ طے کرتے عمر نے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے پیشانی سے ٹپکتی بوندیں سمیٹ کر جھٹک دیں۔ سمتوں کا تعین کرتی بڑے چھوٹے پتھروں کو روندتی اچھلتی بل کھاتی بائیک تیزی سے راستہ طے کرتے ہوئے بالآخر منزل پر جا ٹھہری۔ عمر نے بائیک سے چابی نکال کر پینٹ کی جیب میں ڈالی اور اپنے برقی آلات و ساز و سامان سے بھرا ایک شانے سے لٹکا نیلے لوہے کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ دستک دینے کے چند لمحوں بعد دروازہ وا ہوا اور وہی کل والی شخصیت برآمد ہوئی۔ بعد از سلام کلام عمر اس کی پیروی کرتا اندر چلا آیا۔ گھر اگرچہ نیا تعمیر شدہ نہیں تھا لیکن وائرنگ کا کام از سر نو توجہ کا طلب گار تھا۔ کل اس نے جائزہ لے کر کام شروع کرنے کا لائحہ عمل تیار کر لیا تھا سو آج آتے ہی وقت ضائع کیے بنا کام میں جت گیا۔

عمر کے ایک پرانے کسٹمر کے توسط سے الوینہ نے عمر سے رابطہ کیا تھا۔ بیوہ اور چار بیٹیوں کی ماں الوینہ قدرے پکی عمر کی عورت تھی۔ لیکن متناسب سراپے، پرکشش چہرے، صاف رنگت اور مالی طور پر مستحکم حیثیت کی خصوصیات نے اس کی شخصیت پر وقت کی گرد اور حالات کی بے رحم دھوپ کا عکس نقش نہ ہونے دیا تھا۔ یا شاید کچھ لوگ گردش دوراں کے تھپیڑوں سے نڈھال ہونے کے باوجود اپنی ظاہری صورت کو سنبھالنے کے فن سے آشنا ہوتے ہیں۔

چار کمروں صحن اور برآمدے والا کھلا کھلا ہوادار کشادہ گھر سلیقے سے آراستہ خاصا خوبصورت تھا۔ چار میں سے تین کمرے نیچے اور ایک اوپری پورشن تھا۔ کام اچھا خاصا لمبا تھا۔ کافی جگہ پوائنٹس تھے۔ جن میں جدید طرز کے فینسی ہولڈرز اور بلب نصب کرنے تھے۔ خستہ حال سوئچ بورڈز اور لمبی چوڑی وائرنگ کی تبدیلی پھر مین سرکٹ کی سیٹنگ۔

"کم سے کم بھی دو تین دن یا چار سے پانچ دن لگ جائیں گے کیونکہ لوڈشیڈنگ کا عذاب بھی تو سر پہ ہے۔" عمر نے ڈرل مشین سے دیوار میں خلا پیدا کرتے ہوئے سوچا اسے کام کرتے ہوئے خاصا وقت ہو چلا تھا۔ کلائی میں بندھی گھڑی دیکھی تو ساڑھے بارہ کا احساس ہوا۔

"ایک بجے لائٹ چلی جائے گی۔" عمر نے خود کلامی کرتے ہوئے ڈرل مشین کا کام پہلے نبٹانے کا ارادہ کیا۔ پہلے کمرے کے آخری ہولڈر کی سیٹنگ کرتے ہوئے اسے گرما گرم سموسے کی اشتہا انگیز خوشبو نے چونکا دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو سینٹرل ٹیبل پر سموسے کی طشتری اور چائے کا کپ رکھنے کے بعد الوینہ اس کی جانب متوجہ کھڑی تھی۔

"آیئے پلیز کام تو ہوتے رہیں گے۔" وہ دلربائی سے مسکرائی تھی۔

"ہاں لیکن ایک بجے لائٹ چلی جائے گی میں اس سے پہلے کم از کم یہ مکمل کردوں پھر باقی کے لیے شام تک آؤں گا۔ کیونکہ ابھی کی گئی لائٹ چار پانچ سے پہلے تو نہیں آئے گی۔" عمر نے ہاتھ میں تھامی ہتھوڑی رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ چائے پیے بغیر تو نہیں جاسکتے نا! اور ٹھنڈی چائے یقیناً" آپ پینا پسند نہیں کریں گے۔" اس کے انداز میں ایک ناز بھرا اصرار تھا عمر مزید انکار نہیں کرسکا اور خاموشی سے ہاتھ دھونے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے الوینہ کے پیچھے واش بیسن تک چلا آیا۔

"امی میں جارہی ہوں۔ اللہ حافظ۔" سیاہ عبایا اور زرد اسکارف میں ملبوس ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی گھر کے داخلی دروازے پر کھڑی الوینہ سے مخاطب تھی۔

عمر کو تھوڑی حیرانی تو ہوئی لیکن جلد ہی وہ اس حیرانی سے نکل آیا کہ الوینہ کا اس لڑکی کی ماں ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں بہرحال الوینہ کوئی کم عمر لڑکی کی نہیں لگتی تھی۔ ہاں یہ ہے کہ عورت ہونے کے باوجود عمر کو اس کی ہیئت میں خاص طرح کی کشش محسوس ہوئی تھی۔

"یہ سب کب تک ہوجائے گا۔" الوینہ عین اس کے سامنے بیٹھی۔

"زیادہ کام ہے کم از کم چار پانچ دن تو لگ ہی جائیں گے۔ لائٹ کا ٹائم ٹیبل تو معلوم ہی آپ کو۔"

"ہوں... وہ بھی الگ مسئلہ ہے۔ اچھا۔ ایک کام اور ہے۔ وہ میری پانی کی موٹر میں بھی کچھ خرابی ہوگئی ہے تو آپ..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جی میں ٹھیک کردوں گا۔"

"ارے سموسے لیجیے نا۔" الوینہ نے سموسے عمر کی جانب بڑھائے۔ لیکن اس نے لینے سے احتراز برتا۔

آج اس نے زینب سے گوبھی گوشت کی فرمائش کررکھی تھی۔ اب سموسے سے پیٹ بھرنے کے بعد گوبھی گوشت سے انصاف ممکن نہ ہوپاتا۔

"بھئی' آپ فاروق بھائی کے توسط سے آئے ہیں اور ان سے ہمارے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ اس حیثیت سے آپ کی خاطر کرنا تو بنتا ہے نا!"

وہ دانستہ ہنسی جواباً" اسے بھی مسکرانا پڑا۔

"آپ اکیلی رہتی ہیں۔" ذہن میں کلبلاتا سوال عمر کے لبوں پہ ٹھہرا۔

"نہیں! اکیلی تو نہیں رہتی میری چار بیٹیاں ہیں۔ ماشاءاللہ۔"

وہ کچھ حیران سی ہوئی۔

"میرا مطلب ہے کہ اور... اور کوئی نہیں؟" وہ اب بھی کھل کر پوچھ نہیں پارہا تھا کہ کوئی مرد نہیں ہے۔

"ہے تو سہی' میرا پورا خاندان ہے۔ سسرال بھی اور میکا بھی... ماں' باپ بھائی بہنیں' دیور' جیٹھ' نندیں اور ساس سسر سب ہیں۔ ہاں ساتھ نہیں رہتے یہ اور اس کے پڑوس کا مکان میرے شوہر کے نام تھے ان کی وفات کے بعد مجھے مل گئے۔ اب اس میں ہم رہتے ہیں برابر میں کرایے دار' پھر شوہر کی پینشن آتی ہے تھوڑا بہت سسرال والے بھی سپورٹ کردیتے ہیں سو گزر بسر احسن طریقے سے ہوجاتی ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں بتارہی تھی۔ عمر کی نظریں اس کے ٹھوڑی سے نزدیک ابھرے ہوئے سیاہ تل سے الجھ گئیں۔ لیکن مجال ہے جو وہ عمر کی نظروں سے خائف ہوئی ہو۔

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟" اس کے سوال پر وہ چونک اٹھا۔

"دو... دو بچے ہیں۔ بڑا بیٹا' چھوٹی بیٹی۔" وہ لمحے کے لیے گڑبڑایا تھا شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ دو بچوں کا باپ ہوکر ایسی چھچھوری حرکت اسے زیب نہیں دیتی۔ اس نے سختی سے خود کو ڈپٹا۔

"اچھا! ماشاءاللہ..." وہ پھر مسکرائی۔ عمر کا دھیان بے دھیانی میں اس کے مسکراتے بھرے بھرے لبوں سے ہوتا ہوا زینب کے قدرے پتلے اور بے رونق ہونٹوں کی طرف چلا گیا۔

"لاحول ولا... استغفراللہ!" اس نے بے ساختہ توبہ کرتے ہوئے۔ خود کو سرزنش کی۔ الوینہ اس کے پراگندہ گمان سے بے خبر گویا ہوئی۔

"وہ جو باہر کھڑی تھی نا! میری بڑی بیٹی ہے اس سے چھوٹی تین ہیں۔" وہ مسلسل خود اعتمادی سے اس کے سامنے براجمان تھی۔ عمر جزبز ہورہا تھا۔

مرد تھا آخر' دعوت نظارہ دیتی الوینہ سے نظریں آخر کب تلک چراتا۔ اسی لمحے بجلی چلی گئی۔ تو وہ ٹھنڈی سانس خارج کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ واپسی کے راستہ بھر اس کے دماغ میں عجیب سی چپ طاری تھی۔ خاموشی' سناٹا...

"شاید طوفان آنے سے پہلے کا سناٹا۔"

گھر پہنچا تو دروازہ زینب نے ہی کھولا تھا۔ مسکے ہوئے پسینے سے شرابور لباس میں ملبوس' پنڈلیوں تک پائنچے چڑھائے وہ غالباً" صحن دھو رہی تھی۔

بکھرے بالوں کی الجھی لٹوں کے درمیان سانولا چہرہ دھوپ پڑنے کے باعث سرخ ہوگیا تھا۔ عمر کے ذہن میں الوینہ کا تروتازہ سراپا اجاگر ہوگیا۔ لان کے زرد اور نارنجی امتزاج کے کھلے کھلے رنگوں والے برنٹڈ لباس میں سلیقے سے بال بنائے نظروں کو تراوٹ بخشتی الوینہ کی شبیہہ اس کے ذہن میں سرسرائی۔

"لائٹ تو ہے نہیں' کھانا برآمدے میں لارہی ہوں۔ کمرے میں بہت گرمی لگے گی۔"

"واہ..." پہلا نوالہ منہ میں لیتے ہی عمر معترف ہوا کھانا بے حد لذیذ تھا۔ زینب بے اختیار مسکرائی۔

وہ بلاشبہ بہترین کھانا پکانا جانتی تھی جبھی تو عمر اس کے ہاتھ کے بنے کھانوں کو دل کھول کے سراہتا تھا۔

زینب اپنی ساس کی پکار پر ان کی بات سننے گئی۔ جب تک وہ لوٹی عمر آخری نوالہ لے رہا تھا۔

"ارے! اور لیجیے نا۔ اتنا کم کیوں کھایا؟ اچھا نہیں بنا کیا؟"

وہ خود بڑھ کر چاولوں سے بھرا چمچہ عمر کی پلیٹ میں ڈالنے لگی۔

"بہت اچھا ہے بھئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ضرورت سے زیادہ کھالوں۔" عمر نے نرمی سے اس کا ہاتھ پیچھے کیا۔

"گرمی بہت ہے یار!... زیادہ کھالوں گا تو اور لگے گی۔" وہ تاویل پیش کررہا تھا۔

"اچھا!" وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے برتن اکٹھے کرنے لگی۔

"تم نے نہیں کھانا؟" عمر نے اسے چاولوں کی ڈش اور سالن' کا ڈونگا اٹھاتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں! لائٹ آجائے تو کھاؤں گی۔" وہ کچن میں جاتے ہوئے تیز آواز میں گویا تھی۔

"عباس اور ندا کہاں ہیں؟" عمر کو بچوں کا خیال آیا۔

"زبیدہ باجی کے گھر گئے ہیں۔ میں صفائی کررہی تھی تو وہ اپنے گھر لے گئیں۔" زینب نے پڑوس کے دو گھر چھوڑ کر تیسرے گھر میں رہائش پذیر اپنی بڑی اور اکلوتی شادی شدہ نند کا ذکر کیا۔

"چائے بنارہی ہوں میں۔ جائیے گا نہیں آپ۔" وہ کچن سے ہی تیز آواز میں بول رہی تھی۔

"نہیں زینب چائے مت بناؤ۔" وہ کہتا ہوا کچن میں ہی چلا آیا۔

"کیوں؟" وہ پلٹ کر بہت معصومیت سے بے ساختہ بولی تھی۔ عمر کو بے ارادہ ہی اس کی ادا پہ پیار آیا۔

"بھولی بیگم' جلدی جانا ہے مجھے' صبح سے دکان کا چکر بھی نہیں لگایا۔ پہلے وہیں جارہا ہوں۔" وہ

مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔
"اچھا!" وہ بھی مسکرائی۔ عمر کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا۔
بھرے بھرے گلابی ہونٹ، دلکش مسکراہٹ کے پیرہن میں لپٹے وہ ایک لمحے کے لیے تھم سا گیا۔
"بات سنیں! مجھے دو ڈھائی کلو دودھ لادیں۔" زینب کی آواز اسے منظر میں واپس کھینچ لائی۔
"فلفہ بناؤں گی۔" وہ اس کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں بولی تو عمر کھوئے کھوئے سے انداز میں سرہلاتا پلٹ گیا۔
سرکتے دنوں میں عجیب بے چینی نے دل کا رستہ دیکھ لیا تھا۔ سکون و اطمینان آہستہ آہستہ دور کھسکنے لگے تھے۔ مزید بے کلی حد سے سوا تب ہوتی جب وہ بے چین دل کی بے تابی سے مصلحت و سمجھوتے کی تاویلیں گھڑتے گھڑتے تھک جاتا۔ اور غیر محسوس طریقے سے زینب اور الوینہ کا موازنہ کرنے لگتا۔ زینب کی سادگی و معصومیت بھری وفاداری اور الوینہ کی ترغیبانہ ہمت افزائی دونوں کے درمیان معلق اس کا دل ڈانواں ڈول ہونے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اور الوینہ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ وہ کسی بات پر بے تحاشہ ہنس رہی تھی اور عمر اسے وارفتگی سے تک رہا تھا۔ عمر کے ہاتھوں میں دبے اس کے ہاتھ کی حدت عمر کے دل کی دھڑکن بڑھا رہی تھی۔ وہ بالکل پاس تھے بہت قریب اتنے کہ عمر ہاتھ بڑھا کر الوینہ کے رخ پر جھولتی لٹ کنارے کر سکتا تھا۔ ماحول کی معنی خیزی عروج پر تھی۔ ایک جانب نفس کی ترغیب دوسری جانب بے لگام نفس کی بے اختیارانہ تقلید۔ درمیان میں بیٹھا شیطان دونوں کو اکسائے دے رہا تھا وہ قریب آنے لگے تھے۔
"اف!۔۔" عمر ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ جس کے شدید احساس سے وہ سینہ مسلنے لگا۔ دو چار لمبی لمبی گہری سانسیں لینے کے بعد حواس قدرے درست ہوئے تو اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔
نیم تاریک کمرا شناسا تھا برابر محو خواب زینب پر ایک نگاہ ڈال کر اس نے پرسکون سانس خارج کی۔ بیڈ سے تھوڑی دور پڑے صوفہ کم بیڈ پر ندا اور عباس سوئے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں سر گرائے ہوئے عمر نے بال مٹھیوں میں بھینچے پھر تھوڑے توقف سے بیڈ سے اٹھ کر فریج کے نزدیک چلا آیا۔ روم فریج سے پانی کی ایک بوتل نکال کر منہ سے لگائی اور ایک ہی سانس میں آدھی بوتل خالی کر دی۔ وہ بہت آہستگی سے حرکت کر رہا تھا کہ کسی کی نیند ڈسٹرب نہ ہو۔ بوتل واپس رکھ کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ برآمدے میں رکھے تخت پر دراز ہوتے ہوئے اس کا ذہن کلی طور پر غائب تھا۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا اس نے گھڑی دیکھنے کی کوشش نہیں کی وہ اپنے حواسوں میں ہی کب تھا۔ زور زور سے دھڑکتے دل کی بے قراری، دماغ کی سرزنش اور ابھی ابھی دیکھے خواب نے اس کی وحشتوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔
عمر کو الوینہ سے آشنا ہوئے تقریباً" ایک ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا الوینہ کے گھر کا کام اس نے ایک ہفتے میں نبٹا دیا تھا لیکن اس کے بعد نکل آنے والے اتفاقیہ کاموں میں جیسے پانی کی موٹر کی خرابی، فریج کے تار کی معمولی سی خرابی نہیں کچھ تو کہیں کچھ نے مزید پندرہ دن تک اسے الوینہ سے رابطے میں رکھا باقی روابط ان کی بے تکلفی نے اپنے آپ استوار کر لیے۔ گزشتہ دنوں میں اس نے الوینہ کے دل اور گھر میں اپنے لیے کسی حد تک جگہ ہموار کر لی تھی۔
ایسا نہیں تھا کہ الوینہ کوئی بہت حسین عورت تھی جس کو دیکھتے ہی کوئی دل ہار جائے یا عمر نے اس سے پہلے کبھی پرکشش چہرے نہیں دیکھے تھے۔ لیکن "کچھ" تھا الوینہ میں ایسا جو عمر کو بے ساختہ اپنی اور کھینچ رہا تھا۔ اور وہ "کچھ" تھا الوینہ کی "ترغیبانہ حوصلہ افزائی۔"

بے شک مرد پہلا قدم بڑھاتا ہے مگر جہاں اسے مخالف سمت سے پذیرائی نہ ملے تو وہ بڑھا ہوا قدم پلٹ بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر اس اولین قدم کو ترغیبانہ پذیرائی مل جائے تو فاصلے بڑی سرعت سے سمٹنے لگتے ہیں رات کی تنہائی میں دل میں دماغ میں ناچتے پر ہول سناٹے سمیت وہ تخت پر چت لیٹا اپنے احساسات ٹٹول رہا تھا۔ ان سب کا جواز تلاش رہا تھا۔
"وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔" وہ خود کلامی کرنے لگا۔
"تو۔؟" کوئی تمسخرانہ گویا تھا۔
"تو میں اس کے نزدیک رہنا چاہتا ہوں اور کیا؟" وہ بے زار ہوا۔
"وجہ؟" کوئی اس کے ساتھ محو کلام تھا۔
"کسی کے اچھا لگنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" وہ الجھ گیا۔
"بہت ساری وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اگر غور کرو تو۔" وہ جو کوئی بھی تھا اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔
"وجوہات ؟؟" وہ واقعی سوچنے لگا۔
"ہاں! وجوہات۔ سوچو۔" کوئی اکسا رہا تھا۔
"وہ خوبصورت ہے۔" اس کی سوچ کو الجھی ڈور کر سرا مل گیا۔
"یا شاید مجھے خوبصورت لگتی ہے۔" اپنی ہی کہی بات میں ترمیم کرتے ہوئے وہ مزید سوچ رہا تھا۔
"اس کی صورت، آنکھیں، ہونٹ، نقش۔۔ میں اسے سوچتا ہوں۔ تو سوچتا چلا جاتا ہوں دیکھتا ہوں تو دیکھتا چلا جاتا ہوں وہ میرے تصور و خیال میں رہتی ہے میرے خوابوں میں چلی آتی ہے اس سے آشنائی کے بعد دل کا قرار کھو گیا ہے۔ میری راتیں بے چین ہو گئی ہیں۔ شاید۔ شاید!"
وہ تھم سا گیا۔
"شاید کیا؟" کوئی بے صبرا ہوا۔
"شاید۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔" وہ بہت آہستگی سے بڑبڑایا۔
"ہاہاہا۔ ہاہاہا۔" وہ جو کوئی بھی تھا بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔
عمر خائف ہوا۔
"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ محبت میں بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے نا۔ بے چینی اور بے قراری حد سے سوا ہوتی ہے دل محض محبوب کے قرب کا خواہاں رہتا ہے۔" عمر پتا نہیں کیا اور کس کو باور کروانا چاہ رہا تھا۔
"میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں عمر! تم جس انداز سے اس کے بارے میں سوچتے ہو۔ اسے دیکھتے ہو۔ حقیقت پسندی سے غور کرو تو یوں جذبہ محبت کی توہین کے مرتکب نہ ہو۔"
اس کے اندر کا شخص سفاکیت سے اس کا تجزیہ کر رہا تھا۔ عمر نظریں چرا کر رہ گیا۔
"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ کمزور لہجے میں اپنا دفاع کر رہا تھا۔
"تو پھر یہ سب کیا ہے۔؟" اشارہ اس کے تصورات و خیالات و خوابوں کی طرف تھا۔
"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے دامن چھڑانے کی سعی کی۔
"کہہ دیجیے جو تم چھپاتے ہو اپنے دلوں میں اور ظاہر کرتے ہو اللہ سب جانتا ہے۔"
"اف!" ۔ اس نے جھنجلا کر سر دونوں ہاتھوں میں بھینچا۔
"نہیں ایسا نہیں ہے۔۔ میں اس کے بارے میں یوں نہیں سوچتا۔"
اس نے بالوں کو جھٹکا دیا۔
"ہاہاہا۔ ہاہاہا۔" تمسخر اڑاتی ہنسی اس کے ارد گرد ناچنے لگی۔
"بس کرو۔!" وہ دھاڑ اٹھا۔
"کیا ہوا؟" زینب کی آواز پر وہ چونک کر پلٹا کمرے کے دروازے میں زینب حیران کھڑی تھی۔
"ہوں! ن نہیں۔۔ وہ۔" وہ بوکھلایا ہوا تھا۔ زینب ہولے ہولے قدم بڑھاتی تخت کے نزدیک چلی آئی۔
"یہاں کیوں آ گئے ہیں؟۔ طبیعت ٹھیک ہے نا۔؟ کوئی برا خواب دیکھا کیا۔؟ اتنے حواس باختہ کیوں لگ رہے ہیں۔؟"

زینب عمر کی پیشانی چھوتی پریشان سی ہوئی۔

"ہاں! بس وہ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔" وہ اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ زینب کے چہرے پر فکرمندی ہلکورے لینے لگی تھی۔

"یہاں آکر لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔ بائیں کروٹ پر سو گیا تھا شاید برا خواب دیکھ کر آنکھ کھلی ابھی۔" وہ آہستہ آہستہ کہتا کھویا کھویا سا لگا۔ زینب نے محسوس کرتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی۔

"چلو۔" وہ مزید کچھ کہنے بنا اسے بلاتا کمرے کی طرف بڑھا۔ الجھی الجھی سی زینب نے بھی اس کی تقلید کی۔

"مجھے اس سے محبت ہی ہے۔" تکیے پر سر رکھے وہ اسی سوچ میں تھا۔

"میں اس محبت کو جائز شکل دینے کے لیے الوینہ سے نکاح کر سکتا ہوں اس کی اجازت مجھے میرا مذہب دیتا ہے۔ لیکن... زینب؟" وہ تھم سا گیا۔

"اس سے اجازت لینا ضروری تو نہیں۔ فی الحال اس سے یہ بات پوشیدہ رکھوں گا۔ اسے خود بخود معلوم ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔"

وہ مطمئن ہوتا کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ چونکا تب جب پیروں پر زینب کے نرم گرم ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ وہ ہولے ہولے اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔

"رہنے دو زینب! سو جاؤ۔" وہ خوامخواہ خائف ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ تھک گئے ہوں گے۔ سو جائیں آرام سے۔" پنڈلیوں پر محسوس ہوتے لمس میں اعتبار، بھروسے، وفا اور محبت کی بھرپور تپش تھی۔ کہیں درون قلب محسوس ہونے والی شرمساری عمر کی پیشانی بھگو گئی۔ لیکن تازہ تازہ ہوئی نام نہاد محبت کا خمار عرق آلود پیشانی کی شرمساری پر جلد ہی غالب آ گیا۔ اور چند لمحوں میں وہ الوینہ کی شبیہ آنکھوں میں بھر کر پلکیں موند گیا۔

محبت کو بدنام کرتے ہیں ظالم
ہوس کو جو دیتے ہیں نام محبت

☆ ☆ ☆

"میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔" وہ نہایت سنجیدگی سے گویا تھا۔

"کیا؟" الوینہ پہلے تو حیرانی سے اسے تکنے لگی پھر اس کے لبوں سے پھوٹنے والی ہنسی بڑی بے ساختہ تھی۔ وہ ہنس رہی تھی اور عمر خاموشی سے اسے تک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد الوینہ نے عمر کی سنجیدگی محسوس کرتے ہوئے اپنی ہنسی مسکراہٹ میں سمیٹ لی۔ وہ ہنوز چپ تھا۔

"تمہارا ہنسنے کا شغل پورا ہو گیا ہو تو میں کچھ کہوں؟" عمر کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔

"ضرور کہو۔ لیکن وہی مذاق پھر نہ دہرانا ورنہ میں پھر سے ہنس پڑوں گی۔" الوینہ کے لبوں پر استہزائیہ مسکان تھی۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں الوینہ۔" عمر کا لہجہ بہت ہموار تھا۔

"تم مذاق اچھا کرتے ہو عمر۔" وہ تمسخرانہ ہنسی۔

"میری محبت تمہیں مذاق لگ رہی ہے۔" وہ صدمے کے زیر اثر آیا تھا غالباً"۔

"میں تم سے عمر میں بڑی ہوں۔ میری چار بیٹیاں ہیں۔ میرا فیملی بیک گراؤنڈ جانتے ہوئے بھی محبت کے دعوے دار ہو۔ مجھ سے نکاح کرنا چاہتے ہو۔ یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟"

وہ حقیقت پسندی سے اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔

"تمہارے فیملی بیک گراؤنڈ میں قابل اعتراض کیا ہے؟ تمہارا عمر میں مجھ سے بڑا ہونا یا تمہاری چار بیٹیاں؟"

وہ سوال کر رہا تھا۔

"اگر تمہاری چار بیٹیاں ہیں تو خدانا خواستہ اس میں غلط کیا ہے۔ تم سے نکاح کے بعد مجھے چار یتیم لڑکیوں کی سرپرستی کا ثواب ملے گا۔ تم کیوں انہیں بے وجہ کا جواز بنا رہی ہو۔ تمہارا عمر میں مجھ سے بڑا ہونا میرا نہیں خیال کہ ہمارے نکاح کی راہ میں کوئی رکاوٹ ڈالے گا۔

اس کی بھی کئی دلیلیں میں ابھی تمہیں دے سکتا ہوں۔"

وہ غالباً" ہر پہلو پر سوچ چکا تھا۔

"تم ہوش میں ہو۔ تمہاری ایک بیوی ہے دو بچے ہیں پوری فیملی ہے پھر...؟" الوینہ متحیر تھی عمر کی سنجیدگی پر۔

"تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟" الوینہ لاجواب ہوئی۔

"تمہیں اگر دوسری شادی ہی کرنی ہے تو تمہیں مجھ سے اچھی کم عمر اور غیر شادی شدہ لڑکی بھی مل سکتی ہے عمر۔ پھر کیا وجہ ہے؟"

وہ متذبذب سی کیفیت میں گھری تھی۔

عمر خاموش تھا۔ اب اسے کیسے بتاتا کہ لڑکی تو بلاشبہ مل ہی جاتی لیکن اسے نکاح میں لینے کے بعد عمر کو دوہری ذمہ داری سے نبرد آزما ہونا پڑتا جب کہ الوینہ کی جانب ایسا کوئی معاملہ نہیں وہ خود مختار عورت تھی اس کو عمر کی مالی سپورٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر وہ الٹا عمر کو سپورٹ کر سکتی تھی۔ اور بدلے میں اسے کیا دینا پڑتا سوائے تھوڑی سی محبت کے... کھوٹی ہی سہی۔ محبت تو محبت ہے اور الٹی پسلی سے جنی عورت صرف محبت سے رام ہو سکتی ہے۔ سو اس نے بھی یہی حربہ استعمال کیا الوینہ سے نکاح عمر کے لیے گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ وہ واقعی ہر پہلو پر سوچ بچار کر چکا تھا۔

"الوینہ!" عمر نے ہولے سے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ الوینہ چونکی ضرور لیکن اس نے مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔

"مجھے لڑکی نہیں۔ میری محبت چاہیے۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ متاثر ہونے لگی اس اقرار میں بہت لطف تھا وہ یاد کرنے لگی ایسا اقرار اس کے مرحوم شوہر نے کب کیا تھا؟ کیا بھی تھا یا نہیں؟

"مجھے تم چاہیے ہو۔ کیونکہ میری محبت تم ہو۔" عمر کے لہجے میں صداقت ہو نہ ہو لیکن بے خودی کا عنصر خاطر خواہ تھا۔ اور صنف قوی کی یہ بے خودی اور بے اختیاری صنف نازک کی دکھتی رگ پہ اثر انداز نہ ہو ایسا کیسے ممکن ہے۔

"لیکن۔"

"بس۔" وہ ابھی بھی کچھ کہنے لگی تھی جب عمر نے اس کے لبوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے قربت کے یہ انداز الوینہ کو بھانے لگے تھے۔ دل کی لے بدلنے میں دیر کب لگتی ہے۔

"صرف ایک بات بتاؤ مجھے؟" الوینہ نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔

"مجھ سے اپنے اب تک کے تعلق کو کیا نام دو گی تم؟ محبت یا دل لگی؟" عمر کے سوال پر الوینہ کی نگاہیں جھک گئیں۔

کیا کہتی بھلا۔ وہ تو محض دل پشوری کا سامان کر رہی تھی کیا خبر تھی مقابل سنجیدہ ہو جائے گا۔

"تمہاری بیوی کو اعتراض تو ہو گا۔" الوینہ نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔

"اونہہ! اسلام میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے اور میرا تم سے نکاح شرعاً" جائز ہے بغیر زینب کی اجازت کے بھی۔"

وہ شرمسار لہجے میں کہتے ہوئے یکسر فراموش کر گیا کہ جس قدر بے تکلفی سے وہ اور الوینہ آمنے سامنے اور نزدیک براجمان ہیں اس کی اسلام میں قطعاً" اجازت نہیں اور عمر کے ہاتھ میں دبے الوینہ کے ہاتھوں پر عمر کا پرجوش لمس اسلام میں جائز نہیں ہے... لیکن اسی فیصد مردوں کی طرح عمر نے بھی اپنے مطلب کی جائز احکامات کی دلیل اٹھائی اور باقی کے اسلامی احکامات کو کنارے رکھ دیا۔

بے شک نکاح کرنا کوئی ناجائز کام نہیں ہے اور جس صورت حال میں عمر الوینہ سے نکاح کر رہا تھا وہ تو اور بھی افضل ہے کہ چار لڑکیوں کی سرپرستی کا اجر عمدہ ہی ملنا تھا لیکن یقیناً" اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اور اللہ پاک نیتوں کا حال جانتا ہے۔

☆ ☆ ☆

الوینہ سے خفیہ نکاح کے بعد بھی عمر نے زینب کے ساتھ اپنی برتاؤ میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی اس کا وہی پرانا معمول تھا کہ حد سے زیادہ التفات برتنا نہ ہی ضرورت سے زیادہ بے نیازی ولاپروائی۔ بلکہ پہلے کی نسبت وہ اب زینب کا زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ شاید یہ ضمیر کی ملامت کی کارگزاری تھی کہ وفاشعار بیوی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر وہ اندر ہی اندر شرمساری محسوس کررہا تھا۔ اپنے طور تو اس نے زینب پر کچھ واضح نہ ہونے دیا تھا لیکن ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ کہ تبدیلی اپنا احساس نہ دلائے۔

گزرے چھ ہفتوں میں عمر کی مصروفیات کافی بڑھ گئی تھیں۔ صبح کام کے لیے جلد روانگی' دوپہر میں کھانے کے لیے گھر نہ آنا رات واپسی میں تاخیر۔ زینب کی باز پرس پر اس کو نہایت آرام سے مصروفیات کی طویل داستان سنا کر رام کرلینا' عمر کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا اور زینب ٹھہری سادہ لوح خاتون خانہ عمر کی بات پر آنکھ بند کرکے یقین کرلینا اس کا ایمان تھا۔ ڈیڑھ مہینے کم نہیں ہوتے ان دنوں میں عمر نے جی بھر کے شاپنگ' ہوٹلنگ اور سیرو تفریح کے پرمسرت لمحات من چاہی ہستی کے ساتھ بتائے تھے۔ اور اس مصروفیات کو کاروباری اور روزگار کی دوڑ دھوپ کے پیرہن میں لپیٹ کر زینب کی ہمدردی سمیٹ لینا عمر کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا۔ اپنی شاپنگ اور ہوٹلنگ کے دوران اگر وہ کبھی کچھ زینب کے لیے لے جاتا تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی۔۔۔ پتا نہیں زینب حد سے زیادہ خوش گمان تھی یا بے وقوف۔ لیکن کب تک ایک نہ ایک دن تو یہ عقدہ کھلنا ہی تھا۔

زینب نے اگر بے وقوفی و بے خبری کی پٹی عقل و نگاہ پر باندھ رکھی تھی تو ضروری نہیں کہ ساری دنیا کی آنکھیں بھی بند ہوں۔ ایک کو پتا چلا' ایک سے دوسرے کو اور دوسرے سے تیسرے کو۔۔۔ تیسرے سے زینب بھی باخبر ہو ہی گئی اور اس پر تو گویا آسمان ہی ٹوٹ پڑا۔

☼ ☼ ☼

"یہ سچ ہے۔" عمر کے منہ سے ان تینوں لفظوں کا ادا ہونا تھا کہ زینب چیل کی مانند اس پر جھپٹی تھی۔ اپنے ہاتھوں میں اس کا گریبان بھینچے وہ پاگلوں کی طرح رو رہی تھی۔

"زینب! زینب یہ کیا پاگل پن ہے۔" وہ پے درپے اس کے سینے پر مکے برساتی اس کے چہرے پر اپنی ناخنوں سے خراشیں بھی ڈال گئی تھی۔ عمر حواس باختہ سا اس کی کلائیوں کو گرفت میں لیے اسے قابو کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"کیوں کیا آپ نے ایسا۔۔ کہاں کوتاہی ہوئی مجھ سے؟" وہ چیخ رہی تھی بکھرے بالوں اور ٹوٹی چوڑیوں والی کلائیوں سے خون رسنے لگا تھا۔ کئی جگہ چوڑیوں کے ٹکڑے پیوست ہوگئے تھے پر پروا کسے تھی۔

"زینب۔ بات سنو۔ پلیز بات۔۔۔" وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا مگر اس پر تو جیسے جنون سوار ہو چلا تھا۔

"نہیں سنی مجھے کوئی بات آپ کی۔ میں تو برباد ہوگئی میرے اللہ۔"

وہ رو رو کر بے حال ہوتی بیڈ پر گر کے سسکیاں لینے لگی۔ عمر کا دل تاسف سے بھر گیا۔ اسے معلوم تھا یہ سب ہوگا لیکن بہرحال زینب کی حالت دیکھ کر اسے بہت تکلیف ہورہی تھی۔

جو بھی تھا زینب تھی تو اس کے بچوں کی ماں۔۔۔

"زینب!" وہ اس کی نزدیک بیٹھا زینب ہنوز اوندھی پڑی سسک رہی تھی۔

"معاف کردو مجھے!۔۔" اس نے زینب کے بکھرے بالوں کی الجھی لٹیں چہرے سے سمیٹ کر پرے کی۔ وہ لاتعلق تھی۔

"زینب!" وہ اس کی آنکھوں سے ابلتے آنسوؤں کی بوندیں سمیٹنے لگا۔ زینب نے بھیگی آنکھیں کھول کر عمر کو دیکھا جو پشیمان سا دکھائی دے رہا تھا۔

"آپ!۔۔۔" وہ اٹھ بیٹھی اور بال سمیٹ کر چہرہ ہتھیلیوں سے رگڑ کر خشک کیا اور عمر کی جانب دیکھا وہ ہمہ تن گوش تھا۔

"آپ مانتے ہیں نا آپ نے غلطی کی ہے؟" عمر نے اس کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں سر اثبات میں ہلایا تھا۔ وہ سرک کر عمر کے قریب ہوئی اور اس کے مردانہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ عمر کو ایک لمحے کے لیے لگا جیسے یہ مرحلہ سر ہوگیا ہو۔

"آپ۔۔۔ اسے طلاق دے دیں۔" زینب کے اگلے جملے پر عمر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ زینب پرامید نظروں سے اسے دیکھ ہی تھی وہ خاموش تھا۔

"غلطی کو سدھارا ابھی جاسکتا ہے نا! آپ اسے طلاق دے دیں بس۔" وہ جیسے سب طے کرچکی تھی۔

"میں نے غلطی اس سے نکاح کرکے نہیں کی زینب کہ اسے طلاق دے دوں تو غلطی سدھر جائے گی۔ غلطی میں نے تم سے یہ بات چھپا کر کی ہے۔ رہی اسے طلاق دینے کی بات تو یہ میں نہیں کرسکتا۔"

عمر نے تو جیسے آخری فیصلہ سنا دیا تھا لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو بٹوارے پر راضی نہیں تھا۔

"کیوں نہیں کرسکتے؟" زینب کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ پڑیں۔

"اس کا حق مہر پچاس ہزار ہے۔ جو اس وقت میں ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" عمر نے جواز سامنے رکھا۔ اس کی بات سن کر زینب الماری کی طرف بڑھی۔

"یہ بیچ کر اسے دے دیں۔" وہ اپنے طلائی زیورات کا صندوق اٹھا لائی تھی جس میں اس کے شادی کے سیٹ اور کنگن تھے۔ عمر نے حیران ہوکر اسے دیکھا۔

عورت کو اپنی شادی کے زیورات کس قدر عزیز ہوتے ہیں' بیان کرنے کی ضرورت تو نہیں لیکن یہاں سوال سر کے سائیں کا تھا اس کے لیے تو دنیا تیاگی جاسکتی ہے یہ تو پھر زیورات تھے۔

"لیں۔" زینب نے ڈبا اس کے ہاتھوں میں تھمایا۔

"زینب تم سمجھ نہیں رہی ہو۔" عمر نے بے چارگی سے ہاتھ میں تھاما ڈبا بیڈ پر رکھ دیا۔

"سمجھ تو واقعی نہیں رہی میں۔ نا سمجھ ہوں تب ہی تو یہ دن دیکھنا پڑا نا مجھے۔" وہ پھر سسک کر ہاتھوں میں [illegible] ڈھانپے رونے لگی۔ عمر نے نزدیک ہوکر اس کے [illegible] گرد اپنے بازو لپیٹے۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہ[illegible] نہیں کیا۔

"زینب!" عمر نے تسلی آمیز انداز میں اس کی پشت [illegible] تھپکی۔ وہ اس کے سینے میں منہ دیے رو رہی تھی۔

"آپ اسے طلاق دے دیں بس!" گھٹی گھٹی آوا[illegible] زینب کی تھی۔

"زینب پلیز!" عمر اسے بہلا رہا تھا۔

"عمر پلیز۔۔۔" وہ اس کی شرٹ اپنی مٹھیوں میں بھینچے بلکتی ہوئی اسے مجبور کررہی تھی۔

"مجھے اگر اسے طلاق ہی دینی ہوتی تو نکاح کیوں [illegible] کرتا؟"

"تو آپ اسے نہیں چھوڑیں گے۔" زینب تڑپ [illegible] کر الگ ہوئی۔ عمر چپ تھا۔

"ٹھیک ہے پھر!۔۔" وہ سرعت سے اٹھ کر ڈریسنگ [illegible] کی دراز میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو زینب!۔۔۔ زینب!" عمر حواس باختہ سا اس کی طرف بڑھا۔

جب تک وہ پہنچا زینب دراز میں موجود قینچی نکال چکی تھی۔

"یہ کیا بچپنا ہے زینب!" عمر نے اس کی کلائی کو جھٹکا دیا تو زینب کے ہاتھ سے قینچی زمین بوس ہوئی۔ عمر نے تیزی سے قینچی اٹھا کر کمرے کے کھلے دروازے سے باہر اچھال دی۔

"میں اپنی جان دے دوں گی اگر آپ نے۔۔۔" وہ دیوانی ہوئی جارہی تھی۔

"زینب! پلیز ہوش میں آؤ۔" عمر نے اسے اپنے حصار میں لینا چاہا۔

"ہاتھ مت لگائیں مجھے۔" وہ بدک کر پیچھے ہوئی۔

"شکل نہیں دیکھنا مجھے تمہاری جاؤ یہاں سے۔" زینب نے اسے کمرے سے باہر دھکیلا۔

"خود کو کوئی نقصان پہنچانے سے پہلے میرے اور بچوں کے بارے میں ۔۔۔ ضرور سوچنا۔"

"تم نے سوچا تھا میرے اور اپنے بچوں کے بارے میں؟" عمر نظریں چرا کر رہ گیا۔ زینب نے اس کے منہ پر زور سے دروازہ بند کیا۔ وہ بے بس سا اس کی دھتکار برداشت کر رہا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

ادھر اس کے گھر مسرال والے دونوں ہی زینب کے حامی تھے۔ دونوں جانب سے لعن طعن عمر کے حصے میں ہی آ رہی تھی۔ پتا نہیں معاشرے میں دوسری شادی کو اتنا بڑا ایشو کیوں بنا دیا جاتا ہے عمر کی نیت جو بھی رہی ہو لیکن بہر کیف اس کا دوسرا نکاح شرعاً" فعل تھا جس کے لیے کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن کیا کیا جائے کہ رسم دنیا کی پاسداری بھی ضروری ہے۔

عمر کا خیال تھا کہ زینب کچھ دن ناراض رہے گی روئے دھوئے گی سمجھوتا کر ہی لے گی۔ اس کا یہ خیال ضرور درست ہوتا اگر زینب کے ماں باپ اور بھائی اس کے خیر خواہ بن کر عمر سے بازپرس کرنے نہ پہنچتے۔ زینب نے اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود میکے جانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا کیونکہ وہ ساس سسر اور سسرال والوں کی سپورٹ سے مطمئن تھی دوسری جانب عمر پہ بھی الوینہ کو طلاق دینے کے لیے دباؤ شدید تھا۔ جلد یا بدیر وہ پر امید تھی کہ عمر کلی طور پر اس کی جانب پلٹ آئے گا۔ لیکن خیر خواہوں کی خیر خواہی نے حالات کا دھارا کہیں سے کہیں موڑ دیا۔

"تم اسے (الوینہ) طلاق دو گے یا نہیں؟" یہ زینب کا بڑا بھائی تھا۔

"مجھے ٹھوس وجہ بتا دیں تو میں الوینہ کو طلاق دے دیتا ہوں۔" عمر کا لہجہ سرد تھا۔

"پہلے تم میری بیٹی پر سوتن بٹھانے کی وجہ بتاؤ۔" زینب کی ماں نے زینب کو خود سے لپٹایا۔ زینب خاموش تھی۔

"میں ابھی ان دونوں پر ایک اور سوتن بٹھا سکتا ہوں اور اس کے لیے مجھے کسی کو کوئی وجہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" عمر دو ٹوک بات کر رہا تھا اس کی آخری بات پر حاضرین کی آنکھیں فرط اشتعال سے ابل گئیں۔ ان کے نزدیک عمر کسی بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھا تھا جس کے بعد ایسی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر کے وہ ان کی غیرت کو للکار رہا تھا۔

"ارے کرنا ہی تھا تو کسی کنواری لڑکی سے نکاح کیا ہوتا جو میری بیٹی کے مقابلہ کی تو ہوتی چار بیٹیوں کی ماں سے بیاہ رچاتے شرم نہیں آئی تمہیں۔۔؟"

عمر کی ساس ملامتی انداز میں گویا تھی۔

"اب آپ لوگ کیا چاہ رہے ہیں؟" عمر اس لعن طعن سے ——— بے زار ہو چکا تھا۔

"ابھی الوینہ کو طلاق دو یا میری بہن کو، میری بہن کی دو روٹی بھاری نہیں ہم پر۔" یہ زینب کا چھوٹا بھائی ریحان تھا۔

عمر نے چونک کر زینب کو دیکھا جو خود حیرانی سے اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ عمر کو ایک پل لگا یہ سمجھنے میں کہ زینب ایسا کچھ نہیں چاہ رہی۔

"میں نے اگر طلاق کا لفظ منہ سے نکالا تو وہ دونوں کے لیے ہوگا، کسی ایک کے لیے نہیں۔ میں کسی ایک کو نہیں دونوں کو چھوڑ دوں گا۔"

عمر کا لہجہ بے لچک تھا۔

"عمر! زبان سنبھال اگر زینب کے ساتھ تو نے کوئی ناانصافی کی تو میرا مرا ہوا منہ دیکھے گا یاد رکھنا۔" عمر کی ماں تڑپ اٹھی تھی۔ "کتنے ارمانوں سے بہو بیاہ کے یہ دن دیکھنے لیے تو نہیں لائی تھی نا۔"

"ٹھیک ہے میں نہ اسے طلاق دوں گا نہ الوینہ کو۔ آپ لوگ جو کرنا چاہتے ہیں کر لیجیے۔" وہ اطمینان سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ زینب کی ماں بھی۔

"ٹھیک ہے! پھر زینب ہمارے ساتھ جا رہی ہے۔ فیصلہ کر لو کہ کسے رکھنا ہے تو مطلع کر دینا۔"

زینب کی ماں طیش میں آ کر کیا فیصلہ کر گئی ہے۔ زینب کے لیے غیر متوقع تھا۔

"لے جائیں۔۔۔! میں دو چار دن میں جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو لینے آ جاؤں گا۔ لیکن اس بات کو دماغ سے نکال دیں کہ میں الوینہ کو طلاق دوں گا مجھے اگر اسے چھوڑنا ہی ہوتا تو نکاح ہی نہیں کرتا۔ اتنے کھڑاگ کے بعد اب میری بھی ضد ہے نہ میں اسے چھوڑوں گا نہ الوینہ کو۔ دیکھ لوں گا کون کیا بگاڑ لیتا ہے میرا۔" عمر بھڑک اٹھا تھا۔ جارحانہ انداز میں کہتا وہ کمرا چھوڑ گیا۔ پیچھے زینب کی ماں زینب سے مخاطب تھی۔

"چا! حجاب لے کر آ چل ہمارے ساتھ۔" زینب نے اپنی ساس کی طرف دیکھا جو بے بسی سے اسے دیکھ کر سر نفی میں ہلانے لگی تھیں۔

"اماں! میں نہیں جاؤں گی یہاں سے۔" زینب منمناتے ہوئے ماں سے مخاطب تھی۔

"یہاں ناقدروں میں رلنا چاہتی ہے۔۔۔ زندگی برباد ہو گئی تیری اور تو ان کے بارے میں سوچ رہی ہے؟؟" اشارہ مایوس بیٹھے ساس سسر کی طرف تھا۔ زینب کشمکش میں گھری تھی۔

"اماں۔۔۔ میں۔۔۔ وہ ندا اور عباس۔۔۔" وہ متامل تھی۔

"وہ کون ہیں؟ اسی دھوکے باز آدمی کی اولاد ہیں نا! ان کی پروا مت کر۔ اپنی سوچ۔"

اس کی ماں اپنی دانست میں اسے عقل کے ناخن دے رہی تھی۔ جب کہ زینب کو اپنے ساس سسر کی ڈبڈبائی آنکھوں نے پسپا کر رکھا تھا۔ بیٹے کی من مانی کے بعد بہو کی ضد ان کے بیٹے کے لیے بسائے گھر کو تہس نہس نہ کر دے سو وہ دونوں ہی فکر مند تھے۔

"اماں! میں۔۔۔" زینب کچھ کہہ رہی تھی جب بڑے بھائی کو کھڑے ہوتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

"اگر آج یہاں سے ہم لوگ تمہیں لیے بغیر گئے۔ تو یاد رکھنا ہمارا تمہارا ہر تعلق ختم۔۔۔ ہم دونوں باہر ہیں جلدی آ جائے گا۔"

وہ دو ٹوک کہتے آخر میں ماں کی جانب دیکھتے باہر نکل گئے۔

پنچایت کے لیے اہتمام سے آئے اپنے سسرالیوں کو خاطر میں نہ لا کر عمر نے ان کی انا کو چوٹ پہنچائی تھی۔ اور اب وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے زینب کو ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے اس بات سے قطع نظر کہ زینب کیا چاہتی ہے؟۔۔۔ یا پھر زینب کو وہ لوگ دو وقت کی روٹی کتنے دن کھلا سکیں گے۔۔۔؟ یا پھر زینب اور اس کے بچوں کو زینب کی بھابھیاں اور ان کے بچے کتنے دن برداشت کریں گی؟

"چل جلدی ورنہ میں بھی بھول جاؤں گی کہ میری کوئی بیٹی بھی تھی۔" زینب کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔

یہ کیسے لوگ تھے جنہیں صرف "میں" عزیز تھی۔ بیٹی نہیں۔ بیٹی کی خواہش نہیں۔

"گھر مت چھوڑ کے جا زینب۔۔۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" زینب کی ساس رندھی آواز میں محض اتنا ہی کہہ سکی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔۔۔" زینب بلک اٹھی۔

"ہائے! ہائے! میری بچی پر جادو کر دیا۔ عمل کروا دیا ہے۔ کیسے ان کی زبان بولنے لگی ہے تو۔ ماں سامنے بیٹھی تڑپ رہی ہے۔ تجھے احساس نہیں۔ بچوں کی پروا ہے ساس سسر کی پروا ہے۔ اپنی پروا نہیں ہے بس!"

زینب کی ماں واویلا کرتے ہوئے اٹھی اور زینب کی الماری سے حجاب نکال لائی۔ زینب محض کمزوری مزاحمت کر سکی لیکن اس کی ماں نے اسے زبردستی حجاب میں لپیٹ دیا۔

"اماں! نہیں اماں۔۔ میرے بچے۔" وہ تڑپ رہی تھی زینب کی ماں نے اسے باہر کی جانب ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹا۔

"ٹھیک ہے پھر۔ مر گئی تیری ماں۔۔۔ رہنا اب اپنے "سگوں" کے ساتھ۔" اس کی ماں نے یک بیک زینب کی کلائی چھوڑی اور باہر نکلنے لگی۔

"اماں!۔۔۔ ایسے مت کریں۔ میں کیا کروں میرے اللہ۔" زینب نے پشت سے اپنی ماں کو تھاما اور ان کے شانے سے سر ٹکا کر سسکنے لگی۔ اس کی ماں ٹھہر گئی۔

"زینب! بہت کڑا عمل کروایا ہے ان لوگوں نے تجھ پر۔۔۔ چل میرے ساتھ بڑے عامل بابا سے تیرے عمل کی کاٹ کرواؤں گی۔ یہاں رہے گی تو سب بے کار ہو جائے گا۔۔۔ چل میرے ساتھ۔۔۔"

اس کی ماں پیار سے پچکار رہی تھی۔ وہ ہی خالص زنانہ در حقیقت جاہلانہ وسوسے اس کی ماں کو ستانے لگے تھے۔

"میں بچوں کے بغیر نہیں جاؤں گی۔" زینب نے پسپائی اختیار کی۔

"چل لے آ بچوں کو۔" کروفر میں اکڑے ان لوگوں کو بس اپنی ضد عزیز تھی۔ کسی بھی صورت زینب کو یہاں سے لے جانا مقصود تھا۔

☼ ☼ ☼

دو ہفتوں سے زینب اپنے میکے میں تھی۔ ان دو ہفتوں میں عمر دو مرتبہ اسے لینے جا چکا تھا لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ الوینہ سے علیحدگی کے بعد ہی وہ اس گھر میں قدم رکھے گی۔ اور عمر کا ایک ہی جواب تھا۔

"میں نے نکاح اسے طلاق دینے کے لیے نہیں کیا پھر بھی اگر کوئی ٹھوس وجہ ہے تو بتاؤ میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔"

سو معاملہ ہنوز جوں کا توں تھا۔

پچھلے دنوں زینب اور اس کی ماں نے الوینہ کے محلے میں آکر بہت شور شرابا اور دنگا فساد کیا۔ اس کے بھائیوں نے کچھ لڑکوں کے ساتھ مل کر الوینہ کے گھر پہ پتھراؤ اور توڑ پھوڑ بھی کی۔ اس وقت تو محلے والوں کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہو گیا ورنہ ان لوگوں کے ارادے خطرناک تھے۔ عمر شدید پریشانی میں گھرا ہوا تھا۔

کبھی کبھی وہ سوچ میں پڑ جاتا کہ جب دوسری شادی اتنے دنگے فساد اور بدسکونی کا باعث بن رہی ہے تو تیسری اور چوتھی کس قدر قیامت خیز ہوگی اور اگر یہ سب اتنا ہی بڑا جرم ہے تو اللہ نے اجازت کیوں دی۔۔۔؟

"میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" آج پھر وہ زینب کے سامنے تھا۔

"میں نے کہہ دیا یا وہ رہے گی آپ کے ساتھ یا میں۔"

زینب کا لہجہ اٹل تھا۔

"زینب وہ مجھ سے کچھ نہیں مانگ رہی سوائے میرے نام کے۔ تم بتاؤ ذرا ایک بیوہ عورت کو سہارا دینا اس کی یتیم بیٹیوں کو اپنا نام دینا کون سا گناہ ہے۔ کیوں مجھ پر اتنے عتاب نازل ہو رہے ہیں۔۔۔؟ میں نے کوئی ناجائز کام تو نہیں کیا نا؟۔۔۔ میں اگر تمہارے حقوق میں کوتاہی کرتا، تمہیں کسی چیز کی تکلیف ہوتی میری طرف سے تو تمہارا خفا ہونا بجا تھا مجھ سے۔ لیکن یوں بے وجہ یہاں آکے بیٹھ جانا مسئلے کا حل تو نہیں ہے۔"

وہ زچ ہو چکا تھا اس روز روز کی چخ چخ سے۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ جب تک تمہارا اس سے تعلق ہے میں اس گھر میں پاؤں نہیں دھروں گی۔" وہ کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھی۔

"اور۔۔۔ جب تک میں یہاں ہوں۔ مجھے میرا اور بچوں کا ماہانہ خرچ دو۔" زینب نے نان و نفقہ کا مطالبہ کیا۔

"میں کیوں تمہارا خرچ دوں۔۔۔ میں نے تمہیں گھر سے نہیں نکالا ہے تم اپنی مرضی سے بلا جواز یہاں رہ رہی ہو۔" عمر نے تیوری چڑھائی۔

"اور جو لوگ سینہ ٹھونک کر اپنی بہن کو یہاں لائے تھے ان پر دو وقت کی دو روٹی دو ہفتوں میں ہی بھاری پڑ گئی کیا؟" عمر استہزائیہ ہنسا۔

"ان کی ذمہ داری نہیں ہوں میں۔۔۔ تمہاری بیوی ہوں۔ تمہاری ذمہ داری ہوں سمجھے۔" زینب پھنکاری۔

"میری بیوی ہو تو یہاں اپنے ماں باپ کے گھر میں کیا کر رہی ہو۔ میری بیوی کی جگہ میرے گھر میں ہے یہاں نہیں۔" عمر بھی پھٹ پڑا تھا۔

"ذمہ داری کی بات کرتی ہو۔ میری ذمہ داری تم ہو یہ معلوم ہے تمہیں تمہاری کیا ذمہ داری ہے اس کا احساس ہے یا نہیں؟؟ ڈھائی ہفتوں سے یہاں پڑی ہو۔ سوچا ہے تم نے تمہارے پیچھے گھر کا کیا حال ہے؟۔۔۔ گھر والوں کا کیا حال ہے؟۔۔۔ میرا کیا حال ہے؟" عمر کا لہجہ نرم تھا۔

اس نے زینب کو موم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔

"اب میری کیا ضرورت ہے؟" وہ تمسخرانہ ہنسی تھی۔

"ضرورت ہے تمہاری۔۔۔ جب ہی تو بار بار تمہیں لینے آ رہا ہوں۔ چلو میرے ساتھ۔"

عمر تحمل سے کہتا اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا رہا تھا۔

"نہیں جانا مجھے کہیں۔" اس نے عمر کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"آج میں بھی تمہیں لیے بنا نہیں جاؤں گا۔" عمر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"بیٹھے رہیے شوق سے جب تک چاہیں۔۔۔ لیکن میں یہیں رہوں گی۔"

وہ نخوت سے کہتی اٹھ کر باہر کی طرف بڑھی عمر کھول کر رہ گیا۔ غصہ یک بیک عود کر آیا تھا۔

"بہت شوق ہے تمہیں یہاں رہنے کا۔۔؟" عمر کی پھنکارتی آواز پر زینب نے دروازے سے پلٹ کر دیکھا وہ کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اور اس کی نگاہیں چہار جانب چکراتی کچھ تلاش رہیں۔ تھیں معاً" عمر کی نگاہ دروازے کے پیچھے کونے میں رکھی فنائل کی بوتل پر ٹھٹک کر رکیں اس نے سرعت سے بڑھ کر بوتل اٹھائی۔ زینب بوکھلا کر نزدیک آئی۔

"میں ہی مر جاتا ہوں۔ اچھی طرح یہاں رہنے کا شوق تمام کر لینا تم۔" شدید طیش کے عالم میں کہتے عمر نے بوتل کی ڈھکن اتار کر بوتل منہ سے لگالی۔ زینب نے روکنے کی کوشش کی تھی مگر ایک مضبوط توانا مرد کے مقابل اس کی کمزور سی کوشش کارگر نہ ہو سکی۔

"اماں۔۔۔ اماں!۔۔۔ ریحان۔۔۔!" زینب حواس باختہ سی سب کو پکارتی باہر کی جانب دوڑی ادھر عمر غٹاغٹ پوری بوتل خالی کرنے کے بعد بے دم سا زمین پر گرا۔ بند ہوتی آنکھوں کے آخری دھندلائے منظر میں زینب اور اس کے پیچھے بہت سے لوگ کمرے میں داخل ہوتے نظر آئے پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

نیم مردہ جسم نے دو تین جھٹکے لیے نیلے ہوتے لبوں کے کنارے سے زرد جھاگ ابلنے لگا زینب کی دلدوز چیخیں آسمان چیرنے کے درپے ہو گئیں۔ آناً" فاناً" اسپتال لے جانے پر بھی زہریلی دوا اپنا کام دکھا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

پورے دو دن عمر موت کی بانہوں میں زندگی سے نبرد آزما رہنے کے بعد موت کو شکست دے کر زندگی کی جانب لوٹ آیا تھا۔ ان دو دنوں میں زینب کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی تھی۔ بیوگی کا خوف۔ بے آسرا ہونے کا دھڑکا اور بے گھر ہونے کی اذیت کا احساس اس کی روح کھینچ گیا تھا۔

عمر سے علیحدگی کا مطالبہ کرتے ہوئے زینب کو یقین کامل تھا کہ عمر اسے (زینب کو) کبھی بھی طلاق نہیں دے گا اس لیے وہ بے خوف ہو کر اسے خود سے علیحدہ ہونے کا ڈراوا دے رہی تھی۔ لیکن جو صورت حال عمر نے پیدا کر دی تھی۔ اس میں زینب سوائے اپنا سر پیٹنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ دو دن محض یہ سوچ سوچ کر اس کی جان نکلتی رہی کہ اگر خدانا خواستہ ابھی عمر کو کچھ ہو جاتا ہے تو اس کے پیچھے زینب کا کیا ہو گا اس کے بچوں کا کیا ہو گا؟ کہیں کسی اور کو کوئی فرق نہیں پڑے گا سوائے زینب کے؟

الوینہ پہلے بھی اکیلی تھی پھر ہو جائے گی۔۔۔ عمر کے گھر والے چار دن اسے روئیں گے پھر فراموش کر جائیں گے۔ اور زینب کے گھر والے؟؟ ان کے لیے زینب محض اک بوجھ ہو گی۔ ویسے بھی گزشتہ دنوں میں زینب کو بھابھیوں کے بدلتے رویے محسوس ہو رہے تھے۔ بلاوجہ بچوں کی بے ضرر سی لڑائیوں میں واویلا کرتے ہوئے زینب کو بھی دو چار کھلے جملے دان کر دیے جاتے۔ اس کے پاس خاموشی سے سننے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تب ہی جب جعفر (زینب کا

چھوٹا دیور) عباس کو گھر لے جانے آیا تو وہ انکار نہیں کر سکی اور عباس کو اس کے ہمراہ بھیج دیا۔ یہاں عباس کو دوسروں کی جھڑکیاں کھاتے دیکھنے کا مزید حوصلہ نہیں تھا اس میں۔

عمر پندرہ دن ہسپتال میں ایڈمٹ رہا اور ان پندرہ دنوں میں زینب کے بھائیوں نے محض دو سے تین مرتبہ غیروں کی طرح کھڑے کھڑے اس کی عیادت کا فریضہ نبھایا تھا۔ علاج معالجے کی ضمن میں کچھ کرنا تو دور کی بات۔ زینب اپنے گھر والوں کے برتاؤ سے سخت رنجیدہ تھی جو بھی تھا عمر بہرحال اس کا شوہر تھا اور ابھی جب وہ حیات ہے تو لوگوں کے رویے بدلنے لگے تھے خدانا خواستہ اگر۔۔۔ نہیں نہیں!

وہ سوچ کر ہی دہل جاتی۔

مہینہ بھر پہلے جس اکڑ، غرور اور گھمنڈ کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ پر زینب گھر چھوڑ کر گئی تھی۔۔ لوٹی تو اس کا شائبہ تک نہیں تھا۔

کمزور لاغر وجود، بکھرا سراپا اور ڈھلکے ہوئے شانوں سے نڈا کو لگائے وہ اکیلی گھر میں داخل ہوئی۔ زینب کا چھوٹا بھائی ریحان اسے گلی کے کونے تک چھوڑ کر گیا تھا۔

گھر میں کسی نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اس کی آمد پر وہ بہت خاموشی سے اس ماحول سے دوبارہ منسلک ہو گئی۔ زینب کی واپسی کے تیسرے دن عمر ڈسچارج ہو کر گھر آیا۔ زینب کے تیور و اطوار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سمجھوتہ کر چکی ہے عمر کے ساتھ اس کا رویہ ٹھیک ہی تھا نہ بہت خوشگوار نہ ہی بہت ناخوشگوار۔۔ وہ اس کا خیال رکھ رہی تھی۔ اس کی تیمار داری کر رہی تھی۔ ان کے تعلق میں کھنچاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ مگر امید واثق تھی کہ یہ تناؤ بھی جلد معدوم ہو جائے گا۔ زینب گھر واپس آ گئی تھی اس کے اس عمل سے آگے کے حالات بھی بہتری کی جانب گامزن ہو چکے تھے۔ رفتہ رفتہ زندگی معمول کی رفتار پکڑ لیتی ہاں یہ تھا کہ زینب الوینہ سے چشم پوشی اختیار نہیں کر سکتی تھی ــــــ شوہر کی بٹی ہوئی محبت پر صبر کرنا آسان نہیں تھا۔ اور 80 فیصد جذباتی عورتوں کی طرح زینب بھی صبر نہیں کر سکی تھی۔

زندگی "جینے" کے لیے صبر کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جو صبر کر نہیں پاتا اسے زندگی گزارنے کے لیے صبر آ ضرور جاتا ہے۔ نامساعد حالات کی بھٹی میں تپ کر زینب کو بھی صبر آ گیا تھا۔

زندگی بھی تو گزارنی تو تھی نا۔

☼ ☼ ☼

میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ پھر عمر، زینب اور الوینہ ایک ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ کیونکہ یہ زندگی ہے کوئی بچوں کی کہانی نہیں کہ جس کے اختتام پر سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔۔ بہت کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے بھی ان کی زندگی میں کہیں کچھ غیر مطمئن تھا۔ اور محبت کی ڈور میں پڑی بے اعتباری کی گرہ اتنی آسانی سے تو نہیں کھلنی تھی۔ صبر و اطمینان و تحمل کا طویل دورانیہ اس الجھی ڈور کو سلجھا سکتا تھا جلد بازی سے جھٹکا دینا اس ڈور کی ساخت کو کمزور کر سکتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ ان تین لوگوں کی زندگی میں یہ جو تلاطم خیز دور آیا جس نے ہمیشہ کے لیے تینوں کے دلوں میں عناد و بغض کو جگہ دی اس کا ذمہ دار و قصوار وار کون ہے؟

عمر، زینب اور الوینہ۔ میری کہانی کے یہ تین کردار آپس میں ایک دوسرے کو غلط گردان رہے ہیں، کٹہرے میں گھسیٹ رہے ہیں ہر ایک کی نظر میں دوسرا قصوار ہے۔

زینب کہتی ہے۔

عمر نے اس سے بے وفائی کی اسے دھوکہ دیا۔

الوینہ نے اس سے اس کا شوہر چھین لیا۔ اس کے شوہر کو ورغلایا اور اس سے بے وفائی پر مجبور کیا۔

کیا زینب کا موقف درست ہے؟؟؟ کیا عمر شرعاً جائز نکاح کر کے پہلی بیوی سے بے وفائی کا مرتکب ہوا ہے۔؟ ٹھیک ہے کہ اس نے زینب کو لاعلم رکھا اس معاملے سے لیکن یہ کوئی ایسا گناہ تو نہیں تھا کہ زینب

گھر چھوڑ جاتی یا علیحدگی کا مطالبہ کرتی۔۔۔ کیا زینب کو اس بات پر شکر گزار نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے شوہر نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے جائز راستہ اختیار کیا۔ اگر وہ چاہتا تو ناجائز طریقہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ تب یہ ساری مصیبتیں جو اب عمر نے جھیلی ہیں شاید اسے نہ جھیلنی پڑتیں کسی کو خبر ہی نہیں ہوتی تو واویلا کون کرتا۔۔ یہاں بیویاں اپنی شوہر کی بڑی سے بڑی برائی کے ساتھ سمجھوتا کر بیٹھتی ہیں۔ اس نے تو صرف دوسری شادی کی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ صحیح اور جائز طریقہ پر انگلیاں اٹھا کر لوگوں کو چور راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

کیا واقعی الوینہ نے زینب سے اس کا شوہر چھین لیا؟ اگر عمر کی باتوں پر ایمان لاتے ہوئے الوینہ نے عمر سے نکاح کر لیا تو کون سا گناہ کیا؟ کون سی عورت ہے جسے مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں اگر اس نے بھی یہ سہارا عمر کی صورت قبول کر لیا تو کیا خطا کی۔

ادھر عمر کہتا ہے میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ نکاح کرنا کوئی گناہ نہیں ہے مجھے حق حاصل ہے اس کا اور اس کے لیے میں زینب سے اجازت لینے کا مجاز نہیں ہوں۔ اس عورت (زینب) نے بے جا بات کو اتنی طوالت دی۔

کیا عمر ٹھیک سوچتا ہے؟؟ کیا زینب کی دل آزاری کر کے وہ گناہ کا مرتکب نہیں ہوا؟

باقی رہ گئی الوینہ۔۔ تو اس کی نظر میں عمر کا کوئی قصور نہیں غلطی زینب کی ہے کہ اس نے یہ نوبت ہی کیوں آنے دی کہ عمر ادھر ادھر جھانکنے نکلا اس نے اتنی غفلت برتی ہی کیوں،

اور مزید یہ کہ عمر خود اس کی جانب بڑھا تھا الوینہ نے دانستہ اسے متوجہ نہیں کیا۔

کیا الوینہ کا نظریہ درست ہے؟ کیا عمر واقعی بے قصور ہے؟

عمر کے سامنے بیٹھ کر بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہوئے دعوت نظارہ دینا نادانستہ سہی لیکن تھا تو غلط ہی نا۔ عمر خود اس کی جانب بڑھا تھا۔ وہ کون سا دو قدم پیچھے ہٹی تھی یا اس نے عمر کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھی دو قدم بڑھا کر اس کے نزدیک ہوئی تھی۔

سوچ کر دیکھیں تو بات صرف اتنی ہے کہ زندگی اتنی مشکل ہے نہیں جتنی ہم اپنی جلد بازی اور جذباتی رد عمل سے اسے مشکل بنا دیتے ہیں۔ ☼

سلمیٰ فاروقی

یہی آگہی کا کرب ہے

میں بازل علی چوبیس سال کا خوش شکل نوجوان۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اب فرصت ہی فرصت۔ کام دھندے کی فکر نہ کسی کی طرف سے دباؤ کہ والد صاحب دبئی میں کافی کچھ کما رہے ہیں اور گھر میں خرچ کرنے والے ہم صرف تین افراد۔ میں' میری چھوٹی بہن نازش اور امی۔

والد صاحب کا کہنا تھا کہ "فی الحال عیش کرو' کچھ عرصے بعد جب وہ مستقل پاکستان آئیں گے تو پھر ہم کوئی کاروبار کرنے کا سوچیں گے۔" اور میں نے انتہائی فرمانبرداری سے ان کی بات مان لی۔ اب میرے جیسے آزاد' بے فکر نوجوانوں کی زیادہ تر یہی مصروفیات ہوتی ہیں کہ دوستوں کے ساتھ گھوم پھر لیا۔ ہوٹلنگ کی' اس کے علاوہ آج کے دور کی نئی مصروفیات۔۔۔ نیٹ سرفنگ اور چیٹنگ۔ بس میری بھی یہی مصروفیات ہیں۔

پہلے تو میں اپنے کمرے میں ہی اپنے کمپیوٹر پر کافی وقت گزارتا تھا' پھر پچھلے سال میرے دوست عاقب نے اپنا نیٹ کیفے کھولا تو میرا زیادہ وقت وہیں گزرنے لگا۔ ایک تو وہاں کا ماحول بڑا مزے کا ہوتا ہے۔ رونق لگی رہتی ہے لڑکے لڑکیوں کی آمدورفت کی وجہ سے اور پھر عاقب سے تفصیلی ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔

یوں تو عاقب اور میں ایک ہی محلے میں رہتے ہیں' لیکن میری اس سے دوستی اس وقت ہوئی' جب ہم نے ایک ہی کالج میں داخلہ لیا۔ اس سے پہلے چونکہ ہمارے اسکول مختلف تھے' اس لیے صرف محلے دار کے طور پر جان پہچان تھی۔ کالج میں روزانہ ملاقات کے بعد بات دوستی تک پہنچنے میں اس لیے دیر نہ لگی کہ ہماری باتیں' عادتیں کافی حد تک ایک جیسی ہی تھیں اور ان میں سے ایک یہ بھی کہ ہم دونوں ہی لڑکیوں کو لڑکوں کی مخصوص نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ یعنی ہمارے لیے لڑکی اور لڑکے سے بات کرنا برابر تھا۔ میرا مطلب ہے کہ کسی لڑکی سے بات کرتے ہوئے دل میں یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ یہ لڑکی ہے اور مجھے اس سے کچھ خاص طریقے سے بات کرنی ہے کہ یہ متاثر ہو جائے۔ سوائے اس خیال کے کہ بات تمیز سے کرنی ہے اور اگر کبھی کوئی خوب صورت چہرہ نظر آئے تو صرف خوشگواریت کے احساس کے سوا اور کوئی احساس' کوئی جذبہ نہیں جاگتا تھا۔ کیفے میں کافی خوب صورت چہرے بھی نظر آتے رہتے تھے۔ بات چیت بھی جاری رہتی تھی' لیکن دل اپنی جگہ قائم تھا۔ نہ اس کی دھڑکن میں کوئی فرق آیا' نہ کبھی اس کے کھو جانے کا احساس ہوا۔

لیکن۔۔۔ یہ سب تو ماضی ہوا۔ مجھے پتا ہی نہ چلا اور دل اپنی چال چل گیا۔ شاید اسے یہ بات پسند نہ آئی تھی کہ میں نے اسے اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا ہے۔

سچ ہی کہتے ہیں' دل پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ اسے اپنی من مانی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں نے تو اپنی شادی کے بارے میں بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ ہاں' ایک بار عاقب کے پوچھنے پر میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ لڑکی پسند کرنا' یہ شادی وغیرہ' سب امی کے ذمے ہے۔ وہ جیسے مناسب سمجھیں اور جب مناسب سمجھیں' مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا اور اس وقت تو حقیقت بھی یہی تھی۔

پھر یہ کیا ہو گیا میرے ساتھ۔۔۔؟

بے چینی' کچھ کھو جانے کا احساس' کچھ پانے کی تمنا' اندر سے خالی پن سا محسوس ہوتا۔۔۔ بے سکونی بڑھتی چلتی گئی اور پھر مجھے سارا جسمانی نظام ہی بگڑتا محسوس ہونے لگا۔

بھوک کبھی بالکل ختم اور کبھی جی چاہتا کہ کھاتا ہی چلا جاؤں۔ شاید کھانے کی مصروفیت میں کچھ بھلانا یا پھر کچھ چھپانا چاہتا تھا خود سے' دوسروں سے۔۔۔

سب تو نوٹ کر ہی چکے تھے' میری بدلتی حالت کو۔ امی' نازش اور عاقب۔۔۔ بلکہ عاقب نے تو سب سے پہلے پوچھا تھا۔

"یار! کیا ہو گیا ہے' کچھ بجھے بجھے سے اور گم صم نظر آ رہے ہو۔" اور میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔ اصل بات اور کسی کو تو بتا ہی دیتا' لیکن عاقب سے تو ہر صورت چھپانی ہی تھی۔ بھلا میں اس کو کیسے

بتاتا کہ میں۔۔۔

"میں سوچتا کہ کاش! میں اس دن عاقب سے ملنے نہ جاتا۔ کاش! میں اس کے پیچھے اسپتال ہی نہ جاتا' کاش! میں۔۔۔"

میں اس دن حسب معمول نیٹ کیفے گیا' لیکن وہ وہاں نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنے والد کو اسپتال لے کر گیا ہے۔ ان کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ میں بھی فوراً" اسپتال پہنچا۔ اٹیک زیادہ شدید نہ تھا۔ کچھ دیر بعد عاقب کی امی اور بہن بھی وہاں پہنچ گئیں۔ میں آنٹی سے بات کر رہا تھا کہ ایک آواز نے میری توجہ کھینچ لی۔

"بھائی! ابو ٹھیک تو ہو جائیں گے نا۔ اب کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے نا؟"

عاقب کی بہن اس سے پوچھ رہی تھی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر جیسے پلکیں جھپکنا بھول گیا۔

وہ آنسوؤں سے بھری سرمئی آنکھیں۔ وہ رونے کی وجہ سے سرخی لیے چہرہ۔

وہ شاید گھر سے یہاں آنے تک روتی ہی رہی تھی اور اس رونے سے یا پھر ویسے ہی اس چہرے میں کچھ ایسی بات' ایسی کشش تھی کہ میں اسے دیکھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر یک دم مجھے احساس ہوا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے پریشانی سے عاقب کی طرف دیکھا۔ اس کا دھیان دوسری طرف تھا' پھر میں ان سے دور جا کر کھڑا ہو گیا' لیکن نظریں تو بار بار اسی سمت ہی اٹھ رہی تھیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اختیار نہ رہا' تو میں عاقب کو ضروری کام کا کہہ کر واپس گھر آ گیا۔

مجھے خود پر بہت غصہ آ رہا تھا کہ وہ میرے دوست کی بہن ہے اور میں۔۔۔ رات تک اپنے آپ کو کوستا رہا۔ نیند کی وادی میں پہنچنے سے پہلے تک مجھے یقین تھا کہ وہ کیفیت صرف وقتی تھی' لیکن صبح آنکھ کھلتے ہی وہ رویا' رویا سا دلکش چہرہ پھر میرے سامنے آ گیا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں' لیکن تصویر تو جیسے اندر چپکی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند کرنے پر زیادہ واضح نظر آنے لگی اور پھر۔۔۔ میں دیکھتا ہی چلا گیا۔ کتنی ہی دیر میں آنکھیں موندے لیٹا رہا اور جب احساس جاگا کہ میں کوئی غلط کام کر رہا ہوں تو پھر وہ سارا دن بھی اپنے آپ سے لڑتے گزر گیا۔ میں عاقب سے ملنے' انکل کی خیریت معلوم کرنے بھی نہ جا سکا۔

دل کہتا' آنکھیں بند کیے پڑے رہو اور میں اسے سمجھاتا رہا کہ۔۔۔ آج کے دور میں جس طرح مخلوط تعلیمی نظام' مکس پارٹیاں اور خواتین کا جاب کرنا وغیرہ ہے تو اکثر لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ پہلی نظر کی محبت یا ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد محبت اور پھر خود ہی شادی کا فیصلہ' اب ایک عام بات ہو گئی ہے اور اگر یہ واقعہ یا حادثہ میرے ساتھ بھی ہو گیا تو کوئی بات نہیں' لیکن ۔۔۔ہاں' یہ لیکن ہی تو ہے میری کہانی میں سب سے اہم۔

پیار' محبت کے راستے پر چلنے کو فضولیات اور مصیبت کہنے اور سمجھنے کے باوجود اگر میں اس راستے پر قدم رکھ رہا تھا' تو یہ شرمندگی یا پریشانی والی بات نہیں تھی' پریشانی والی بات تو میرے لیے یہ تھی کہ یہ محبت کا مرض لگنا ہی تھا تو پھر کسی اور سے ہی محبت ہو جاتی نا۔۔۔ عزیز دوست کی بہن سے کیوں؟

مجھے لگنے لگا کہ میں بہت گھٹیا حرکت کا مرتکب ہوا ہوں۔ اپنی دوست کی بہن کے بارے میں سوچتا' دل میں اس کے لیے جذبات کا پیدا ہونا۔۔۔ مجھے کسی جرم کا سا احساس ہوتا۔

میں کئی دن تک اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس چہرے کو بھلانا چاہتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی' لیکن مرض بڑھتا گیا' جوں جوں دوا کی۔

میری دوسری پریشانی یہ تھی کہ میں عاقب سے ہر بات شیئر کرتا تھا اور یہ محبت ہونے والی بات تو میں سب سے پہلے اسی کو بتاتا' لیکن اب تو اس سے چھپانا پڑ رہا تھا۔ اگر بتاتا' تو وہ پھر یہ بھی پوچھتا کہ وہ کون ہے۔ اور اس نے تو ایک دفعہ پوچھا بھی تھا۔

"یار باذل! کیا ہوتا جا رہا ہے تجھے؟ یہ تیرا کھویا کھویا رہنا' مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ذہن کا کہیں اور ہونا یہ ساری علامتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ تجھے پیار وغیرہ ہو گیا ہے' کہیں چیٹنگ کرتے کرتے بات آگے تو نہیں بڑھ گئی؟"

"پیار؟ نہیں تو! ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں گھبرا کر بولا تو اس پر وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

"او بھائی! یہ محبت کے نام پر تو اتنا پریشان کیوں ہو گیا ہے' ٹھیک ہے کہ تو کہتا تھا تجھے محبت وغیرہ کا کچھ پتا نہیں' مجھے ان چکروں میں پڑنا ہی نہیں' مگر اب ایسا کچھ ہو گیا ہے تو اتنی بری بات بھی نہیں' محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں۔"

"ہاں عاقب! محبت کرنا کوئی جرم نہیں' لیکن اگر میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں نے تمہاری بہن سے محبت کر لی ہے تو پھر شاید تم میری محبت کو جرم ہی سمجھو۔" میں سوچ کر رہ گیا۔

"یار! تو کیا فضول باتیں لے بیٹھا ہے' میں تو بس کوئی کام شروع کرنے کا سوچتا رہتا ہوں۔"

میں نے جلدی سے بات ٹالی اور پھر اس سے پوچھنے لگا کہ میرے لیے کون سا کام سب سے بہتر رہے گا۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور محبت پر بات کرتا رہا تو جس طرح اسے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ میں دل ہار بیٹھا ہوں تو وہ یہ بھی جان جائے گا کہ کس کے آگے ہار بیٹھا ہوں۔

ویسے یہ پہلی نظر کی محبت بھی کتنی عجیب چیز ہے اور میں تو اب تک اسے جھوٹ ہی سمجھتا آیا تھا۔ جب کسی فلم یا کسی ڈرامے میں یہ دیکھتا یا کسی سے سنتا تو ہمیشہ مذاق ہی اڑاتا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کو دیکھا اور دیکھتے ہی وہ ایسا بھایا کہ ہمیشہ کے ساتھ کی خواہش پیدا ہو گئی اور وہ ساری دنیا سے زیادہ اچھا لگنے لگا' مگر جب خود پر بیتی تو فلمی کہانیاں بھی سچی لگنے لگیں۔

مجھے یہ سب اچھا لگنے لگا اور محبت کے خلاف اپنی ہی کہی گئی باتیں غلط لگنے لگیں' لیکن ساتھ پھر وہی خلش کہ۔۔۔ وہ عاقب کی بہن ہے۔

میں نے اس کو بھلانے کی کوشش میں بزنس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا اور اس سلسلے میں جب ابو سے بات کی تو ان کا پھر وہی جواب۔ "جب میں آؤں گا تو پھر اس پر سوچیں گے۔"

میں نے آنکھیں بند کیے لیٹے رہنے کا کام بھی چھوڑ دیا' لیکن جب رات گئے سونے کے لیے لیٹتا تو آنکھیں بند کرتے ہی پھر وہی چہرہ سامنے آ جاتا ہے۔

میں اسے بھلانے کی کوشش کرتا رہا اور دل ملنے کی تڑپ بڑھاتا رہا۔ میں نے دل کو بہت سمجھایا' لیکن وہ ضدی ایک ہی راگ الاپتا رہا۔

مجھے ہر کام سے پہلے
سحر سے شام سے پہلے
یہی اک کام کرتا ہے
اسی کا نام لیتا ہے
اسی کو یاد کرتا ہے

اور پھر میں اس ضدی دل کے ہاتھوں ہار گیا۔ میں نے اس کو ایک بار پھر سے دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے' کچھ کہنے کے لیے مجھے اس کے گھر ہی جانا تھا اور وقت بھی وہ منتخب کرتا تھا' جب عاقب گھر پر نہ ہوتا۔ عاقب کی غیر موجودگی میں یوں اس طرح اس کے گھر جانا مجھے برا بھی بہت لگا' لیکن کیا کرتا' اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں شرمندہ سا' کچھ کچھ پریشان سا اس وقت عاقب کے گھر کی طرف روانہ ہوا' جب وہ اپنے نیٹ کیفے میں' انکل آفس میں اور چھوٹی بہن کالج گئی ہوتی ہے۔ گھر میں صرف آنٹی اور وہ یعنی زونیرا تھیں۔

اس کا نام زونیرا ہے' یہ بھی مجھے اسی دن اسپتال میں ہی معلوم ہوا تھا کہ عاقب اسے چپ کراتے ہوئے اس کا نام لے رہا تھا۔ اس سے پہلے تو میں صرف یہی جانتا تھا کہ عاقب کی دو بہنیں ہیں۔ ان کے نام نہ میں جانتا تھا اور نہ ہی ایسی کوئی دلچسپی تھی۔

اگرچہ ہماری دوستی اب تو کافی پرانی ہو چکی ہے۔ کالج کے چار سال اور پھر ایم اے بھی اکٹھے کیا۔ اس کے بعد شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو' جب ہم نہ ملے ہوں۔ کالج کے زمانے میں عاقب اکثر میرے گھر آیا کرتا تھا اور ہم مل کر نوٹس بناتے تھے۔ اس کے گھر کے اندر البتہ میں شاید دو' تین مرتبہ ہی گیا تھا۔ اسے

بلانے کے لیے کبھی جانا ہوتا تو دروازے تک ہی محدود رہتا۔ عاقب کی بہنوں کو میں نے دیکھا تو تھا' مگر جب وہ اسکول میں پڑھتی تھیں۔ اس کے بعد شاید کبھی نظر پڑی ہو' مجھے یاد نہیں' جیسا کہ میری عادت یا یوں کہہ لیں' میری فطرت میں ہی یہ بات نہیں کہ میں لڑکیوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھوں۔ لیکن اب یہ کیسی نظر پڑی کہ ساری کہانی ہی بدل گئی۔

کال بیل دبانے سے پہلے بھی یہی خیال آیا' کاش! ایسا نہ ہوتا' اور پھر اگلے ہی لمحے میں یہ دعا بھی کر رہا تھا کہ دروازہ زونیرا ہی کھولے۔

یہ دل بھی بڑی عجیب چیز ہے' جو اس کی نہ مانے اسے تو بے سکون کرتا ہی ہے اور جو مان لے' اسے بھی پاگل کر دیتا ہے۔ مجھے بھی اپنا آپ کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔

میرے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ ہو سکتا ہے' دوبارہ دیکھنے پر شاید' وہ جو اندر تصویر چسپکی ہوئی ہے' وہ مٹ جائے۔ شاید' دوبارہ دیکھنے پر وہ مجھے اتنی اچھی نہ لگے۔ شاید' وہ وقتی جذبہ ہی ہو۔ مگر ہوا یہ کہ جب وہ میرے سامنے آئی تو۔۔۔ میں پھر سے بے اختیار ہو گیا۔ میں یک ٹک اسے یوں دیکھنے لگا جیسے عرصے بعد پیاسی آنکھوں کو میراب کر رہا ہوں۔

اس نے شاید کچھ کہا بھی تھا' لیکن مجھے اس کے صرف لب ہلتے نظر آئے۔ ہوش تو تب آیا' جب پاس سے زوردار آواز کے ساتھ ایک رکشا گزرا اور ہوش آنے پر میں نے اسے کہتے سنا۔

"باذل بھائی! کیا ہوا' آپ اتنے پریشان کیوں ہیں۔ سب خیریت تو ہے نا؟" وہ کافی پریشان نظر آرہی تھی۔

"ہاں۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ وہ میں۔۔۔ عاقب گھر پر نہیں ہے کیا؟"

، اس کے اتنی پریشانی کے ساتھ باذل بھائی کہنے پر میرا رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو گیا اور جب میں نے عاقب کا پوچھا تو وہ پھر حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ "آپ کو پتا ہے وہ اس وقت گھر پر نہیں ہوتے۔"

اور میں جو یہ بھی سوچ کر گیا تھا کہ اگر زونیرا سے ملاقات ہو گئی تو میں اسے کہوں گا کہ اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے اور اس کے لیے میں اسے فون کروں گا' لیکن ہوا یہ کہ عاقب کا پوچھنے کے بعد میں وہاں رکا ہی نہیں۔ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔

سارے رستے اور پھر گھر آکر بھی اپنے دل کو کوستا رہا کہ اس نے کیوں مجھے اس راہ ڈالا۔ کیوں مجھے اس طرح خوار کر رہا ہے۔۔۔ لیکن دل تو مسکرا رہا تھا کہ میرا احتجاجی لہجہ کافی کمزور تھا اور کچھ ہی دیر بعد مجھے محسوس ہوا۔ اب دل کو الزام دینا فضول ہے کیونکہ میں پورا کا پورا اسی کے رنگ میں رنگ چکا ہوں۔

پہلے وہ اداس سا روپ اور اب وہ سادہ سا' نکھرا نکھرا' کھلا کھلا چہرہ۔۔۔ میں مسکراتا ہوا بیڈ پر گر گیا۔

تمہارا نام لیتا ہے
تمہیں کو یاد کرتا ہے
یہی اک کام کرتا ہے

میں سارا دن اسے فون کرنے کے بارے میں سوچتا رہا۔ واپسی کا راستہ تو بند ہو چکا تھا اب مجھے آگے ہی بڑھنا تھا۔۔۔ اور پھر اگلا قدم بھی میں نے اٹھا ہی لیا۔

دوسرے دن اس وقت میں نے فون کیا جب یقین تھا کہ فون وہ ہی اٹھائے گی۔

"ہیلو۔۔۔ میں باذل علی۔۔۔ وہ میں۔۔۔ عاقب ہے؟"

"آپ نے کل بھی اسی وقت بھائی کا پوچھا تھا' کیا آپ کا بھائی سے اب ملنا جلنا نہیں رہا؟"

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔ میں نے آپ سے ہی بات کرنی تھی۔ کچھ کہنا تھا آپ سے۔"

"جی مجھ سے! کیا؟"

"نہیں آپ سے۔۔۔ دیکھیں! آپ مجھے غلط مت سمجھیے گا' آپ شاید میرے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتی ہی ہیں میں کوئی برا لڑکا ہرگز نہیں ہوں۔"

"جی ہاں میں جانتی ہوں آپ کو اور میں ہرگز آپ کو برا نہیں سمجھتی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے' میرا کہنے کا مطلب تھا کہ میری بات سننے کے بعد بھی پلیز اپنی رائے مت بدلیے گا۔ میں۔۔۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے' جب سے آپ کو' اس دن اسپتال میں دیکھا تو اس وقت سے ہی آپ مجھے۔۔۔ میں نے خود کو بہت روکا' لیکن۔۔۔ پلیز! مجھے غلط مت سمجھیے گا۔ میں فلرٹ نہیں ہوں' بلکہ میں نے تو کبھی کسی لڑکی کو غلط نظر سے دیکھا' نہ کسی کے متعلق کبھی کچھ سوچا' لیکن اب مجھے لگتا ہے۔۔۔ آپ ہی وہ لڑکی ہیں جسے مجھے اپنی زندگی کا ساتھی بنانا ہے۔ میں آپ کو۔۔۔ بہت پسند کرنے لگا ہوں' میں آپ سے بہت۔۔۔"

اور یوں شروع میں کچھ گھبراہٹ لیے اٹکتے ہوئے بات کرنے کے بعد اتنی روانی کے ساتھ میں نے حال دل سنایا کہ بعد میں کتنی ہی دیر میں خود اپنی ہمت پر حیران بھی ہوتا رہا اور خوش بھی۔

میں نے اس کا جواب سنے بغیر یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا کہ کل بات کروں گا' کیونکہ اپنی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اندازہ تھا کہ وہ بھی اس وقت کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہ ہو گی' پھر فوری جواب تو میں لینا بھی نہ چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں زونیرا الحسن۔۔۔ گریجویشن مکمل ہونے کے بعد میری شادی گھر میں سب سے اہم موضوع ہے۔ ابو کو بہت جلدی تھی میری شادی کی' کیونکہ ان کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سے پہلے کہ میری صحت میرا ساتھ بالکل چھوڑ جائے میں چاہتا ہوں بیٹی کی شادی کا فریضہ خوش اسلوبی سے انجام پا جائے۔ جبکہ میں چاہتی تھی پہلے بھائی کی شادی ہو' وہ بڑے ہیں۔ لیکن میری بات کو کوئی اہمیت ہی نہ دی گئی چنانچہ مجھے راضی ہونا پڑا۔ اگرچہ مجھے راضی ہونے کے لیے کسی نے کہا تو نہیں تھا' لیکن میرے نزدیک تو میری رضا کی اہمیت تھی نا' اس لیے میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو شادی کے لیے راضی کیا۔

اب رہ گئی یہ بات کہ شادی کہاں ہونی چاہیے' کس بندے کو میری زندگی کا ساتھی منتخب کیا جاتا ہے تو یہ کام بھی حسب روایت امی' ابو کو بالا بالا ہی طے کرنا تھا اور مجھے اس بات کے لیے ایک بار پھر خود کو راضی کرنا پڑا۔ ویسے تو میں نے اس سلسلے میں کبھی کچھ سوچا ہی نہ تھا کہ وہ کون ہو گا' کیسا ہو گا وغیرہ وغیرہ' سوائے اس بات کے کہ وہ جو بھی ہو میرے لیے بہت اچھا ہو۔ ویسے مجھے یقین تھا میرے والدین میرے لیے بہت اچھا فیصلہ ہی کریں گے' اسی لیے میں مطمئن' بے فکر اور پرسکون تھی' لیکن پھر۔۔۔

باذل علی' جسے میں اپنے بھائی عاقب کے دوست کی حیثیت سے کافی عرصے سے جانتی ہوں نے مجھے فون کر کے کہا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگا ہے اور میری محبت میں وہ بہت آگے بڑھ چکا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ سب سن کر میں حیران رہ گئی کہ میری تو کبھی اس سے کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی تو پھر اسے یہ محبت کیسے ہو گئی۔ وہ کہہ رہا تھا اس نے اسپتال میں مجھے باقاعدہ طور پر دیکھا تھا پہلی بار اور بس دیکھتے ہی۔۔۔

پھر اس نے میرا جواب مانگے بغیر ہی فون بند کر دیا' شاید جانتا تھا' میری حالت کیا ہو گی۔

میں کتنی ہی دیر وہیں ساکت پریشان بیٹھی رہی اور اس کی باتیں میرے اردگرد گونجتی رہیں' پھر رات تک میری پریشانی خوشگوار حیرانی میں بدل چکی تھی۔

باذل علی کا فون آنے سے کچھ دن پہلے ہی تو میں نے اس کا بغور جائزہ لیا تھا۔ میں اور امی کہیں جا رہے تھے کہ وہ بھی سامنے سے آتا نظر آیا اور سر جھکائے پاس سے گزر گیا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ اپنے نام کی طرح اس کی شخصیت بھی کتنی منفرد ہے۔

اب وہ منفرد و ہر دلعزیز نوجوان میرے لیے دیوانہ ہو رہا ہے۔ اس بات نے میرے اندر ایک عجیب سی سرشاری بھر دی کہ مجھ میں کچھ ایسی خاص بات تو ہے کہ وہ بندہ جس کے دل کی دھڑکن کبھی کسی لڑکی کو دیکھ کر بے ترتیب نہ ہوئی' مجھے ایک مرتبہ دیکھنے سے ہی اپنے آپ پر سے اختیار کھو بیٹھا۔

یہ چاہے جانے کا احساس بھی کتنا خوش کن ہے۔

رات کے آخری پہر جب میری آنکھیں تھک کر خود ہی بند ہونے لگیں اس وقت تک میں فیصلہ کر چکی تھی کہ باذل علی سے زیادہ اچھا اور کوئی نہیں میرے لیے۔

☼ ☼ ☼

یوں ہر دوسرے تیسرے دن میری زونیرا سے فون پر بات ہونے لگی۔ میں نے اس سے جواب نہ مانگا تھا کہ اس سلسلے کے شروع ہو جانے کا مطلب یہی تھا' اس کو میں اور میری محبت بری نہ لگی تھی' میں بہت خوش تھا' لیکن ساتھ ہی ایک پریشانی کی بات بھی تھی۔ مجھے امی کو زونیرا کا رشتہ مانگنے کے لیے جلد بھیجنا تھا زونیرا نے بتایا تھا' اس کے گھر آج کل سب سے اہم موضوع اور کام جلد از جلد اس کی شادی کرنے کا ہی ہے۔

میں نے زونیرا سے تو کہہ دیا تھا کہ میں جلد امی کو اس کے گھر بھیجوں گا' لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امی سے یہ بات کیسے کروں۔ پھر میں نے اپنی بہن نازش کو ساری بات بتائی' کیونکہ بہنوں کو ایسی باتیں بتانا آسان ہوتا ہے اور یہ یقین بھی ہوتا ہے کہ وہ مشکل کو حل کرنے میں مدد بھی کریں گی اور میری مشکل یہ تھی کہ میں چاہتا تھا پہلے دونوں گھروں کی ایک' دو ملاقاتیں ہو جائیں۔ امی' زونیرا سے مل کر پھر اپنے طور پر رشتہ مانگیں۔ میری یہ بات سن کر نازش کہنے لگی۔

"بھائی! آپ لو میرج کو ارینج ظاہر کرنا چاہتے ہیں' میں اس کو آپ کی چالاکی کہوں یا شرمیلا پن؟"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں تو یہ سب عاقب کی وجہ سے کر رہا تھا کہ اب وہ اکثر مجھ سے یہ کہتا تھا۔ "تجھے محبت کا مرض لگ چکا ہے۔"

اب اچانک امی اس کے گھر جا کر رشتے کی بات کرتیں تو اسے یقین ہو جاتا کہ میں نے ہی امی کو بھیجا ہے اور میں نہیں چاہتا تھا' اسے یہ سب معلوم ہو جائے۔

"کتنا گمبھیر مسئلہ بنا دیا ہے آپ نے ایک آسان سی بات کو۔" نازش نے کہا۔ وہ زونیرا کو اچھی طرح جانتی تھی اور اسے میری پسند اچھی لگی تھی اور اس کا خیال تھا امی کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا' لیکن پھر میرے اصرار پر اس نے ایک ترکیب نکال ہی لی۔

"بھائی! میں گھر میں میلاد کروا لیتی ہوں۔ ثواب کا ثواب اور آپ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور زونیرا کو بھی آنے کی خوب تاکید کروں گی۔"

نازش! جس کو میں ابھی چھوٹی سی گڑیا سمجھتا تھا' اس نے اتنے اچھے طریقے سے میرا مسئلہ حل کر دیا کہ میں حیران رہ گیا۔ میلاد کے بعد امی کے ساتھ زونیرا کے گھر کا ایک اور چکر بھی لگا لیا اور اپنے طور پر امی سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ زونیرا کو اپنی بھابھی بنانا چاہتی ہے' پھر امی کے سامنے میری رائے بھی لے لی۔ اور امی بھی جلدی راضی ہو گئیں کیونکہ انہوں نے زونیرا کے نام پر میری آنکھوں میں چمکتے جگنو دیکھ لیے تھے۔ بھلا ماؤں سے ایسی باتیں کہاں چھپ سکتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

میں بہت خوش تھا سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔ مجھے اس پیار بھرے رستے پر چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے ہنسی بھی آتی تھی اس وقت کو سوچ کر' جب میں پہلا قدم اٹھاتے ہوئے بے انتہا گھبرایا ہوا تھا۔ میں اپنے دل کا بے حد مشکور تھا۔ اسے شاباش دیتا کہ اس نے مجھے پیچھے ہٹنے نہیں دیا۔

زونیرا نے ابھی تک باقاعدہ اظہار محبت تو نہیں کیا تھا اور نہ ہی میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا' لیکن مجھے اس کی باتوں سے' اس کے لہجے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ بہت نہ سہی' کچھ نہ کچھ محبت تو وہ بھی مجھ سے کرنے لگی ہے' ابھی چنگاری ہے تو کل آگ بھی لگ ہی جائے گی۔

ہماری جب بھی بات ہوتی تو زیادہ تر اختتام اسی بات پر ہوتا کہ مجھے جلد اپنے گھر والوں کو اس کے گھر رشتہ کے لیے بھیجنا چاہیے کہ اس کے گھر میں آئے روز کسی نہ کسی رشتے کی بات چل رہی ہوتی ہے۔ میں بھی جلد کچھ کرنے کا وعدہ تو کرتا' لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ امی تو آسانی سے راضی ہو گئی تھیں' دیر ابو کی وجہ سے ہو رہی تھی کہ ان ہی دنوں ابو نے آنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ اب جب ابو آ ہی رہے تھے تو یہی مناسب سمجھا گیا کہ ان کے آنے پر ہی یہ کام ہو اور صرف دس دن ہی تو تھے ان کے آنے میں۔

اور ان ہی دس دنوں میں وہ ہو گیا جس کا میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ جب یہ یقین پختہ ہو گیا تھا کہ چند دنوں کے بعد زونیرا ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی' اس وقت اس نے اطلاع دی کہ اس کا نام کسی اور کے ساتھ جڑ گیا ہے اور اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا جو کرنا ہے جلد کرنا' لیکن تم نے میری بات کو اہمیت نہ دی۔ اب ابو نے کسی اور کو ہاں کہہ دی ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

اس دن پہلی مرتبہ زونیرا نے خود سے فون کیا تھا اور آنسوؤں کی نمی لیے صرف اتنی بات کی اور فون بند کر دیا اور اس وقت مجھے پتا چلا آنکھوں کے آگے اندھیرا کیسے چھاتا ہے۔ پیروں کے نیچے سے زمین کا ہٹنا کسے کہتے ہیں۔

میں کچھ دیر تو گم صم سا بیٹھا رہا' پھر خیال آیا کہیں زونیرا نے مذاق نہ کیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی دل کو کچھ سنبھالا ہوا اور میں نے فوراً فون ملایا' لیکن فون انگیج جا رہا تھا اور جب کافی کوشش کرنے پر بھی فون انگیج ہی ملا تو پریشانی پھر سے بڑھ گئی۔ وہ سارا دن یوں ہی پریشانی میں گزر گیا۔ اگلے دن اس سے بات تو ہو گئی' لیکن ساری بات ختم بھی ہو گئی۔

جس طرح میری محبت کی کہانی اچانک شروع ہوئی تھی' ویسے ہی اچانک ختم ہوتی نظر آئی۔ میں نے اسے بہت کہا میں آج ہی اس کے گھر امی کو بھیج دیتا ہوں کہ ابھی تو اس نے انگوٹھی بھی نہیں پہنی تھی' لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ اپنے ابو کو انکار نہیں کر سکتی۔ ان کی طبیعت پہلے ہی خراب رہتی ہے اور اب تو دو' تین دن میں نہ صرف اس کی منگنی ہو جائے گی بلکہ ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی طے ہو جائے گی۔ اس نے روتے ہوئے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ اب میں اسے کبھی فون نہ کروں۔

اور میں کتنی ہی دیر وہیں بیٹھا اپنے آنسو اپنے اندر گراتا رہا۔ نازش کو پتا چلا تو اس نے امی کو بھی سب کچھ بتا دیا اور پھر دونوں تیار ہو گئیں زونیرا کے گھر جانے کو' لیکن میں نے ان کو سختی سے منع کر دیا کہ زونیرا نے سختی سے منع کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

امی نے جب مجھے بتایا کہ ابو نے رشتہ طے کر دیا ہے اور دو' تین دن تک وہ لوگ آئیں گے انگوٹھی پہنانے اور تاریخ طے کرنے تو پہلے تو مجھے یقین ہی نہ آیا' مگر جب دوبارہ پوچھنے پر امی نے بتایا کہ ایسا ہی ہونے جا رہا ہے تو ایک بار تو میں چکرا ہی گئی۔

"امی! اتنی جلدی... اور آپ نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔" میں بمشکل یہی کہہ پائی۔ میں باذل کو تو جلدی کچھ کرنے کا کہتی رہتی تھی' مگر میرے ابو بھی اتنی جلدی کچھ کر جائیں گے اس کا اندازہ مجھے نہ تھا۔

"پسند تو وہ لوگ تمہیں پہلے ہی کر گئے تھے۔ روز فون کر کے جواب مانگ رہے تھے۔ بس تمہارے ابو کو تو ویسے ہی تمہاری شادی کی جلدی تھی' ان کو کہہ دیا کہ آ کر تاریخ پکی کر جاؤ' پتا نہیں ان کو کیا ہو گیا ہے۔ اس دل کی بیماری نے تو ان کو کچھ زیادہ ہی پریشان کر دیا ہے' لیکن تم پریشان نہ ہو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

امی تو مجھے دلاسے دے کر چلی گئیں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ میں اتنی جلدی شادی کا سن کر پریشان ہوں اور مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی ان کو یہ بتانے کی کہ میں کسی کو پسند کرنے لگی ہوں اور اسی سے ہی شادی کرنا چاہتی ہوں پھر یہ ڈر بھی تھا کہیں میرے اس جواب سے ابو کو غصہ نہ آ جائے' ان کی طبیعت پھر سے نہ خراب ہو جائے۔ پھر میں نے ساری رات رونے اور سوچنے کے بعد باذل کو ہی انکار کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا کیا حال ہوگا' لیکن میرے بس میں کچھ تھا ہی نہیں۔

☼ ☼ ☼

میں تین‘ چار دن گھر پر ہی پڑا رہا‘ طبیعت بھی خراب اور کچھ سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ یہ میرے ساتھ ہوا کیا۔ میں پھر سے اپنے دل کو کوسنے لگا کہ اس نے مجھے اس راہ پر کیوں لگایا تھا۔ میں تو اتنے مزے کی پرسکون زندگی گزار رہا تھا اور اب۔۔۔

عاقب اسی رات کو میرے گھر پہنچ گیا تھا‘ جب میں سارا دن اس کو نہ ملا۔ بعد میں بھی آتا رہا۔ وہ حیران تھا کہ پہلے تو میں کبھی اتنا بیمار نہ ہوا تھا اتنی اچھی صحت تھی‘ اب اچانک سے کیا ہو گیا‘ اور پھر جب میرا حال دیکھ کر امی بھی پریشان ہونے لگیں تو مجھے خود کو ٹھیک کرنا ہی پڑا۔

”یار! اب تو جلدی سے بالکل ٹھیک ہو جا۔ بہن کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے‘ ایک مہینے بعد کی ایک تو میرے اپنے کام کی مصروفیت اور اب شادی کے اتنے بکھیڑے‘ مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔“

”تو اتنی جلدی کیوں کی‘ دو‘ تین مہینے ٹھہر جاتے‘ اچھی طرح ان لوگوں کو جانچ لیتے۔“ میں ایکدم بولا۔ عاقب خود بھی پریشان تھا‘ اس نے میرے لہجے کو نوٹ نہ کیا۔ کہنے لگا کہ ”یہی بات میں نے بھی کہی تھی‘ لیکن ابو چونکہ ریٹائر ہونے والے ہیں اس لیے یہ فریضہ وہ ریٹائرمنٹ سے پہلے ادا کرنا چاہتے ہیں اور پھر جب سے ان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے تو وہ زیادہ ہی جلدی جلدی کا کہنے لگ گئے ہیں۔ زونیرا بھی اتنی جلدی شادی کا سن کر پریشان ہو گئی ہے۔“

زونیرا کے ذکر پر میرا دل زور سے دھڑکا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں گا اور یہی بتانے میں عاقب کے پاس آیا تھا کہ میں کل اپنے ماموں کے پاس پنڈی جا رہا ہوں‘ لیکن اس نے مجھے یہ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور شادی کے انتظامات کی بہت سی ذمہ داریاں مجھے سونپ دیں۔ میں تو شادی میں ہی نہیں جانا چاہتا تھا مگر اب زونیرا کو کسی اور کے حوالے کرنے میں حصہ لینا پڑ رہا تھا‘ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے آپ کو کیسے اتنا مضبوط کروں۔

☼ ☼ ☼

”بھائی صاحب! بارات کی روانگی کا وقت تو کب کا ہو چکا مگر یہ دولہا میاں نظر نہیں آرہے۔“

”میں تو خود پریشان ہوں‘ دس منٹ کا کہہ کر گیا تھا اور اب گھنٹہ ہونے والا ہے۔“

”فون کرنا تھا یا کسی کو پیچھے بھیجنا تھا‘ پتا کرو گیا ہو گا نا کہاں جا رہا ہے۔“

”بازار جانے کا کہہ رہا تھا‘ اس کے ماموں کا بیٹا ساتھ ہی گیا ہے۔“ باپ اس کو فون کرنے ہی لگا تھا ایک طرف سے شور اٹھا۔

”ہائے‘ یہ کیا ہوا حامد بیٹا! یہ پٹیاں ہائے۔۔۔ کہاں سے اتنی چوٹیں لگوا آئے۔“ دولہا کی ماں اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

”دولہا زخمی ہو گیا‘ ایکسیڈنٹ ہو گیا۔“ ہر طرف شور مچ گیا تھا۔

”اماں! پریشان نہ ہوں‘ ٹھیک ہوں میں‘ شکر کریں بچ گیا۔ سامنے سے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ بس آرہی تھی‘ اس سے بچتے بچتے موٹر سائیکل پھسل گئی۔“

”ہائے! یہ تو بہت برا ہوا شادی کے دن حادثہ! بہت ہی برا شگون ہے‘ یہ سب بغیر کسی وجہ کے تو نہیں ہوا‘ نحوست ہے نحوست۔“ پھوپھی کی آواز گونجی۔

”آپا! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“

”ارے! میں سچ کہہ رہی ہوں‘ یہی حقیقت ہے‘ وہ لڑکی منحوس ہے۔ سامنے سے بس نہیں‘ اس کی نحوست آرہی تھی۔ توبہ! شادی سے پہلے یہ حال ہے‘ بعد میں نہ جانے کیا گل کھلائے گی منحوس۔“

”پھوپھی! خدا کا واسطہ‘ مت کریں ایسی جاہلوں والی باتیں۔ یہ ایک حادثہ تھا اور بس۔“ دولہا چلایا۔

”بیٹا! نہ مانو۔ میں تو وہی کہوں گی جو حقیقت ہے۔ بھابھی! یاد نہیں آپ کو جس دن یہ رشتہ آپ طے کر کے آئی تھیں‘ اسی دن آپ چکرا کر گر پڑی تھیں‘ اور تو اور سنا ہے اس لڑکی کے باپ کو بھی دل کا دورہ پڑا ہے۔ مانیں نہ مانیں لیکن یہ سارا اس کی نحوست کا چکر ہے۔“

”نہیں بھئی! چکر تو اس بات کے دوسرے دن آیا تھا‘ ناشتا ٹھیک سے نہیں کیا تھا‘ شوگر کم ہو گئی تھی۔“

”بھابھی! وجہ تو کوئی نہ کوئی بنی ہی تھی‘ ورنہ آپ تو سارا دن مٹھائی بانٹتی رہی تھیں‘ لیکن اپنے منہ میں نہ ڈال سکیں۔“

پھوپھی کی دلیلیں بہت سے مہمانوں کے دلوں کو لگ رہی تھیں۔

”بھئی میں تو بارات کے ساتھ نہیں جاؤں گی‘ کیا پتا راستے میں کچھ اور ہو جائے۔“

پھوپھی صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولیں‘ یہ بات کئی دلوں میں خوف پیدا کر گئی۔ ہر کوئی لڑکی کے منحوس ہونے اور نہ ہونے پر تبصرہ کرنے لگا۔ دولہا ایک طرف سر پکڑے بیٹھ گیا اور اس کے ماں‘ باپ لخت جگر کے سر اور بازو پر بندھی پٹیوں کو نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے رشتہ داروں کی باتوں کو ذرا توجہ سے سننے لگے۔

بارات لیٹ ہو رہی تھی‘ لیکن اب اس طرف کسی کا دھیان نہ تھا۔

”بھائی! مان لو میری بات۔۔۔ نہ کرو بیاہ اپنے بیٹے اور گھر کو‘ دیکھو! بیٹے کی حالت‘ سر پر پٹی بازو پر پٹی اور چال میں لنگڑاہٹ‘ کیا اس حال میں اس کی بارات لے کر جائیں گے؟ وہاں تو یہ مذاق بن کر رہ جائے گا‘ پٹیوں میں بندھا دولہا۔“ پھوپھی نے ایک اور تیر چھوڑا۔

”لیکن آپا!“ باپ کو کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔

”چھوڑو لیکن ویکن‘ میں تو کہتی ہوں اگر لڑکی نحوست والی ہوتی تو چاہے بس اوپر چڑھ جاتی‘ حامد کو خراش تک نہ آتی اور پھر یہ بھی تو دیکھو‘ دوسرے لڑکے کو کچھ بھی نہ ہوا‘ اگر تو وہ بھی حامد کے ساتھ ہی تھا‘ وجہ نحوست۔۔۔ جو صرف حامد کے پیچھے لگی تھی۔“

پھوپھی کی یہ دلیل باقی سب کے علاوہ حامد کے ماں‘ باپ کے دل کو بھی لگی۔

”ٹھیک ہے آپا! ہم تمہاری بات مان بھی لیں‘ مگر ادھر وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں اور پھر یہاں گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے‘ کتنے دنوں سے رسمیں ہو رہی ہیں اور اب میں کیسے سب ختم کر دوں۔ اتنا خرچہ بھی ہوا اور شادی بھی نہ ہو‘ رسوائی الگ۔“

”رسوائی کیوں‘ یہاں سب جانتے ہیں رشتہ کیوں توڑا جا رہا ہے اور پھر تم لوگ تو شکر کرو پہلے ہی پتا چل گیا‘ اگر شادی کے بعد پتا چلتا کہ لڑکی منحوس ہے تو پھر! اور رہی تیری یہ پریشانی کہ اتنا خرچہ بھی ہوا اور شادی بھی نہ ہو تو میرے پیارے بھائی! آخر مشکل وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں۔ میں تیری مدد کرنے کو‘ تجھے رسوا ہونے سے بچانے کو حاضر ہوں اور پھر میری شکیلہ تو اس لڑکی سے زیادہ خوب صورت‘ سمجھ دار اور پھر سب سے بڑھ کر تیری اپنی ہے۔“

اتنے عرصے سے ناکام کوششوں کے بعد بھی پھوپھی یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھیں۔

پھر کچھ ہی دیر بعد پھوپھی اپنی بیٹی کو دلہن بنانے کی تیاریاں کرنے لگیں‘ دولہے کے غصے اور ناراضی کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ تھا۔ منحوس زونیرا کی جگہ بختوں والی شکیلہ نے لے لی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر کب سے آئی بیٹھی تھی‘ لیکن ابھی تک بارات پہنچنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ میری سب کزنز اور دوست میرے گرد بیٹھی مجھے تنگ کر رہی تھیں‘ لیکن ان کی یہ چھیڑ چھاڑ میرے اندر کوئی ہلچل نہ پیدا کر سکی۔ مجھے تو ان کی یہ بات بھی بہت بری لگ رہی تھی کہ مجھ پر بہت روپ آیا ہے۔

کہتے ہیں جس کو مہندی کا رنگ گہرا چڑھے اس کو سسرال میں بہت پیار ملتا ہے اور میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی‘ جہاں سے مجھے بہت سا پیار ملنا تھا‘ وہاں تو میں نے جانا ہی نہیں تو پھر مہندی نے میرے ہاتھوں پر اتنا گہرا رنگ کیوں چھوڑا‘ شاید مہندی ہی رنگ والی تھی۔

میں اپنی ہی سوچوں میں گم سر جھکائے بیٹھی تھی کہ

اچانک میرے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی ساری لڑکیاں اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ شاید بارات آگئی۔ میں نے سوچا۔ دل زور سے دھڑکا اور آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد کئی پریشان آوازیں مجھ تک پہنچنے لگیں۔

"بارات نہیں آئے گی۔۔۔ انکار ہو گیا۔۔۔ دولہا کا حادثہ ہو گیا۔۔۔ ذمہ دار لڑکی ہے' وہ منحوس ہے۔۔۔"

باہر شور مچا تھا اور میں اندر اکیلی بیٹھی تھی۔ دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔ میں اس شادی سے خوش نہ تھی' آج کے دن سے پہلے کتنی ہی بار میں نے دعا کی تھی' اس شادی کے نہ ہونے کی اور اب جب سب ختم ہونے کا سنا تو مجھے تو خوش ہونا چاہیے تھا' لیکن کیسی خوشی! میں تو منحوس قرار دی گئی تھی۔ رشتہ ختم ہوا تو ساتھ رسوائی بھی ملی تھی۔

"ہائے ہائے لڑکی پر تو داغ لگ گیا۔" ایک تیز آواز میرے کانوں تک پہنچی تو میرے دل سے مرنے کی دعا نکلی۔

کچھ دیر بعد جب میں اپنی چوڑیاں اتارنے ہی لگی تو سمیرا بھاگی بھاگی آئی اور آتے ہی خوشی سے میرے گلے لگ گئی۔ میں اس کی خوشی پر حیران ہو رہی تھی پھر اس نے میرے کان میں جو بات کہی تو میں کتنی ہی دیر بے یقینی سے اس کو دیکھتی رہی۔

"آپی! میری بات کا یقین نہیں آرہا نا' اب قاضی صاحب آکر آپ کو یقین دلائیں گے' جب وہ آکر آپ سے پوچھیں گے زونیرا بی بی! آپ کو باذل علی قبول ہیں؟" سمیرا کھلکھلائی۔

وہ میری محبت کے بارے میں جانتی تھی اور میری اس شادی پر وہ بھی دل سے خوش نہ تھی۔ میری نظر بے اختیار ہی اپنی مہندی کی طرف چلی گئی۔ میں منحوس نہیں' بہت خوش قسمت ہوں' میں سوچ کر مسکرائی۔

ساری لڑکیاں پھر سے میرے گرد گھیرا ڈالے بیٹھ گئی تھیں۔ پہلے میں نے ان سے اپنے غم کو چھپانے کے لیے سر جھکائے رکھا تھا اور اب خوشی سے دمکتے چہرے کو چھپانا تھا' وہ یقیناً" حیران ہی ہوتیں کہ رشتہ ٹوٹ جانے' منحوس قرار پانے پر یہ اتنی خوش کیوں ہے۔

اب میں باذل علی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوں۔ امی' ابو نے مجھے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا اور ان کے چہروں پر میں نے بہت اطمینان اور خوشی دیکھی تھی۔ غلط سوچ رکھنے والے لوگوں سے تعلق ختم ہونے پر اور بیٹی ایک بہت اچھے گھر کے حوالے کرنے پر انہیں خوش ہی ہونا تھا۔

ابھی نازش مجھے بتا کر گئی ہے کہ بھائی بازار گئے ہیں سرخ گلاب لینے۔ پہلے وہ کمرا سجائیں گے۔ جب تک مجھے یہیں بیٹھنا ہو گا۔ باذل کو یہ بات یاد تھی کہ مجھے سرخ گلاب بہت پسند ہیں' لیکن اب پھولوں کی کیا ضرورت' مجھے تو ویسے ہی ہر طرف گلاب کھلے نظر آرہے ہیں اور ان کی خوشبو بھی محسوس ہو رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

یہ گہری رات میں جگ مگ کرتی روشنیاں کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔ صبح کتنا حبس تھا اور اب کیسی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ سچ ہی کہتے ہیں کہ دل خوش تو دنیا خوش' دل غمگین دنیا غمگین۔

میں بازار جا رہا ہوں سرخ گلاب لینے' بہت سارے سرخ گلاب۔ ایک مرتبہ زونیرا نے مجھے بتایا تھا اسے سرخ گلاب بہت اچھے لگتے ہیں اور اس وقت میں نے سوچا تھا' جب ہماری شادی ہو گی تو میں زونیرا کے لیے کمرے کو سرخ گلابوں سے سجاؤں گا۔ اب اچانک مجھے یہ بات یاد آئی تو میں اس کو بتائے بغیر گلاب لینے نکل پڑا۔ زیادہ نہ سہی' تھوڑا بہت تو کمرے کو سجا ہی لوں گا۔

محبت کے کھو جانے کا زخم جب تازہ تھا تو میری بہت بری حالت تھی۔ امی اور نازش بھی میری وجہ سے پریشان اور دکھی تھیں' پھر مجھے خود کو سنبھالنا ہی پڑا کہ میرے یوں پڑے رہنے سے کچھ تبدیل تو نہ ہو گا۔ لیکن گھر والے ضرور متاثر ہوں گے۔ محبت صرف پالینے کا نام تو نہیں۔ میں اس کو روگ کیوں بناؤں'

محبت کو تماشا کیوں بناؤں۔ میں نے زونیرا کو چاہا اور دل کی گہرائیوں سے چاہا اور اس چاہت کو ہمیشہ رہنا تھا اور جس سے محبت ہو اس کے لیے تو ہمیشہ بہت اچھا سوچا جاتا ہے۔ میں نے ایسی بہت سی باتیں سوچتے ہوئے خود کو مضبوط کیا اور اس کے لیے خوشیوں بھری زندگی کی دعا کی۔

اپنی محبت کو دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر عاقب کا بھی بھرپور ساتھ دیا' لیکن جب شادی کا دن آیا تو میری ساری مضبوطی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ آج میرا دل کر رہا تھا بس کمرا بند کیے پڑا رہوں مگر عاقب کہاں ایسا کرنے دیتا' چاہے میں بیماری کا بہانہ کرتا یا سچ میں طبیعت خراب ہوتی' وہ مجھے آکر گھر سے اٹھا کر لے جاتا۔ اس لیے اس کے ایسا کرنے سے پہلے ہی میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ ابو بھی دو دن پہلے پہنچے تھے' کہا تو انہوں نے دس دن بعد آنے کا تھا' پھر آتے آتے کچھ زیادہ دن ہی ہو گئے۔ عاقب نے بہت اصرار کے ساتھ ان کو شادی کی دعوت دی تھی۔

سب لوگ بارات کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں ایک طرف سب سے الگ کھڑا اپنے دل میں زونیرا سے آخری مرتبہ ملنے کی خواہش کو دبا رہا تھا کہ عاقب پر نظر پڑی جو بے حد پریشان تھا۔ اس کے ابو کو دیکھا تو وہ کرسی پر بیٹھے سینے کو دبا رہے تھے' پھر جس چہرے پر نظر پڑی وہ پریشان ہی دکھائی دیا۔

میں تو اپنے دکھ میں گم تھا' پتا ہی نہ چلا کیا بات ہو گئی ہے اور پھر عاقب نے جو کچھ مجھے بتایا تو مجھے بھی اپنا سر چکراتا محسوس ہوا۔ عین وقت پر انکار کوئی چھوٹی بات تو نہ تھی۔ زونیرا کی شادی کہیں اور ہونے پر میرا دل بہت زیادہ دکھی تھا' لیکن اب وہاں سے رشتہ ٹوٹنے کی خبر پر خوشی کے بجائے غم بڑھا تھا' یہ سوچ کر کہ نہ جانے اندر دلہن بنی زونیرا کا کیا حال ہو گا۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی بات میرے ذہن میں آنہ رہی تھی۔

اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے جو زونیرا کے لیے خوشیوں بھری زندگی کی شوہر اور سسرال سے بہت سا پیار ملنے کی دعا کی تھی' وہ تو قبول بھی ہو چکی تھی' کیونکہ مجھ سے اور میرے گھر سے زیادہ پیار زونیرا کو اور کہیں سے نہ ملنا تھا۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانے' غیب سے مدد آئی تھی میرے لیے یا شاید ہم دونوں کے لیے ہی۔

امی' ابو کے بروقت فیصلے نے روتے چہروں پر خوشی بکھیر دی اور کچھ ہی دیر بعد میں اس اسٹیج پر جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا' زونیرا کے سنگ بیٹھا تھا اور نازش دھڑا دھڑ ہماری تصویریں بنا رہی تھی۔

"بھائی! آپ شادی بھی زونیرا آپی سے کرنا چاہتے تھے اور لو ہونے کے باوجود لو میرج نہیں کرنا چاہتے تھے' اپنے دوست کی وجہ سے۔ دیکھیں! اللہ نے آپ کی کتنی اچھی مدد کی۔"

نازش نے ہنستے ہوئے میرے کان میں کہا تھا۔

اب مجھے خیال آرہا ہے کہ یہ سب میری دعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوا ہے' یا واقعی جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔

آپ کا کیا خیال ہے؟

☼

شکوہ بھی جفا کا کیسے کریں، اک نازک سی دشواری ہے
آغازِ وفا خود ہم نے کیا تھا، پہلی بھول ہماری ہے

دکھ تم کو جب جب پہنچا ہے تو خود ہم نے آنسو پونچھے ہیں
اب دل پہ ہمارے چوٹ لگی ہے اب کے تمہاری باری ہے

بے کھیلے بازی جیت کے بھی تم ہم سے شاکی رہتے ہو
اور ہم کو دیکھو، ہم نے تو خود جان کے بازی ہاری ہے

وہ عہد تھا عیش و جوانی کا اب عمر ہے سعی تلافی کی
پہلے بھی نیند پرائی تھی اور اب بھی شب بیداری ہے

جو کاری زخم لگا ہے دل پر، پہلے اس کی فکر کرو
یہ بعد میں دیکھا جائے گا، یہ کس کی کارگزاری ہے

جو صاحب گھر گھر میری بابت زہر اگلتے پھرتے ہیں
وہ صرف میرے ہمسائے نہیں ہیں، ان سے قرابت داری ہے

اس راہ سے ہو کر گزرے ہیں، کچھ رہبر بھی کچھ رہزن بھی
اب نقشِ قدم پہچان کے چلنا آپ کی ذمہ داری ہے

اقبال عظیم

تبدیلی

فلسطین، کشمیر، بوسنیا
یہ سارے ہمارے اپنے ہیں
کل ان کے دکھ پہ روتے تھے
آج اپنے گھر میں ماتم ہے
یہ قہر جو تم پہ ٹوٹا ہے
یہ سب غیروں کی سازش ہے
اک دھماکے کی گونج میں
کتنے قہقہے دب جاتے ہیں
ماں، جن کا رستہ دیکھے
وہ بیٹے کب گھر جاتے ہیں
بیرونی امداد کے بدلے
ہم نے کیا کیا رہن رکھا ہے
اپنی طاقت، اپنی حرمت
سوچو چند سکوں کے بدلے
کتنے سپنے بیچ دیے ہیں
اس بیرونی مداخلت کے ذریعے
اتنی تبدیلی آئی ہے
کل جو پھول چہرے ہنستے تھے
آج ان کے لبوں پر ہوکیں ہیں
کل جن ہاتھوں میں بستے تھے
آج ان میں بندوقیں ہیں

ام تمامہ

کیسے بتائیں، ہجر کی ساعت کتنی بھاری تھی
تین سو پینسٹھ دنوں سے لمبی رات گزاری تھی

رات اچانک ہی نہیں کچھ پروانے راکھ ہوئے
اصل میں یہ کیفیت ان پر شام سے طاری تھی

ہم نے تو جب بھی ذکر کیا ہے شہر سے جانے کا
ادھر جواب میں لمبی چپ یا گریہ و زاری تھی

کتنے برس تک رات کی انگلی تھام کے پھرا کیے
کبھی نہ اس نے ہاتھ چھڑایا، ایسی یاری تھی

ٹھنڈی میٹھی ایک بھی شام اس در سے ملی نہیں
جلتی جوانی ہم نے جس دہلیز پہ واری تھی

حسن رضا ہم نے تو یہاں کچھ ایسے عمر بتائی
تیغ دو دم پر پاؤں تھے ننگے، سر پر آری تھی

حسن عباس رضا

جب یار نے رختِ سفر باندھا، کب ضبط کا یارا اس دن تھا
ہر درد نے دل کو سہلایا، کیا حال ہمارا اس دن تھا

جب خواب ہوئیں اس کی آنکھیں، جب دھندلا ہوا اس کا چہرہ
ہر اشک ستارہ اس شب تھا، ہر زخم انگارہ اس دن تھا

سب یاروں کے ہوتے سوتے، ہم کس سے گلے مل کے روتے
کب گلیاں اپنی گلیاں تھیں، کب شہر ہمارا اس دن تھا

جب تجھ سے ذرا غافل ٹھہرے، ہر یاد نے دل پر دستک دی
جب لب پہ تمہارا نام نہ تھا، ہر دکھ نے پکارا اس دن تھا

اک تم ہی فراز نہ تھے تنہا اب کے تو بلا کا جب آیا
اک بھیڑ لگی تھی مقتل میں، ہر درد کا مارا اس دن تھا

احمد فراز

ہنسنا منع نہیں / ہنسی کے مسالے

مرتبہ: غلام نبی

تو کیا کرتا....

تانگے اور کار کے حادثے کے بعد تانگے والے نے عدالت میں دعوا کیا کہ اسے کار والے سے تانگا توڑنے، گھوڑے کو مارنے اور اسے زخمی کرنے کا معاوضہ دلایا جائے۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ حادثہ کے بعد تم نے کار کے مالک سے زخمی نہ ہونے کا اعتراف کیا تھا؟" جج نے کہا۔

"میں اعتراف کرنے پر مجبور تھا جناب عالی!"

"تمہیں کس نے مجبور کیا تھا؟" جج نے پوچھا۔

"میں آپ کو تفصیل بتاتا ہوں جی۔" تانگے والے نے کہا۔ جب حادثہ ہوا تو کار والا اپنی گاڑی سے ریوالور لیے نکلا۔ اس نے ایک نظر زخمی گھوڑے پر ڈالی اور بولا۔

"مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔" یہ کہہ کر اس نے تڑتڑ تین فائر کیے اور گھوڑے کو ختم کر دیا۔ پھر اس کے بعد مجھ سے بولا۔

"کیا تم بھی زخمی ہو گئے ہو؟"

"آپ ہی بتائیے جناب عالی! اس خطرناک صورت حال میں اگر میں زخمی نہ ہونے کا اعتراف نہ کرتا تو کیا کرتا؟"

رابعہ۔ کراچی

اصل شکایت

بخدمت جناب اسٹیشن ماسٹر صاحب!

گزارش یہ ہے کہ میرا گھر ریلوے لائن کے قریب واقع ہے۔ رات کے وقت آپ کی جو ریل گاڑیاں میرے گھر کے قریب سے گزرتی ہیں، ان کی وجہ سے ہمارا گھریلو سکون تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ گاڑیاں اس قدر شور کرتی ہیں کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں، بچے خوف سے چیخیں مار کر رونے لگتے ہیں۔

یہ باتیں میری بیوی نے مجھے بتائی ہیں۔ اصل شکایت اسے ہی ہے۔ وہ اس وقت اس بات پر مجھے ڈانٹ ڈپٹ کرنا چاہتی ہے کہ میں اتنے زور، زور سے خراٹے کیوں لے رہا ہوں، مگر ٹرین کے شور اور گڑگڑاہٹ میں اس کی آواز دب کر رہ جاتی ہے۔

نصرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

پریشانی کی بات

- ڈاکٹر! آپ کی ٹانگ کافی سوجی ہوئی ہے، لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

مریض! اگر آپ کی ٹانگ سوجی ہوتی تو میرے لیے بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں ہوتی۔

امتل عزیز شہزاد۔۔۔ کراچی

پسند

☆ تمہیں کون سی اداکارہ پسند ہے؟

☆ رانی مکرجی!

☆ اچھا مجھے بھی بہت پسند ہے اور اداکار کون پسند ہے؟

☆ ارجن رامپال۔

☆ واہ، مجھے بھی ارجن رام پال پسند ہے۔ اچھا تو تمہیں گلوکار کون پسند ہے؟

☆ لتا جی اور پنکج ادھاس۔

☆ واہ بھئی تمہاری اور میری پسند تو بالکل ایک جیسی ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں سیاست دان کون پسند ہے؟

☆ مہاتما گاندھی۔

☆ توبہ توبہ۔۔۔ ارے وہ تو ہندو تھا۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

زبان

سردار جی نے پٹھان سے پوچھا۔

"ہمارے بھگوان جی کی زبان کیوں باہر نکلی ہوتی ہے۔"

پٹھان بولا۔

"پانچ روپے کا ہار اس کے گلے میں ڈال کر پانچ لاکھ مانگو گے تو بے چارے کی زبان ہی باہر آئے گی نا۔"

مزے کرنا

- شرابی کی بیوی نے ایک بار شراب کے گلاس میں سے ایک گھونٹ بھرا، اور فوراً تھوک دیا۔

"توبہ توبہ۔۔۔ تم ایسی بے ہودہ اور گھناؤنی چیز پیتے ہو۔ اسے پی کر تو جی اور خراب ہونے لگتا ہے۔"

"اور تم اس پر بھی کہتی ہو کہ میں مزے کرتا ہوں۔" شوہر فوراً بولا۔

(رضوانہ شکیل رائے۔۔۔ لودھراں)

شکوہ

ایک نوبیاہتا لڑکی اپنی سہیلی سے شکوہ کر رہی تھی۔ "واقعی شادی کے بعد عورت کی کوئی قدر نہیں رہتی۔ اب یہی دیکھ لو کہ میری شادی کو صرف دو ماہ گزرے ہیں اور دو ماہ سے سلیم نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔"

"پھر تو تمہیں سلیم سے طلاق لینے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔" سہیلی نے تشویش سے کہا۔

"لیکن میں سلیم سے طلاق کیسے لے سکتی ہوں؟ میری شادی سلیم سے تھوڑا ہی ہوئی ہے۔" لڑکی نے مجبوری بیان کی۔

فرحین بابر۔ بسیلہ

جہنم میں جاؤ

ایک توندیل شخص مرنے کے بعد اینڈتا اور اکڑتا ہوا جنت کے دروازے پر پہنچا۔

"کون ہو تم؟" داروغہ جنت نے دریافت کیا۔

"میں کاغذی بازار کا سیٹھ موٹا بھائی کھوٹا بھائی ہوں۔"

"کیا چاہتے ہو؟"

"اندر جنت میں جانا چاہتا ہوں۔"

"تم نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا ہے کہ خود کو جنت کا مستحق سمجھتے ہو؟"

"میں نے ایک بیوہ کی پچیس پیسے کے سکے سے مدد کی تھی۔"

"محاسب!" داروغہ جنت نے ایک فرشتے کی طرف منہ کر کے کہا۔ "کیا یہ نیکی اس کے اعمال میں درج ہے؟" فرشتے نے بتایا۔

"جی ہاں درج ہے۔"

داروغہ جنت نے دوبارہ سیٹھ موٹا بھائی کھوٹا بھائی کی طرف دیکھا۔ "اس کے علاوہ بھی کوئی نیک کام کیا ہے۔"

"میں نے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے شخص کو دس پیسے کا سکہ دیا تھا۔"

"محاسب! کیا یہ بات بھی اعمال نامے میں موجود ہے۔"

"بے شک جناب!"

"ہاں تو سیٹھ جی! اس کے علاوہ تم نے اور کون سی نیکی کی؟"

"بس جناب! یہی دو نیکیاں ساری عمر کی کمائی ہیں۔"

"محاسب!" داروغہ جنت نے کہا۔ "تمہارے خیال میں اس نیک انسان کے ساتھ ہمیں کیا سلوک کرنا چاہیے؟"

"میری ناچیز رائے میں ہمیں اس کے پینتیس پیسے اس کے منہ پر واپس مار کر صاف صاف کہہ دینا چاہیے

کہ "جہنم میں جاؤ۔"
محاسب نے جواب دیا۔

نورین فیاض، راولپنڈی

مثال

ایک عاشق نے تھوڑے فاصلے سے اپنی محبوبہ کو قریب آنے کے لیے کہا۔ محبوبہ نے اشارے سے بتایا کہ وہ نہیں آسکتی کیونکہ اس کے پاؤں میں چپل نہیں ہے۔ عاشق موصوف نے اس کے پاس آکر کہا۔

"محبت میں تو چاہنے والوں کو کانٹوں پر بھی چلنا پڑتا ہے اور تم ہو کہ میری خاطر ننگے پاؤں نہیں چل سکتیں؟" محبوبہ نے اترا کر کہا۔

"تم تو فوراً" افسانہ شروع کردیتے ہو جبکہ تمہارے بھائی تو کچھ بھی نہیں کہتے تھے، جب میں ان سے کہتی تھوڑی دیر رکو میں چپل پہن آؤں۔"

ثمینہ اقبال، میرپور خاص

سدھرنے کے بعد

لڑکا اپنے دوست سے۔ "یار! تونے اس لڑکی کے لیے سگریٹ چھوڑ دی؟"

دوست: "ہاں۔"

لڑکا: "شراب بھی چھوڑ دی؟"

دوست: "ہاں۔"

لڑکا: "جوا بھی چھوڑ دیا؟"

دوست: "ہاں۔"

لڑکا: "ابے پھر تونے اس سے شادی کیوں نہیں کی؟"

دوست: "یار! اتنا سدھر گیا تھا کہ اس سے اچھی مل گئی۔"

عاشی مرتضیٰ، کراچی

کیا ایسا نہیں ہوسکتا؟

ایک دفعہ ایک اخبار نویس ڈوب رہا تھا۔ اتفاق سے ایک شخص نے اسے ڈوبنے سے بچالیا۔ اخبار نویس نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا اور اسے مکمل ایڈریس دیا اور دفتر آنے کی دعوت بھی دی۔

ایک عرصہ بعد اس شخص نے ایک نظم لکھی اور اسے کہیں چھپوانا چاہا۔ اسے اسی اخبار نویس کا خیال آیا تو وہ فوراً" اس کے دفتر چلا گیا۔ اخبار نویس نے اس کی بڑی خاطر مدارات کی اور پھر آنے کا مدعا پوچھا۔

اس نے کہا۔ "میں اپنی نظم اخبار میں چھپوانا چاہتا ہوں۔"

اخبار نویس نے نظم پڑھی اور اس کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"جناب! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ مجھے پھر وہیں لے چلیں، جہاں آپ نے مجھے ڈوبنے سے بچایا تھا۔"

کوثر شاہد، میٹروول کراچی

کوئی بات نہیں

شوہر نے مرتے وقت اپنی بیوی سے کہا۔

"تمہاری الماری میں سے تمہارا گولڈ کا سیٹ میں نے ہی چوری کیا تھا۔" بیوی نے روتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

شوہر بولا۔ "اور وہ تمہارے بھائی نے جو امانت رکھوائی تھی ایک لاکھ روپے، وہ بھی میں نے ہی غائب کیے تھے۔"

بیوی۔ "میں نے آپ کو معاف کیا۔"

شوہر: "اور تمہاری کمیٹی کے پیسے بھی کسی اور نے نہیں میں نے چوری کیے تھے۔"

بیوی: "کوئی بات نہیں۔"

شوہر: "اور تمہاری بہن کے ساتھ میرا ہی افیئر چل رہا تھا۔"

بیوی: "کوئی بات نہیں، آپ کو زہر بھی میں نے ہی دیا ہے۔"

بلقیس افتخار، ملیر کراچی

شگفتہ جاہ

ہاتھوں سے خوشبو

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اپنے وارث کو ترکہ دینے سے بھاگے گا (ایسی وصیت کرے گا جس سے جائز وارث کو حصہ نہ ملے یا اس کے اصل حصہ سے کم ملے) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس کی جنت کی میراث سے محروم فرما دے گا۔"

تین طریقے،

ایک مرتبہ عوام کے ایک بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"صرف تین طریقے ایسے ہیں جن کے اختیار کرنے سے کوئی مال صالح ہوسکتا ہے وہ تین طریقے یہ ہیں۔

1۔ حق کے ساتھ وصول کیا جائے۔
2۔ حق کی راہ میں صرف کیا جائے۔
3۔ ناجائز طریقے سے خرچ نہ کیا جائے۔

اخلاق،

اخلاق وہ چیز ہے جس کی قیمت کچھ نہیں دینی پڑتی۔ ہاں مگر اس سے ہر انسان خریدا جاسکتا ہے۔

توبہ،

جب تم سکون کی کمی محسوس کرو تو اپنے رب کے حضور توبہ کرو کیونکہ انسان کے گناہ ہی ہیں جو دل کو بے چین رکھتے ہیں۔

زوباریہ خالد۔ لاہور

میل جول،

حضرت وہیب بن ورد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "میں نے آج تک (تقریباً پچاس برس) لوگوں سے میل جول کیا ہے لیکن کسی نے میری غلطی معاف نہیں کی اور نہ میری کسی لغزش کو درگزر کیا اور جب کبھی ان میں سے کوئی مجھ سے ناراض ہوا تو اس سے خود مجھے بھی دلی تکلیف ہوئی۔"

رابطے،

حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ فرماتے تھے کہ لوگوں کو آگ فرض کرو اور بلا ضرورت ان کے پاس نہ جاؤ اور جب ان کے قریب جاؤ تو اس طرح ڈرو، جیسے آگ کے قریب جانے سے ڈرتے ہو۔

گفتگو کی حد،

ایک دفعہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سفر میں تھے۔ جب واپس آئے تو لوگوں نے سلیمان خواص سے کہا۔

"آپ ان سے ملاقات کو کیوں نہ گئے؟"

انہوں نے فرمایا۔

"میں ڈرتا ہوں کہ ان سے مل کر چکنی چپڑی باتیں کروں تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالوں۔"

دانائی،

ربیع بن خثیم رحمۃ اللہ علیہ اپنی قوم کی مجلس میں ساری عمر میں صرف ایک دفعہ شریک ہوئے۔ ایک مرتبہ اپنے گھر کے دروازے میں بیٹھے تھے کہ ایک پتھر گرا۔

جس سے آپ کا سر زخمی ہوگیا لیکن مارنے والے کا پتا نہ چلا۔ آپ کھڑے ہوگئے اور کہا۔

"اے ربیع! تجھے نصیحت کی گئی ہے۔"

اس کے بعد مرتے دم تک بغیر ضرورت کے گھر سے نہ نکلے اور فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص راستے میں بیٹھے، اسے راہ کا حق ادا کرنا چاہیے۔ یعنی سلام کا جواب دے۔ مظلوم کی امداد کرے اور ظالم پر شہادت دے اور جو ضرورت مند ہو، اس کی امداد کرے۔"

ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

تکبر،

حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ پہلے زمانے میں ایک آدمی تھا، جب وہ چلتا تھا تو بادل اس کی بزرگی کے باعث اس پر سایہ کرتے تھے۔ ایک شخص نے اسے دیکھا تو کہا۔

"بخدا! میں بھی اس کے سائے میں چلوں گا، شاید مجھے بھی اس کی برکت حاصل ہو۔"

اس آدمی نے جب لوگوں کو اپنے سائے میں چلتے دیکھا تو دل میں غرور کیا۔ پھر جب دونوں آپس میں جدا ہوئے تو سایہ دوسرے شخص کے ساتھ چلا گیا۔

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

اعلا زندگی،

اعلا زندگی کی چار نشانیاں ہیں۔

1۔ نیک گفتار۔
2۔ نیک نیت۔
3۔ نیک کردار۔
4۔ نیک بخت۔

آمنہ، محدسہ، مقدسہ۔ فیصل آباد

تساہل،

ایک شخص بظاہر زبان کا شیریں لیکن دل کا بے حد تلخ تھا۔ مخلوق خدا کو اذیت دینے کی تدبیریں دن رات سوچتا۔ ایک مرتبہ اس کینہ خصلت شخص نے راستے کے بیچ میں لمبے لمبے کانٹوں کی ایک جھاڑی بودی۔ چند دن کے اندر جھاڑی خاصی بڑھ گئی اور اس میں بے شمار کانٹے اُگ آئے۔ ہر چند لوگ اس سے بچ کر نکلتے لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی کانٹا توڑے زخمی کردیتا یا دامن تار تار کر دیتا۔

لوگوں نے پریشان ہوکر اس شخص سے بار بار کہا "تو نے اپنے گھر کے سامنے عین راستے پر یہ جھاڑی کیوں اُگنے دی؟ اب تکلیف کی انتہا ہوچکی ہے۔ اسے اکھاڑ دے۔"

وہ مسکرا کر انتہائی نرمی سے جواب دیتا۔ "بہت بہتر۔ ابھی اکھاڑ ڈالتا ہوں۔"

مگر جھاڑی نہ اکھاڑتا۔ یہاں تک کہ جھاڑی نے آدھا راستہ گھیر لیا۔ آخر حاکم وقت تک یہ بات پہنچی۔ اس نے فوراً اس شخص کو بلا کر سختی سے حکم دیا۔

"ابھی جا اور جھاڑی اکھاڑ دے۔"

اس نے عرض کیا "ابھی حکم کی تعمیل ہوئی جاتی ہے۔"

وہ حاکم شہر سے وعدہ کرکے چلا آیا لیکن جھاڑی پھر بھی نہ اکھاڑی۔ کوئی اس طرف توجہ دلاتا تو کہہ دیتا۔

"آج فرصت نہیں، کل یہ کام کروں گا۔"

اس کل کل پر ٹالنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن جھاڑی اتنی بڑھ گئی کہ اب اس کا ہٹانا آسان نہ رہا اور راستہ بالکل بند ہوگیا۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ برائی کو دور کرنے میں تساہل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ جس قدر وقت گزرتا جائے گا اسی قدر برائی کی خاردار جھاڑی بڑھتی چلی جائے گی اور تیرے قویٰ مضمحل ہوتے چلے جائیں گے۔

(حکایت رومی)

مسلمان،

ملا جیونؒ (جی وَن) ایک بار اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں بحیثیت فقیہہ مدعو تھے کہ ان کے پاس ان کے علاقے کے کچھ شریر اور تیز طرار لوگ آ پہنچے۔ انہوں نے ملا جیون سے کہا۔

"ملا صاحب! ہمارے گاؤں کا وہ پل جو دریا پار کرنے کے لیے بنا ہوا تھا۔ پچھلے دنوں طغیانی کی وجہ سے بہہ کر دوسرے گاؤں چلا گیا ہے۔ اب وہیں ہے اور ان ہی کے زیر استعمال ہے۔ لہٰذا اپنے گاؤں کے نئے پل کی تعمیر کے لیے بادشاہ سلامت سے ہمیں کچھ فنڈ دلوا دیجیے۔"

ملا جیون مذکورہ وفد کو ساتھ لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں جا پہنچے۔ جو کچھ ان سے کہا گیا تھا انہوں نے وہی دربار میں دوہرا دیا۔ بادشاہ یہ قصہ سن کر ہنسا اور کہنے لگا۔

"ملا صاحب! آپ بھی کتنے سادہ آدمی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دریا کے اوپر بندھا ہوا کوئی پل ایک گاؤں سے صحیح سلامت بہہ کر دوسرے گاؤں چلا جائے؟"

ملا صاحب نے جو جواب دیا، اس سے دھوکے باز وفد پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ملا صاحب نے فرمایا۔

"جی ہاں سرکار عالی! یہ تو ممکن ہے کہ دریا پر بندھا ہوا کوئی پل ایک گاؤں سے صحیح سلامت بہہ کر دوسرے گاؤں چلا جائے۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان جھوٹ بولے۔"

کچھ اہم،

- اگر خوشی کا ایک در بند ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ایک اور در کھول دیتا ہے مگر ہم نہیں دیکھ پاتے وہ کھلا در، کیونکہ ہم بند دروازے کے سامنے رو رہے ہوتے ہیں۔
- ہر چیز ہمارے لیے تب تک اہمیت رکھتی ہے ایک حاصل ہونے سے پہلے، دوسرا کھونے کے بعد۔
- دوسروں کے احساسات سے مت کھیلو، کیونکہ اگر وہ کھیل تم جیت بھی جاؤ تو یقیناً اس شخص کو ہمیشہ کے لیے کھو دو گے۔

ماریہ راحت۔ ٹنڈو جان محمد

جینے کے گُر،

٭۔ اگر چاہتے ہو کہ دھوکا نہ کھاؤ تو تین دکانوں سے قیمت دریافت کرلو۔
٭۔ اچھے دوست حساب چکانے میں جلدی کرتے ہیں۔
٭۔ صرف دوسروں کی آنکھ کی بدولت ہم اپنے عیب دیکھ سکتے ہیں۔
٭۔ سستی چیزیں اچھی نہیں ہوتیں، اچھی چیزیں سستی نہیں ہوتیں۔

لاریب عروج عندلیب

زندگی،

سقراط سے پوچھا گیا کہ موت سے بھی کوئی سخت تر چیز ہے؟

سقراط نے جواب دیا۔ "زندگی" کیونکہ ہر قسم کے رنج و آزار اور مشکلات زندگی میں ہی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اور موت ان سے نجات دلاتی ہے۔"

ثمینہ اصغر۔ گجرات

علم اور عمل،

انسان عمل کے لیے علم حاصل کرتا ہے لیکن جوں جوں علم پھیلتا ہے عمل کے مواقع سمٹنے شروع ہوجاتے ہیں۔ آج کے انسان کا سب سے بڑا عمل حصول علم ہے اور یہ عمل اس کو فرائض کی بجا آوری کے عمل سے بہت دور کر دیتا ہے۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہیں بیٹھ کر زندگی کا مفہوم سمجھنے والا اس زندگی کو نہیں سمجھ سکتا جو سڑک پر سے گزر رہی ہے۔

(واصف علی واصف)

حقیقت،

کچھ لوگ حقیقت کو تلاش کرتے ہیں۔ دراصل یہ تلاش نہ ختم ہونے والی تلاش ہے۔ دراصل محدود کا لامحدود کے لیے سفر کسی بیان میں نہیں آسکتا۔ قطرے کے قلزم آشنا ہونے کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے یہ وہی جانتا ہے جس پر مقامات اور مراحل گزرتے ہیں۔

(واصف علی واصف)

زندگی کا اصل راز،

نماز کے دوران غیر اختیاری وسوسے آنے کی وجہ سے مایوسی یا پریشانی کا شکار ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ دراصل انسان کا دل ایک سپر ہائی وے کی مانند ہے۔ اس پر شاہی سواریاں بھی گزرتی ہیں۔ امیر کبیر بھی چلتے ہیں۔ غریب اور فقیر بھی گزرتے ہیں تو خوبصورت اور بدشکلوں کی بھی یہی گزرگاہ ہے۔ نیکوکاروں، پارساؤں کی اور دین داروں کے علاوہ کافروں، مشرکوں، مجرموں اور گنہگاروں کے لیے بھی یہی شاہراہ عام ہے۔ عافیت اسی میں ہے کہ اس شاہراہ پر جیسا ٹریفک بھی خود بخود آجائے اسے خاموشی سے گزر جانے دیا جائے۔ اگر اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے بند کرنے یا رخ موڑنے کی کوشش کی گئی تو دل کی سڑک پر خود بہت جام ہو جانے کا شدید خطرہ ہے۔ اس راستے کا ٹریفک سگنل صرف سبز بتی پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں سرخ بتی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز کے علاوہ یا نماز کے اوقات کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی زندگی کا اصل راز یہی ہے۔

(قدرت اللہ شہاب)

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

مرتبہ،

حکیم لقمان ایک دن اپنے شاگردوں کو حکمت و دانائی کا درس دے رہے تھے۔ ایک شخص سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور کافی دیر تک ان کی صورت پر غور کرتا رہا۔ آخر پہچان کر بولا۔

"تم وہی آدمی ہو نا جو فلاں مقام پر میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے؟"

"ہاں، میں وہی شخص ہوں۔" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"تو یہ مرتبہ تمہیں کیونکر حاصل ہوا؟"

حکیم لقمان نے فرمایا۔ "دو باتوں سے۔ ایک سچ بولنا اور دوسرا بلا ضرورت بات نہ کرنا۔"

امثل عزیز شہزاد۔ کراچی

ولیم جیمز کا کہنا ہے کہ...

انسان کے ہر جذبے کے ساتھ ایک فعل وابستہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر۔ دکھی ہوتا ہے تو۔ روتا ہے۔ خوش ہو تو وہ ہنستا ہے غصے میں آئے تو وہ چیختا چلاتا ہے۔ محبت کرے تو۔ پچکارتا ہے۔ بوسا لیتا ہے۔ خوفزدہ ہو تو وہ بھاگتا ہے۔ کامیاب ہو تو چلا تگیں لگاتا ہے تالیاں پیٹتا ہے اور وہ بھوکا ہو تو ندیدے پن کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اگر انسان اس عمل کو الٹا دے وہ کسی جذبے سے وابستہ فعل یا عمل دہرانا شروع کر دے تو تھوڑی ہی دیر میں اس عمل یا اس فعل سے وابستہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص بڑا ریلیکس بیٹھا ہو وہ اٹھے اور اٹھ کر ناراضی۔ اور غصے کی ایکٹنگ شروع کر دے، وہ چیخنے چلانے لگے تو تھوڑی دیر بعد اس کے جسم میں حقیقتاً غصہ پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص غصے سے بھرا بیٹھا ہو لیکن وہ اوپری دل سے خوش مزاجی اور وضع داری کی ایکٹنگ کرے، وہ ہر ملاقاتی سے اٹھ کر ملے اور ناگوار سے ناگوار بات بھی ہنس کر برداشت کر لے تو ذرا دیر بعد خوش مزاجی اس کے غصے کی جگہ لے لے گی، وہ حقیقتاً خوشگوار اور ہلکا پھلکا ہو جائے گا۔

(زیرو پوائنٹ 3۔ جاوید چودھری)

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

رسم سجدہ بھی اٹھا دی ہم نے
عظمت عشق بڑھا دی ہم نے
دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

حرا شاہ ——— شجاع آباد

مل ہی جائے گا کبھی، دل کو یقین رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے
روز ملنے پہ بھی لگتا تھا کہ جگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے

نمرہ، اقرا ——— کراچی

تو نے دیکھا ہے کبھی صحرا میں جھلستا ہوا پیڑ
اس طرح جیتے ہیں وفاؤں کو نبھانے والے
کوئی دیکھے تو سہی ان کی صبحوں کو محسن
کتنا روتے ہیں لوگوں کو ہنسانے والے

ماریہ راحت ——— ٹنڈو جان محمد

تمہاری یاد بھی محسن کسی مفلس کی پونجی ہے
جسے ہم ساتھ رکھتے ہیں، جسے ہم روز گنتے ہیں

تمثیلہ اصغر ——— گجرات

کتنی دلکش ہے تیری خاموشی
ساری باتیں فضول ہوں جیسے

صبا افضال ——— دینالہ خورد

میرے قابو میں کیوں نہیں رہتا بول
تو میرا دل ہے یا اس کا ہے

سعدیہ سلیم ——— شریف آباد

مانی نہ میری ایک بھی خود سر ہے تو اے دل
اب خود ہی بھگت، میں تو تیرا کچھ نہیں لگتا

ثنیعہ خان ——— ایبٹ آباد

ہے میرے یار کا یہ حوصلہ کہ مجھ سے
بچھڑ رہا ہے مگر آنکھ اس کی نم بھی نہیں
دل نادان کی افسردگی نہیں ملتی
جو سچ کہوں تو اتنا خاص کوئی غم بھی نہیں

زیب نجم ——— لندن

سورج کو جاگنے میں ذرا دیر کیا ہوئی
چڑیوں نے آسمان کو سر پہ اٹھا لیا

شہلا اظہر ——— وہاڑی

اس کی یاد کے پیوند لگ گئے ورنہ
میرے وجود کی اڑ جاتیں دھجیاں کتنی

عفت جبیں ——— فیصل آباد

دہکتی ہے میرے اندر فصل شعلوں کی
تم بات کرتے ہو بارش کی پھواروں کی
اک لڑکی ہنستی تھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر
مگر یہ بات پرانی ہے جانے کتنے سالوں کی

عائشہ، رابعہ ——— چیچہ وطنی

برسوں وہ مجھ سے دور، مجھ سے خفا رہا
لیکن میرے وجود کی دیمک بنا رہا
وہ شخص اجنبی تو نہیں دوست بھی نہیں
کل جب ملا تو دیر تک دیکھتا رہا

سیما ممتاز عباسی ——— لاڑکانہ

جو میرا ہے، میں کسی اور کو کیوں دوں
میں اپنی محبت میں بچوں کی طرح ہوں

شائستہ اکبر ——— ڈگری کالج گڈو

اس کائنات محبت میں ہم مثل شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے، اک فاصلہ مسلسل ہے

سونیا رہائی ـــــ قاضیاں محلہ بالا

تیرے بغیر بھی وہ دن گزر گئے آخر
تیرے بغیر یہ دن بھی گزرتے جاتے ہیں
تمام عمر جہاں ہنستے کھیلتے گزری
اب اُس گلی میں بھی ہم ڈرتے ڈرتے جاتے ہیں

مسز ارشد آسی اتووالہ ـــــ کھاریاں

ابھی تو تنقید ہو رہی ہے مرے مذاقِ جنوں پہ لیکن
تمہاری زلفوں کی برہمی کا سوال آیا تو کیا کرو گے
ابھی تو دامن چھڑا رہے ہو بگڑ کے قابل سے جا رہے ہو
مگر کبھی دل کی دھڑکنوں شریک پایا تو کیا کرو گے

عابدہ اکرم غوری ـــــ راجن پور

تمہارے ذہن میں جو بھی ہے صاف صاف کہو
منافقت کا نشاں ہے اگر مگر کرنا

سور یٹھ ساند ـــــ ردمل وائی گاؤں

تحریروں میں اُس کی عکس نمایاں ہے میرا
لکھتا رہا مجھے بھی گرچہ بھلا دیا اُس نے
رہ گیا تھا وہ بھی بس مجاور بن کے اپنے مزار کا
میرے بغیر اگرچہ زندہ رہ کر دکھایا اُس نے

عائشہ ـــــ ٹنڈو محمد خان

لوگ منتظر رہے کہ ہمیں ٹوٹتا دیکھیں
ہم ضبط کرتے کرتے پتھر کے ہو گئے

زینب لودھی ـــــ اوکاڑہ

پھر کبھی لوگوں کی باتوں میں نہیں آئے گا وہ
دیکھ لینا مجھ سے مل کر ٹھیک ہو جائے گا وہ
صلح تو کرے گا آکے مجھ سے لیکن اس کے بعد
جب ملے گا بس یہی احسان جتلائے گا وہ

اُمِ رومان ـــــ عبدالحکیم

وہ ساتھ تھا تو عجب دھوپ چھاؤں رہتی تھی
بس اب تو ایک ہی موسم ٹھہر گیا مجھ میں

حمنہ سویٹی ـــــ عبدالحکیم

جانے کتنے ہی سوالات ادھورے تھے ابھی
وقتِ رخصت میری آنکھوں کو تو دیکھا ہوتا

شازیہ رانا ـــــ دیپال پور

مدت سے کیے بیٹھے ہیں گو ترکِ محبت
ہاں باعثِ تسکین وہی نام ہے اب بھی

شکیلہ خرم ـــــ گوجر خان

اے میرے احساسِ جنوں کیا مجھے دینا
دریا اسے بخشتا ہے تو صحرا مجھے دینا
اک درد کا میلہ کہ لگا ہے دل و جاں میں
اک روح کی آواز کہ رستہ مجھے دینا

مسز یوسف رضا ـــــ فاضل پور

کبھی کبھی تو یونہی رو پڑتی ہیں آنکھیں
اُداس ہونے کا کوئی سبب نہیں ہوتا
میں اپنے دل کو یہ بات کیسے سمجھاؤں
کہ کسی کو چاہنے سے کوئی اپنا نہیں ہوتا

نیک بخت سراجی ـــــ ڈیرہ اسماعیل خان

بہت ہوشیار ہوں اپنی لڑائی آپ لڑتا ہوں
میں دل کی بات کو دیوار پہ لکھا نہیں کرتا
زمین پیروں سے کتنی بار دن میں نکلتی ہے
میں ایسے حادثوں پہ دل کو مگر چھوٹا نہیں کرتا

مقدس رباب ـــــ چکوال

شفق کے رنگ سے برگ و ثمر گلابی ہیں
سنہری شام ہے سارے شجر گلابی ہیں
یہ کس کا دستِ حنائی ہے میری آنکھوں پر
کہ میرے خوابوں کے سارے نگر گلابی ہیں

ناہید غفور ـــــ گنگا پور

جو اس کے چہرے پہ رنگِ حیا ٹھہر جائے
تو سانس، وقت، سمندر ہوا ٹھہر جائے
وہ مسکرائے تو ہنس ہنس پڑیں کئی موسم
وہ گنگنائے تو بادِ صبا ٹھہر جائے

عائشہ رانا ـــــ خانیوال

تو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے
ہم سفر چاہیے ہجوم نہیں
اک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے

شعاع کے ساتھ

ادارہ

کہتے ہیں کہ شاعری احساسات کی زبان ہے، محبت کی زبان ہے اور احساسات سدا حقیقی ہوتے ہیں اپنے انتخاب کا آغاز سب سے پہلے اس انتہائی خوبصورت شعر سے کروں گی جو مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔

- میرے ہاتھوں اور میرے ہونٹوں سے خوشبو جاتی نہیں
کہ میں نے اسمِ محمدؐ کو لکھا بہت اور چوما بہت

میرے موسٹ فیورٹ شاعر امجد اسلام امجد ہیں۔ شاعری کا ذوق رکھنے والے قارئین میں شاید ہی ایسا کوئی ہو جسے امجد اسلام امجد کی شاعری پسند نہ ہو۔ ان کی نظم "اندیشہ" پیشِ خدمت ہے۔

ضروری نہیں ہے
جو ساحل کی گیلی خنک ریت پر ہاتھ میں ہاتھ دے کر
سفر اور تلاطم کے قصے سنائے
جزیروں، ہواؤں اور ان دیکھے موسم
اور آنکھوں سے اوجھل کناروں پر بکھرے
منظروں، ذائقوں اور رنگوں کی باتیں کرے
وہ ان واردا توں سے گزرا بھی ہو
مگر کہے آؤ ہم ان پریشان موجوں کا پیچھا کریں
جو تیرے میرے پاؤں کو چومتی ہیں
تلاطم کی بے نام منزلوں سے گزریں
یہ دیکھیں ہوائیں کسے ڈھونڈتی ہیں
تو چلنے سے پہلے ذرا سوچ لینا
ضروری نہیں جو ان دیکھے رستوں کی خبر سنائے
وہ ان راستوں کا شناسا بھی ہو
کہیں یہ نہ ہو تم سمندر میں اس کو
ڈھونڈو تو وہ
ساحلوں پر کھڑا مسکرا رہا ہے

ناصر کاظمی کی غزل کے چند اشعار جو الفاظ و مفہوم کی بنا پر اپنی مثال آپ ہیں۔

- ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

- اے دل کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

- اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

قتیل شفائی کا سادہ انداز ہمیشہ دل کو چھو جاتا ہے وہ بہت ہی سادہ انداز میں اپنی شاعری بیان کرتے ہیں۔ آنکھوں کے سلسلے میں انہوں نے ایک بہت ہی خوبصورت نظم لکھی ہے جو کہ آنکھوں کے جذبات کی مکمل طور پر عکاسی ہے۔

اکھیاں جھوٹ نہ بولیں
پہلے دل کا حال کہیں
پھر اپنے بھید بھی کھولیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں
ان پہ گزری جیسی جیسی
بات کریں تو ویسی ویسی
روتے روتے کبھی ہنسیں
کبھی ہنستے ہنستے رو لیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں
کاجل کے سنگ بہتے بہتے
تھک جائیں سچ کہتے کہتے
سچ بچھا کر سپنوں کی تب تھوڑی دیر کو سو لیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں

شاعری کے تذکرے میں سیّد وصی شاہ کا نام یقیناً ایک بجلی کی طرح ذہن میں کوندتا ہے اور اُن کا بہترین کلام ذہن میں آتا ہے۔ اُن کی کتاب "آنکھیں بھیگ جاتی ہیں" میں سے ایک نظم پیش کرتی ہوں۔

شکوہ

میں نے تم سے
تمہیں مانگا
تو تم مسکرا دیے
تم یہ بھی تو کہہ سکتے تھے
میری جان!
اپنی چیزیں بھی بھلا مانگی جاتی ہیں

یہ نظم عوامی جمہوریہ چین کی ممتاز شاعرہ میڈم کوآن کی ہے۔ جسے ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔

تیرے اور میرے درمیان
بعد کیسا، فاصلہ باقی کہاں؟
لے ذرا مٹی کی اک چکنی ڈلی
ڈال پانی، گوندھ اس کو زور سے
اور بناؤ دو بُت، حسین و لاجواب
ایک بُت کی شکل ہو تیری طرح
دوسرا بُت ہو مرا
بُت شکن بن کر انہیں اب توڑ دے
ڈال پانی گوندھ پھر ان کو ذرا
اب بنا پھر دونوں بُت
ایک اپنا۔ اک مرا
اب میرے بُت میں ہے کچھ تیرا وجود
اور تیرے بُت میں ہے کچھ پیکر مرا
زندگی کی کون سی طاقت بتا
تجھ کو کر سکتی ہے مجھ سے اب جُدا

- ساری خوشیاں وفا نہیں کرتیں
درد کو دل سے آشنا رکھنا

- سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اُسی گھڑی
جب سُن کے تیرا نام وہ بے تاب سا ہوا

- حسن کے سمجھنے کو عمر چاہیے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں
ماؤں سے کیا کہیں گی دکھ ہجر کا کہ خود پر بھی
اتنی چھوٹی عمروں کی بچیاں نہیں کھلتیں

- جتنی دیر ملوں میں اُس سے
اتنی دیر تو یوں لگتا ہے
سمے سے لے کر انت سمے تک
سارا جیون میرے پاس

اپنے انتخاب کا اختتام میں اس خوبصورت نظم پر کروں گی، جو یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گی۔

تمہیں کیا معلوم
سرد ہوا کے دوش پر
اُڑنے والے خزاں رسیدہ درختوں کے
ان زرد پتوں سے پوچھو کہ
شاخوں سے ٹوٹنا
اور ٹوٹ کر بکھرنا کسے کہتے ہیں

آخر میں اپنا تعارف بھی کرا دوں۔ میرا نام صبا طارق ہے۔ گوجرانوالہ سے میرا تعلق ہے۔ آئی کام کر رہی ہوں۔ لکھنے کو تو بہت کچھ ہے میری ڈائری میں لیکن مدّی کی ٹوکری کے ڈر سے اسی پر اکتفا کرتی ہوں۔ اور ہاں! اپنی رائے دینا مت بھولیے گا کیونکہ آپ کی رائے میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

تبصیر نشاط

حق دار

23 مارچ پوری قوم کے لیے تو یادگار ہے ہی، مگر اس سال 23 مارچ اداکارہ میرا کے لیے زندگی بھر نہ بھلایا جانے والا دن ہوگا کہ اس دن انہیں "صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی" سے نوازا جا رہا ہے۔ (کارکردگی کی وضاحت بھی ہو جاتی تو بہتر ہوتا۔)

میرا کو یہ ایوارڈ دیے جانے کا جب سے اعلان ہوا ہے، اعتراضات کی بارش بھی جاری و ساری ہے۔ عوام کو اعتراض ہوا تو میرا نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی ہوگی کہ "یہ کس گنتی میں ہیں۔" ہم عصر اداکاراؤں نے اعتراض کیا تو میرا نے کہا۔ "جل گئیں" مگر جب معروف اداکارہ بابرہ شریف نے اعتراض کیا تو میرا بولیں۔

"بابرہ شریف فلم انڈسٹری سے دولت کما کر غائب ہو گئیں۔ انہوں نے بیس سال سے کوئی کام ہی نہیں کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے پہلے کچھ اچھا کام کیا ہے، مگر انہوں نے آخر ایسا کون سا کام کیا ہے کہ وہ ایوارڈ کی حق دار مجھ سے زیادہ ہیں؟"

(کوئی ہے جو میرا کے اس سوال کا جواب دے؟)

واضح رہے کہ بابرہ شریف کو تاحال یہ ایوارڈ نہیں دیا گیا ہے۔

ویسے یہ سال میرا کے لیے صرف ایوارڈ کے حوالے سے ہی ناقابل فراموش نہیں، ان کے بیانات کے اعتبار سے بھی یادگار ہے کہ اس سال میرا نے کئی "یادگار" بیانات دیے ہیں۔ مثلاً "میرا کا کہنا ہے کہ آٹھ سال قبل وہ سعود سے شادی کرنا چاہتی تھیں، تاہم اپنی والدہ اور اداکارہ و ہدایت کارہ سنگیتا کے مشورے پر نہیں کی۔ (سعود کی قسمت اچھی ہوگی نا۔)

میرا کے مطابق شعیب اختر نے دو سال قبل انہیں پرپوز کیا، مگر پھر ان کی کزن کو بھی کر دیا۔ (عتیق الرحمان کا فیصلہ ہونے تک انتظار نہیں کر سکتے ہوں گے۔ آخر کو تیز رفتار ترین باؤلر جو ٹھہرے۔) اس پر میرا نے ان سے بھی شادی نہیں کی۔ (گویا شعیب بھی قسمت کے دھنی ہیں۔)

پھر امریکی پائلٹ نوید پرویز سے منگنی اور اس کے بعد کئی متنازعہ بیانات بھی سامنے آئے۔ اب خبر ہے کہ

نوید پرویز جلد ہی میرا کے ساتھ پاکستان میں ایک مشترکہ پریس کانفرنس کرنے والے ہیں، جس میں کوئی اہم اعلان متوقع ہے۔ (ہوشیار رہیے گا میرا جی! کہ پائلٹ بھی کچھ کم تیز رفتار نہیں ہوتے۔)

خیمہ

معروف گلوکار عدنان سمیع کی صلاحیتوں سے کون واقف نہیں۔ (خود عدنان ہی نہیں ہیں شاید، جب ہی تو بھارت میں اپنی بے عزتی کرا رہے ہیں۔) عدنان صرف ایک مشاق گلوکار و موسیقار ہی نہیں ہیں، بلکہ انہیں دنیا کے "تیز ترین کی بورڈ پلیئر" کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ سات سال کی عمر میں جب بچے گیند بلے اور گاڑیوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں، اس وقت عدنان "پیانو" کے سروں سے کھیلتے تھے۔ (کھلونا نہیں، بلکہ "دو ختلی تے وڈا" پیانو۔) چند سال پہلے عدنان "تھوڑی سی تو لفٹ کرا دے" کہتے ہوئے بھارت گئے۔ وہ ملک انہیں کچھ اتنا بھایا کہ پھر وہ وہیں کے ہو رہے۔

پاکستانی عوام نے لاکھ درخواست کی کہ "کبھی تو نظر ملاؤ، کبھی تو قریب آؤ..... ہم بھی تو ہیں تمہارے دیوانے..... ہو دیوانے" مگر جناب! عدنان نے مڑ کر نہ دیکھا۔ فن کی سرپرستی کے دعوے دار بھارت نے ان کے فنی جواہر سے فائدہ تو اٹھایا، مگر قدر نہ کی۔

عدنان نے وہاں جتنی بھی جائیداد بنائی، سب پر بھارتی سرکار نے قبضہ کر لیا (گویا عدنان کی جائیداد نہ ہوئی، کشمیر ہو گیا۔) اور انہیں ہر طرح تنگ بھی کیا۔ ان دنوں عدنان کی خانگی زندگی بھی مشکلات کا شکار تھی۔ (سابقہ بیوی کے ساتھ) پھر انہیں فلموں میں قابل ذکر کام ملنا بھی بند ہو گیا اور اب تو نوبت یہاں تک آ گئی کہ یہ عظیم گلوکار و موسیقار شادی بیاہ جیسی نجی تقریبات میں گانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ (غالباً" پیٹ بھرنے کے لیے، کیونکہ ان کا پیسہ تو سرکار کے پیٹ میں گیا۔)

تاہم شاباش ہے عدنان کی ہمت پر (مؤدبانہ گزارش ہے کہ اسے تعریف ہرگز نہ سمجھا جائے۔) کہ وہ اب بھی وہیں رہنے کے خواہاں ہیں۔ جی ہاں جناب! عدنان سمیع کا کہنا ہے کہ

"چاہے مجھے خیمے میں کیوں نہ رہنا پڑے، رہوں گا میں بھارت میں ہی۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی عدنان نے ایک نئی تاریخ رقم کر ڈالی ہے کہ انہوں نے وہ قدیم محاورہ غلط ثابت کر دیا ہے کہ اپنا تو جھونپڑا بھی پیارا ہوتا ہے۔ (مگر جناب! ہم تو "قدیم تاریخ" کو یاد رکھیں گے اور آپ کو بھی یہی مشورہ دیں گے میر عدنان... اوہ! ہمارا مطلب ہے عدنان سمیع جی! کہ "پرایا گھر تو پرایا ہی رہتا ہے۔")

مشکل

گلوکار علی ظفر ان دنوں بھارت میں بے حد مقبول ہیں۔ ان کی فلمیں وہاں لگاتار کامیاب ہو رہی ہیں۔ حال ہی میں انہیں ایک اور بھارتی فلم "چشم بددور" میں کاسٹ کیا گیا ہے۔ وہ ان دنوں اس کی عکس بندی کرانے میں مصروف ہیں۔ لیکن بھارت میں اتنا کام ملنے کے بعد بھی وہ مشکل میں ہیں۔ گھبرایئے نہیں! علی ابھی ان مشکلات میں نہیں پڑے، جن کا سامنا عدنان سمیع کو ہے کہ ان کی مشکل ہے ذرا وکھری ٹائپ کی۔

بات کچھ یوں ہے کہ ان دنوں بالی ووڈ کے شائقین صرف ہیروئن کو ہی نہیں، بلکہ ہیرو کو بھی ڈانس کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں اور علی کی مشکل یہ ہے کہ وہ ناچنا نہیں جانتے۔ (شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی) چنانچہ فلم "چشم بددور" کے ہدایت کار ڈیوڈ دھون آج کل انہیں رقص کی باقاعدہ تربیت دے رہے ہیں۔ (گویا "نچا" رہے ہیں، حالانکہ پاکستانی فنکاروں کے لیے یہ کام بال ٹھاکرے اور وہاں کی حکومت نے سنبھال رکھا ہے۔)

دن رات کی ریہرسل کے بعد علی اتنے تھک جاتے ہیں کہ رات کو سونے سے پہلے وہ برف سے بھرے ہوئے ایک ٹب میں کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔ علی کا کہنا ہے کہ اس طرح ان کی تھکن دور ہو جاتی ہے اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ سو بھی نہیں سکتے۔ (جیسی وکھری ٹائپ کی مشکل، ویسا ہی وکھری ٹائپ کا حل۔)

حقیقی رنگ

اس دنیا میں سب سے مشکل کام کسی کو سمجھانا ہے، اگر وہ سمجھنا نہ چاہے تو... لیکن جناب! ایک باشعور اور عقل مند انسان کو اگر کوئی بات سمجھائی جائے تو وہ بات سمجھ بھی لیتا ہے۔

ایک ٹیلی فلم کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ کہانی کا محور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک خاندان تھا، لہٰذا شوٹنگ کے لیے غریبوں کی ایک بستی کا انتخاب کیا گیا تھا۔ وہاں کی گلیاں نہایت تنگ تھیں اور جگہ جگہ گٹر بھی ابل رہے تھے۔ (یہ تو غریبوں کی بستی کا "ٹریڈ مارک" ہے بھئی!) معروف اداکارہ سویرا ندیم شوٹنگ کے لیے پہنچیں تو بے حد غصہ ہو گئیں۔ ناک پر فوراً کپڑا رکھ لیا اور ہدایت کار سے بگڑ کر پوچھا۔

"شوٹنگ یہاں ہو گی کیا؟"

ہدایت کار نے اثبات میں جواب دیا تو بولیں۔

"یہاں تو گٹر ابل رہے ہیں، پھر بدبو بھی اتنی زیادہ ہے۔ میں یہاں تین دنوں تک کام کیسے کروں گی؟ آپ لوکیشن بدلیں، ورنہ میں کام نہیں کروں گی۔"

سویرا کی بات سن کر ہدایت کار بھی غصہ ہو گئے، بولے۔

"آپ کام نہیں کر سکتیں تو آپ کی مرضی، مگر لوکیشن نہیں بدلی جا سکتی، البتہ آرٹسٹ بدلا جا سکتا

ہے۔"

اس تلخ اور دو ٹوک جواب نے سویرا کے ہوش اڑا دیے کیونکہ یہ جواب ان کی توقعات کی سرحدوں سے کافی پرے تھا۔ وہ حیران رہ گئیں۔ ان کی حالت دیکھ کر ہدایت کار نے انہیں نرمی سے سمجھایا۔

"مجھے اپنے کام سے عشق ہے۔ میں اپنا کام خراب نہیں کر سکتا۔ آپ بھی ایک اچھی اداکارہ ہیں۔ آپ کو کہانی کے تقاضے سمجھنے چاہئیں۔ کردار میں حقیقی رنگ بھرنے کے لیے کچرے کے ڈھیر میں بھی بیٹھنا پڑے تو بیٹھ جائیں، کسی فاقہ زدہ عورت کی رہائش کلفٹن یا ڈیفنس کے بنگلے میں دکھائی جائے تو ڈرامے کا کیا تاثر بنے گا' یہ آپ بھی بہتر سمجھتی ہیں۔"

ہدایت کار کی معقول بات سویرا کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے کہا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ مجھے کردار کی ڈیمانڈ پوری کرنا چاہیے۔ میں اسی لوکیشن پر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

یوں سویرا نے اسی لوکیشن پر کام کر کے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرا اور جب ڈراما نشر ہوا تو انہوں نے اپنے کام پر داد و تحسین کے ڈونگرے بھی سب سے زیادہ سمیٹے۔ (ویل ڈن سویرا!)

بیان کالمانہ

آج نہیں تو کل پرویز مشرف کو انصاف کے کٹہرے میں پیش ہونا ہے۔ 2001ء کے بعد جن پاکستانیوں کو غائب کیا گیا۔ ان کے خاندانوں کا مجرم پرویز مشرف ہے۔ پشاور کی صبیحہ بی بی اور کوئٹہ کی نور بی بی کا ملزم پرویز مشرف ہے۔

(قلم کمان۔۔۔ حامد میر)

مشرف پر مقدمہ چلانا ہے تو صرف غدار پر کیوں؟ شریک غداروں کے بارے میں کیا خیال ہے اور ان پر بھی جو مشرف کے کل پرزے بنے ہوئے تھے۔ جو بگٹی کے قتل میں بھی ساتھ تھے اور لال مسجد کے ذبیحے میں بھی۔

(وغیرہ وغیرہ۔ عبداللہ طارق سہیل)

سینیر سفارت کار ظفر ہلالی نے افغانستان میں قرآن پاک کی توہین پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ایسے واقعات غلطی سے ہوتے ہیں' جان بوجھ کر نہیں۔" سینیر سفارت کار کی اس لاعلمی پر یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ آخر کیوں ہماری سفارت کاری کامیاب نہیں ہے' کیونکہ امریکی فوجی خود اعتراف کر چکے ہیں کہ انہوں نے جان بوجھ کر قرآن کی توہین اور خدا کی پناہ ٹھٹھے تک۔۔۔

(وغیرہ وغیرہ۔ عبداللہ طارق سہیل)

حنا ربانی کھر نے برطانوی ہائی کمشنر کی آٹھ سفیروں کے ساتھ دعوت کی اور اپنے خاندان کی انگریزوں سے وفاداریوں کی داستانیں سناتی رہیں اور انہیں آزادی سے قبل ان "خدمات" پر ملنے والے سرٹیفکیٹ دکھائے۔

(روزنامہ جنگ)

کراچی میں اہل علم و ادب کی پیداوار بندوق اور پستول کے خوف سے رک گئی ہے۔ حکیم سعید شہید دہلوی' ملا واحدی' شان الحق حقی جیسے کم اور ریحان کانا' اجمل پہاڑی' اسلم لنگڑا جیسے زیادہ نمایاں ہیں۔

(وغیرہ وغیرہ۔ عبداللہ طارق سہیل)

شاعری سچ بولتی ہے

ضیا طارق

شازیہ جمال نیئر ... وہوا

1 "شعاع" سے وابستگی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟ یہ سوچنے کے لیے کتاب ماضی کے اوراق پلٹے تو بے شمار خوب صورت یادیں ذہن کے دریچے سے جھانکنے لگیں۔ ہمارے گھر میں ڈائجسٹ امی اور آپی نازیہ پڑھا کرتی تھیں۔ باجی آسیہ' سعدیہ اور مجھے صرف انٹرویوز اور لطائف وغیرہ پڑھنے کی اجازت تھی۔ میٹرک کے بعد مکمل آزادی کے ساتھ ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت ملی تو یوں لگا گویا قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ دلچسپ واقعات تو بہت سارے ہیں' جن میں سے اکثر دادی اماں سے وابستہ ہیں۔ کیونکہ شعاع سے کہانیاں پڑھ کر دادی کو سنایا کرتی تھی اور اپنی عظیم مصنفات سے تہ دل سے معذرت خواہ ہوں کہ ان کی اتنی جانفشانی اور عرق ریزی سے لکھی گئی کہانیوں کا سارا کریڈٹ میں لے جاتی تھی۔ اگر وہ دادی اماں کے سرائیکی زبان میں دیے گئے بے ساختہ تبصرے سنتیں تو یقیناً" عش عش کر اٹھتیں۔ مگر افسوس! کہ یہ سب اب ماضی کی حسین یادیں بن کر رہ گئی ہیں۔ میری ہم دم' میری دوست' میری رازدار' مجھ سے فرمائش کر کے کہانیاں سننے والی اور کسی بھی موضوع پر بلا تکان بولنے والی میری پیاری دادی تین ماہ قبل ہمیں دائمی جدائی کے دکھ سے ہمکنار کر کے ملک عدم سدھار گئیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

2 ہم چونکہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ اس لیے صبح کا آغاز فجر کی پہلی اذان کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ نماز و تلاوت قرآن کے بعد چائے بناتی اور آٹا گوندھتی ہوں۔ روٹی اور پراٹھے وغیرہ آپی بناتی ہیں۔ ناشتے سے فراغت پانے کے بعد اپنے حصے کی صفائی کرتی ہوں۔ (ہماری حویلی چونکہ بہت بڑی ہے' اس لیے ہم نے صفائی کے لیے اس کے حصے بانٹ رکھے ہیں۔) مجھے گائے' بکریوں اور مرغیوں کے رہائشی حصہ کی جھاڑو لگانی ہوتی ہے۔ جسے یہ "میڈمائیں" حسب توفیق گندا کرنا اپنا فرض اولین سمجھتی ہیں۔ خیر! یہ کام نپٹانے کے بعد جلدی سے اسکول جانے کے لیے تیار ہوتی ہوں۔ میں ایک نجی تعلیمی ادارے "آفاق پبلک اسکول وہوا" میں معلمہ کے فرائض بھی سرانجام دے رہی ہوں۔ اسکول سے واپسی تقریباً" ایک یا ڈیڑھ بجے تک ہو جاتی ہے۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد نماز ظہر ادا کرتی ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد شعاع لے کر ریسٹ کرتی ہوں۔ دن کو سونا میری عادت ہے۔ اور شعاع پڑھے بغیر مجھے نیند نہیں آتی ہے۔

شام کی چائے بنانا اور آٹا گوندھنا بھی میری ذمہ داری ہے۔ سعدیہ اور میں گھاس کا ٹوکہ کرتی ہیں اور پھر باجی آسیہ گائے کا دودھ دوہتی ہے۔ کچن کی باقی ساری ذمہ داری آپی کے سر پر ہے۔ امی آج کل ریسٹ پر ہیں۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اور سعدی چہل قدمی کرتی ہیں اور سارے دن کی روداد ایک دوسرے کو سناتی ہیں۔ کبھی کبھار آپی اور باجی بھی ہمیں جوائن کر لیتی ہیں۔ عشاء کی نماز کے بعد فراغت نصیب ہوتی ہے۔ ویسے شعاع کے لیے کوئی ایک وقت مقرر نہیں ہے۔ نئے شمارے کے آتے ہی ساری روٹین دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ سب سے پہلے قسط وار ناول پڑھتی ہوں' اس کے بعد ناولٹس کی باری آتی ہے اور آخر میں افسانے۔

3 شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ افسانوں کی دنیا میں کچھ بھی جھوٹ نہیں ہوتا۔ شعاع

کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ اسے ہمیشہ سے ہی بہترین مصنفات کا ساتھ حاصل رہا ہے۔ چاہے عمیرہ احمد ہو یا نمرہ احمد 'تنزیلہ ریاض ہو یا عائشہ فیاض 'فائزہ افتخار ہو یا ام ثمامہ 'راحت جبیں ہو یا عنیقہ محمد بیگ 'فرحت اشتیاق ہو یا ثمینہ عظمت علی 'رخسانہ نگار ہو یا راشدہ رفعت 'سعدیہ حمید چوہدری ہو یا نایاب جیلانی 'شعاع کی ایسی بے شمار تحاریر ہیں جو ذہن و دل پر انمٹ نقوش چھوڑ گئیں۔ من و سلویٰ عمیرہ احمد "زرد موسم" راحت جبیں "متاع جاں ہے تو" خوشبو 'بادل' چاند" فرحت اشتیاق "قراقرم کا تاج محل" نمرہ احمد "میرے چارہ گر" رخسانہ نگار "کچی عمر کے دکھ" سعدیٰ حمید "ایک تھی علیزہ" نگہت سیما "تشنگی کا سفر" کنیز نبوی میرے موسٹ فیورٹ ناول ہیں۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

4۔

اچھی ہوں یا بری ہوں خود اپنے لیے ہوں
میں خود کو نہیں دیکھتی اوروں کی نظر سے

میں چونکہ اپنی فیورٹ ہوں اور اپنی خوبیوں کے انبار لگانا میرے لیے قطعاً مشکل نہیں ہے۔ لٰہذا بہتر یہی ہے کہ پبلک کی رائے لی جائے۔

آپی کا کہنا ہے کہ تم اچھی سامع ہو 'لیکن ساتھ ہی گھنی اور میسنی جیسے القابات سے نوازنا کبھی نہیں بھولتیں۔

باجی آسیہ نے ایک بار کہا تھا "تم بہت کیئرنگ ہو۔"

سعدی کہتی ہے "تم میں قوت برداشت بہت زیادہ ہے اور تم غصہ نہیں کرتی ہو۔" اور میں اپنی پیاری بہن کو کبھی نہیں کہہ سکی کہ۔

جو حیراں ہیں تمہارے ضبط پہ کہہ دو قتیل ان سے
جو دامن پہ نہیں گرتا وہ آنسو دل پہ گرتا ہے

قدسیہ ہاشمی نے ایک بار کہا تھا "تم بہت خوش اخلاق 'خوش مزاج اور خوش اطوار ہو۔"

دادی کا یہ جملہ آج بھی مجھے بے انتہا خوش کردیتا ہے۔ "میری شازی مائی بہت معصوم اور بھولی بھالی ہے۔" اپنے بارے میں توصیفی جملے بہت سارے لوگوں سے سن چکی ہوں۔ میری کلاس ٹو کی اسٹوڈنٹ مقدس خان نے ایک بار گفٹ دیا تھا 'جس میں سب سے قیمتی چیز وہ چھوٹا سا خط تھا جس میں مقدس خان نے لکھا تھا۔

"ٹیچر! مجھے آپ سے پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں کسی بھی کلاس میں چلی جاوٴں 'آپ کو نہیں بھول سکتی۔"

فرسٹ ایر میں اردو کی ٹیچر مس فاطمہ نے ایک دفعہ کہا تھا "بیٹا! اپنا رخ انور ان محترمات کی طرف کرکے پڑھو 'تاکہ جن ناگزیر وجوہات کی بنا پر انہیں کتاب کھولنے کا موقع میسر نہیں آسکا۔ کچھ ان کے پلے بھی پڑجائے۔" یہ سن کر میں بری طرح جھینپ گئی تھی۔

6۔ راحت جبیں کے ناول "زرد موسم" سے پسندیدہ اقتباس۔

"یہ بیٹیاں خدا کی رحمتیں 'ہمارے آنگن کی تتلیاں 'یہ ہمارے لیے آزمائش ہیں یا سزا 'کیسے خوش نصیب وہ باپ ہوں گے جن کی بیٹیاں عزت و آبرو کے ساتھ اپنے اپنے گھروں میں شاد آباد ہوں گی 'سب کچھ ان ہی کے ہاتھ میں ہے 'چاہیں تو والدین کا سر فخر سے اونچا کردیں اور چاہیں تو ساری زندگی کے لیے پشیمانی کے گڑھے میں دھکیل دیں اور اپنی من مانی 'اپنی ضد پوری کرکے یہ بھی کون سا خوشی کے جھولے جھولتی ہیں۔ اپنے نازک پیر کانٹوں پر رکھ کر گلابوں کی تمنا کرنے والی معصوم روحو! تمہاری فہم و فراست کہاں سو جاتی ہے؟ اپنی عزت و آبرو 'والدین کا فخر و غرور معاشرتی و مذہبی اقدار ایک انجان دھوکے باز قدموں میں ڈھیر کرتے ہوئے تمہاری عقل و شعور کا دریچہ کیوں بند ہوجاتا ہے؟ میں دھوکہ دینے والوں کو الزام کیسے دوں کہ شیطان کا کام تو ورغلانا ہے 'مگر سیدھے راستے کا شعور تو تمہارے پاس ہے۔"

7 پسندیدہ اشعار۔

نہ بجھا چراغ دیار دل 'نہ بچھڑنے کا تو ملال کر
تجھے دے گی جینے کا حوصلہ 'میری یاد رکھ لے سنبھال کر

یہ بھی کیا کہ ایک ہی شخص کو کبھی سوچنا کبھی بھولنا
جو نہ بجھ سکے وہ دیا جلا 'جو نہ ہوسکے وہ کمال کر

غم آرزو میری جستجو 'میں سمٹ کے آگیا روبرو
یہ سکوت مرگ ہے کس لیے میں جواب دوں تو سوال کر

تو بچھڑ رہا ہے تو سوچ لے تیرے ہاتھ ہے میری زندگی
تجھے روکنا میری موت ہے 'میری بے بسی کا خیال کر

میرے درد کا 'میرے ضبط کا 'میری بے بسی میرے صبر کا
جو یقین نہ آئے تو دیکھ لے تو ہوا میں پھول اچھال کر

فرخ فاطمہ...... حویلی لکھا

1 شعاع سے وابستگی تو تب سے ہے جب سے پڑھنا آیا ہے۔ ہمارے خاندان میں خواتین کی اکثریت ڈائجسٹوں کی دیوانی ہے۔ اور یہ ڈائجسٹ خواتین اور شعاع کے علاوہ اور کون سے ہوسکتے ہیں۔ جب میں اسکول میں پریپ کلاس میں داخل ہوئی تو اردو روانی سے پڑھنا جانتی تھی۔ (ماں 'باپ دونوں ٹیچر ہوں تو فائدہ تو ہوتا ہے نا) اکثر امی کو دیکھا تھا کہ رسالے پڑھتی ہیں۔ فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر اگر کبھی جو اٹھا کر دیکھے تو امی حضور فوراً "ڈانٹ کرلے لیتی تھیں۔ پھر تجسس کو اور ہوا نہ ملتی تو اور کیا ہوتا 'نتیجہ یہ کہ ہم رسالے چھپ کر پڑھنے میں ماہر ہوگئے۔

دلچسپ واقعہ تو یہ ہے کہ ما بدولت پرائمری کی کسی کلاس کے طالب علم تھے۔ (جماعت یاد نہیں) اسکول میں دسمبر کے ٹیسٹ ہورہے تھے۔ ان ہی دنوں ابا اپنی کسی کولیگ سے نیا نکور ڈائجسٹ لائیں۔ (پتا نہیں شعاع تھا یا خواتین) ہم نے جو دیکھا تو پھڑک اٹھے 'لیکن اب پڑھیں تو پڑھیں کیسے۔ اتفاقاً "شام کو میری

چھوٹی بہن کو بخار ہوگیا تو امی 'ابو اسے لے کر ڈاکٹر صاحب کے پاس۔۔۔ اور ہم ڈائجسٹ کے پاس۔ ایک مکمل ناول شروع سے تھوڑا سا پڑھا اچھا لگا 'سو اسی پر جست ۔۔۔ تھوڑا سا ہی پڑھا تھا کہ امی 'ابو کی واپسی ہوگئی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق جلدی سے رسالے کو مقررہ مقام پر رکھا۔ اگلے دن امی کو پھر ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا اور ہمارے پھر عیش۔ لیکن حسب سابق پھر جلد واپسی اور۔۔۔ چند دن یہ سلسلہ چلتا رہا اور پھر امی جان نے رسالہ اپنی کولیگ محترمہ کو واپس کردیا۔ مارے صدمے کے میرا برا حال تھا۔

اب دو سال پہلے مڈل پاس کرنے کے بعد ہمیں رسالے پڑھنے کی جوں ہی اجازت ملی 'علاقے کا ہر بک اسٹال چھان مارا 'لیکن وہ کہانی کہیں نہیں ملی۔ کہانی کا نام 'رائٹر کا نام اور کرداروں کے نام مجھے یاد نہیں۔ (بھلکڑپن کی بھی حد ہوتی ہے۔) لیکن اسٹوری ذہن میں ہے۔ دو بہنوں کی کہانی تھی۔ مزاحیہ انداز میں لکھی ہوئی۔ مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھیں۔ دونوں کے بالوں کا ذکر رائٹر نے چوہیا کی دم کے طور پر کیا تھا۔ کہانی میں ان کے ایک عدد پھوپھا حضور کا ذکر تھا جو ہر دم گئی جوانی کو آواز دینے کی خاطر مختلف ادویات نوش جان فرماتے تھے۔ التماس ہے کہ اگر کسی بہن کو کچھ یاد ہو تو مجھے ضرور بتائیے۔ میں ہر قیمت پر یہ مکمل ناول پورا پڑھنا چاہتی ہوں۔

2 بھئی ہم تو قائداعظم کے اس قول کی مجسم تصویر ہیں۔ (ان دنوں) کام 'کام اور کام۔ صبح کا آغاز نماز سے ہوتا ہے۔ (جوکہ اکثر آخری چند منٹوں میں جلدی جلدی ادا ہوتی ہے۔) نماز کے بعد اپنے اور دیگر بہن 'بھائیوں کے یونیفارم پریس کرنے کے بعد سارے گھر کی صفائی ستھرائی سے فارغ ہوکر جلدی جلدی ناشتا "ٹھونس جاں" کرکے اسکول کا رخ۔ اسکول سے سیدھا انگلش اکیڈمی کا دیدار اور وہاں سے سیدھا سائنس اکیڈمی کی منہ دکھائی کے بعد رات سات بجے ہم گھر داخل ہوتے ہیں۔ کچھ دیر ریسٹ کرنے کے بعد

دوبارہ کتابیں بن بلائے مہمان کی طرح چمٹ جاتی ہیں۔
پڑھ پڑھ کر (بند ہوتی آنکھوں سے) بمشکل نماز عشاء ادا کرکے لڑھک جاتے ہیں۔ لیکن جب شعاع کی آمد ہو تو حال یہ ہوتا ہے صبح ناشتا کرتے ہوئے بھی سامنے شعاع۔ رات کھانا کھاتے ہوئے بھی سامنے شعاع ——— چند دنوں میں شعاع ختم شد اور پھر دوبارہ وہی بور روٹین شروع۔

3 خواتین شعاع کی ہر تحریر ہی بے مثال ہوتی ہے، لیکن کچھ (اسپیشل) تحریریں ایسی ہوتی ہیں جو بھلائے نہیں بھولتیں۔ مریم عزیز کا مکمل ناول "ہم نے دل کو روکا تھا" مجھے بے حد پسند ہے۔ اس ناول کو بلا مبالغہ میں نے پچاس سے زائد دفعہ پڑھا ہے۔ (صرف اسے نہیں، گھر پڑے پرانے رسالے بار بار میں حفظ کرتی ہوں بقول ماما)

فرحت اشتیاق کا ہم سفر بھی بے حد اچھا ہے۔ دل کبھی بھی کسی تحریر کو پڑھ کر نہیں الجھا، بلکہ اگر دل و دماغ میں کوئی الجھن ہو تو شعاع پڑھ کر سلجھ جاتی ہے۔ کبھی کسی کردار میں اپنی شخصیت کی جھلک تو نظر نہیں آئی، لیکن سلوی علی بٹ کے ناول دل کے رستے کے کاشا کی جذباتیت مجھے بالکل اپنی جذباتیت جیسی لگتی ہے۔ یہ جذباتیت ہی تو تھی جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کی۔

اب تک میں نے جتنی بھی تحریریں پڑھی ہیں، کاشا ان میں میرا فیورٹ کریکٹر ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ فطرتاً ایسا معصوم بچہ تھا جو ماں کی محبت کے لیے بلکتا رہتا تھا۔ اور اسی محبت کی عدم دستیابی نے نیگیٹو مائنڈڈ کاشا کو جنم دیا۔

4 اکثر قارئین کی طرح میں بھی یہ گھسا پٹا جملہ دہراؤں گی، آہ یہ کیا سوال پوچھ لیا آپ نے۔
خامیاں دل تھام کے سنیے، بے حد جذباتی، بہت حد تک ضدی، اور کچھ کچھ بے وقوف ہوں۔ (جو مردم شناس نہ ہو وہ کچھ کچھ بے وقوف ہی ہوتا ہے نا) کچھ کچھ بدتمیز بھی ہوں۔ بے حد پوزیسو ہوں۔ قوت برداشت کی کمی بھی ہے۔ تھوڑی سی جلد باز بھی ہوں۔ یعنی جہاں مجھے خاموش رہنا چاہیے وہاں بھی جلدی سے بول پڑتی ہوں اور پھر نتیجہ تو ظاہر ہے، کچھ لوگ مجھے مغرور کہتے ہیں، لیکن میں ان سے متفق نہیں۔ (بس یا ابھی اور ——)

خوبیاں، ایک خوبی تو یہی ہے کہ اپنی خامیاں ٹھیک ٹھیک بتا دیتی ہوں۔ دوسری یہ کہ الحمدللہ شروع سے ہی آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ہوں۔ (بس اللہ کا کرم ہے ورنہ میں تو کچھ بھی نہیں) تیسری یہ کہ مجھے منافقت سے سخت نفرت ہے، اور منافق لوگوں سے بھی۔ کھری بات کرتی ہوں۔ (بعض اوقات اسی وجہ سے لڑائی بھی ہو جاتی ہے۔)

تعریفی جملہ۔ 9th کلاس میں آئے ہوئے ابھی ایک ماہ ہی ہوا تھا میرے انگلش کے استاد سر اشرف وٹو صاحب (بہت قابل ٹیچر ہیں۔ ایک زمانہ ان کی مدح سرائی کرتا ہے۔) نے میرے پاپا جی سے کہا۔ (میرے سامنے ہی)
"یہ بچی ماشاءاللہ بہت ذہین ہے۔ اگر آپ اس پہ توجہ دیں گے تو بہت نام کمائے گی۔"
اتنے قابل استاد کے منہ سے توصیفی کلمہ سن کر مجھے جو خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔

6 پسندیدہ کتاب نسیم حجازی کی "تلوار ٹوٹ گئی" اور ڈپٹی نذیر احمد کا "فسانہ مبتلا"
پسندیدہ شعر۔
دلوں کی عمارتوں میں بندگی نہیں ہے
اور پتھر کی مسجدوں میں خدا ڈھونڈتے ہیں لوگ
اقتباس۔ "جب اپنا بہت عزیز بہت پیارا بچھڑ جائے تو انسان اپنے جینے کے جواز، اپنے زندہ رہنے کے بے معنی سے ہی سہی، لیکن بہانے ڈھونڈنے لگتا ہے، تاکہ اگر ان سے کبھی وہ بچھڑنے والا ملے تو ان سے جینے کا جواز ان کی زندگی کا استفسار نہ مانگے اور مانگے تو وہ جھٹ سے بتائیں۔ تیری یادیں تھیں، کچھ نشانیاں تھیں، کچھ وعدے تھے، کچھ ذمہ داریاں تھیں جن کو نبھانے کے لیے جینا پڑا، مجبوری تھی، سمجھا کرو۔"

ماں

مصنف: میکسیم گورکی
تبصرہ: آمنہ زریں

صلاحیت کا استعمال اگر اجتماعی فائدے کے لیے کیا جائے تو لامحالہ اسے شہرۂ عام ملنے کا امکان ہوتا ہے۔ ادب کے میدان میں بھی لکھنے والوں نے اپنی صلاحیت، جب کبھی "عوام" کہلائی جانے والی جنس کے حقوق کی پامالی اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تحریک پر آزمائی ہے، اسے دوام ہی نصیب ہوا ہے۔

"کنویں کا مینڈک" کی اصطلاح، عرف عام میں محدود پیمانے پر زندگی بسر کرنے والوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ محض اپنے اردگرد کی دنیا کو ہی دنیا تصور کرنا، کنویں کا مینڈک ہو جانے کے لیے کافی ہے —— اس طرح تو پھر ہر دوسرا آدمی ——!
لیکن اس حالت کو ختم کرنے کے لیے، اگر ہم ملکوں ملکوں پھرنے کے لیے وسائل، وقت اور ترجیح نہ رکھتے ہوں تو پھر کتاب ہمارے خیال کو وسعت دینے کا وسیلہ بنتی ہے۔

روس کے سرخ انقلاب نے ایک عالم پر اثرات مرتب کیے —— اور یہ انقلاب کسی غیر ملکی استبداد کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ ریاست کے استحصالی نظام کے خلاف مزدور طبقے کی جدوجہد کا حاصل تھا۔
"ماں" ایک لازوال کردار —— ایک خوب صورت کہانی۔
"ماں" ایک آفاقی رشتہ جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ جس کی اتھاہ محبت کی گہرائی کو ماپنے کے لیے کوئی لفظ نہیں۔

"ماں" محبت کا استعارہ
"ماں" وقف شدہ وفا کی علامت۔
ماں —— دھرتی ماں!
"شہنشاہ" سے آپ نے جانا تھا کہ —— افلاس اور جبر دنیا کے فطری نظام کا حصہ نہیں۔
"ماں" کی کہانی اسی شعور اور یقین پر استوار نظریات کو پھیلانے کی جدوجہد پر مشتمل ہے۔
مشقت اور اس کے صلے میں ملنے والی کٹھن زندگی کو اپنا مقدر سمجھ کر تبدیلی کے کسی امکان کو یکسر فراموش کر کے مزدور اپنے حق سے، حق تلفی سے بے خبر —— اپنی قوت سے ناآشنا —— بے مقصد، بس جیتے جانے اور مر جانے کے عمل سے گزر رہے تھے۔
تو چلیے چلتے ہیں پچھلی صدی کے اوائل کے روس میں، جہاں مزدور کے روز و شب کچھ اس طرح سے گزر رہے ہیں۔
"شام کے وقت جب غروب ہوتے ہوئے سورج کی تھکی تھکی کرنیں مکانوں کی کھڑکیوں میں چمکتیں تو کارخانہ لوگوں کو اپنے پتھریلے تہہ خانوں سے اگل دیتا جیسے وہ محض میل کچیل ہوں اور وہ لوگ ایک بار پھر سڑکوں پر نکل آتے۔"
"دن کارخانے نے نگل لیا، جس کی مشینوں نے اپنی حسب ضرورت مزدوروں کی محنت نچوڑ لی تھی۔ دن ذرا سا بھی نشان چھوڑے بغیر ختم ہو گیا اور انسان اپنی قبر کی طرف ایک قدم اور بڑھ گیا۔"
"وہ لوگ یوں تو اپنے بچوں کو بے دردی سے مارتے

اور گالیاں دیتے تھے لیکن نوجوانوں کی لڑائی اور شراب خوری کو ایک امر واقعہ کی طرح تسلیم کرلیا گیا تھا۔ زندگی کا ہمیشہ یہی رنگ رہا تھا۔ وہ سالہا سال سے اسی طرح ایک گہرے دھارے کی شکل میں بہہ رہی تھی۔ آہستگی اور یکسانیت کے ساتھ اور روز روز ہی ایک سی' غیر متنوع باتیں سوچنے اور کرنے کی عادت' جس کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط تھیں' سب چیزوں کو مضبوطی سے ایک جگہ باندھے ہوئی تھی اور کسی میں ذرہ برابر خواہش بھی نہیں تھی کہ کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔"

"مزدوروں کے شب و روز کے احوال کی جامع تفصیل کا اختتام اس جملے پر ہوتا ہے کہ "ایسی زندگی کے کم و بیش پچاس سال گزارنے کے بعد آدمی مرجاتا تھا۔"

بظاہر سادہ سا لگنے والا یہ جملہ دراصل زندگی کی بے مقصدیت اور بے کیف انجام اور انسان کے فہم و ادراک پر ٹھہرے ہوئے پردے کی طرف اشارہ ہے۔

"پاویل ولاسوف نے باپ کی وفات کے بعد اسی راستے کو اختیار کرنے کی کوشش کی' جو بستی کے تمام نوجوانوں کے لیے 'اپنے بڑوں کا نقش قدم تھا' مگر جلد ہی اس نے اپنے بیٹے میں کچھ تبدیلیوں کو محسوس کرلیا۔ اس نے چھپ کر کتابیں پڑھنا شروع کیں اور کتابوں سے کچھ کاغذوں کی نقل بھی..... ظاہری طور پر اس کے اطوار میں مثبت اور حیران کن تبدیلی آچکی تھی جو کہ بستی کے نوجوانوں میں سے کسی کا خاصہ نہ تھی..... جیسے گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹانا..... سادگی اور صفائی کا خیال رکھنا اور مہذب لہجے کا اختیار کرنا۔

ماں کے استفسار پر پاویل نے کہا۔ "میں قانوناً" ممنوع کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ ان کے پڑھنے پر اس لیے پابندی عائد ہے کہ وہ ہماری' مزدوروں کی زندگی کے متعلق سچی باتیں بتاتی ہیں۔ ان کتابوں کو چھپ کر خفیہ طریقے سے چھاپا جاتا ہے اور اگر مجھے یہ کتابیں پڑھتے دیکھ لیا گیا تو جیل میں ڈال دیا جاؤں گا۔ جیل میں اس لیے کہ میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔"

"تو تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"پہلے پڑھنا اور پھر دوسروں کو پڑھانا چاہتا ہوں۔ ہم مزدوروں کو پڑھنا چاہیے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا اور یہ سمجھنا چاہیے کہ ہماری زندگی اتنی کٹھن کیوں ہے۔"

قانون کے متعلق ایک خوش گمانی وابستہ ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ مگر قانون بنانے والے بھی جب قانون کو موم کی ناک سمجھ لیتے ہیں۔ تب قانوناً" جرائم کی اشکال کو "نیکی اور بدی" کی بجائے "مفاد اور نقصان" میں واضح کرتے ہیں۔

پڑھنا مطلب جاننا..... جانکاری حقیقت کو واضح اور فہم کو نئے امکان عطا کرتی ہے..... یہ ہر طبقے کے لیے ضروری ہے۔ دیکھیے روس کے نوجوان اپنے مادر وطن کی خوشحالی کے خواب کو تعبیر دینے کے لیے کس طرح جان لڑا رہے ہیں۔

"پاویل کے گھر اس کے جیسے اور ساتھیوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ ان مجلسوں کے ساتھی کتابوں کا مطالعہ کرتے' آپس میں بحث کرتے اور اپنے لوگوں کے حالات بدلنے کے لیے پُرعزم جدوجہد کا آہنی ارادہ..... "

"اس چھوٹے سے دم گھٹنے والے کمرے میں ساری دنیا کے مزدوروں کے ساتھ ایک روحانی رشتے کے احساس نے جنم لیا تھا۔ اس احساس نے ماں کو بھی متاثر کیا اور سب کو ایک عظیم جذبے کے رشتے میں منسلک کردیا تھا۔ حالانکہ اس احساس کے پورے معنی اس کے لیے ناقابل فہم رہے' لیکن اسے اس احساس کی بھرپور طاقت کا اندازہ تھا' جو بے انتہا پُرمسرت' پُرامید اور مخمور کن تھی۔"

یہ کتاب ہم پر واضح کرتی ہے کہ سرخ انقلاب مزدور کی حالت زار کے خلاف برپا کیا گیا تھا..... اور استحصالی قوتیں جو حتی الامکان مزاحمت کرتی ہیں' وہ مخالف فریق کے لیے جدوجہد کہلاتی ہے۔

بلند آورش زندگی کی لگی بندھی طرز کو مقصدیت اور حسن عطا کرتے ہیں اور راہ عمل خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے مضطرب رہتی ہے۔

"بستی میں لوگ سوشلسٹوں کا تذکرہ کرنے لگے جو نیلی روشنائی میں لکھے ہوئے پرچے تقسیم کررہے تھے۔ ان پرچوں میں کارخانے کے انتظام و انصرام پر سخت تنقید ہوتی تھی۔ ان میں پیٹرس برگ اور جنوبی روس کی ہڑتالوں کا تذکرہ ہوتا اور مزدوروں سے کہا جاتا کہ وہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے متحد ہوجائیں۔

لوگ مختلف طرز کا رد عمل دیتے۔ کچھ اسے بے فائدہ خیال کرتے۔ کچھ پرجوش تائید کرتے..... ان اشتہاروں سے کھلبلی مچ گئی... ماں نے محسوس کیا کہ ساری ہلچل اس کے بیٹے کی وجہ سے ہے۔ اس کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے فخر اور اس کی سلامتی کی فکر دونوں قسم کے جذبات کی آمیزش تھی۔ خفیہ پولیس نے چھاپا مار کر پاویل کے ساتھیوں کو گرفتار کرلیا۔ خوخول کو پرانی کارکردگی کی بنا پر اور روسوف شکوخا کو دوبدو جواب دینے اور چلانے پر..... پاویل اس دفعہ تو بچ گیا۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ دلدل کے کوپک کا معاملہ کارخانے میں اٹھ پڑا..... کارخانے کے مالک نے دلدل خشک کرانے پر اٹھنے والے خرچ کے لیے تمام مزدوروں کی تنخواہ میں سے ہر روبل پر ایک کوپک کو کاٹنے کا نوٹس لگایا..... مزدوروں میں ہلچل بپا ہوگئی۔ مزدور پاویل سے مشورہ اور راہ نمائی لینے پہنچے اور یوں پاویل نے عملی جدوجہد میں پہلا قدم رکھ دیا۔

"ساتھیو!" اس لفظ سے قوت اور انبساط حاصل کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "ہم وہ لوگ ہیں جو کلیسا اور کارخانے بناتے ہیں' جو زنجیریں اور روپے ڈھالتے ہیں۔ ہم وہ زندہ قوت ہیں جس کی وجہ سے پالنے سے قبر تک تمام لوگ پیٹ بھرتے اور زندہ رہتے ہیں! ہمیشہ اور ہر جگہ ہمیں محنت کرنے والوں میں سب سے پہلے ہوتے ہیں اور ہمارا ہی خیال سب سے آخر میں کیا جاتا ہے۔ ہماری پروا کون کرتا ہے؟ ہماری بھلائی کے لیے کبھی کسی نے ذرہ برابر بھی کوئی کام کیا؟ کیا کوئی ہمیں انسان بھی سمجھتا ہے؟ کوئی نہیں!

ہم اس وقت تک اپنے لیے بہتر حالات حاصل نہ کرسکیں گے' جب تک ہم یہ محسوس نہ کریں کہ ہم سب رفیق ہیں۔ دوستوں کا ایک ایسا خاندان ہیں جو اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کی واحد خواہش کے رشتے میں بندھا ہوا ہے۔"

انتظامیہ سے بات چیت ہوئی..... مزدوروں کو مطالبہ پورا نہ ہونے تک کام نہ کرنے کی تجویز پاویل ولاسوف نے دی' سو کچھ دن بعد' چھاپہ ماروں نے آدھی رات کے وقت مطالعہ میں مصروف پاویل کو گرفتار کرلیا.....!

اس دن اس نے نہ چولہا جلایا' نہ کھانا پکایا اور نہ چائے پی۔ چند برس سے وہ کسی اچھی اور اہم چیز کی مستقل امید میں زندگی گزارنے کی عادی ہوگئی تھی۔ اس کے چاروں طرف نوجوان لوگوں کی مسرت آگیں' پُرشور سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کا سنجیدہ اور آرزومند چہرہ دیکھنے کی عادی ہوگئی تھی جو اس اچھی لیکن خطرناک زندگی کا محرک تھا..... اور اب وہ جاچکا تھا' اور ہر چیز چلی گئی تھی۔

اب تک ماں اپنے بیٹے کے ساتھ ساتھ تھی..... اس کی خوشی میں خوش..... اس کے ساتھیوں کے لیے مہربان میزبان..... مگر پاویل کے جیل جاتے ہی ماں کا عملی کردار دلچسپ اور فطری انداز میں شروع ہوا..... اور غیر محسوس انداز میں ماں بھی اپنے بیٹے کے انقلابی ساتھیوں میں شامل ہوگئی۔

"شہر سے آنے والے یگورا یوانوچ' جس کی سانس پھولی رہتی تھی..... اور گلے سے خرخر کی آوازیں آتی تھیں..... نے ماں سے کہا کہ پاویل کے جیل جانے سے پرچوں کی تقسیم رک جانے کا مطلب ہوگا کہ تمام تر ذمہ داری پاویل پر عائد ہوتی ہے اور پولیس اس کی سزا کو بڑھا دے گی۔ کام کو رکنا نہیں چاہیے۔ یگور نے ماں سے خوانچے والی ماریا سے بات کرنے کو کہا کہ اگر وہ

کھانے کے وقت پرچے بھی لے جاسکے؟ماں نے اس خیال کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ ماریا کو بہت زیادہ بولنے کی عادت لاحق ہے اور وہ آسانی سے پرچے بھجوانے والوں کی نشاندہی کردے گی۔

ماں نے یہ کام خود کرنے کا خیال پیش کیا۔اس نے جلدی جلدی ان لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ہر چیز بہت اچھی طرح کرے گی اور لوگوں کی توجہ کا مرکز نہیں بنے گی۔آخر میں اس نے بڑے وجد وانبساط کے عالم میں کہا۔"انہیں معلوم ہو جانا چاہیے کہ پاویل کے ہاتھ جیل سے یہاں پہنچ جاتے ہیں'انہیں معلوم ہو جانا چاہیے۔"

ماں نے کر دکھایا۔وہ ماریا کی جگہ خود خوانچہ لے کر گئی اور اس کے پہنچائے ہوئے پرچوں نے خفیہ پولیس کو پریشان اور مزدوروں کو پُرجوش کردیا۔پرچوں کی تقسیم کے ایک دن بعد وہ سپاہیوں سے اصرار کرتی کہ اس کی تلاشی لی جائے——اور اپنی اس تدبیر پر بہت خوش رہتی۔

خوخول رہائی پاکر واپس آگیا——ماں نے بڑے جذباتی انداز میں اپنی کارروائی اور کامیابی کا ذکر کیا——خوخول نے آنکھیں پھاڑ کر تعجب سے دیکھا اور پھر مسرت سے چلایا۔

"یہ بات بہت اچھی ہوئی۔"

اور تب خوخول کی دی ہوئی مسرت کے جوش نے ماں کو اپنی سابقہ اور موجودہ زندگی کا موازنہ کرنے پر آمادہ کردیا۔

"جب میں خود اپنی زندگی کے متعلق سوچتی ہوں ——یا میرے یسوع!میں زندہ کیوں رہی؟محنت——مار——اپنے شوہر کے علاوہ کسی کو جانتی نہ تھی۔سوائے خوف کے کسی چیز سے واقف نہیں تھی۔میرے سارے خیالات اور فکریں ایک ہی چیز کے بارے میں تھیں۔بغیر انتظار کرائے اس کی خواہشوں کو پورا کرنا تاکہ اسے غصہ نہ آئے اور مجھے مار کی دھمکیاں نہ ملیں تاکہ اسے کبھی ایک بار تو مجھ پر رحم آجائے!لیکن مجھے تو یاد نہیں کہ اس نے ایک بار بھی مجھ پر رحم کھایا ہو——میں اپنے بیٹے کے لیے خوفزدہ تھی کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں زندہ کیسے رہوں گی۔

ہم عورتوں کی محبت خالص محبت نہیں ہوتی۔ ہمیں ان ہی چیزوں سے محبت ہوتی ہے جن کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔لیکن میں دیکھتی ہوں——دوسرے لوگ دوسرے لوگوں کے لیے مصیبتیں اٹھا رہے ہیں'جیل جارہے ہیں اور سائبریا جارہے ہیں۔ مر رہے ہیں۔نوجوان لڑکیاں'کیچڑ پانی اور برفباری میں شہر سے چار پانچ میل پیدل چل کر راتوں کو تن تنہا ہمارے گھر آرہی ہیں'اس لیے کہ ان کے پاس بے پناہ خالص محبت ہے اور ان کے پاس اعتقاد ہے'لیکن میں اس طرح محبت نہیں کرسکتی۔مجھے تو صرف اپنوں سے محبت ہے'جو چیزیں میرے نزدیک ہیں۔"

"نہیں!تم کرسکتی ہو۔"خوخول نے کہا۔"ہر شخص اس کو چاہتا ہے جو اس کے نزدیک ہو۔لیکن ایک وسیع دل دور کی چیزوں کو بھی اپنا لیتا ہے۔تم بہت بڑی بڑی چیزیں کرسکتی ہو'کیونکہ تم میں ماں کی بے پناہ مامتا ہے۔"

"ماں"کی کہانی محض جدوجہد اور اس کی راہ میں آنے والی دشواریوں کی کہانی نہیں ہے'بلکہ یہ ہر کردار کو بدلتی ہوئی صورت حال کے ساتھ پیش آنے والے ذہنی ارتقا کی کہانی ہے۔دیکھیں ماں کے ذہنی ارتقا کو

"اور اب وہ جیل میں پڑا ہوا ہے——اس بات سے ڈر لگتا ہے——لیکن بہت زیادہ نہیں——زندگی اب مختلف ہے اور میرے خوف بھی مختلف ہیں۔اور میرا دل بھی مختلف ہے'کیونکہ میری روح نے میرے دل کی آنکھیں کھول دی ہیں اور یہ سب کچھ دیکھ کر وہ رنجیدہ ہے لیکن خوش بھی ہے۔بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں میں نہیں سمجھتی۔مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ تم لوگ صحیح معنوں میں اچھے لوگ ہو۔عوام کی خاطر تم نے ایک سخت اور کٹھن زندگی اختیار کی ہے اور صداقت کی خاطر مشکل زندگی گزار رہے ہو اور اب میں تمہاری صداقت کو سمجھنے لگی ہوں۔اپنی جوانی کی امنگوں کے بارے میں سوچتی ہوں'جو پیروں تلے مسل دی گئیں اور اپنے جوان دل کے لیے'جو گھونسوں سے زخمی کردیا گیا اور خود اپنے لیے میرے دل میں ترحم اور تلخی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں'لیکن اب میرے لیے زندہ رہنا کتنا آسان ہوگیا ہے۔رفتہ رفتہ میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی ہوں کہ میں کیا ہوں——!"

ماں کی سادگی اور معصومیت دل کو چھو لینے والی ہے اور اس کے دل میں موجود ہر ایک کے لیے محبت توجہ اور ہمدردی سب کو اپنا بنا لینے والی——!

"جیل میں پاویل سے ملاقات کے دوران ماں نے اسے بتایا کہ وہ کارخانے پرچے پہنچاتی رہی ہے۔

"مگر کیسے؟"کہ پولیس والا ملاقات کی نگرانی پر مامور تھا۔

"ایسے——میں وہ ساری چیزیں کارخانے لے جاتی رہی ہوں۔

وہی گوبھی کا سالن اور دلیا اور ماریا کا پکایا ہوا کھانے کا دوسرا سامان اور دوسری چیزیں۔"

پاویل کی خوشی نے ماں کو مسرور کردیا——اور اپنی خوشی کو خوخول سے ذکر کرتے ہوئے'پاویل کی خوشی سے منسوب کرنے پر——خوخول کہنے لگا"تم بھی عجب ہو!لوگ طرح طرح کی چیزیں چاہتے ہیں'لیکن ماں صرف محبت چاہتی ہے۔"

آخر پاویل رہا ہو کر گھر آگیا۔

"شکریہ ماں!"اس کا ہاتھ کانپتی ہوئی انگلیوں سے دباتے ہوئے پاویل نے دھیمی آواز میں کہا۔

"میری اچھی ماں!بہت بہت شکریہ۔"ہمارے عظیم کام میں مدد کرنے کے لیے شکریہ۔"اس نے دہرایا۔"بہت کم ایسی خوشی کسی کو نصیب ہوتی ہے کہ کوئی کہہ سکے میں اور میری ماں بالکل ایک جان دو قالب ہیں۔"

وہ خاموش تھی اور بڑی آرزو اور اشتیاق سے اپنے بیٹے کے الفاظ کو امرت کے گھونٹوں کی طرح پی رہی تھی اور اس کو توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔کتنا اچھا'کتنا پیارا۔جیل سے رہائی کے بعد پاویل نے یکم مئی کو'مزدوروں کے عالمی دن کو منانے کی تیاری شروع کردی——یعنی اپنی تحریک اور اس کے منشور کا کھلم کھلا اعلان——وہ تحریک جو تمام تحریکوں کے ابتدائی دور کی طرح چھپ چھپا کر' تعداد میں کم ہونے کی بنا پر زیر زمین انداز اختیار کیے ہوئے تھی——یکم مئی اس کے اعلان کا دن ثابت ہونے والا تھا۔

یکم مئی کا دن آن پہنچا——پاویل اور اس کے ساتھی' کارخانے کے مزدور اکٹھے ہوگئے——ہجوم نے مجمع کی شکل اختیار کرلی۔

"ساتھیو!"پاویل کی گہری پاٹ دار آواز آئی۔ماں کی آنکھوں میں گرم گرم آنسوؤں سے جلن سی ہونے لگی اور ایک ہی قدم میں وہ اپنے بیٹے کے پیچھے جاکر کھڑی ہوگئی۔ہر طرف سے آکر تمام لوگ پاویل کے گرد جمع ہوگئے۔جیسے مقناطیس کی طرف لوہے کے ٹکڑے کھنچ آتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

یہاں ناول کا ایک حصہ ختم ہوا——اور دوسرے حصے میں ماں نے شہر جاکر عملی جدوجہد میں کس طرح نوجوانوں کے شانہ بشانہ حصہ لیا——پاویل پر مقدمہ قائم ہوا اور ماں نے بھیس بدل بدل کر کس طرح دور دراز کے سفر طے کرکے لوگوں کو بیدار کرنے کی مہم میں حصہ لیا۔

یہ سب آپ جان پائیں گے——ان شاءاللہ اگلے ماہ۔
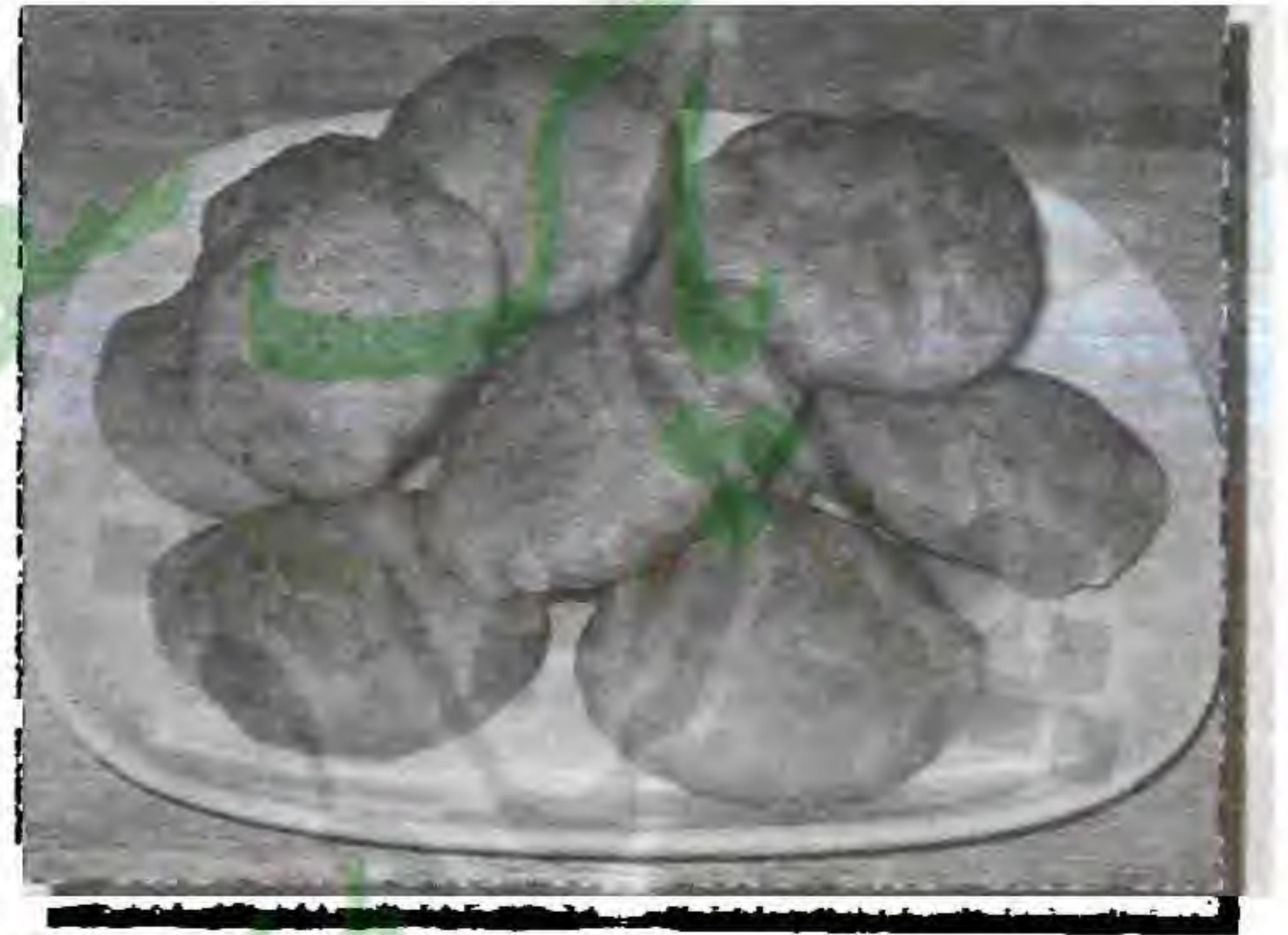
موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مچھلی کے کباب

اجزا :

مچھلی — 1کلو
ڈبل روٹی کا چورا — 1کپ
انڈا — 1عدد
سرخ کٹی مرچ — 1چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا — آدھا چائے کا چمچہ
کھٹائی پاؤڈر — 1چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا — آدھی گٹھی
پودینہ — آدھی گٹھی
ہری مرچ — 4عدد
لہسن پیسٹ — 1کھانے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
تیل — تلنے کے لیے

ترکیب :

مچھلی کو بھاپ میں گلا لیں۔ ٹھنڈا کر کے کانٹے اور گوشت الگ کر لیں۔ ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ کو باریک کاٹ کر باقی تمام اجزا کے ساتھ مچھلی میں ملائیں اور پیس لیں۔ آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں، پھر کباب بنا کر گہرے تیل میں احتیاط سے تل لیں۔

کھٹی کڑھی

اجزا :

کھٹا دہی — آدھا کلو
بیسن — آدھا کلو
لہسن ادرک پیسٹ — 2کھانے کے چمچے
پسی سرخ مرچ — 2کھانے کے چمچے
ہلدی — حسب مرضی
ثابت دھنیا — 2چائے کے چمچے
ثابت سرخ مرچ — 6عدد
کڑی پتا — 6پتے
زیرہ — ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا — آدھی گٹھی
ہری مرچ — 6عدد
نمک — حسب ذائقہ
تیل — حسب ضرورت

ترکیب :

دہی میں آدھا بیسن، نمک، مرچ، ہلدی ملا کر پھینٹ لیں، پھر کسی ململ کے کپڑے یا باریک چھلنی سے چھان لیں اور چار گلاس پانی ڈال کر پکنے کے لیے چولہے پر چڑھا دیں۔ ایک ابال آجائے تو آنچ ہلکی کر کے تین سے چار گھنٹوں کے لیے پکنے دیں۔ باقی بیسن میں نمک، مرچ اور ثابت دھنیا ڈالیں اور پانی سے گھول لیں۔ ہرا دھنیا، ہری مرچ کاٹ کر ملا لیں۔ پکوڑوں کا آمیزہ تیار ہے۔ پکوڑے تل لیں۔ کڑھی گاڑھی ہو جائے تو اس میں پکوڑے ڈال دیں۔ بگھار دینے کے لیے فرائنگ پان میں تیل گرم کریں۔ ثابت سرخ مرچ، کڑی پتا اور زیرہ ڈال کر سنہرا کر لیں۔ (اگر چاہیں، تو پیاز بھی بگھار میں شامل کر سکتی ہیں۔ اس صورت میں زیرہ نکال دیں) اور کڑھی میں ڈال دیں۔ مزیدار کھٹی کڑھی تیار ہے۔

دہی کھٹا نہ ملے تو ایک دن باسی کر کے استعمال کریں۔ بصورت دیگر املی گھول کر یا کیری پیس کر بھی کڑھی میں ملائی جا سکتی ہے۔ اس سے کڑھی کی رنگت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

خستہ کچوریاں

اجزا :

میدہ — 2کپ
بیکنگ پاؤڈر — 1چٹکی
پسا زیرہ — 1چوتھائی چائے کا چمچہ
پسی سونف — 1چوتھائی چائے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ — 1چوتھائی چائے کا چمچہ
چینی — آدھا چائے کا چمچہ
سفید ماش کی دال — 1تہائی کپ
نمک — حسب ذائقہ
تیل — تلنے کے لیے

میدے میں نمک اور بیکنگ پاؤڈر (میٹھا سوڈا) ملا کر چھان لیں۔ چار کھانے کے چمچے تیل ملا کر نیم گرم پانی سے گوندھ لیں اور گیلے کپڑے سے ڈھانک کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ماش کی دال ایک گھنٹہ بھگو کر تھوڑے سے پانی کے ساتھ پیس لیں۔ پسی ہوئی دال میں تمام اجزا ملا کر دو چمچے تیل میں فرائی کر لیں۔ گندھے ہوئے میدے کے پیڑے بنائیں۔ ہتھیلی پر رکھ کر چپٹا کریں۔ تھوڑی سی مسالے دار دال بیچ میں رکھ کر بند کر دیں، پھر ہاتھ سے دبا کر تھوڑا اور چپٹا کر لیں۔ تیل خوب گرم کر کے آنچ ہلکی کر دیں، پھر آہستہ آہستہ کچوریاں ڈالیں۔ سنہری ہونے پر اتار لیں۔ املی اور پودینے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

بادام کا شربت

اجزا :

بادام — 1چھٹانک
چار مغز — 1چھٹانک
چینی — 3پاؤ
پانی — 3لیٹر

بادام کو رات بھر پانی میں بھگو دیں اور صبح اس کے چھلکے اتار لیں، پھر چار مغز اور پانی کے ساتھ ملا کر گرائنڈ کر لیں۔ چینی شامل کر کے چولہے پر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب ایک تار کا ہو جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔ فرحت بخش مشروب تیار ہے۔

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ساتویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل نے اسلامی سلطنت پر حملہ کیا اور عراق' ایران' ترکستان میں مسلم تہذیب و سلطنت کو زیروزبر کر ڈالا' مگر اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں کو نرم کیا اور تقریباً" پوری کی پوری قوم مسلمان ہو کر اسلام کی پاسبان بن گئی۔
اس زمانے کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جا رہے تھے۔ اتفاق سے ان ہی دنوں ایک تاتاری شہزادہ تغلق تیمور شکار کے لیے نکلا ہوا تھا۔ یہ شہزادہ تاتاریوں کی چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا' جو ایران پر حکومت کر رہی تھی۔ شیخ جمال الدین چلتے ہوئے اس علاقے میں پہنچ گئے' جہاں شہزادہ شکار کھیل رہا تھا۔ شہزادے کے سپاہیوں نے شکار گاہ میں ان کی موجودگی کو برا فال سمجھا اور انہیں پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ انہیں شہزادے کے پاس لے گئے۔ وہ انہیں دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ غصے کی حالت میں اس کی زبان سے نکلا
"تم سے تو ایک کتا اچھا ہے۔"
شیخ جمال الدین' تاتاری کے اس نفرت انگیز بیان کو سن کر سنجیدہ انداز میں بولے "اگر ہمیں سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً" ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے۔"
تاتاری اگرچہ وحشی تھے' مگر ان میں فطری مردانگی کا جوہر موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کا یہ جواب تغلق تیمور کے لیے جھنجھوڑنے والا ثابت ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ جب میں شکار سے فارغ ہو جاؤں تو انہیں میری خدمت میں حاضر کرو۔ شیخ جمال الدین جب حاضر کیے گئے تو وہ انہیں تنہائی میں لے گیا اور ان سے پوچھا کہ
"یہ دین کیا ہے؟"
شیخ جمال الدین نے نڈر ہو کر اس کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ اس گفتگو نے تاتاری شہزادے کا دل ہلا دیا۔ بے دینی کی حالت میں مرنا اسے بڑا خطرناک معلوم ہونے لگا۔ وہ اس پر آمادہ ہو گیا کہ اسلام قبول کر لے' تاہم ابھی وہ ولی عہد تھا' بادشاہ نہ تھا۔ اس نے کہا کہ "اس وقت اگر میں اسلام قبول کرتا ہوں تو میں اپنی رعایا کو اسلام کے دین پر نہیں لا سکتا۔"
پھر اس نے شیخ جمال الدین سے کہا۔ "اچھا اس وقت تم جاؤ۔ جب تم سنو کہ میری تاج پوشی ہوئی ہے اور میں تخت پر بیٹھ گیا ہوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا۔"

جمال الدین اپنے گھر واپس آ گئے اور اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب تغلق تیمور کے تخت نشینی کی خبر انہیں معلوم ہو' مگر یہ وقت ان کی زندگی میں نہیں آیا یہاں تک کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے اپنے بیٹے شیخ رشید الدین کو بلایا اور تاتاری شہزادے کا بتا کر کہا کہ
"دیکھو! میں ایک مبارک گھڑی کا انتظار کر رہا تھا' مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آنا میری زندگی میں مقدر نہیں' اس لیے میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ جب تم سنو کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوئی ہے تو تم وہاں جانا اور اسے میرا اسلام کہنا اور بے خوفی کے ساتھ اسے شکار گاہ کا واقعہ یاد دلانا' جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ شاید اللہ اس کا سینہ حق کے لیے کھول دے۔"
اس کے بعد شیخ جمال الدین کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی وصیت کے مطابق ان کے بیٹے شیخ رشید الدین تاتاری شہزادے کی تخت نشینی کا انتظار کرنے لگے۔ جلد ہی انہیں خبر ملی کہ تغلق تیمور تخت پر بیٹھ گیا ہے۔ اب وہ اپنے وطن سے روانہ ہوئے۔ منزل پر پہنچے تو دربانوں نے خیمے کے اندر جانے سے روک دیا' کیونکہ

ان کے پاس دربانوں کو بتانے کے لیے کوئی بات نہ تھی کہ وہ کیوں بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ وہیں خیمے کے قریب ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔ ایک روز وہ فجر کے لیے اٹھے۔ اول وقت تھا اور فضا میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ انہوں نے بلند آواز سے اذان دینا شروع کی۔ یہ آواز خیمے کے اس حصے تک پہنچ گئی' جہاں شاہ تغلق تیمور سو رہا تھا۔ بادشاہ کو اس وقت یہ آواز بے معنی شور معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے ملازموں سے کہا "دیکھو! یہ کون ہے' جو اس وقت ہمارے خیمے کے پاس شور کر رہا ہے' اسے پکڑ کر ہمارے پاس حاضر کرو۔" چناں چہ شیخ رشید الدین فوراً" بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیے گئے۔
اب بادشاہ نے ان سے سوال و جواب شروع کیا کہ تم کون ہو اور کیوں ہمارے خیمے کے پاس شور کر رہے ہو؟ شیخ رشید الدین نے اپنے والد شیخ جمال الدین کی پوری کہانی سنائی اور کہا کہ "آپ کے سوال کے جواب میں جب میرے والد نے کہا تھا کہ اگر ہمیں سچا دین نہ ملا ہوتا تو یقیناً" ہم کتے سے بھی زیادہ برے ہوتے تو آپ نے کہا تھا کہ اس وقت میں کچھ نہیں کہتا مگر جب میری تخت نشینی ہو جائے تو تم میرے پاس آنا' مگر اس کے انتظار میں میرے والد کا آخری وقت آ گیا۔ اب ان کی وصیت کے مطابق میں آپ کے پاس وہ بات یاد دلانے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"
بادشاہ نے پورے قصے کو غور سے سنا۔ آخر میں اس نے کہا کہ "مجھے اپنا وعدہ یاد ہے' میں تمہارے انتظار میں تھا۔" اس کے بعد اس نے اپنے وزیر کو بلایا اور کہا۔
"ایک راز میرے سینے میں تھا' جسے آج اس درویش نے یاد دلایا ہے' میرا ارادہ ہے کہ میں اسلام قبول کر لوں' تمہاری کیا رائے ہے؟"
وزیر نے کہا۔ "میں بھی یہی راز اپنے سینے میں لیے ہوئے ہوں' میں سمجھ چکا ہوں کہ سچا دین یہی ہے۔"
اس کے بعد بادشاہ اور وزیر دونوں شیخ رشید الدین کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد بقیہ درباریوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ بادشاہ کے قبول اسلام کے بعد پہلے ہی دن ایک لاکھ ساٹھ ہزار افراد نے اسلام قبول کر لیا اور بالآخر پوری تاتاری قوم نے بھی۔

ادارہ

خوبصورت

شخصیت کی دلکشی کے لیے صرف خوب صورت چہرہ ہی کافی نہیں۔ صاف ستھرے، خوب صورت ہاتھ اور پاؤں بھی شخصیت کی دلکشی کو اجاگر کرتے ہیں۔ آج ہم آپ کو ''مینی کیور اور پیڈی کیور'' کا سادہ سا طریقہ بتا رہے ہیں جو آپ خود بھی باآسانی گھر پر کر سکتی ہیں۔

درکار اشیا:۔

نیل کٹر، نیل فائیلر، جراثیم کش محلول، تولیہ، شیمپو، چھوٹا برش (پرانا ٹوتھ برش بھی لے سکتی ہیں۔) اور جھانواں۔

طریقہ:۔

سب سے پہلے نیل کٹر سے ہاتھ اور ناخنوں کے ناخن تراش لیں اور پھر فائیلر کی مدد سے انہیں گھس کر مناسب شکل دے لیں۔

☆ ایک ٹب میں نیم گرم پانی لے کر اس میں تھوڑا سا شیمپو اور چند قطرے کسی جراثیم کش محلول کے ملا لیں۔ یہ محلول نہ ہو تو ایک چٹکی پسی ہوئی پھٹکری شامل کرلیں یا پھٹکری کا ایک چھوٹا ٹکڑا پانی میں ڈال دیں۔

☆ تقریباً'' دس منٹ تک ہاتھ اور پیر اس پانی میں ڈبوئے رکھیں۔

☆ ٹوتھ برش کی مدد سے پانی میں ڈوبے ہوئے ہاتھوں اور پیروں کے ناخن اچھی طرح صاف کرلیں۔ ہاتھوں کی پشت پر اور پیروں کے اوپری حصے کو بھی برش کی مدد سے ہلکے ہاتھوں سے صاف کرلیں۔ پیروں کی ایڑیوں کو جھانویں سے رگڑ کر صاف کرلیں۔ اس عمل سے جلد پر موجود میل کچیل اور مردہ خلیات جلد سے الگ ہوجائیں گے اور جلد صاف ستھری نظر آئے گی۔

☆ پھر سادہ پانی سے ہاتھ اور پیر دھو کر تولیہ سے خشک کرلیں۔

☆ بازار میں دستیاب کوئی معیاری اسکرب لے کر اسے ہاتھوں اور پیروں پر ملیں۔ اسکرب نہ ہو تو ایک پیالی دہی میں دو چمچے ہلدی ملا کر ہاتھوں اور پیروں پر ملیں۔ پانچ سے دس منٹ بعد مل کر اتار لیں اور پھر سادہ پانی سے ہاتھ دھولیں۔

☆ آخر میں کوئی اچھا سا موئسچرائزر ہاتھوں اور پیروں پر مل لیں۔ موئسچرائزر نہ ہو تو عرق گلاب لگائیں یا پھر ایک کیلا مسل کر اس میں تھوڑا سا خشک دودھ ملائیں اور پھر اسے ہاتھوں اور پیروں پر تقریباً'' دس منٹ تک لگا رہنے دیں، پھر سادہ پانی سے دھولیں۔ یہ عمل جلد کو قدرتی نمی فراہم کرکے تر و تازہ کردے گا۔

ہمارے بتائے ہوئے طریقے سے مینی کیور اور پیڈی کیور کرکے دیکھیں۔ آپ خود کہہ اٹھیں گی کہ ''لوگ صرف ہمارا چہرہ ہی نہیں، ہاتھ پاؤں بھی دیکھتے ہیں۔''